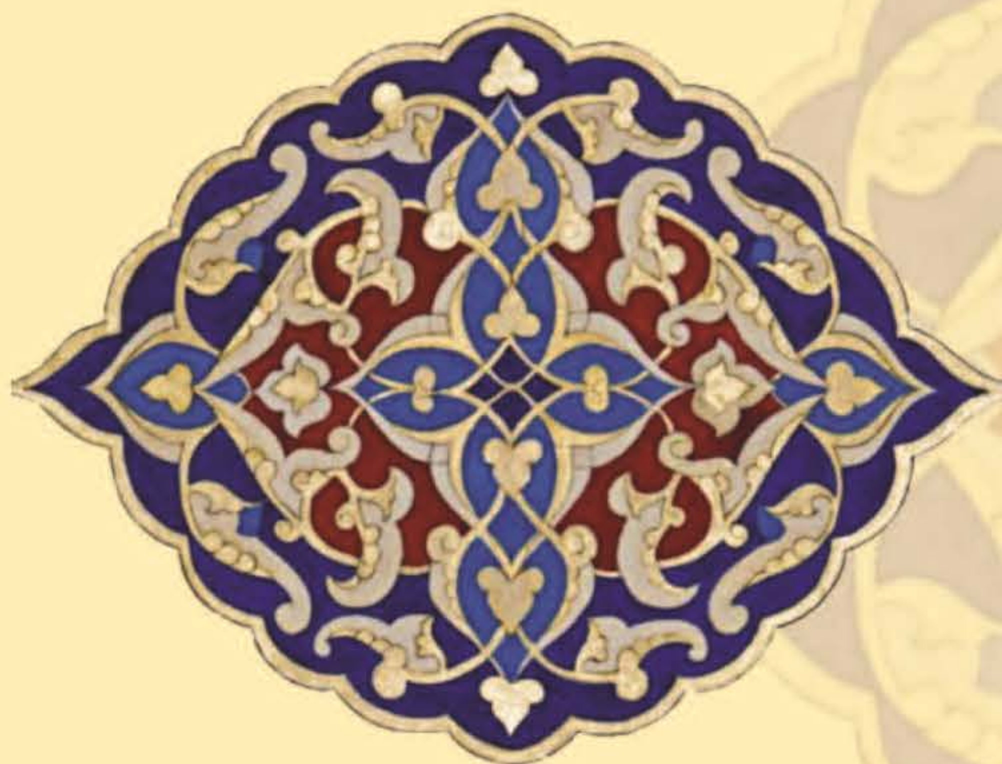


اجتہاد

اسلامی فکر کی عصری تشکیل

ظفراللہ خان



اجتہاد

فکر اسلامی کی عصری تشکیل

ظفر اللہ خان

مشتاق بک کارنر
الکریم مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور

مصنف	:	**ظفراللہ خان**
ایڈیشن	:	2023
اشاعت	:	اکتوبر، 2023ء
تعداد	:	۱۰۰۰
آئی ایس بی این	:	000-000-000-000-0
قیمت	:	....

مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ :https://mushtaqbookcorner.blogspot.com/ فون : 042-37230350
ای میل :

۲۹۷ خان، ظفراللہ
خ ا ن اجتہاد: فکر اسلامی کی عصری تشکیل/ ظفراللہ خان۔
لاہور: مشتاق بک کارنر، ۲۰۲۳
xxx، ۵۷۶ ص۔
کتابیات
آئی ایس بی این:0-000-000-000-000

۱۔اسلام ۲۔اجتہاد ۳۔ نشاۃ ثانیہ ۴۔عنوان ۵۔ مصنف

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

(اقبالؒ)

فہرست مضامین

(اجمالی)

حصۂ اول

پدرم سلطان بود

حصہ دوئم

کسی اور زمانے کا خواب

حصہ سوئم

از خواب گراں خیز

فہرست مضامین

(تفصیلی)

حصہ دوئم

کسی اور زمانے کا خواب

حصہ سوئم

ازخواب گراں خیز



انتساب

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے نام جن
کی فکر کی روشنی میں یہ کتاب لکھی گئی ہے



نغمۂ حیات

اسلام، انسانیت کے لیے فرداً فرداً اور ان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے بھی خدا کی طرف سے آخری ہدایت ہے۔ اس کے امن و سلامتی اور خوشحالی کے پیغام نے 1400 سال سے زائد عرصہ پہلے ایک پاکیزہ اور پُر جمال و پُر جلال امّت کی تشکیل کی۔ مسلمانوں نے ایک شاندار اور بے مثل تہذیب کی تخلیق کی جس نے انسان کی زندگی، اس کے علم اور اس کے ارتقا کی سرحدوں کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔ یہ امّت تقریباً ایک ہزار برس تک بنی نوعِ انسان کے لیے روشنی کا مینار بنی رہی۔ دنیا اس عظیم الشان تہذیب و تمدن، اس کی وسعت پذیر ذہنی استعداد اور قوتِ عمل کو نگاہِ حیرت سے دیکھتی رہی مگر یہ سلسلہ اس شان و تمکنت کے ساتھ جاری نہ رہ سکا۔

پھر مسلم تہذیب لڑکھڑانے لگی اور مسلمان سو گئے۔ اس گہری نیند کے دوران وہ اپنے شاندار ماضی کی یادوں میں کھوئے رہے اور چیختے رہے۔ 'پدرم سلطان بود' (ہمارا باپ بادشاہ تھا)۔ اس دعوے نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر کوئی اثر نہیں ڈالا، نہ پہلے اس سے کوئی فائدہ ہوا اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ عظمتِ رفتہ حالیہ افزائش و ترقی کی ضرورتوں کو نہیں جھٹلاتی۔ مسلمانوں کو سنجیدگی کے ساتھ دروں بینی کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں تازہ افکار پیدا کرنے ہوں گے تا کہ جہانِ نو کو وجود میں لا سکیں۔ یہ ان کی بقا اور زندہ درگور کر دینے والے تعطل سے بچنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ آپ اس کتاب میں ایسی نئی دنیا کے بارے میں میرا خواب پائیں گے۔

میں نے اسلام کی تعلیم بہت کم عمری میں، ملتان کے ایک دُور افتادہ گاؤں کے ایک مدرسے میں حاصل کرنا شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر اسلام کی خوبصورت سچائیاں واضح ہوتی چلی گئیں۔ اس سے میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ اسلام کی موجودہ قدامت پسندانہ تعبیر بعض اوقات نہ صرف وقت کے پیچھے (anachronistic) ہے

بلکہ دشمنِ ترقی اور دشمنِ انسانیت بھی ہے۔ اسلام، جو بنی نوعِ انسان پر اللہ تعالیٰ کی سراسر شفقت و رحمت ہے، غلط تعبیر کرنے والوں کے ہاتھوں استحصال اور غربت و افلاس پھیلانے حتیٰ کہ دہشت گردانہ اقدامات کی وجہ سے قتلِ انسان کا بھی ایک ذریعہ بن چکا ہے۔ مسلمان ماضی میں پھنس کر رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک صحیح جدید اسلامی زندگی وجود میں لانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اگر پیروکارانِ اسلام اپنے مذہب کو صحیح طور پر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے تو یہ انہیں شاندار ترقیوں سے ہمکنار کر دیتا۔ حقیقی 'اجتہاد' نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان امن و خوشحالی کی زندگی کے حصول سے محروم ہو چکے ہیں، جس کی بنا پر وہ اپنی پوری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع کھو بیٹھے ہیں۔

'یہ کتاب' لکھنے کی بنیاد ایک لیکچر بنا جو میں نے 2003ء میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں علماء کے سامنے دیا تھا۔ اس لیکچر کو شرح و بسط کے ساتھ پہلے اردو بعنوان ''کسی اور زمانے کا خواب'' (2004ء) میں شائع کیا گیا۔ اس موضوع پر میں 40 برس تک اسلام کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ یہ مسئلہ اب تک میری روز و شب کی سوچ بچار کا مرکز و محور بنا چلا آ رہا ہے۔ پھر 2008ء میں انگریزی میں اس کا ترجمہ (The Way Out) شائع ہوا۔ جس کا پیش لفظ جناب ڈاکٹر مہاتیر بن محمد، سابق وزیر اعظم ملائیشیا نے تحریر کیا۔ اس کتاب کے مندرجات کو جب زیادہ وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے تو یہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن نے انگریزی میں

Islam in the Contemporary World: A New Narrative

کے عنوان سے شائع کی۔ 2008ء سے لے کر 2020ء تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ 2018ء میں اس کا ایک ایڈیشن ''حرف محرمانہ: عہد حاضر میں فکری اجتہاد'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اب دوبارہ اس کا نیا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے جس میں دیگر اہم تبدیلیوں کے علاوہ ایک باب (پانچواں) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اب یہ کتاب نئے نام کے ساتھ چھپ رہی ہے، یہ نام کتاب کے مضمون کی روح کے زیادہ قریب ہے۔

یہ کتاب عملاً دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول: پدرم سلطان بود، ماضی کے حالات کی نقش گری ہے اور حصہ دوئم: کسی اور زمانے کا خواب، میں حال اور مستقبل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حصہ اول (باب ایک تا باب چھ) میں، میں ایک تاریخی تنقید کے عمل میں سے گزر رہا ہوں تا کہ ماضی کو واضح طور پر سمجھا جائے اور ہم مستقبل کا نئے سرے سے تصور قائم کرنا شروع کر دیں۔ حصہ دوئم (باب سات تا باب چوبیس) میں اسلامی افکار اور مسلم معاشروں کی تشکیلِ نو پیش کر رہا ہوں۔

ذیل میں ہر باب کے مواد کا ایک مختصر خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے جو میرے استدلال کی ساخت اور نئے اسلامی بیانیے کی تشکیل کی بنیاد کی وضاحت کرتا ہے۔

حصہ اول

پہلا باب: کائنات کی زندگی حرکت میں سے نمودار ہوتی ہے؛ حالتِ جمود میں موت چھپی ہوئی ہوتی ہے تاہم فطرت میں تغیر اور استحکام بیک وقت موجود رہتے ہیں لہٰذا تغیر اور استحکام کے باہمی انحصار کا تسلسل زندگی میں ایک توازن قائم کرتا ہے اور اسلام کی تشکیل میں اصولِ تحرک کو 'اجتہاد' کہا جاتا ہے۔

دوسرا باب: مسلمانوں نے ماضی میں تبدیلی اور جہاد کے سنہرے اصولوں کی روشنی میں ہر چیلنج کا جواب دیا ہے۔ اس طرح وہ ہر شعبۂ زندگی میں بنی نوعِ انسان کے ارتقاء میں خصوصی کردار ادا کرتے رہے۔

تیسرا باب: اسلام نے اپنی اعلیٰ وارفع اقدار کے لیے روحانی بنیادیں اور فطری ترغیبات فراہم کی ہیں۔ اس نے فطرت کے مطالعے پر زور دیا ہے، نہ کہ اس کی پوجا پر، جیسے کہ یہ ہوتی رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں سائنسی اندازِ فکر نے جنم لیا، اس طرح علم کو بڑے پیمانے پر فروغ ملا۔ یہ علم پورے یورپ میں پھیلا اور اس سے یورپی نشاۃ ثانیہ کی شمع روشن ہو گئی۔

چوتھا باب: قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنے زمانے کے چیلنج کا بڑی کامیابی سے جواب دیا اور وہ

مہذب دنیا پر چھا گئے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ انحطاط کا شکار ہوتے چلے گئے۔ بالآخر نیند کی گہری وادیوں میں کھو گئے جبکہ اہل یورپ نے مسلمانوں کے علم کی بنیادوں پر سلطنتیں استوار کر لیں۔ یہ بنیادیں آج تک حکمرانی کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔ ان کے سائنسی انقلاب نے ان کی کایا پلٹ دی ہے اور عہدِ روشن خیالی (Age of Enlightenment) نے ایک نئے معاشرتی نظام کو جنم دے دیا ہے تاہم ان پیش قدمیوں کے دوران مسلمان غفلت کی گہری نیند میں پڑے رہے۔

پانچواں باب: عہد متوسط اور جدید دور میں جب مغرب میں پرانے علوم نئی شکل اختیار کر رہے تھے اور نئے علوم رونما ہو رہے تھے تو مسلم دنیا خواب غفلت کے مزے لے رہی تھی یا پھر پدرم سلطان بود (مرا باپ بادشاہ تھا) پکار رہی تھی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مسیحی علما کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عقل و خرد سے جنم لینے والے علوم اور اس کے نتیجے میں بننے والے اداروں کی مخالفت کر رہی تھی اور انہیں اسلام کی تعلیمات کے خلاف ثابت کر رہی تھی۔

چھٹا باب: مسلم تہذیب خطرات سے دوچار ہے۔ یہ خطرات نہ اچانک سامنے آئے ہیں اور نہ یہ غیر متوقع تھے۔ یہ آنے ہی تھے کیونکہ مادی دنیا فطری قوانین کے تابع ہے۔ مسلمانوں نے ان قوانین کی اطاعت اختیار نہیں کی چنانچہ وہ اپنی زیست کے سب سے پست درجے پر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا فخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔

حصہ دوئم

ساتواں باب: یہ دنیا فضول نہیں بنائی گئی بلکہ ایک مقصد کے تحت وجود میں لائی گئی ہے۔ یہاں آنے والے انسانوں کے لیے خدا کی طرف سے رہنمائی کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اپنے مقصدِ تخلیق کو فراموش کیے بیٹھی ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ دوسرا گروہ کئی خداؤں کے احکامات کی اطاعت کرتا ہے۔ پھر ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ تمام انسانی مسرتیں گناہ ہیں۔ مسلمانوں کو ایک صحیح نظامِ فکر کی ضرورت ہے جسے اختیار کر کے انھیں ان

مطالبات کو پورا کرنا ہے جو یہ نظامِ فکر ان پر عائد کرتا ہے۔

آٹھواں باب: اسلام میں صرف دو ہی مستند ماخذ ہیں۔قرآن پاک اور سنت۔ یہی شریعت کی بنیاد ہیں جبکہ فقہ میں حالات کے مطابق قرآن پاک اور سنت کی تشریحات شامل ہیں۔شریعت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا لیکن فقہ میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔عصرِ حاضر کے مسلمان شریعت کی بہ نسبت فقہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مزید برآں فقہ کو بہت زیادہ اہمیت دینے سے قانون پرستانہ نقطۂ نظر (legalistic view) پیدا ہو گیا ہے جس سے اسلام کے اخلاقی، معاشرتی اور روحانی پہلو نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

نواں باب: اسلام کا مطلب ہے سلامتی اور اطاعت۔اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو اطاعت کہا جاتا ہے۔اسلام میں چند ایک بنیادی اجزائے ایمان ہیں اور چند ایک لازمی رسوم ہیں۔ مقاصدِ شریعت میں مذہب کا تحفظ و مدافعت، زندگی، قوائے ذہنی، عزت و ناموس، خاندان، مال و دولت کی حفاظت اور عدل گستری شامل ہیں۔ چند ایک بنیادی اور قانونی تعلیمات ہیں جن پر عمل کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔مسلمانوں کو صرف بنیادی تعلیمات پر توجہ مرکوز کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

دسواں باب: عقلیت (rationality) انسان کو دیگر مخلوقات سے الگ کرتی ہے۔مسلم روایت عقلیت کو وحی کے اندر شامل کرتی ہے اور عقل کو ایک بڑی حقیقت کا جزو سمجھتی ہے۔ تاہم بیشتر مسلمانوں کا عمومی طرزِ عمل غیر معقول اور غیر متوازن ہے جس کی وجہ سے انہوں نے نظامِ ترجیح کو درہم برہم کر دیا ہے۔لہٰذا انہیں اس غیر معقول رویّے سے نجات پانے کی کوشش کرنا ہوگی۔

گیارہواں باب: اسلام کسی مادی و اخلاقی اور دنیاوی و روحانی تقسیم کی اجازت نہیں دیتا۔مسلمانوں نے 'دین' کے اسلامی تصور کو ترک کر دیا ہے اور اس کی بجائے نفس کشی اور رواقیت کا تصور اپنا لیا ہے۔مسلمانوں کو دنیاوی اور روحانی شعبوں کی تقسیم کا سلسلہ چھوڑ دینا چاہیے، ورنہ وہ ترقی نہیں کر سکیں گے۔

بارہواں باب: اسلام نے نیم قبائلی یا موروثی سیاسی نظاموں کو تبدیل کر کے مشاورت پر مبنی نظام (شوریٰ) قائم کیا ہے۔ چاروں خلفائے راشدین کے بعد مسلم حکمرانوں نے پھر سے مطلق العنان خاندانی نظام قائم کر لیے تھے۔اس تاریخی سیاق وسباق نے مسخ شدہ مذہبی وسیاسی سوچ کو جنم دیا۔بعض اہل دانش اس فطری جمہوری اصول سے اختلاف کرتے ہوئے ایک غیر حقیقی مثالیت کا تصور پھیلا رہے ہیں تا کہ ایک ہمہ مقتدر خلیفہ وجود میں لا سکیں جبکہ مسلمانوں کو ایک ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہے جو کہ مشاورتی ہو۔

تیرہواں باب: ہمارے مدارس نے روایتی اسلامی تعلیمات ہم تک منتقل کر کے حیرت انگیز کردار ادا کیا ہے لیکن اب حالات و کیفیات تبدیل ہو چکی ہیں۔مسلمانوں کو بھی لازماً تبدیل ہو جانا چاہیے تا کہ وہ وقت کے ساتھ ہم قدم ہو کر چل سکیں۔ ہمارے مذہبی تعلیم کے نظام کی اصلاح وتجدید کی ضرورت ہے۔نصاب اور طریقِ تدریس فوری تبدیلیوں کے متقاضی ہیں تا کہ مسلمانوں کو مزید ذہنی افلاس سے بچایا جا سکے۔

چودہواں باب: آج مسلم دنیا میں سائنس کا حال اندوہ ناک ہے۔مسلم ممالک میں ہر دس لاکھ کی آبادی میں صرف 530 سائنسدان ہیں جب کہ جاپان میں ہر دس لاکھ افراد میں 5095 سائنس دان ہیں۔194 یہودی سائنسدانوں کو نوبیل پرائز مل چکا ہے جبکہ یہ صرف دو مسلمانوں کو مل سکا ہے اور وہ دونوں امریکہ میں ہی آباد ہو چکے ہیں۔مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی اگر وہ دنیا میں باوقار حیثیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پندرہواں باب: مسلمان بالعموم اخلاقی انحطاط کا شکار ہیں اگرچہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کے پیروکار ہیں جو اعلیٰ وارفع کردار کے حامل تھے۔کسی انسان کی عظمت کو اس کی تعلیم، مال ومتاع یا منصب کے پیمانے سے نہیں بلکہ اس کے بلند کردار اور طور طریقوں سے ناپا جاتا ہے۔مسلمانوں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے ایک باقاعدہ تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

سولہواں باب: اسلام ہمیں بنی نوعِ انسان کے فطری وقار کا احترام کرنے کا درس دیتا ہے لیکن مسلمانوں نے انسانی حقوق کی جدید تحریک کے بارے میں منفی رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ وہ ان طور طریقوں سے اختلافی رویہ اختیار کر سکتے ہیں جو ان کے نظامِ عقائد سے متصادم ہوں لیکن ایسے تمام اطوار کو مثبت انداز میں قبول کر لینا چاہیے جو ان عقائد سے مطابقت رکھتے ہیں۔

سترہواں باب: عورتیں انسانی آبادی کا نصف ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کے بارے میں مسلمانوں کا رویہّ زیادہ تر غیر اسلامی اور قدامت پسندانہ بلکہ ازمنہ وسطیٰ جیسا ہے۔ جب کہ مسلم تہذیب کے سنہری دور میں عورتیں امت مسلمہ کی معاشرتی ثقافتی اور تہذیبی زندگی میں موثر طور پر شریک رہی ہیں۔ اس کے برعکس جدید دور کے مسلمانوں نے عورتوں کو مسلم معاشرے سے الگ تھلگ کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کو اپنا طرز عمل تبدیل کرنا ہوگا کیونکہ یہ بالکل ناقابل دفاع ہے۔

اٹھارہواں باب: قدیم اسلامی ادب میں مسلم ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمّی کہا جاتا ہے یا ایسے لوگ کہا جاتا ہے جن کی حفاظت ایک معاہدے کے تحت کی جاتی ہو۔ قرآن پاک کسی عداوت کے بغیر ہمہ گیر مذہبی یکجہتی کو مقدس قرار دیتا ہے، اس طرح شدت پسندی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیا آج کل کے مسلمان اپنے ملکوں میں اقلیتوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ 'ہرگز نہیں' یہ صورت حال تبدیل ہونی چاہیے۔

انیسواں باب: بیشتر مسلمان کسی نہ کسی شکل میں غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مذہبی طبقہ ماضی بعید کے ساتھ چپکا ہوا ہے اور سوچتا ہے کہ ہر وہ چیز جو مغرب سے آتی ہے وہ 'کفر' ہے۔ مسلم آبادی کا تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تہذیب کا ایک اندھا غلام ہے۔ مسلمانوں کو یہ سوچ ترک کر کے ہر اس چیز کو قبول کر لینا چاہیے جو اچھی ہے اور جو چیز بُری ہے اسے ترک کر دینا چاہیے۔ انہیں ذہانت میں بھی دنیا کی قیادت کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

بیسواں باب: اسلام 'شریعہ' اور 'تزکیۂ نفس' یا تصوّف پر زور دیتا ہے۔ تصوف نے بیرونی اثرات کے تحت ایسے اصول وضع کر لیے ہیں جو اسلامی روحانیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ سے

مسلمان ترکِ دنیا (asceticism) اور غیر معقولیت (irrationality) کی طرف مائل ہو گئے۔ حقیقی تصوّف اس جدید دنیا میں مفید کردار ادا کر سکتا ہے، جہاں لوگ دولت، جائیدادوں اور سامانِ تعیش کی ہوس میں مبتلا ہو رہے ہیں، تصوّف انہیں راہِ راست پر لا سکتا ہے۔

اکیسواں باب: مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں بستی ہے۔ جدید شہریت ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ان ملکوں کے قوانین کی پاسداری کریں اور وہاں کے شہریوں کے ساتھ یکجہتی اور یگانگت کا مظاہرہ کریں۔ مغربی ریاستوں کے مسلم رہائشیوں کو سیاسی لبرل ازم کا مقامی برانڈ قبول کرنا پڑتا ہے۔ 'دعوت' اور 'مصلحت' کے اصول تقاضا کرتے ہیں کہ وسیع تر معاشرے کے ساتھ خوش دلانہ اور مخلصانہ روابط بڑھائے جائیں۔ اگر مسلمان ایک غیر مسلم ریاست میں ایسا کرنے میں اذیت محسوس کریں تو وہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی اسلامی ریاست میں جا سکتے ہیں۔

بائیسواں باب: بعض مسلمان پوری مسلم اُمّہ کے لیے ایک 'خلافت' کے قیام پر زور دیتے ہیں تاہم اسلام ہمہ گیر 'خلافت' کے قیام کا حکم نہیں دیتا جو کہ ایک تاریخی تعامل کا مظہر ہوتی ہے۔ مسلمان زمین پر اللہ عزوجل کے خلیفہ ہیں۔ تاریخی طور پر خلافتِ راشدہ کے بعد کوئی مستحکم خلافت قائم نہیں ہوئی۔ ایک ہمہ گیر مسلم خلافت کا قیام اب ناقابلِ عمل (unrealizable) رومانوی تصور ہے، بالخصوص جدید قومی ریاستوں کے سیاق وسباق میں یہ بالکل ہی ایک خواب ہے۔ مسلم اُمّہ کے اتحاد کی خواہش مسلم ریاستوں کی دولتِ مشترکہ کے قیام میں ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

تئیسواں باب: جہاد کے نام پر مسلمانوں کی بہت خون ریزی ہو چکی ہے۔ جہاد، درحقیقت شر کے خلاف تمام سطحوں پر ایک طویل پُرامن جدوجہد کا نام ہے۔ جہاد کا مطلب یہ بھی ہے کہ بہت ہی خاص حالات میں ایذارسانی سے بچنے کے لیے ایک مسلح جدوجہد شروع کر دی جائے۔ جہاد کا اعلان صرف ایک مسلم ریاست اپنے دفاع کی خاطر کر سکتی ہے؛ چند گروہوں یا افراد کو، حکومت سے بے نیاز ہو کر، اعلانِ جہاد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جب گروہ یا افراد اپنے طور پر،

آزادانہ یہ عمل شروع کر دیں گے تو یہ انارکی اور فتنہ انگیزی ہوگی جو کہ 'انسان کے ہاتھ سے انسان کے قتل' سے بھی بدتر ہوگا۔

چوبیسواں باب: اسلام کے بعض اصول مستقل نوعیت کے ہیں۔ اسلام اجتہاد کا تصور اس لیے دیتا ہے کہ انسانی تہذیب کی پیش قدمی کے لیے پُرامن جدوجہد کا ساتھ دیا جائے۔ شریعت بنیادی اصول دیتی ہے جن کی ترجمانی لازماً بذریعہ اجتہاد کی جانی چاہیے۔ پوری امتِ مسلمہ ایک ذہنی انحطاط کے دور سے گزر رہی ہے۔ اس کا رُخ پیچھے کی طرف موڑنے کی اشد ضرورت ہے۔ آج مسلمانوں کو ایک کلّی اجتہاد کی ضرورت ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کی بنیاد پر موجودہ مذہبی افکار کی جامع تشکیل نو کی طرف لے جائے لیکن گزشتہ پانچ سو سالوں کی پیش قدمیوں کو بھی ذہن نشین رکھنا ہوگا۔

کتاب کے مختصر سے تیسرے حصے میں حضرت علامہ اقبالؒ کی ایک ولولہ انگیز نظم کے ساتھ ساتھ مصنف کی طرف سے ایک گزارش کی گئی ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں مسلم عوام اور مذہب اسلام پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میرا یہ یقین بھی ہے کہ علم اور صحیح ایمان رکھتے ہوئے ہم وہی لوگ بن سکتے ہیں جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ ایسے لوگ جیسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے چاہتا رہا ہے کہ ہم ویسے ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس نصب العین کے لیے یہ کتاب ہمارے سفر کا ایک حصہ ہوگی۔ درحقیقت گم شدہ روایت کی بازیافت کے لیے ایک کوشش ہے:

میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
(بال جبریل: ذوق شوق)

اس کتاب میں کہیں کہیں دردِ دل کی وجہ سے زبان ذرا تلخ ہوگئی ہے جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ شاید اس طرح کی صورت حال کے لیے کہا جاتا ہے کہ

نوا را تلخ تر زن جو ذوق نغمہ کم یابی
(جب نغمہ سننے کا ذوق کم ہو تو اپنی نوا کو زیادہ تلخ کر دو)

اسی پس منظر میں کچھ سابقہ عظیم تاریخی شخصیتوں کی تعلیمات پر بھی تبصرے کیے گئے ہیں جو صرف اور صرف ضروری سبق سیکھنے کی نیت سے کیے گئے ہیں جبکہ ہمارا خیال ہے کہ وہ لوگ روشنی کے عظیم مینار تھے مگر انسان تھے۔

میں ان متعدد حضرات کا شکر گزار ہوں، جنھوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔ میں جناب یحییٰ خان کا پر شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کے انگریزی ایڈیشن کو اردو میں بہت مہارت اور عرق ریزی سے منتقل کیا۔ میں شکریہ ادا کرتا ہوں سیف اللہ بخاری کا جس نے تحقیق میں میری مدد کی۔ جناب احمد جاوید، وقار حمدی اور خورشید ندیم کا مشکور ہوں جن سے ہمیشہ ان موضوعات پر عالمانہ بحثیں رہتی ہیں۔ میں شکر گزار ہوں جناب ڈاکٹر حسن الامین، اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ڈائیلاگ اسلام آباد، کا جنھوں نے میری اس کاوش کو خوبصورت کتابی شکل میں قارئین تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔

میں خاص طور پر اپنی والدہ محترمہ اور اپنے بچوں (حسن اور فاطمہ) کا مشکور ہوں جن کی دعاؤں اور قربانی کے بغیر یہ تحقیقی کام ممکن نہ تھا۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے جو میں نے بہتر پاکستان اور بہتر دنیا وجود میں لانے اور مسلمانوں کی اصلاح اور احیا کی خاطر کی ہے اور میری کوتاہیوں کو اپنے فضل وکرم سے معاف فرمائے۔

سپردم به تو مایه خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

(میں نے اپنا سب کچھ آپ کے سپرد کر دیا ہے)
(آپ ہی اس میں کم اور زیادتی کا خیال فرمائیں)

ظفراللہ خان

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

(بانگ درا: خضر راہ)

حصہ اول

پدرم سلطان بود



اسلام بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے خداوند قدوس کی طرف سے بھیجی گئی آخری وحی ہے۔اس نے ایک اعلیٰ وارفع امت کی تشکیل کی طرف رہنمائی کی اور ایک ایسی شاندار تہذیب کو جنم دیا جس نے زیستِ انسانی کی تمام سرحدوں کو آگے دھکیل دیا۔مسلمان تقریباً ہزار سال تک بنی نوع انسان کے لیے روشنی کا مینار بنے رہے اور دنیا ان کی پُرعظمت تہذیب سے استفادہ کرتی رہی۔مگر پھر ان کی تہذیب خود ہی لڑکھڑا گئی اور مسلمان رفتہ رفتہ حالتِ خودرفتگی میں کھو گئے۔ایک گہری نیند نے انہیں دبوچ لیا۔اُس حالت کے دوران وہ اپنے شاندار ماضی کی طرف دیکھتے رہے ہیں اور صدا دیتے رہے ہیں:

'پدرم سلطان بود'

(میرا باپ بادشاہ تھا)

۱

اسلام کا اصولِ حرکت



ساحل افتادہ گفت گرچہ بے زیستم
ہیچ نہ معلوم شدہ آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ، ئی تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم، گر نروم نیستم

ا۔ حرکت

1972ء میں جب میں چھٹی جماعت میں تھا۔ میرے ایک محترم استاد کلاس میں با آواز بلند حضرت اقبالؒ کی یہ نظم پڑھ کر ہمیں سنایا کرتے تھے:

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا چلنا، چلنا، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے کہتے ہیں جسے سکوں، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب تارے، انساں، شجر، حجر سب
ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا
کہنے لگا چاند، ہم نشینو اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

(بانگ درا: چاند اور تارے)

میرا ناپختہ ذہن اس خوبصورت نظم کے پُرشکوہ معنوں کو نہ سمجھ سکا۔ پھر بھی میں نے اس کے غنائی ابیات اور ہم وزن مصرعوں کو زبانی یاد کرلیا۔ جوں جوں میرا شعور ترقی کرتا رہا۔ ان کے معنی اور اہمیت میری روح کو سیراب کرتی رہی۔ میرے استاد کی رعب دار تحریک انگیز آواز میرے ذہن میں گونجتی رہی۔

جب میں نے ایک مدرسے میں فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو پہلی کتاب جو ہم نے پڑھی 'ایساغوجی فی منطق'[۱] تھی۔ اس کتاب کے فلسفیانہ مفروضوں میں سے ایک یہ ہے کہ 'کائنات ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے'[۲]۔ ایساغوجی فی منطق، ہرقلیطس[۳] کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ جس نے بجا طور پر کہا تھا کہ 'ہر چیز متغیر ہوتی ہے، کوئی چیز ساکن نہیں رہتی۔ کوئی شخص ایک ہی دریا میں دو مرتبہ قدم نہیں رکھ سکتا'۔ میرے نوخیز اور اثر پذیر ذہن نے کتاب کے نام کو کسی حد تک مزاحیہ پایا تاہم اس نے مجھے کائنات پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کر دیا جو ہمیشہ متغیر ہوتی اور وسیع سے وسیع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں زندگی بھر حرکت اور تبدیلی (تغیر) کے ہمہ گیر تصورات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرتا آ رہا ہوں۔ تاہم جب میں ان تصورات کو سمجھنا شروع کرتا ہوں تو وہ پہلے ہی تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں۔ صاحبِ شعور انسان بننے کے چالیس سال بعد اور زندگی کے عملی تجربات حاصل ہونے پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تبدیلی کائنات کا جوہرِ حقیقی ہے اور ہم سب کو اس سے ہم قدم ہو کر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں
(بانگ درا: ستارہ)

۱۔ 'ایساغوجی فی المنطق' علم منطق کی ایک یونانی کتاب Porphyry's Isagoge کی شرح ہے۔ جو ایک ایرانی فلسفی اثیرالدین ابہری نے لکھی ہے۔ یہ کتاب برصغیر ہند و پاکستان کے دینی مدرسوں کے نصاب کا حصہ ہے۔

۲۔ العالم متغیرون

۳۔ Heraclitus of Ephesus: ہرقلیطس (BC475-535) یونانی فلسفی تھا جس نے کائنات کے بنیادی جوہر کے مستقل تغیر پر اصرار کی وجہ سے شہرت پائی تھی۔

قرآن تغیر پیہم کے اس اصول کی توثیق کرتا ہے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ. (سورۃ الرحمٰن، آیت:۲۹)

(ہر آن وہ نئی شان میں ہے)

اس کارگاہ عالم میں اللہ تعالیٰ کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ وہ بے حد وحساب نئی سے نئی وضع اور شکل اوصاف پیدا کررہا ہے۔اس کی دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔اوراس کا خالق ہر بار اُسے ایک نئی صورت سے ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ. (سورۃ النور، آیت:۴۴)

(رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کررہا ہے۔اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے)

یہ آیات اس بدیہی (manifest) صداقت کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتی ہیں کہ کائنات میں بنیادی اصول حرکت ہے، جمود (innertia) نہیں۔ یہاں مسلسل آگے کی طرف بڑھتی ہوئی ایک حرکت اور ایک مستقل تخلیقی بہاؤ ہے، نہ کوئی ٹھہراؤ ہے اور نہ رکاوٹ ہمیشہ ایک پیش قدمی ہے، ہر لمحہ نیا ہے اور ہر لمحہ ایک نئی دنیا سامنے لاتا ہے۔ کائنات متحرک ہے اور مستقلاً حرکت میں رہتی ہے۔اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی واضح وصحیح تقسیم نہیں۔ جدید سائنس اس حقیقت کی دریافتوں کے ساتھ شہادت دیتی ہے کہ مادہ (matter) مستقل وجود نہیں رکھتا بلکہ ہمیشہ 'سیال حالت' میں رہتا ہے۔

لیکن کائنات کی تبدیل ہوتی ہوئی حالت کے بارے میں ہمارے علم کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے فراہم کی گئی ہے جس میں ہمیں ہدایت دی گئی ہے کہ صرف تغیر مستقل ہے۔خالق حقیقی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ صرف اہل بصیرت حالتِ تغیر کو سمجھ سکیں گے بہ الفاظ دیگر نادان مستقل رہتے ہیں اور حالتِ موجود میں خوش وخرم رہتے ہیں اور وہ مستقلاً تبدیل ہوتے ہوئے زمانے اور ہمیشہ برپا رہتی ہوئی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ یقیناً فہم وبصیرت سے محروم ہیں۔

اس فہم کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں حالتِ تغیر کو قبول کرنا ہوگا۔ ہر تغیر ایک لمحہ پہلے مستقل (constant) تھا۔ تسلسل، تغیر کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ حال (present) کے لیے

ماضی (past) ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت میں تغیر اور تسلسل/ استقلال (استحکام) پہلو بہ پہلو موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک دائمی قانون ہے جو بتاتا ہے کہ 'پائیداری' اور تغیر کو لازماً ساتھ ساتھ رہنا ہے۔صرف حالتِ استحکام (stability) میں موجود رہنے کا مطلب جامد(static) رہنے اور ملیامیٹ ہوجانے کی طرف میلان کا مظہر ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ناعاقبت اندیشی سے تبدیلی کر دینا دروازے کے قبضے اکھاڑ دینے کے مترادف ہے۔اگر کوئی آدمی استحکام کے ساتھ زنجیر سے بندھا رہے اور مسلسل ہونے والی تبدیلیوں کا ساتھ نہ دے تو وہ ماضی کی یادگار بن جائے گا، یا زیادہ بہتر الفاظ استعمال کئے جائیں تو وہ ایک پتھرایا ہوا ڈھانچہ (fossil) کہلا سکے گا۔اگر وہ صرف تبدیلی کے ہی ساتھ رہے تو وہ ماضی کے استحکام کے ساتھ اپنے نفع بخش روابط منقطع کر بیٹھے گا۔شواہد کے اس مجموعے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تسلسل اور تغیر کائنات کے دو مطلق حقائق ہیں اور ان کا مسلسل باہمی انحصار انسانی زندگی کے توازن کی ضمانت ہے۔

اس تغیر کا انسانی اور اخلاقی، سیاق وسباق میں ایک خاص مقصد اور خصوصی مطلب ہے: وہ ہے انسانی تجربات کی تقطیر کرنا۔فطرت، اس طریق عمل کے ذریعے بنی نوع انسان کو آزمائش میں ڈالتی ہے اور مفید کو غیر مفید سے چھانٹ کر الگ کر دیتی ہے۔قرآن مجید اس نقطے کو یوں واضح کرتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۭ. (سورۃ آل عمران، آیت: ۱۴۰)

(ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں تاکہ ہم چھانٹ سکیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ونظام کو کون سمجھتا ہے اور کون اس کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے)

یہ آیت اس بات کو کافی حد تک واضح کر دیتی ہے کہ جو لوگ تبدیلی کا ساتھ دیتے ہیں وہ بقا پائیں گے۔حضرت اقبالؒ نے حرکت کے اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ شخصیت کا ایک تسلسل ہے جس کے لیے 'خودی' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

شخصیت ایک کیفیت اضطراب ہے اور یہ صرف اسی صورت میں جاری رہ سکتی ہے کہ یہ حالت قائم رہے۔ اگر کیفیت اضطراب برقرار نہ رہے تو سکون آنا شروع ہو جائے گا۔ حالت اضطراب انسان کی انتہائی بیش قیمت کامیابی ہے اس لیے اسے اس امر کا اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ حالت سکون کی طرف واپس نہ لوٹ جائے۔ وہ چیز جو کیفیت اضطراب کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہتی ہے وہ ہمیں لافانی بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس طرح اگر ہمارے مشاغل کا رخ اضطراب برقرار رکھنے کی طرف ہے تو موت کا صدمہ اس کو متاثر نہیں کرے گا۔ (تعارفی نوٹ، اسرار خودی)

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بے زیستم
ہیچ نہ معلوم شدہ آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ، ئی تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم، گر نروم نیستم

(شکستہ ساحل نے کہا اگرچہ میری زندگی کے دن بیت چکے)
(آہ میں سمجھ نہیں سکا کہ میں کون ہوں)
(آپے سے باہر ہوتی موج نے پاس سے گزرتے ہوئے کہا)
(میں اس وقت تک ہوں جب تک چلتی رہوں، اگر نہ چلی تو مر جاؤں گی)
(پیامِ مشرق: زندگی و عمل)

۲۔ جدوجہد

تسلسل کے ساتھ ہونے والا یہ تغیر ہم سے توجہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ عظیم مسلم فلسفی اور سائنسدان ابن مسکویہ[۱] نے کہا ہے کہ کائنات میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر جہد للبقا (بقا کی کوشش) جاری ہے۔ جس میں صرف اعلیٰ صلاحیتوں والی انواع بقا پا سکتی ہیں۔ یہی وہ اصول

۱۔ بوعلی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ (932ء-1030ء) موجودات عالم پر سائنسی نقطہ نظر سے بحث و تحقیق کرنے والا حکیم، حیاتیات کا ماہرِ خصوصی، نباتات میں زندگی دریافت کرنے والا پہلا سائنس دان تھا۔ زندگی کے ارتقا کا نظریہ سب سے پہلے معلم ثانی ابونصر فارابی نے پیش کیا اور ابن مسکویہ نے اس کی تشریح کی۔

ہیں جو چارلس ڈارون[1] نے 'جہد للبقا' اور 'بقائے اصلح' کے عنوانات سے لکھے ہیں۔ ہم بطور مسلمان ان حیاتیاتی اصولوں کی تعبیرات سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے۔ بہرحال ہم ان اصولوں کے انسانی اور اخلاقی سطحوں پر عملی اطلاقات کا ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو لوگ روحانی اور مادی طور پر ترقی کی منازل طے نہیں کرتے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔

بنی نوع انسان اور انبیاء علیہم السلام کی تاریخ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے اس حقیقت کی ایک قابل اعتماد گواہی ہے کہ بنی نوع انسان کا ارتقاء اور اس کی بقا جہدِ مسلسل اور بلند اخلاقی اقدار کا علم بلند رکھنے میں مضمر ہیں۔ قرآن مجید اس کی یوں تاکید کرتا ہے:

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۗ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ. (سورۃ الرعد، آیت: ۱۷)

(اللہ تعالیٰ حق و باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نفع دینے والی ہے وہ زمین میں قائم رہتی ہے)

کیا خوبصورت اصول بیان کیا گیا ہے۔ بے کار جھاگ اور غیر مفید چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک شخص جھاگ جیسا ہے یا اس جیسا ہو جاتا ہے وہ مٹا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ بنی نوع انسان کے لیے فائدہ مند ہے وہ دوام حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی نسل، قوم یا مذہب انسانیت کے لیے بے فائدہ ہو جاتا ہے، اسے صفحاتِ تاریخ سے مٹا دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی قوم، نسل یا مذہب انسانیت کے لیے نفع بخش ہے، وہ اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک اپنے اندر افادیت رکھتا ہے۔ حافظ شیرازیؒ بالکل بجا کہتے ہیں:

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ باعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما
(جس کا دل عشق سے زندہ ہو جائے وہ کبھی بھی نہیں مرتا)
(ہم انسانیت کے عشق میں مبتلا ہیں، لہٰذا دنیا کے نقشہ پر ہمیشہ رہیں گے)
(غزلیات حافظؒ)

---

[1] ۔ Charles Robert Darwin: چارلس ڈارون (1809ء - 1882ء) ایک انگریز ماہر حیاتیات تھا۔ اس نے قدرتی انتخاب (Natural Selection) کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق جو چیز زیادہ خوبیوں کی حامل اور طاقتور ہے وہی اس دنیا میں باقی رہتی ہے۔

انسان کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت، ترقی کرنے اور بقا پانے کی اہلیت اور مقامِ عظمت حاصل کرنے کی استعداد ان اوصاف اور اعمال کے ذریعے نشوونما پاتی ہیں جن کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ مثلاً علم، عبادت، صداقت، دیانت، محبت، انسان کی خدمت، انصاف، گناہ سے نفرت اور دیگر خصوصیات جو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو ودیعت کی ہیں، انہیں فروغ دینے کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ ان خصوصیات کے برعکس بھی کچھ خصوصیات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔ سچائی ایک قوت ہے اور جھوٹ کمزوری ہے۔ انصاف ایک قوتِ کار ہے اور بے انصافی ایک ضعیفی ہے۔ صرف ایسے لوگ بقا پاتے ہیں جو نیک اعمال کے ذریعے اپنے اندر قوت اور صلاحیتِ زیست پیدا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید (سورۃ الانبیاء، آیت: ۱۰۵) میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ.

(ہم نے زبور میں (اچھائی اور برائی کے) ذکر کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ زمین کے وارث وہی لوگ ہوں گے جو اچھے اعمال (قوت والے اعمال) کریں گے)

انیسویں صدی کا جرمن فلسفی نطشے[1] اس تصور کو یوں بیان کرتا ہے: جو چیز بھی زندگی کو بڑھاتی اور اس میں بہتری لاتی ہے، مفید ہے، باقی چیزیں بالکل ردّی ہیں اور انسانی تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دینے کے قابل ہیں۔ بنی نوع انسان کے لیے بیکار چیزوں کو ضائع کر دیئے جانے پر انسانی تاریخ میں کوئی نوحہ نہیں ہے۔

متذکرہ بالا روایات، مذہبی اور دنیاوی، دونوں سے یہ بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ صرف وہ لوگ اور مذاہب باقی رہ جاتے ہیں جو بنی نوع انسان کے لیے فائدہ مند ہوں، جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔ علمی معیار رکھتے ہوں۔ سچائی کے حامل ہوں۔ بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں اور عدل گستری کرتے ہوں۔ ظلم، جھوٹ اور انسان سے نفرت پر استوار قوموں اور مذاہب کا تاریخ صفایا کر دیتی ہے۔ لوگوں کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ان کی اخلاقی اور جسمانی کمزوریاں انہیں نیست و نابود نہیں کریں گی۔ انہیں یقینی طور پر معلوم

---

[1] Friedrich Nietzsche: فریڈرک نطشے (1844ء - 1900ء) جرمن فلسفی تھا جس نے فوق البشر (superman) کے تصور کو آگے بڑھایا۔

ہونا چاہیے کہ ان کے لیے موت کا گھنٹہ ضرور بجے گا:

And therefore never send to know for whom the bell tolls;

It tolls for thee.

(Meditation XVII)

(کسی کو یہ جاننے کے لیے باہر مت بھیجو کہ گھنٹہ کس کے لیے بج رہا ہے)
(یہ تمہارے لیے بج رہا ہے جناب)

تغیر کے ساتھ چلنے والے معاشرے اس گروہ، نسل یا قوم کو لازماً پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جس کا قدم آہستہ اٹھتا ہے۔ انگریز رومانوی شاعر کیٹس[۱] نے لکھا ہے:

So on our heals a fresh perfection treads,

A power strong in beauty, born of us

And fated to excel us, as we pass

In glory that old darkness.

(A fragment book II)

(پس پیچھے پیچھے ہمارے کامل تازہ صاحبان کمال آ رہے ہیں)
(یہ ایک قوت ہیں، حسین بھی ہیں جو ہم سے ہی پیدا ہوئے)
(مقدر ان کا ہے کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں)
(اور ہم دیرینہ تاریکیوں میں شان سے گزرتے ہیں)

اگر کوئی کمزور اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے والی قوم کسی بحران سے دوچار ہے تو ترقی کی راہ پر گامزن اقوام ایک لمحہ رک کر اظہار افسوس کر سکتی ہیں لیکن وہ پھر سے اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہو جاتی ہیں۔ ہم اس مادی دنیا میں یہی چیز دیکھ رہے ہیں۔ جب کسی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے تو پیچھے سے آنے والی گاڑیاں لمحہ بھر کے لیے رکتی ہیں اور پھر اپنی منزل کی طرف سفر شروع

۱۔ John Keats: جان کیٹس (1795ء- 1821ء) انگریزی ادب کا ایک عظیم شاعر اور رومانوی تحریک کی ایک اہم شخصیت تھا۔

کردیتی ہیں۔

(دانش کی دیوی کے) اُلّو کو اپنا سفر ہر حال میں پوہ پھٹنے سے پہلے شروع کر دینا ہوتا ہے[۱]۔
حضرت اقبالؒ نے اپنی نظم 'ٹیپو کی وصیت'[۲] میں جو الفاظ کہے وہ اس تصور کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کرتے ہیں اور ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ ہم اس تبدیلی کا خوش دلی سے خیر مقدم کریں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے رکھی ہے۔

تُو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جُوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
(ضربِ کلیم: سلطان ٹیپو کی وصیت)

حضرت اقبالؒ نے بارہا جدوجہد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے اس لیے کہ آزادیٔ عمل ایک انعام ہے جسے جیتا جانا چاہیے۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوای زندگانے نرم خیز است
بہ دریا غلت و باموجش در آویز
حیاتِ جاودان اندر ستیز است
(ساحل پر بزم آرائی نہ کرو)
(وہاں نغمۂ زندگی بہت دھیما ہے)
(دریا میں غوطہ زن ہو اور موجوں سے زور آزمائی کرو)
(کیونکہ دائمی زندگی جدوجہد میں مضمر ہے)
(پیامِ مشرق: لالہ صحرا)

۱۔ منروا، یونانی علم الاصنام میں دانش کی ایک دیوی ہے جو الّو کو اہم کاموں کے لیے استعمال کرتی تھی۔ ہیگل نے اسے اپنی کتاب Elements of the Philosophy of Right میں بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔
۲۔ ٹیپو سلطان کی وصیت کے عنوان سے علامہ اقبال کی یہ نظم ضرب کلیم میں ہے۔ ٹیپو میسور کا مسلمان حکمران تھا۔

چکنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دل نا صبور دارم چو صبا بہ لالہ زاری
(کیا کروں، میں فطری طور پر زیادہ عرصہ ایک جگہ پر ٹک نہیں سکتا)
(میں دل مضطرب رکھتا ہوں، جو ایسے مچلتا ہے جیسے مغرب کی طرف سے آنے والی ہوا سے گلِ لالہ کے کھیتوں میں ہلچل مچتی ہے)

چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے
تپد آن زمان دل من پی خوبتر نگاری
(جونہی میری نظریں ایک خوبصورت چہرے سے ٹکراتی ہیں)
(میرا دل اس سے بھی زیادہ خوبصورت چیز کے لیے مچلنے لگتا ہے)

زشرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابی
سرِ منزلی ندارم کہ بمیریم از قراری
(میں چنگاری سے ستارہ تلاش کرتا ہوں اور ستارے سے سورج)
(منزل کا کچھ پتہ ہی نہیں، ٹھہراؤ کی وجہ سے مرا جا رہا ہوں)

چو ز بادۂ بہاری قدحی کشیدہ خیزم
غزلی دگر سرایم بہ ہوای نو بہاری
(جب ایک چشمے سے کشید کی ہوئی شراب نوش کر کے اٹھتا ہوں)
(تو دوسرا شعر الاپتے ہوئے ایک اور چشمہ تلاش کرنے لگتا ہوں)

طلبم نہایتِ آن کہ نہایتی ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبی بہ دل امیدواری
(میں اس چیز کی انتہا ڈھونڈتا ہوں جس کی کوئی نہایت ہے ہی نہیں) (بے قرار نظروں اور پر امید دل کے ساتھ جی رہا ہوں)
(پیام مشرق: حور و شاعر)

۳۔ اسلام میں حرکت و جد و جہد

زندگی کے لیے تغیر و ثبات دونوں ہی نہایت ضروری ہیں۔ تغیر صرف اس صورت میں اچھا ہوتا ہے جب وہ اپنے اندر انسانیت کے لیے کوئی افادیت رکھتا ہو اور بقائے انسانیت کے لیے کوئی

کردار صرف وہ قومیں ادا کرسکتی ہیں جو علم کے زیور سے آراستہ ہوں اور بنی نوع انسان کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔

ہمیں بحیثیت انسان اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم زمان و مکان میں رونما ہونے والے تغیر و تبدل کا ساتھ دے رہے ہیں؟ کیا ہمارے پاس وہ علم موجود ہے جس کی ہمیں زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضرورت ہے؟ کیا ہم انسانیت کی خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں؟ کیا ہم عہد حاضر کے چیلنجوں کا مناسب جواب دے سکتے ہیں؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا دورِ جدید کے مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی[1] نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'A Study of History' (مطالعۂ تاریخ) میں جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں وہ پوری تاریخ انسانیت میں قوموں کے عروج و زوال کی وضاحت کرتا ہے۔

ٹائن بی نے تہذیبوں کی فرداً فرداً نشاندہی کرتے ہوئے انہیں 'اکائیاں' (units) قرار دیا ہے اور وہ ہر تہذیب کے لیے ایک 'للکار' (challenge) اور ایک 'جواب' (response) کا تصور پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تہذیبیں چند شدید مشکلات کے ایک مجموعے اور ان کے جواب کے طور پر وجود میں آئی ہیں۔ تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والی اقلیتوں نے ان کے ایسے حل وضع کئے جنہوں نے ان کے سارے سماج کی از سرنو تشکیل کردی۔

یہ 'للکاریں' (challenges) اور ان کے 'جوابات' (responses) مادّی و جسمانی تھے جیسا کہ قدیم بابل کے سمیریوں (Sumerians) نے جواب دیا۔ جب انہوں نے جنوبی عراق کے بے قابو دلدلی علاقوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور وہ اس طرح کہ انہوں نے عہد حجری کے آخری دور کے ایسے باشندوں کو اپنے معاشرے میں ضم کرلیا جو بڑے پیمانے کے آبپاشی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے۔ (اور ان سے کام لے لیا گیا) جبکہ بعض تہذیبوں نے 'للکار' کا سماجی جواب دیا جیسے کیتھولک چرچ نے بعد از روما کے یورپ میں چھڑنے والی بدنظمی پر اس طرح قابو پایا کہ نئی جرمن خصوصیات رکھنے والی بادشاہتوں کو ایک غیر منقسم مذہبی کمیونٹی کی شکل

---

[1]۔ Arnold Joseph Toynbee: آرنلڈ جوزف ٹائن بی (1889ء-1975ء) ایک برطانوی مورخ تھا۔ اس کی کتاب A Study of History بہت معروف ہے۔

دے دی۔

جب کسی تہذیب نے پیش آمدہ چیلنج (للکار) کا جواب دیا تو اس نے فروغ پایا۔تہذیبوں کو اس وقت زوال آیا جب ان کے رہنماؤں نے موجدانہ انداز میں جواب دینا چھوڑا تو وہ قومیت، عسکریت اور مستبدِ اقلیت کے جبر کی وجہ سے ڈوب گئیں۔ٹائن بی اپنی قوتِ استدلال کی بنا پر دعویٰ کرتا ہے کہ معاشرے قدرتی اسباب کی بہ نسبت خودکشی یا قتل کی وجہ سے زیادہ مرتے ہیں۔خودکشی کے باعث تقریباً ہمیشہ مرتے ہیں۔وہ تہذیبوں کے عروج وزوال کو ایک روحانی طریق کار کے طور پر دیکھتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان جو تہذیب پاتا ہے وہ اعلیٰ درجے کے حیاتیاتی عطیے یا جغرافیائی ماحول کے نتیجے میں وجود میں نہیں آتی بلکہ اس للکار یا چیلنج کا مناسب جواب دینے کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے جس کا وہ خصوصی نوعیت کی مشکل پیش آنے پر فقید المثال اظہار کرتی ہے۔

(A Study of History, p.570)

اسلام بطور ایک مذہب فطرت جو فلسفہ پیش کرتا ہے وہ بقول حضرت اقبالؒ یہ ہے:

اسلام ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے کائنات (universe) کے قدیم جامد نظریئے کو مسترد کرتے ہوئے ایک متحرک وتوانا (dynamic) نظریہ پیش کرتا ہے۔ جملہ زندگی کی حتمی وقطعی روحانی بنیاد جو اسلام کی پیش کردہ ہے دائمی وابدی ہے اور یہ اپنا اظہار تنوع اور تغیر کی صورت میں کرتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت (reality) کے ایسے تصور پر استوار ہو، اسے اپنی زندگی، دوام اور تغیر کی تمام اقسام کے ساتھ لازماً ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اسے لازماً ازلی و ابدی اصولوں کا حامل ہونا چاہیے تاکہ یہ اپنی اجتماعی زندگی کو منضبط (regulate) کر سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جو حی و قیوم ہے ہمیں مستقل تغیرّات کی دنیا میں قدم جمانے کی جگہ عطا کرتا ہے۔لیکن جب دائمی اصولوں کو یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ تغیرّ کے تمام امکانات کو خارج کر دیتے ہیں، جو کہ از روئے قرآن اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین 'نشانیوں' میں سے ہے۔ یہ ایسے مظہر کو ساکت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش ہے جو اپنی فطرت کے تحت اساسی طور پر متحرک ہے۔ یورپ کی سیاسی اور سماجی علوم میں ناکامی اوّل الذّکر اصول کو روز روشن کی طرح واضح کر دیتی ہے؛ اسلام کی

گزشتہ پانچ سو (۵۰۰) سالوں کے دوران حرکت ناپذیری (immobility) مؤخرالذکر اصول کی وضاحت کردیتی ہے۔تو پھر اسلام کی تشکیل میں اصولِ تحرک کیا ہے؟ اسے 'اجتہاد' کہا جاتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے: ہم کیسے یقین حاصل کریں کہ ہم پہلے ہو چکے ہوئے تغیر سے جا ملیں گے کہ ہم بہتری کی طرف بڑھ رہے ہیں اور یہ کہ ہم بنی نوع انسان کے لیے نفع بخش ہیں؟ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہمیں اپنے آپ کو جانچنا اور اپنا احتساب کرنا ہوگا۔

اپنا احتساب کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں: یہ کام ہم خود کریں یا دوسروں کو اجازت دیں کہ وہ ہمارا احتساب کریں۔اسلام ہمیں خود احتسابی (self-reckoning) کی تعلیم دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے خود احتسابی کے عمل کو پسند فرماتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے:

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا. (سورۃ الصافات، آیت: ۲)

(پھر قسم ان کی جو جھڑک کر چلاتے ہیں)

یہ تصوّف کی تعلیمات کا ایک لازمی جزو ہے کہ ہر رات سونے سے پہلے ہم اپنے دن بھر کے اعمال پر غور وفکر کریں۔ اپنا محاسبہ کریں اور اپنے آپ کو جانچیں۔ ہر لمحے کے بارے میں سوچیں اور ہر قدم پر غور کریں۔صوفیاء کرامؒ کے دو اصول ہیں[1]۔(i) نظر بر قدم (اپنے قدموں کا مشاہدہ کرنا) اور (ii) نگاہ داشت (دھیان رکھنا):

(i)۔ **نظر بر قدم (اپنے قدموں کا مشاہدہ کرو):** اپنی توجہ کو مسلسل مقصد پر مرکوز رکھو۔قدموں کا مشاہدہ کرنے کا مقصد اپنے حالات پر نظر رکھنا بھی مراد ہے۔اس امر کا خیال رکھو کہ اقدام کرنے کے لیے کونسا وقت صحیح ہے؟ کون سا وقت ایسا ہے کہ اقدام نہ کیا جائے اور کون سا وقت توقف کے لیے صحیح ہے؟ بعضوں کا خیال ہے کہ 'نظر بر قدم' ایک جملہ ہے جو کسی کے فطری مزاج میں مضمر دانش کا حوالہ دیتا ہے۔

---

[1]۔ یہ اصول خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ (متوفی، 1179ء) کے وضع کردہ آٹھ اصولوں میں سے ہیں۔یہ اصول ان کے صوفیانہ اعمال میں سے ہیں جنہیں کلمات قدسیہ یا قواعد یا اسرار نقشبندیہ کہا جاتا ہے۔

(ii)۔ **نگاہ داشت (دھیان رکھنا):** تمام اجنبی اور ضعیف خیالات اور اعمال کا مقابلہ کرو۔ ہمیشہ خیال رکھو کہ تم کیا سوچ رہے ہو اور کیا کر رہے ہو؟ تاکہ ہر گزرتے واقعے اور تمہاری روزمرہ کی زندگی کے ہر معاملے پر تمہاری بقائے دائمی کا نقش ثبت ہو سکے۔ خبردار رہو۔ خیال کرو کہ کونسی چیز تمہاری توجہ کو کھینچتی ہے؟ اپنی توجہ کو ناپسندیدہ چیزوں سے واپس موڑنا سیکھو۔ اس امر کا اس طرح بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ خیالوں میں چوکنا رہو اور اپنے آپ کو یاد رکھو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنے فکر اور عمل کے ہر پہلو کے بارے میں محتاط اور ہوشیار رہنا چاہیے۔ یہ مسلسل خود احتسابی بطور فرد اور بطور قوم ہماری بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
(بال جبریل: مسجد قرطبہ)

اسلام نے تغیر اور ثبات کے دو اساسی اصولوں کو درست قرار دیا ہے۔ اسلام کے اندر بھی چند نظریات ہیں جنہیں 'محکمات' (مستقل) کہا جاتا ہے جو زمان یا مکان کی تبدیلی کے تابع نہیں ہیں۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ. (سورۃ آل عمران، آیت: ۷)

(وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اس میں بعض آیتیں محکم ہیں (جن کے معنی واضح ہیں) وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری مشابہ ہیں (جن کے معانی معلوم یا معین نہیں)

مثال کے طور پر خدا کی وحدانیت پر ایمان لانا۔ رسولوں پر ایمان لانا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر ایمان۔ قرآن پر ایمان۔ جزا و سزا پر ایمان۔ بنیادی اشیائے ضرورت کے جائز و ناجائز ہونے پر ایمان۔ یہ سب دائمی و مستقل اصول ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ بنیادی عقائدِ ایمان ہیں جو اثبات و استحکام کے تقاضے پورے کرتے ہیں اور صحت مند انسانی نفسیات اور اجتماعی وجود کے لیے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

اسلام نے تغیر و تبدل کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلنے کے لیے ہمیں 'اجتہاد' کا تصور دیا ہے۔ لفظ

'اجتہاد' عربی کے لفظ 'جَہَدَ' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں 'جدوجہد' (جہد فی الامر کسی کام کے لیے بہت کوشش کرنا) بالخصوص 'اجتہاد' کے معنی ہیں گہرے غور وفکر کے ذریعے اپنے آپ سے سخت مقابلہ کرنا۔ اسلامی قانون میں اجتہاد کے معنی ہیں ایسے مسائل کی آزادانہ یا فطری و خلقی تعبیر کرنا جن کا قرآن پاک اور سنت (حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور ارشادات) اور 'اجماع' (اہل علم کے اتفاق رائے) میں واضح طور پر اور حسب ضرورت ذکر موجود نہیں۔ قرون اولیٰ کی امت مسلمہ میں مناسب استعداد اور اہلیت رکھنے والے ہر قانون دان کو اپنی فکر کو بروئے کار لا کر ان مسائل پر اپنی 'رائے' اور 'قیاس' کے استعمال کا حق ہوتا تھا۔ جن فقہا نے یہ ذہنی کاوشیں کیں انہیں اصطلاحاً مجتہدین کہا جاتا تھا۔ عباسیوں کے دور (750ء–1258ء) میں مختلف 'مذاہب فقہی' وجود میں آ گئے تھے۔ بعض سنی علما نے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں قرار دیا کہ 'اجتہاد کے دروازے' بند ہو چکے ہیں اور کوئی عالم کبھی بھی 'مجتہد' کی اہلیت حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ طے پایا کہ بعد میں آنے والے فقہا کو صرف 'تقلید' کرنا ہو گی۔ یعنی انہیں اپنے عظیم پیشروؤں کی رائے بلا حیل وحجت مستند سمجھنا ہو گی اور وہ زیادہ سے زیادہ اس امر کے مجاز ہوں گے کہ وہ اپنی قانونی رائے ان مسلمہ نظائر (established precedents) کی روشنی میں قائم کریں۔ اہل تشیع (جو اسلام کے اندر ایک اقلیتی فرقہ ہے) نے اس معاملے میں سنیوں کی کبھی پیروی نہیں کی اور وہ اب بھی اپنے سرکردہ فقہا کو 'مجتہد' قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود متعدد سنّی ممتاز علما مثلاً شیخ ابن تیمیہؒ[۱] اور امام جلال الدین سیوطیؒ[۲] نے خود کو مجتہد کے طور پر پیش کرنے کی جرأت کی۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں متعدد اصلاحی تحریکیں اٹھیں جنہوں نے بڑے زور وشور سے 'اجتہاد' کے احیاء کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اسلام کو ان 'بدعتوں' کی ضرر رسانیوں سے نجات دلائی جائے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہیں اور ایسی اصلاحات کی جائیں جو اسلام کو جدید دنیا کے

---

[۱]۔ امام تقی الدین احمد ابن تیمیہؒ (1263ء–1328ء) اسلامی سکالر اور مفکر تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ انہوں نے تاتاریوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی سرپرستی کی۔

[۲]۔ امام جلال الدین سیوطیؒ (1445ء– 1505ء) ایک معروف مفسر، محدث، فقیہ اور مورخ تھے۔ آپ کی کثیر تصانیف ہیں جن میں تفسیر جلالین، تفسیر درمنثور، الاتقان فی علوم القرآن اور تاریخ الخلفاء کافی مقبول ہیں۔

تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے قابل بنا دیں۔

اسلام اپنے بنیادی اصولوں (محکمات) کے تحت ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم 'اجتہاد' کے ذریعے ہر نئے چیلنج کا جواب دیں۔ قرآن مجید اور احادیث کی ہر دور کے مطابق تشریح و تعبیر کی ضرورت ہے۔ اگر ہم قرآن پاک یا احادیث میں کسی مسئلے پر اپنی رہنمائی نہیں پاتے تو پھر ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنی ذہانت اور تمثیلی استدلال سے کام لیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا۔ یمن اس وقت ریاست مدینہ کے سیاسی اثر تلے آ گیا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ تعالیٰ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی ہیں۔ (سنن ابوداؤد، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۹۹)

اس حدیث شریف سے یہ بالکل واضح ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چشم تصور سے دیکھ لیا تھا کہ انسانی تہذیب کی مسلسل ترقی کے جاری عمل کی وجہ سے یقیناً ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب مسلمان قرآن و سنت سے براہِ راست رہنمائی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے جواب کو بے حد پسند فرمایا کہ وہ جن معاملات کے بارے میں قرآن و سنت سے رہنمائی حاصل نہیں کر پائیں گے وہ آزادانہ طور پر سوچیں گے اور ایسا کرتے ہوئے قرآن پاک میں مذکور رحم، انصاف، غیر جانبداری اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو یقیناً ذہن میں رکھیں گے۔ یہی اجتہاد کے تصور کا ماخذ ہے۔

اس سیاق و سباق میں ایک اور حدیث بھی قابل ذکر ہے۔ جب حضور نبی پاک ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے کھجور کے درختوں کے عملِ زیرہ پوشی (pollination) کو پسند نہ کیا۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا۔ ہم چند لوگوں کے پاس سے گزرنے لگے تو وہ اپنی کھجوروں کے بالائی حصے پر کچھ کام کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا 'یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟' (بعض لوگوں نے) جواب دیا: 'یہ درختوں میں نر حصوں کو مادہ حصوں کے ساتھ ملا کر زیرہ پوشی کر رہے ہیں'۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'میرا نہیں خیال کہ اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا'۔ انہیں آپ ﷺ کی بات بتائی گئی اور انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو ان کے یہ کام چھوڑنے سے متعلق مطلع کیا گیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'اگر یہ ان کو فائدہ پہنچاتا ہے تو پھر انہیں یہ کرنا چاہیے۔ میں نے محض ایک خیال ظاہر کیا تھا، مجھے اظہار خیال پر اس کا ذمہ دار مت ٹھہراؤ۔ جب میں تم سے اللہ تعالیٰ سے متعلق کچھ کہوں اسے قبول کر لو کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹی بات نہیں کہتا'۔ آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا اپنی دنیاوی زندگی کے بارے میں تم بہتر جانتے ہو۔ (صحیح مسلم، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۶۲۵، ۱۶۲۶، ۱۶۲۷)

اس سے عام بھلائیوں پر ایمان 'معروف' کا تصور دیا گیا ہے۔ 'عرف' ایک رائج الوقت قاعدے یا رسم کو کہا جاتا ہے جسے لوگوں کا اجتماعی شعور قبول کرتا ہے اور قابل اعتبار ہوتی ہے۔ عربی میں ایک عادت یا رواج جسے وسیع پیمانے پر قبولیت اور احترام حاصل ہو اس کو معروف کہا جاتا ہے۔ 'معروف' ایک اسلامی تصور ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جسے عام طور پر جانا پہچانا جاتا ہو۔ اسے سمجھا، تسلیم کیا جاتا اور قبول کیا جاتا ہو۔ قرآن مجید میں اس کا چالیس سے زیادہ مقامات پر ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث کی رُو سے بنی نوع انسان کا اجتماعی ضمیر جس بات پر بھی متفق ہو جائے مسلمانوں کو اسے بطور ایک امر لازم قبول کر لینا چاہیے۔

قرآن پاک اور احادیث کے مطالعہ سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ تمام مسلمانوں کے لیے عصری علوم سے آگاہی حاصل کرنا ایک فریضے کی حیثیت رکھتا ہے اور انہیں اچھے اور مشترکہ طور طریقوں کو قبول کرنا چاہیے۔ 'اجتہاد' اور 'معروف' آنے والی تبدیلیوں کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلنے کے لیے ذرائع اور وسائل ہیں۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے ان خدائی اصولوں

پرعمل پیرا ہو کر بہت سے مسائل کے حل ڈھونڈ لیے تھے۔ درحقیقت انہوں نے نئے نئے شعبہ تعلیم تخلیق کئے اور دنیا کی قیادت کی۔ اس طرح وہ دنیا کے بڑے حصے پر صدیوں حکمرانی کرتے رہے۔

مسلمانوں نے بطور ایک امت عمومی اجتہاد کے دروازے بند رکھے ہوئے ہیں اور معروف پر یقین کرنا بھی ترک کر دیا ہے۔ وہ ماضی کے ساتھ زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں جو غیر متغیر ہیں اور ایک یادگار ماضی بن کر زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے گرد و پیش کی دنیا سے ہم آہنگ اور ہمقدم ہونا چھوڑ چکے ہیں۔ ایک سنجیدہ تجزیئے کی ضرورت ہے تا کہ پتہ چلے کہ آج کے مسلمان کہاں کھڑے ہیں اور وہ کل کہاں چلے جائیں گے؟

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب
(بال جبریل: مسجد قرطبہ)

حوالہ جات

۱۔ اسرارخودی، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۵ء۔

۲۔ بال جبریل، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: تاج کمپنی، ۱۹۳۵ء۔

۳۔ بانگ درا، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔

۴۔ پیام مشرق، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۲۳ء۔

۵۔ دیوان حافظ، حافظ محمد شیرازیؒ۔ لاہور: پروگریسو بکس، ۲۰۱۰ء

۶۔ سنن ابوداؤد، امام سلیمان بن اشعت ابوداؤد سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

۷۔ صحیح مسلم، امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج نیشاپوری ترجمہ علامہ وحید الزمان۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۸۔ ضرب کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: کتب خانہ طلوع اسلام، ۱۹۳۶ء۔

۹۔ A Study of History by A. J. Toynbee. New York: Oxford University Press, 1947.

۱۰۔ An Anatomy of the World by John Donne. London: A. Mathewes for T. Dewe, n.d.

۲

عہد اول میں فکری انقلاب



گر بر فلکم دست بُدی چون یزدان
برداشتمی من این فلک را ز میان
از نو فلکی دگر چنان ساختمی
کازادہ بکام دل رسیدی آسان
(رباعیات عمر خیام)

مسلمانوں نے ماضی میں تغیر اور جدو جہد کے دائمی اصولوں کی روشنی میں ہر چیلنج کا جواب دیا ہے۔ (دیکھیے باب:۱) اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کیسے فتوحات کیں اور کس طرح دنیا کے بڑے حصے پر صدیوں شایانِ شان طریقے سے حکمرانی کرتے رہے۔ انہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں بنی نوع انسان کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اس باب میں، صرف چند ایک چیلنجوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا جو مسلمانوں کو اپنے دورِ حکمرانی میں پیش آئے اور چند مثالیں پیش کی جائیں گی جو اس امر کو افشا کریں گی کہ اس عہد کے مسلمان اپنے دور کے ان چیلنجوں سے کس طرح نبرد آزما ہوئے اور انہوں نے کس طرح دنیا کو اپنی آرزوؤں کے مطابق ڈھال کر دکھایا۔ یہ تجزیہ اس لیے ضروری ہے کہ یہ اس امر کا تعین کرے گا کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ کیا ہم خود احتسابی کے تقاضوں سے استقامت کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہے ہیں؟ کیا ہم تغیرات اور اپنے زمان و مکان کے چیلنجوں کا مناسب جواب دے رہے ہیں؟

۱۔ فکر میں تبدیلی

اسلامی عربیہ میں عرب زیادہ تر صحرا نشین تھے۔ ان کے ہاں چند شہری آبادیاں تھیں لیکن ان کے اندر کوئی ترقی یافتہ سیاسی ڈھانچہ نہیں تھا۔ صرف چند ایک مشترک مفادات رکھنے والے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی آبادیاں تھیں جیسے مکہ، مدینہ اور طائف۔ قبائلی ڈھانچے کے بنیادی خدّوخال یہ تھے:

(۱)۔ صحرا نشین یا بدو زیادہ تر قبائلی ماحول میں رہتے تھے۔ جس میں چند خاندانوں کا ایک گروہ ایک

کنبہ بناتا اور کنبوں کے ایک گروہ سے ایک قبیلہ وجود میں آجاتا تھا۔ مکہ اور مدینہ کے اندر اور اردگرد متعدد قبیلے تھے اور ہر قبیلے کے اپنے اپنے رسم ورواج اور قواعد وضوابط تھے۔ جن چیزوں کی ایک قبیلے میں عام اجازت تھی وہ دوسرے قبیلے میں ممنوعہ چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔

(۲)۔ متعدد قبیلے ایک دوسرے سے مستقلاً برسرپیکار رہتے تھے۔ ان کی زیادہ لڑائیاں خطے میں وسائل کی قلت کی وجہ سے ہوتی تھیں۔ قبیلوں کے درمیاں لڑائیاں کئی کئی نسلوں سے چلتی آرہی تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کے عرب میں جنگ بسوس[۱] جو دو حریف قبائل کے درمیان ایک طویل چپقلش تھی ایک اونٹ کی ملکیت کے تنازعے پر شروع ہوئی تھی۔ قبیلہ بنوتغلب اور قبیلہ بنوبکر تقریباً چالیس سال آپس میں لڑتے رہے۔ ایک دوسرے کے مستقل دشمن بنے رہے اور انتقام در انتقام کا سلسلہ جاری رہا۔

(۳)۔ یہ قبیلے خون اور نسل کی بنیاد پر بنے تھے۔ اس سے قبائلی شجاعت اور جوانمردانہ صفت نے جنم لیا جسے 'مرّوۃ' کہا جاتا تھا۔ جس نے ان کی زندگیوں میں معانی پیدا کیے اور ان کے اندر جرأت، صبر، حوصلہ، میزبانی اور سخاوت نے جنم لیا۔ اس سے انتقام کا جذبہ بھی پیدا ہوگیا۔

(۴)۔ کسی قبیلے کے 'شیخ' کا انتخاب بڑوں کی ایک مجلس کرتی تھی۔ شیخ اس شخص کو بنایا جاتا تھا جو اس کام کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا۔ ذہانت، پختہ کاری، جرأت، قیادت، انتظامی صلاحیت، زبان میں روانی اور اعلیٰ تجارتی صلاحیتیں رکھتا ہوتا تھا۔

(۵)۔ شیخ مختارکل تھا جو اپنے لوگوں اور ان کے انتظامی امور کو کنٹرول کرتا تھا، وہ قبیلے کی حفاظت کرتا اور جھگڑے نمٹاتا، اشیا ومقبوضات کی تقسیم کرتا اور قبیلے کے کمزور افراد کو تحفظ بھی دیتا تھا۔

(۶)۔ اس وقت جذبۂ حب الوطنی قومی نہیں بلکہ قبائلی ہوتا تھا۔ ہر چیز قبیلے کے مفاد کے تابع تھی جب کہ کسی شخص کی انفرادیت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔

(۷)۔ زمانہ قبل از اسلام کے عرب اپنی شاعری کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے اور ان کے شعراء

۱۔ جنگ بسوس دو رقیب قبیلوں بنوتغلب اور بنوبکر کے درمیان البسوس نامی عورت کے اونٹ کو ہلاک کرنے پر شروع ہوئی۔ یہ لڑائی تقریباً چالیس برس (494ء-534ء) جاری رہی۔

اپنے قبیلے اور اپنے سرداروں کی عظمت کے گیت گاتے تھے لیکن اپنے بتوں کے گیت کبھی کبھار گاتے تھے۔ شاعری کے مقابلے سالانہ بنیاد پر مشہور منڈی 'عکاظ'[۱] میں منعقد ہوتے تھے۔ جیتنے والے کو بہت پیسہ اور معاشرے میں عزت ملتی تھی۔ اس کے بعد سے اس کو سردار مانا جاتا تھا۔

(۸)۔ قبیلے کے ہر فرد کو پورا تحفظ حاصل ہوتا تھا مگر اس تحفظ کو صرف شیخ یا قبیلہ یقینی بناتا تھا۔ اس سیاق وسباق میں انفرادیت کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ فرد قبیلے کا تابع ہوتا تھا۔ کسی کی شخصی بقا قبیلے پر منحصر تھی۔ قبیلے سے ملنے والے تحفظ میں اکثر انتقام مضمر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ اپنے ہر فرد کی موت کا انتقام لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے قبائلی لڑائیاں نسل در نسل جاری رہتی تھیں۔ نتیجتاً تشدد کا ایک دائمی چکر چلتا رہتا تھا۔

(۹)۔ ان قبیلوں میں ایک نہ ختم ہونے والی مسابقت جاری رہتی تھی۔ توازن قائم کرنے کے لیے اونٹوں، مویشیوں یا اشیا پر قبضے کے لیے چھاپے مارنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ دولت اور خوشحالی قبائلی کلچر کا سرمایۂ افتخار تھا۔ اس معاشرتی ڈھانچے میں صرف طاقتور کو بقا حاصل تھی اور کمزور ہمیشہ استحصال کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ اس لیے عورتیں، لڑکیاں اور معذور افراد خطرے میں رہتے تھے۔

اسلام کی آمد کے بعد قبائلی ڈھانچے میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں آئیں:

(۱)۔ اسلام نے قبائلی وفاداریاں تبدیل کر دیں۔ یہ وفاداریاں اسلامی تصورات کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ نئے نئے اسلام قبول کرنے والے اپنے قبائلی سرداروں کے وفادار رہے لیکن اب ان کی اوّلین وفاداری اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ تھی۔

(۲)۔ اسلام نے 'مروۃ' کی توثیق کی اور اس کے بہترین حصے کو برقرار رکھا لیکن اس میں توسیع کر کے تمام مسلمانوں کو اس میں شامل کیا نہ کہ صرف کسی فرد کے قبیلے کے ارکان کو شامل کیا گیا۔ ہر فرد کو اپنے لیے، اپنے قبیلے کے لیے، اپنے ساتھی مسلمانوں کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے

---

[۱]۔ زمانہ جاہلیت میں عکاظ کا میلہ ہر سال کی یکم سے اکیس ذوالقعدہ تک طائف کے عکاظ نامی بازار میں منعقد ہوتا تھا۔

جدوجہد بروئے کار لانا ہوتی تھی۔

(۳)۔ عرب اپنے شیخ کے چناؤ کے لیے قبائلی مساوات کے عادی تھے مگر اس نظام میں کمزوریاں تلاش کی جاسکتی تھیں۔ خاص طور پر اس وقت جب ایک رہنما کو اس کی شہرت کی بنیاد پر منتخب کرنا ہوتا۔ اس کی شہرت رائے دہندہ کی آزادانہ مرضی پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یہ رائے ایک قسم کا جبر بن جاتی تھی۔ چنانچہ اس طریقے کی اصلاح اس طرح کی گئی کہ انتخاب کی بنیاد تقویٰ، قابلیت، علم اور شعورِ خدمت پر رکھ دی گئی۔

(۴)۔ اسلام نے فرد کو اہمیت دی، قطع نظر اس کے کہ وہ کون تھا اور اس کی قبائلی وابستگی کیا تھی؟ ایک وسیع مسلم امہ کا ایک رکن ہونے کی بنا پر شہری ہونے کی حیثیت، محض مقامی قبائلی وفاداری کی بہ نسبت زیادہ اہم قرار پا گئی۔

(۵)۔ اللہ تعالیٰ حتمی منصف قرار پایا۔ عرب خون خرابے اور انتقام کے زیادہ دلدادہ تھے۔ ان کے اس مزاج نے قبائل کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جاری کرا دیا جو نسل در نسل چلتی رہتی تھیں۔ جیسا کہ جنگ بسوس تھی۔ اسلام نے انتقام کے تصور سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایمان اور عقیدۂ تقدیر کو خدا کے قانون (شریعت) کی طرف موڑ دیا تاکہ وہ ذاتی یا قبائلی انتقام کی بجائے قانون کی حکمرانی پر یقین رکھیں۔

(۶)۔ اگرچہ بدو مستقل مزاج اور محنتی لوگ تھے تاہم ان میں سے بہت سے افراد لوٹ مار اور دیگر اقتصادی جرائم میں ملوث ہوتے تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی مستقل مزاجی کی حوصلہ افزائی کی لیکن نئے نظامِ سیاسی معیشت کے اندر لا کر انہیں غیر قانونی طریقوں اور ناجائز معاشی سرگرمیوں سے روک دیا۔

۲۔ بادشاہت سے شوریٰ تک

اسلام کی آمد کے زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں جو سیاسی نظام مروّج تھا وہ نیم قبائلی اور نیم شاہی تھا جبکہ ہمسایہ علاقوں میں موروثیت اور مستبد بادشاہتوں پر مبنی نظام تھا۔ اس ماحول میں عام لوگوں کے کوئی شہری یا سیاسی حقوق نہیں تھے نہ ہی امور مملکت میں ان کی کوئی آواز ہو سکتی

تھی۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں ایک ریاست کی رسمی بنیاد یں رکھیں۔ حکمرانی کے لیے ایسا نظام وضع کیا جو شراکت اور باہمی مشاورت پر مبنی تھا۔ 'شوریٰ' (مشاورت) سیاسی وسماجی تنظیم کے اسلامی تناظر کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔ مسلم فقہاء کی اکثریتی رائے یہ ہے کہ 'شوریٰ' عظائم الاحکام (Great Commandments) کا حصہ ہے اوران کی اطاعت کرنا حکمران اور مسلم عوام دونوں کے لیے فرضِ عین ہے۔

(۱)۔ قرآن پاک شوریٰ کو حکمرانی کے ایک اصول کے طور پر پیش کرتا ہے، نہ کہ بطور ایک نظام کے۔ ان دونوں باتوں میں ایک فرق ہے اور وہ بہت اہم ہے۔ اسے نوٹ کیا جانا چاہیے۔ ایسا کر کے قرآن پاک نے یہ امر مسلمانوں کی آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ اصول شوریٰ کو زیادہ سے زیادہ حقیقت آفریں بنانے کی کوششیں جاری رکھیں۔

(۲)۔ قرآن پاک حکم دیتا ہے کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ. (سورۃ آل عمران، آیت:۱۵۹)

(کام میں ان کے ساتھ مشورہ کیا کریں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ پختہ ہوجائے تو اللہ پر بھروسہ کریں)

یہ ایک حکم ہے اور اللہ تعالیٰ شوریٰ کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی لازم قرار دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیر معمولی خدائی بصیرت، علم، شفقت اور لوگوں کی بھلائی کا اتنا احساس عطا کیا گیا تھا کہ کسی دوسرے حکمران کو اتنا نہ تھا اور نہ کسی کو ہو سکے گا۔ مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر براہ راست وحی نازل ہوتی تھی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتیازی فضلیت وخصوصیت تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی مسلم حکمران کو نہ حاصل تھی اور نہ کبھی حاصل ہو سکے گی۔ لہٰذا اگر شوریٰ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے لازمی تھی تو بعد کے تمام مسلمان حکمرانوں کے لیے یہ بدرجہ اتم لازمی ہو گئی ہے۔

(۳)۔ شوریٰ کو مومنوں کی ایک لازمی خصوصیت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ. (سورۃ الشوریٰ، آیت:۳۸)

(ان کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں)

اس خصوصیت کا دیگر سب مومنانہ خصوصیات کی طرح ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی، ادائیگی نماز، (فرض نمازیں) اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا (زکوٰۃ عشر، صدقات وغیرہ)، جو کہ قرآن مجید میں مذہبی فرائض کے طور پر مذکور ہیں۔

(۴)۔ شوریٰ کے معنی ہیں فیصلہ سازی میں موثر طور پر شریک کرنا، نہ کہ محض ایک رسمی کارروائی کر کے خانہ پُری کر دینا۔ قرآن مجید، حضور نبی اکرم ﷺ کو جن پر وحی الٰہی نازل ہوتی تھی، مخاطب کر کے کہتا ہے کہ جن معاملات کے بارے میں کوئی خاص وحی نہیں آتی ان کے فیصلے کے لیے شوریٰ پر انحصار کیا جائے۔ تمام اہلِ ایمان کو بطور پکے حکم کے اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ ممتاز اندلسی مفسرِ قرآن ابن عطیہ نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ شوریٰ شریعت کے بنیادی قوانین میں سے ہے اور ایک تاکیدی حکم ہے۔ جس شخص کو سرکاری اختیار دیا گیا ہو اور وہ ان لوگوں سے مشورہ نہیں لیتا جو علم اور خوفِ خدا رکھتے ہیں تو اسے اس منصب سے فارغ کر دیا جانا چاہیے۔

(۵)۔ یہاں شوریٰ کے حوالہ سے دو باتوں کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔ پہلا ہے اس کی اشتقاقی صورت، یہ اپنی جڑ 'شاور' سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے باہمی مشاورت جو ایک وسیع ترین دائرۂ کار میں کی جائے۔ یہ ایک اجتماعی سوچ وبچار کا اہتمام ہے جس میں تمام فریقین نے ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا ہو۔ اس لحاظ سے شوریٰ کی اصطلاح کو استشر اح کی اصطلاح سے ممیز کیا جانا چاہیے۔ جس کے معنی دوسرے آدمی سے صرف مشورہ لینا ہے۔ شوریٰ کا لفظ تشاور سے بھی مختلف ہے جس کا مطلب صرف باہمی مشورہ ہے جبکہ جس بات کا شوریٰ میں تصور کیا گیا ہے، وہ ایک بھرپور قومی شراکت پر مبنی سیاسی مشق ہے۔

(۶)۔ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ کا مطلب خدا کی طرف سے امت کو تفویض کیا گیا اختیار ہے جسے بروئے کار لاکر وہ زمین پر امن قائم کرے۔ عدل وگستری کرے اور خوشحالی لائے۔ یہ تصور اس لحاظ سے ہمہ گیر ہے کہ امہ کا ہر شخص انفرادی طور پر قانوناً اس امر کا پابند ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ تفویض کردہ اختیار پر کماحقہ عمل درآمد ہو اور نمائندہ حکمرانی جس کے ذریعے یہ اجتماعی ذمہ داری مناسب انداز میں پوری ہو سکے۔ اسلام کی رو سے دستوری طور پر واجب التعمیل ہو جاتی ہے۔ مطلق کائناتی حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن

اس نے بذریعہ حکمِ استخلاف (انسان کو اپنا خلیفہ بناتے ہوئے) زمین پر حاکمیتِ اعلیٰ امت یعنی عوام کو سونپی ہے۔

(۷)۔ منتخب خلفاء (مسلم حکمران) عام لوگوں کے پاس جاتے تھے تاکہ بذریعہ بیعت ان سے رضامندی (حلفِ اطاعت) حاصل کرسکیں۔ بیعت (یا بیعہ) ایک باہمی عہد و پیمان ہوتی ہے۔حکمران کی طرف سے یہ عہد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی قانون کی پیروی کرے گا اور پبلک کو مطمئن کرے گا اور عوام کی جانب سے یہ عہد ہوتا ہے کہ وہ حکمران کی پشت پناہی کریں گے اور اس کو مشورے دیں گے۔ خلفاء نے اپنی نامزدگی کے بعد عوام سے بیعت لی تھی۔ 'بیعت' بنیادی طور پر منتخب کرنے یا خلیفہ یا چیف ایگزیکٹو کی توثیق کرنے کی ایک شکل تھی۔ یہ دو مرحلوں پر مشتمل تھی۔ پہلے قدم کو بیعۂ خاصہ (خصوصی اظہارِ وفاداری) کہا جاتا تھا۔ یہ نجی صلاح مشورے کے ذریعے ایک نامزدگی کے مترادف تھی۔ دوسرے قدم کو بیعۂ عامہ (عوامی اظہارِ وفاداری) کہا جاتا تھا۔ یہ نامزد شخص کی عوامی منظوری ہے۔اس منظوری یا قبولیت کا اظہار نامزد خلیفہ کے ساتھ مصافحے کی صورت میں ہوتا تھا۔جن لوگوں کو اختلاف ہوتا تھا وہ مصافحہ سے گریز کرنے میں آزاد تھے۔

(۸)۔ دستوری نقطہ نظر سے بیعت کی منسوخی ممکن ہوتی ہے۔ یہ مواخذے یا منصب سے معزولی کے مترادف ہوتی ہے۔خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اتفاق رائے سے خلیفۂ رسول کے طور پر اپنی توثیق ہوجانے کے بعد اس حق کی پُرزور تائید کی تھی۔انہوں نے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد (مسجد نبوی) میں 'بیعت' کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: مجھے تم پر اختیار دے دیا گیا ہے لیکن میں تم میں سے بہترین نہیں ہوں۔آپ میری اس وقت تک اطاعت کریں جب تک میں تمہارے معاملات میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہوں۔ جب میں اس کی اطاعت نہ کروں تو آپ میری اطاعت نہ کریں۔اسی اصول کی پیروی میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: 'جب میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرنا، اگر میں کچھ غلط کروں تو میری اصلاح کر دینا'۔

(۹)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دنیائے فانی سے رحلت کے بعد امت (مسلم کمیونٹی) کے معاملات عملِ مشاورت سے چلائے جاتے رہے جس میں تمام مسلمان شریک رہتے تھے۔

(۱۰)۔ پہلے بیان کردہ قرآن پاک (سورۃ آل عمران، آیت: ۱۵۹) سے بالکل واضح ہے کہ ہر فیصلہ شوریٰ کے نتائج پر مبنی ہونا چاہیے۔ تاریخی واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ فیصلے اکثریت کی آراء لے کر کیے جاتے تھے۔ اگرچہ اقلیت یا خواہ ایک فرد کی رائے درست ہی کیوں نہ ہو اور اکثریت کی رائے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اکثریتی رائے ہی معقول اور قابل قبول ہوتی ہے۔ اسی میں بنی نوع انسان کی بھلائی سمجھی جاتی ہے کیونکہ ایسے کیس میں خطرے کا امکان، انفرادی یا اقلیتی کیس کی بہ نسبت بہت ہی کم ہوتا ہے۔

(۱۱)۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے کئی نظائر اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فیصلوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کی آرا کے مطابق ہوئے تھے، اگرچہ وہ امیر کے نظریئے سے مختلف تھے۔ اسلام ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ فرد کو معاشرے یا الجماعت کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس کی تعبیر بطور اکثریت کی جا سکتی ہے۔ ذیل کی احادیث اسی اصول کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

(ا)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلا شبہ میری امت گمراہی پر مجتمع (متفق) نہ ہوگی۔ جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کا ساتھ دو۔

(سنن ابن ماجہ، ج: ۳، رقم الحدیث: ۳۹۵۰)

(ب)۔ یقیناً اللہ تعالیٰ میری امت یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو غلط بات پر متفق نہیں ہونے دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ سب سے بڑے اجماع کے ساتھ ہے۔ (جامع ترمذی، ج: ۲، رقم الحدیث: ۴۱۱)

(ج)۔ تم میں سے جو کوئی بھی جنت کے وسط میں جگہ پانا چاہتا ہے، اسے جماعت کے ساتھ پیوستہ رہنا لازمی ہے۔ (جامع ترمذی، ج: ۲، رقم الحدیث: ۴۰۴)

(د)۔ جو کوئی جماعت سے علیحدہ ہو گیا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (صحیح مسلم، ج: ۳، رقم الحدیث: ۲۸۹)

(۱۲)۔ اس مشاورت پر مبنی انقلابی سیاسی فکر نے دنیا میں ایک مقبول انقلاب برپا کر دیا۔ عام سے لوگوں اور زیادہ تر نادار عربوں مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے غریب لوگوں کو منجنیق کی طرح اچھال کر عالی مرتبت مسندوں پر متمکن کر دیا۔ ایرانی اور رومی سلطنتیں زمیں بوس ہو گئیں۔ مقبول انقلابی طوفانی لہر نے جسے مسلم خلافت نے اداراتی شکل دی تھی، ان

کا صفایا کر دیا۔ موروثی شاہی خاندانوں کی جگہ اللہ تعالیٰ کے غلاموں کی حکمرانی نے لے لی۔ پھر تاریخ نے سرِ عام خلفاء کا احتساب ہوتے دیکھا۔

(۱۳)۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ ہم رومیوں اور ایرانیوں کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ ہم نے ان کے رسم و رواج اختیار کرتے ہوئے موروثی خاندانی حکمرانی قائم کر لی۔ بلا شبہ یہ مسلم بادشاہتیں تھیں لیکن اسلامی حکومتیں نہیں تھیں۔ اسلام کا انقلابی اور جمہوری جذبہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ مسلم بادشاہوں نے خود کو زمین پر خدا کا سایہ (ظل اللہ) ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حکمران اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں خدائی حقوق (Divine rights) حاصل ہیں۔ بہت سے علماء نے بدامنی پھیلنے کے خوف سے ان کے اس سراسر غیر اسلامی تصور کی غیر مشروط تائید کی۔ بدقسمتی سے ہم مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں زیادہ زیر بحث عوام کے حقوق کی بجائے امیر (حکمران) کے بنیادی کردار پر پاتے ہیں۔ عوام کو اطاعت امیر کا درس دیا جاتا تھا۔ یعنی یہ کہ ان پر امیر کی اطاعت ایک فرض کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ شوریٰ (پارلیمنٹ) صرف مشورہ دے سکتی ہے جب کہ امیر اس کے مشوروں اور نصیحتوں کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہے۔

(۱۴)۔ اس ناقص اور غیر اسلامی سیاسی نظریے نے ہماری مذہبی اور سیاسی زندگی کے ارتقاء پر سنگین اثرات مرتب کیے ہیں۔ میں نے ذیل میں اس کی دو تاریخی مثالیں پیش کی ہیں:

(ا)۔ تقریباً چار سو پچاس (۴۵۰) علمائے وقت (مذہبی سکالرز) نے ابوالفضل[۱] اور فیضی[۲] کی قیادت میں ایک محضر نامہ[۳] مرتب کیا جو بادشاہ اکبر[۴] کو دنیاوی اور مذہبی اختیارات تفویض

۱۔ شیخ ابوالفضل بن مبارک (1551ء-1602ء) مغل بادشاہ اکبر کا وزیر اور اکبر نامہ کا مصنف تھا۔ اس کا شمار اکبر کے شاہی نورتنوں میں ہوتا تھا۔

۲۔ شیخ ابوالفیضی ابن مبارک (1547ء-1595ء) زیادہ تر اپنے قلمی نام فیضی سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ ابوالفضل کا بڑا بھائی، مغل بادشاہ اکبر کے دور کا شاعر اور عالم تھا۔

۳۔ محضر نامہ ایک حکم نامہ تھا جس کا بیشتر حصہ فیضی نے تحریر کیا تھا۔ اس کا مقصد بادشاہ اکبر کو تمام مذہبی امور میں مختار کل تسلیم کرنا تھا۔

۴۔ ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر (1542ء-1605ء) ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا تیسرا بادشاہ تھا جو 1556ء سے لے کر 1605ء تک برسر اقتدار رہا۔

کرتا تھا اور رعیت پر بادشاہ کی اطاعت لازم قرار دیتا تھا۔ بادشاہ اکبر نے لادینی کے ایک نئے مذہب کو جنم دیا، جس کا نام 'دین الٰہی'[۱] رکھا گیا۔

(ب)۔ جب شیخ احمد سرہندیؒ[۲] اس نئے مذہب کی مخالفت اور اس کے رد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو بہت سے علماء اور صوفی مغل بادشاہ کی طرفداری کرتے ہوئے شیخ احمد سرہندیؒ کی تحریک کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہو گئے اور انہوں نے داراشکوہ[۳] کی بھی حمایت کی جو شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر[۴] کی مخالفت میں نئے مذہب کی حمایت کر رہا تھا۔

(ج)۔ مطلق بادشاہت نے مسلم دنیا میں سیاسی جبر کو جنم دیا۔ ہندوستان کے ایک مسلمان حاکم نے کسی شہری سے ناراض ہو کر اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندنے کا حکم دیا۔ شام کو جب بادشاہ سلامت مغرب کی نماز پڑھنے لگے تو امام صاحب نے اتفاقاً سورۃ الفیل (جس میں ہاتھی والوں کی بربادی کا ذکر ہے) کی تلاوت کی۔ بادشاہ سلامت برہم ہو گئے کہ امام اس کی تضحیک (insult) کر رہا ہے۔ بادشاہ سلامت نے حکم دیا کہ اس امام کو بھی ہاتھی کے پاؤں تلے روند دیا جائے۔ حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں:

کرتی ہے ملوکیّت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو کہ چنگیز
(بالِ جبریل: غزلیں)

۱۔ مغل بادشاہ اکبر (1542ء-1605ء) نے اپنے دور میں، ایک نئے مذہب کی شروعات کی، جس کا نام دین الٰہی رکھا۔ اس مذہب کا مقصد، تمام مذاہب والوں کو یکجا کرنا اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔

۲۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (1564ء-1624ء) ہندوستان کے مشہور و معروف عالم اور صوفی بزرگ تھے جنہوں نے بادشاہ اکبر کے دین الٰہی اور دیگر خلاف شرع بدعات کے خلاف بھرپور عملی کوششیں کیں۔

۳۔ داراشکوہ (1615ء-1659ء) مغل شہنشاہ شاہجہان کا بیٹا اور اورنگزیب کا بھائی تھا۔

۴۔ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ (1618ء-1707ء) مغلیہ سلطنت کا بادشاہ اور شاہ جہاں کا بیٹا تھا۔ جس نے 1658ء سے لے کر 1707ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔ عالمگیرؒ نے ہندوستان میں حکومتی سطح پر اسلامی شریعت کا احیا کیا جس کی وجہ سے آپؒ کو محی الدین کا خطاب دیا گیا۔ فتاویٰ عالمگیری آپؒ کے دور کی تخلیق ہے۔ مغل بادشاہوں میں عالمگیرؒ واحد حافظ قرآن بادشاہ تھا۔

۳۔ غلامی سے آزادی تک

اسلام نے انسانی غلامی کی تمام شکلوں اور مظاہر کی شدید مذمت کی ہے اور اس کے خلاف لڑائی لڑی ہے۔ اس نے اس لعنت کو کم اور صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے عملی اقدامات کئے ہیں۔ اس نے انسانیت کو آزادی کا سبق دیا ہے۔ آیئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تاریخی بیان کو یاد کریں۔

حضرت امام ابن الحاکمؒ کی روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کرتے ہیں کہ مصر کا ایک آدمی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ میں نا انصافی سے پناہ مانگنے کے لیے آیا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تم نے کسی کو اس پر آمادہ پایا۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے سے مقابلہ کیا تھا اور میں جیت گیا تھا۔ اس نے مجھے کوڑے مارے اور کہا کہ میں عزت دار آدمی کا بیٹا ہوں۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر بیٹے سمیت مدینہ بلایا اور پوچھا کہ وہ مصری کہاں ہے؟ وہ آیا تو انہوں نے اس کو کوڑا دیا اور کہا حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو اس سے مارو۔ اس شخص نے اس کو مارنا شروع کر دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم اس شخص نے اسے مارا اور ہمیں اس کا یہ مارنا بہت اچھا لگا۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مصری کو کہا اب اس کے باپ (حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ) کی طرف بڑھو۔ مصری نے جواب دیا کہ یا امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس کے بیٹے نے مجھے مارا تھا۔ میں اس سے بدلہ لے لیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا: تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ مجھے اس کے بارے میں معلوم نہ تھا اور نہ ہی مصری میرے پاس شکایت لے کر آیا تھا۔ (کنز العمال، ج:۶، رقم الحدیث: ۵۶۴۰)

یہ آزادی کا اعلان عہد حاضر کے مشہور فرانسیسی فلسفی اور سیاسی مفکر روسو[1] کے اس مشہور نعرہ سے

[1]۔ Jean-jacques Rousseau: ژاں ژاک روسو (1712ء-1778ء) انسانی مساوات کا مبلغ اور ایک فلسفی تھا۔ جس کی تحریریں فرانس میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بنیں۔

بھی زیادہ جامع ہے کہ

انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں ہے۔

روسو نے محض ایک حقیقت بیان کی تھی جبکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے روسو سے ایک ہزار سال پہلے غلامی کی مذمت کی اور سب کے لیے اعلان آزادی کیا تھا۔ غلامی کی مذمت نہ صرف جسمانی غلامی کے خلاف جہاد تھا بلکہ غلامی کی تمام شکلوں اور تمام مظاہر کے خلاف ایک جہاد تھا۔ مذکورہ واقعے میں 'بڑی عزت والے شخص کا بیٹا ہونے کی شیخی بگھارنے کو غلامی کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے۔

اس اصول کو جنگ قادسیہ سے پہلے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ[1] کے ایلچی نے فارس کے جرنیل کے دربار میں زیادہ شاعرانہ طور پر پیش کیا تھا۔ (یہ جنگ ۶۳۶ء میں عرب مسلم فوج اور ساسانی فارسیوں کے درمیان لڑی گئی تھی)۔ فارسی فوج کے کمانڈر رستم نے مسلم کمانڈر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ بات چیت کے لیے اپنا ایلچی بھیجیں۔ جس پر انہوں نے حضرت ربیعہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بطور ایلچی بھیجا۔

رستم نے حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ فارس میں کیوں آئے ہیں اور آپ کا مقصد کیا ہے؟ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہم کو اللہ پاک نے اس لیے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو، اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر اسلام کے عدل میں لے آئیں۔ (تاریخ الامم والملوک، ج:۲، ص:۷۰۲)

اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت اور اس کے سامنے اظہار نیاز مندی انسانیت کو غلامی کی تمام شکلوں سے نجات دلاتی ہے۔ حضرت اقبالؒ نے اس تصور کو بڑی خوبصورتی سے شعر میں پیش کیا ہے:

---

[1] حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ (578ء-664ء) اولین مسلمانوں میں سے تھے۔ وہ تاریخی جنگ قادسیہ میں اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ اسی جنگ کے بعد سلطنت فارس منہدم ہوئی تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چھ ممکنہ جانشینوں میں بھی شامل تھے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(ضرب کلیم: نماز)

انسانوں کو غلام بنانے کے طریق کار اور اس کی تاسیس کے انسانی معاشرے پر بہت دوررس نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے وقار اور عزتِ نفس کے منافی ہے۔ غلامی میں انسانی سرگرمیوں کا دائرہ سکڑ جاتا ہے جبکہ آزادی میں پھیل جاتا ہے۔ آزادی میں انسان اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر سکتا ہے اور اس کی تخلیقی اور اختراعی قابلیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت اقبالؒ نے کتنی خوبصورتی سے اس بات کا اظہار کیا ہے:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
(بانگ درا: خضر راہ)

ہمارے بادشاہوں کو یہ انسانی شرف پسند نہ آیا۔ انہوں نے انسانوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر غلام بنانا شروع کر دیا۔ غلاموں کی خرید و فروخت ہونے لگی۔ حرم میں باندیوں (slave girls) کا ہجوم بڑھنے لگا۔ علماء نے قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف فقہ کی کتابوں میں غلاموں اور باندیوں کے مسائل اور جواز کے دلائل دیئے۔ اسلام کی حریت کی تعلیم اور شرف انسانی کی تعظیم کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ جس نے بھی ذرہ بھر آواز بلند کی اس کو قید و سلاسل میں ڈال دیا گیا۔ شہید کر دیا گیا۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، حضرت محمد نفس ذکیہؒ [1]، حضرت احمد بن

[1] محمد نفس زکیہؒ بن عبداللہ کامل بن حسن المثنیٰ بن حسن السبط بن علی ابن ابی طالب (متوفی، 763ء) فاطمی سادات میں سے تھے۔ آپؒ کا اصل نام محمد تھا لیکن اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے نفس الزکیہ مشہور تھے۔ آپؒ کو عباسی حکومت نے شہید کروا دیا۔

حنبلؒ[۱]، حضرت امام ابوحنیفہؒ[۲]، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت امام سرخسیؒ[۳] کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

۴۔ ظلم سے عدل واحسان تک

ناانصافی اپنی تمام شکلوں کے ساتھ روزمرہ کا ایک چلن تھا۔

(۱)۔ سماجی استحصال عام تھا جو انفرادی، خاندانی اور معاشرتی سطحوں پر ہو رہا تھا۔ انسانی زیست کی ہر سطح پر طبقاتی امتیازات تھے۔

(۲)۔ سیاسی جبر اور جور وستم تھا جو شخصی اقتدار، معاشرتی اور قبائلی حیثیتوں اور شاہی اختیارات پر مبنی تھا۔

(۳)۔ اقتصادی استحصال اور عدم مساوات تھی جو ہوا و ہوس اور ناانصافیوں پر مبنی تھی۔

اسلام نے ناانصافیوں اور استحصال کی تمام شکلوں کی مذمت کی۔ انصاف و مساوات کے اصولوں کا پرچم بلند کیا اور وسیع ترین پیمانے پر ان اصولوں پر عمل درآمد کا اعلان کیا۔ اسلام نے ظلم کے معاشرے کے خلاف عدل کا اعلان کیا ہے۔ افلاطون[۴] نے ایک نظری بحث کے طور

۱۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ (780ء-855ء) اپنے دور کے بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ آپؒ امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں۔ اپنے زمانہ کے مشہور علمائے حدیث میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے مسند کے نام سے حدیث کی کتاب تالیف کی۔

۲۔ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ (702ء-772ء) مسلمان عالم دین، مجتہد، فقیہ اور اسلامی قانون کے اولین تدوین کرنے والوں میں شامل تھے۔ ان کی وجہ شہرت احادیث رسول ﷺ کو اکٹھا کرنے اور فقہی اجتہاد کی وجہ سے ہے۔ جو لوگ ان کی تشریحات پر عمل کرتے ہیں حنفی کہلاتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اس طرح فقہ حنفی کے بانی امام سمجھے جاتے ہیں۔

۳۔ شمس ائمہ محمد بن احمد ابوبکر امام سرخسیؒ (متوفی، 1096ء) ایک مشہور و معروف حنفی سکالر تھے جن کا تعلق ایران کے شہر سرخس سے تھا۔ اسی نسبت سے سرخسی مشہور ہو گئے۔ آپؒ کی مشہور کتاب المبسوط فی الفقہ ہے۔

۴۔ Plato: افلاطون (428BC - 347BC) یونان کے موثر ترین فلسفیوں میں سے ایک ہے۔ افلاطون سقراط کا شاگرد اور متعدد فلسفیانہ مکالمات کا خالق اور ایتھنز میں اکادمی (اکیڈمی) نامی ادارے کا بانی تھا۔ جہاں بعدازاں ارسطو نے تعلیم حاصل کی۔

کہا کہ

Justice is virtue and virtue is justice

(انصاف نیکی ہے اور نیکی انصاف ہے)

قرآن پاک نے اس سے بڑھ کر بات کی کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. (سورۃ الحدید، آیت:۲۵)

(دنیا میں انبیاء اور آسمانی کتابیں اس لیے نازل کی گئی ہیں کہ لوگوں کے درمیان انصاف قائم کیا جا سکے)

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام (حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اپنی کتابیں (توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن مجید) صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے احکامات دے کر نہیں بھیجیں بلکہ انصاف کے قیام اور عدل وانصاف پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے لیے بھی بھیجی ہیں۔ ہمارے بعض مذہبی علماء یہ اعلان کرنے تک پہنچ گئے ہیں کہ غیر مسلموں کی منصفانہ حکمرانی مسلمانوں کی غیر منصفانہ حکمرانی سے بہتر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بیان کیا جاتا ہے:

اَلْمُلكُ يَبْقٰى مَعَ الكفرِ وَلا يَبقٰى مَع الظُّلم.

(کفر کے ساتھ ریاست قائم رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں رہ سکتی)

اسلامی فلسفے میں انصاف کا تصور کسی بھی دوسرے نظام کے تصورِ انصاف سے زیادہ جامع ہے۔ مسلمان اہل دانش نے 'ظلم' کا دیگر مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا اور اس پر بحث کی ہے۔ ان اہل دانش کے مطابق 'ظلم' کا مطلب کسی چیز کو ایک غلط جگہ پر رکھنا ہے اور 'عدل' کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کی صحیح جگہ پر رکھا جائے۔ یہ 'عدل' اور 'ظلم' کی سادہ مگر جامع بلکہ قدرے وسیع تعریف ہے اور انسانی وجود کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہی حقیقت کہ اہل دانش نے 'انصاف' اور 'ناانصافی' کی تشریحات وسیع ترین ممکنہ اصطلاحات میں کی ہیں، اس امر کا ثبوت ہے کہ مسلم دانشور انصاف کے حقیقی تصور کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اسلام 'عدل' کے علاوہ 'احسان' (Equity) کی وکالت کرتا ہے۔ عدل کا مطلب ہے کہ جو کچھ

واجب ہے جبکہ 'احسان' کا مطلب ہے 'واجب سے زائد'۔ قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ. (سورۃ النحل، آیت:۹۰)
(اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے)

احسان ایک ذریعہ ہے جس سے قانون کا ایک نظام قواعد سازی میں تیقن کی ضرورت کو منفرد حالات میں منصفانہ نتائج حاصل کرنے کی ضرورت کے ساتھ متوازن بناتا ہے۔ یہ ایک اظہار ہے جس سے عموماً اس طریقے کو بیان کیا جاتا ہے جس میں احسان اپنا کام دکھاتے ہوئے عام قانون کی سختی کو کم کر دیتا ہے۔ احسان اس امر کو یقینی بناتا ہے کہ قانون کا سخت استعمال کسی مخصوص معاملے پر لاگو ہو کر اسے غیر منصفانہ نہ بنا دے۔

اسلام نے نہ صرف انصاف اور احسان کی تبلیغ کی ہے بلکہ انصاف بھی قائم کیا ہے اور اس قدیم معاشرے کے ساتھ احسان کر کے دکھایا ہے جو جزیرہ نمائے عرب میں قائم چلا آ رہا تھا۔ ابتدائی اسلامی معاشرے کے ہر شعبے پر انصاف اپنی تمام سماجی، سیاسی اور اقتصادی شکلوں میں غالب رہا۔

- سیاسی نظام: استحقاق اور اخلاقی اصولوں پر استوار تھا۔
- معاشی نظام: سخت محنت، تجارت اور رحم دلی و ہمدردی پر مبنی تھا۔
- معاشرتی نظام: انسانی مساوات اور احسان پر قائم تھا۔

اسلام نے حقوق و فرائض/ ذمہ داریوں کا توازن، انفرادیت اور اجتماعی زندگی کا توازن، شہریوں کے درمیان باہمی توازن، معاشرے اور ریاست کا توازن قائم کیا۔

بعدازاں فاسقانہ سیاسی افکار اور مکروہ عزائم انصاف اور اعتدال پر غالب آ گئے۔ سیاسی اور معاشرتی استحصال شروع ہو گیا اور معاشی ناانصافیوں نے سر اٹھا لیا۔ مسلمان بادشاہوں نے اپنے جبر اور ناانصافیوں کا جواز ثابت کرنے کے لئے علمائے سُو کی خدمات حاصل کر لیں اور عوام پر حکمرانوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ بدقسمتی سے اسلامی حکومت کی ساری تاریخ میں بااثر علمائے سوء اور اہل دانش کی ایک بڑی اکثریت نے مالی منفعتوں کے لئے اہل اقتدار کے ساتھ ساز باز

کرلی۔ ظلم کے خلاف کسی نے موثر آواز نہ اٹھائی بلکہ ان کی صلاحیتیں حکمرانوں کی بدکاریوں کا جواز پیش کرنے پر صرف ہوتی رہیں۔

فقہ کی کتب میں متعدد ابواب اس موضوع پر ہیں کہ زکوٰۃ اور دیگر لازمی محاصل کی ادائیگی سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بچنے کے لیے بنی اسرائیل کی جو حکمت عملیاں اور حیلہ سازیاں تھیں ان کا اگر مسلمان علماء کے گھڑے ہوئے حربوں اور عذر تراشیوں سے موازنہ کیا جائے تو وہ ماند پڑ جاتی ہیں۔

مختصراً یہ کہ مسلمانوں نے انصاف اور مساوات کے اس درس کو فراموش کردیا جو قرآن مجید میں دیا گیا تھا۔ وہ ظلم و جبر اور ناانصافیوں کو فروغ دینے لگے۔

۵۔ بنیادی حقوق کی علمبرداری

قدیم تہذیبوں میں انسانوں کو ایسا نہیں سمجھا جاتا تھا جن کے کچھ فطری حقوق ہوں۔ اگرچہ رومن فقہ میں فطری حقوق کا کچھ سراغ ملتا ہے۔ اسلام پہلا مذہب تھا جس نے شہریوں کے حقوق کا علم بلند کیا اور اعلان کیا کہ انسان تمام معاشرتی، سیاسی اور معاشی حقوق رکھتا ہے کیونکہ وہ ایک بہترین اور عمدہ ترین مخلوق اور ساری تخلیقات کا تاج ہے۔

قرآن مجید نے غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا کہ یہ حقوق انسان کو خلقی طور پر حاصل ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا کسی اور ذی اختیار ادارے یا شخص کے عطا کردہ نہیں ہیں:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا. (سورۃ الاسراء، آیت:۷۰)

(اور بلاشبہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے جو مخلوق پیدا کی، ان میں بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا کی)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ. (سورۃ التین، آیت:۴)

(ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا ہے)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً. (سورۃ البقرۃ، آیت:۳۰)

(اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)

اسلام انسانیت کے لیے مجموعی طور پر چند بنیادی حقوق مقرر کرتا ہے۔ ان حقوق کا ہر قسم کے حالات میں التزام اور احترام کیا جانا چاہیے، خواہ کوئی شخص اسلامی ریاست کے اندر کسی علاقے میں ہو یا باہر ہو، خواہ وہ برسرِ جنگ ہو یا حالتِ امن میں ہو۔ ان بنیادی حقوق کے اہم خدوخال ذیل کی سطور میں بیان کیے جا رہے ہیں:

(۱)۔ انسانی زندگی ہر طرح کے حالات میں مقدس ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو بلا جواز قتل کر کے زندگی کے تقدس کو پامال کرتا ہے تو قرآن مجید اس اقدام کو پوری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیتا ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا. (سورۃ المائدہ، آیت: ۳۲)

(اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس نے ایک جان کو کسی جان کے بدلے کے بغیر قتل کیا یا زمین میں فساد پھیلایا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا)

(۲)۔ اسلام میں انسان کی جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دے دی گئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا: تمہارا خون اور مال ایک دوسرے پر حرام ہے جس طرح یہ آج کا (یوم نحر) دن یہ مہینہ (ذوالحجہ) اور یہ شہر حرام (مکہ مکرمہ) ہیں۔

(صحیح مسلم، ج: ۲، رقم الحدیث: ۴۵۶)

(۳)۔ اسلام میں انسان کی عزت و آبرو کو تحفظ کر دیا گیا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ

وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۭ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ رَّحِیۡمٌ. (سورۃ الحجرات، آیت:۱۱-۱۲)

(اے ایمان والوں! ایک مرد دوسرے مرد کا ذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے بہتر ہو۔ نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد نافرمانی کرنا بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہیں آئیں گے وہ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بدگمانی کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ بہت سی بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔ جاسوسی نہ کرو۔ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں کوئی ہے جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ تم اسے برا سمجھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

(۴)۔ اسلام انسانی رہائش کو بے جا مداخلت سے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتًا غَیۡرَ بُیُوۡتِكُمۡ حَتّٰی تَسۡتَاۡنِسُوۡا وَتُسَلِّمُوۡا عَلٰۤی اَهۡلِهَا ؕ ذٰلِكُمۡ خَیۡرٌ لَّكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ. (سورۃ النور، آیت:۲۷)

(اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو، جب تک اجازت نہ لے لو اور ان میں بسنے والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ امید ہے کہ تم خیال رکھو گے)

(۵)۔ اسلام ظلم کے خلاف احتجاج کے حق کی ضمانت دیتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الۡجَهۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ. (سورۃ النساء، آیت:۱۴۸)

(اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کی برائی علانیہ زبان پر لائی جائے، الا یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو) یعنی مظلوم کو حق پہنچتا ہے کہ ظالم کے خلاف آواز اٹھائے۔

(۶)۔ اسلام میں ضمیر اور عقیدے کی آزادی کے حق کو تحفظ حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے:

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ. (سورۃ البقرہ، آیت:۲۵۶)

(دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے)

(۷)۔ اسلام میں بنیادی انسانی ضروریاتِ زندگی کی ضمانت دی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَفِيٓ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ. (سورۃ الذاریات، آیت:۱۹)
(اوران کے مال ودولت میں سائلوں اورمحروم لوگوں کا (باقاعدہ) حق ہوتا تھا)
یعنی ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے، دونوں کا حق ہوتا ہے۔

(۸)۔ اسلام میں قانون کی حکمرانی کے سامنے سب برابر ہیں۔ جب ایک عالی نسب خاندان کی عورت چوری کے الزام میں پکڑی گئی تو معاملہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے پیش ہوا۔ سفارش کی گئی کہ اسے چھوڑ دیا جائے کیونکہ معاشرے میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جواب دیا کہ تم سے پہلے جو قومیں اللہ تعالیٰ نے تباہ کی ہیں ان میں عام آدمی کو تو جرم پر سزا دی جاتی تھی لیکن بڑے خاندانوں کے افراد کو ان کے جرائم پر سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ جرم کیا ہوتا تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔ (صحیح بخاری، ج:۲، رقم الحدیث: ۳۴۷)

(۹)۔ اسلام میں ہر انسان کو امور ریاست میں حصہ لینے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَالَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ.
(سورۃ الشوریٰ، آیت:۳۸)
(اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی بات مانی ہے اور نماز قائم کی ہے اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں)
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تاریخ انسانیت میں پہلی بار انسانی حقوق کا واضح اور جامع منشور دیا۔ مسلمان پورے وثوق کے ساتھ اور بجا طور پر دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حقوق انسانی کی تاسیس وتشکیل کا تاریخی اعلان خطبہ حجۃ الوداع میں ہوا تھا۔ اس آخری خطبے کے اہم نقاط درج ذیل ہیں:

(۱)۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے انسانوں ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقینا

اللہ پاک سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

(۲)۔ تمام نوعِ انسان حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی اولاد ہے۔ ایک عربی کو ایک عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ ہی ایک عجمی کو ایک عربی پر کوئی فضیلت ہے۔ اسی طرح سفید فام کو سیاہ فام پر یا سیاہ فام کو سفید فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ فضیلت صرف تقویٰ اور اعمالِ صالحہ کی بنا پر ہو سکتی ہے۔

(۳)۔ جان لو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان مل کر اسلامی برادری تشکیل دیتے ہیں۔

(۴)۔ خوب جان لو کہ زمانہ جاہلیت کے تمام طور طریقے اب میرے پاؤں تلے ہیں۔ اس زمانے کے خون کے انتقام معاف کر دیئے گئے ہیں۔

(۵)۔ اے لوگو! تمہارا خون، تمہاری جائیداد اور تمہاری آبرو مقدس اور قابلِ احترام ہیں۔ تاوقتیکہ تم اپنے مالک کے پاس پہنچ جاؤ، یہ اتنی مقدس ہیں جتنا تمہارے لیے یہ دن (یوم نحر)، تمہارا یہ مہینہ (ذوالحجہ) اور تمہارا یہ شہر (مکہ مکرمہ) قابل احترام ومقدس ہے۔

(۶)۔ جان لو! استحقاق کا ہر دعویٰ خواہ خون کا ہو یا املاک کا، میرے پاؤں تلے ہے۔

(۷)۔ کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ تا کہ کوئی تمہیں نقصان نہ پہنچائے۔

(۸)۔ کسی مسلمان کے لیے وہ چیز حلال نہیں ہے جو اس کے مسلمان بھائی کی ملکیت ہے سوائے اس کے کہ وہ اس نے خوشی اور رضا مندی کے ساتھ دی ہو۔ اس لیے اپنے ساتھ ناانصافی نہ کرو۔

(۹)۔ تمہارے پاس کوئی امانت رکھوائی گئی ہو تو اسے اس کے صحیح مالکوں کو واپس دو۔

(۱۰)۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سود لینے سے منع کیا ہے۔ اس لیے تمام سودی مطالبات ختم کر دیئے جائیں گے۔ اصل رقم تمہاری ہے۔ صرف اسے ہی واپس لے سکتے ہو۔

(۱۱)۔ تم بے انصافی نہ مسلط کرو اور نہ اس کے شکار بنو گے۔

(۱۲)۔ اے لوگو! یومِ حساب تم اس طرح نہ پیش ہونا کہ اس دنیا کے بوجھ تمہاری گردنوں پر ہوں۔

(۱۳)۔ اے لوگو! یہ درست ہے کہ عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں لیکن تمہارے ذمہ بھی ان کے حقوق ہیں۔

(۱۴)۔ یادرکھو کہ تم نے اپنی بیویاں صرف اللہ تعالیٰ کی امانت کے طور پر اوراس کی اجازت کے ساتھ حاصل کی ہیں اگر وہ تمہارے حق کی پابند ہیں، ان کا بھی حق ہے کہ تم ان کو شفقت کے ساتھ نان ونفقہ دو۔

(۱۵)۔ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ کیونکہ وہ تمہاری شریک حیات اور پُرخلوص مددگار ہیں۔ یہ تمہارا حق ہے کہ وہ کسی ایسے فرد کے ساتھ دوستی نہ کریں جس کو تم پسند نہ کرو اور یہ بھی کہ وہ کبھی آلودہ دامن نہ ہوں۔

(۱۶)۔ اولاد اسی کی ہے جس کے بستر پر پیدا ہوئی ہو۔

(۱۷)۔ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے جو قادرِ مطلق ہے حکم دیا ہے کہ ہر ایک کو وراثت میں سے اس کا حق دیا جائے۔ اس لیے اب کسی وارث کے حق میں خصوصی وصیت کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۸)۔ اپنی املاک پر عائد ہونے والی زکوٰۃ بلاتاخیر ادا کرو۔

(۱۹)۔ تمام قرضے لازماً واپس لوٹائے جائیں۔ ادھار لی گئی املاک لوٹا دی جائیں۔ تحائف کا بدلہ دیا جائے۔ ضامن کو نقصان کی تلافی کا پورا اہتمام کرنا ہوگا۔

(۲۰)۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ کوئی بچہ اپنے باپ کے جرم کا ذمہ دار نہیں اور نہ ہی کوئی باپ بچے کے جرم کا ذمہ دار ہے۔

(۲۱)۔ کسی مسلمان کے لیے اس کے بھائی کی چیز حلال نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ وہ اپنی مرضی سے اس کو دے دے۔ اس لیے اپنے ساتھ برائی نہ کرو۔

(۲۲)۔ اپنے خدام کو ایسی خوراک دو جیسی تم خود کھاتے ہو اور ایسے کپڑے پہناؤ جیسے تم خود پہنتے ہو۔

(۲۳)۔ اے لوگو! اپنے امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو، خواہ ایک ناک کٹا حبشی تمہارا 'امیر' بنا دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ کتاب اللہ کے احکامات کے مطابق تمہیں ہدایات دے۔

(۲۴)۔ آگاہ رہو کہ دین کے بارے میں جو حدود مقرر ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا کیونکہ ان حدود (کی جائز وسعتوں) سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ہی تم سے پہلے کی امتیں تباہی سے دوچار ہوئی تھیں۔(سیرت ابن ہشام، ج: ۳،ص: ۲۳۲-۲۳۳)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شہریوں کے حق تعلیم کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے غزوہ بدر کے قیدیوں کو اختیار دیا کہ اگر وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ خوف نہیں تھا کہ یہ کافر مسلمانوں کے عقیدے کو خراب کر دیں گے۔ اسلام نہ صرف ان کو مذہبی اعمال کی آزادی دینے کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ ان سے دیگر لوگوں کی طرح منصفانہ سلوک کیا جائے۔حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک محسوس ہوتی ہے۔(سنن ابن ماجہ، ج: ۲، رقم الحدیث: ۸۴۴) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی معاہد (ذمی) پر ظلم کیا یا اس پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالا، میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہوں گا۔

(کنز العمال، ج: ۳، رقم الحدیث: ۲۵۲۱)

مسلم ریاستوں کے علاقوں میں غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کو غیر مسلم مؤرخین نے وسیع پیمانے پر تسلیم کیا ہے۔وِل ڈیورانٹ[۱] نے لکھا ہے:

بنو امیہ کی خلافت کے زمانے میں زیر معاہدہ لوگوں (ذمی) عیسائیوں، زرتشتیوں، یہودیوں اور صائبین لوگوں کے ساتھ ایسا رواداری رویہّ اختیار کیا گیا تھا کہ آج کے مسیحی ممالک میں بھی کہیں نہیں پایا جاتا۔وہ اپنی اپنی مذہبی رسوم آزادی سے ادا کر سکتے تھے ان کے معبدوں اور گرجاؤں کی پوری حفاظت کی جاتی تھی۔انہیں ان میں خود مختاری حاصل تھی اور وہ اپنے علماء اور

[۱]۔William James Will Durant: ولیم جیمز ڈیورانٹ (1885ء- 1981ء) ایک امریکی مصنف، مورخ اور فلسفی تھا۔اس نے فلسفے کا ایک کلی تناظر میں تصور قائم کیا اور تاریخ کے وسیع علم کو یکجا کرنے اور انسان دوست بنانے کی کوشش کی۔اسے سب سے زیادہ شہرت اس کی کتاب The Story of Civilization سے ملی جو گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔

ججوں کے بنائے ہوئے مذہبی قوانین کے تابع تھے۔

(The Story Of Civilization, Vol. 13. p. 131-132.)

آیئے ایک نظر اقتصادی حقوق پر ڈالیں۔ ایک دفعہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ رضی اللہ عنہ معاشی انصاف پر اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کے پاس ایک بکری ہے۔ جس کا آدھا دودھ ان کے لیے ہے اور آدھا ہمسایوں کے لیے۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۲۱۹)

(تم سے یہ دریافت کرتے ہیں کیا خرچ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما دیں اپنی ضرورت سے زائد چیز خرچ کرو)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے کیسا خوبصورت جواب دیا: اوصانی خلیلی (میرے دوست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی حکم ہے)

ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر ساحل فرات پر ایک بھیڑ کا بچہ بھی بھوکا مر گیا تو روزِ قیامت انہیں ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔ یہ محض ایک سیاسی نعرہ یا انتخابی منشور نہیں تھا بلکہ اسلام کے اقتصادی اور سیاسی فلسفے کا ایک ضابطۂ کار تھا جس کا انہوں نے اظہار کیا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا تھا:

انا ولِیُّ مَنْ لا وَلِیَ لَهٗ.

(میں اس شخص کا مددگار اور محافظ ہوں جس کا کوئی مددگار و محافظ نہیں ہے)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض ایک اخلاقی اصول نہیں سکھا رہے تھے یا اپنے ذاتی کردار کی وضاحت نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک پالیسی کا اعلان کر رہے تھے کہ ریاست معاشرے کے تمام کمزور اور زد پذیر طبقات کی سرپرست اور محافظ ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہلِ ایمان کو بھی ان کی یہ ذمہ داری یاد دلا رہے تھے کہ انہیں معاشرے کے مجبور اور محروم طبقات بشمول محتاج افراد، یتامیٰ، نابالغ بچوں اور بیواؤں کی دستگیری و دادرسی کے سلسلے میں کوشاں رہنا ہوگا۔ یہ اعلیٰ وارفع

تعلیمات تھیں جس نے ایک ایسے مثالی معاشرے کو جنم دیا جو سماجی انصاف پر مبنی تھا جس میں لوگوں کو عزت و وقار اور احترام حاصل تھا۔ یہ الفاظ دیگر اسلام نہ صرف انسانی حقوق کے تصور اور دائرہ عمل کو وسیع و عریض کرنے کا ذمہ دار تھا بلکہ ریاست کو شہریوں کے حقوق کے تحفظ کا کردار سونپنے کا بھی ذمہ دار تھا۔

شواہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بلا خوف و خطر کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ دنیا کا منشور عظیم میگنا کارٹا[۱]، دستاویزِ حقوق[۲] اور 'تحریک حقوق انسانی' نے جذبہ و رہنمائی ان اعلیٰ و ارفع تصورات سے حاصل کی جو قرآن پاک اور خطبہ حجۃ الوداع میں بیان کر دیئے گئے تھے۔

۶۔ توہمات سے تجربیت تک

یہ بہت ضروری امر ہے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی عہد میں زمانے کے ذہنی چیلنجوں پر کیسے ردِ عمل کا اظہار کیا اور ان سے عہدہ برآمد ہونے کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں۔ قرآن مجید کے مطابق زمین پر انسانی زندگی کا آغاز علم سے ہوا تھا:

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ‌ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَـكَ‌ؕ قَالَ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ○ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ○ قَالَ يٰٓـاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ‌ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلْ لَّـكُمۡ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ. (سورۃ البقرہ، آیت: ۳۰-۳۳)

---

[۱] میگنا کارٹا (Magna Carta) انسانی تاریخ کی ایک اہم قانونی دستاویز ہے جس میں برطانوی عوام کو بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ دیا گیا ہے۔ یہ قانونی دستاویز جون 1215ء میں برطانوی عوام اور بادشاہ جان کے درمیان رنی میڈ کے مقام پر لکھی گئی۔

[۲] ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دستاویز حقوق کو دسمبر 1789ء میں ایکٹ آف پارلیمنٹ کے طور پر منظور کیا گیا۔ اس دستاویز میں قوم کے قدیم حقوق اور آزادیوں کا اظہار اور اعلان کیا گیا۔

(جب اللہ پاک نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔انہوں نے عرض کیا کہ کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ! انہوں نے عرض کیا: نقص سے پاک تو صرف آپ کی ذات ہے۔ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔پھر اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے چھپی ہوئی ہیں)

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ فرشتوں کی تقدیس وعبادت کے مقابلے میں انسانی علم کو لایا جا رہا ہے۔ علم دے کر آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے فضیلت دی گئی۔علم کو عبادت سے افضل قرار دیا جا رہا ہے۔ شرف آدم علیہ السلام قرار دیا جا رہا ہے۔علم ہی اللہ تعالیٰ کا نائب بننے کے لیے لازم ہے۔علم بھی اشیا کا دیا جا رہا ہے جو سائنس کا موضوع ہے، دینیات یا علم الکلام کا نہیں ہے۔

اسلام کا آخری مرحلہ بھی علم سے شروع ہوا۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو پہلی وحی وصول فرمائی وہ یہ تھی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ. (سورۃ العلق، آیات:۱-۵)

(پڑھو! (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا)

آپ دیکھ لیں کہ نبوت کی ابتدا سائنسی علوم کی طرف مائل کرنے سے ہو رہی ہے۔ خدا کی معرفت کے لیے علم حیاتیات (Biology) کی دلیل لائی جا رہی ہے۔ پھر قلم کی عظمت بیان

ہو رہی ہے۔ کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس کمزور حالت سے اس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اسے پورا انسان بنایا۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو صاحب علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے اور صرف صاحب علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت وترقی کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو لکھنے کا فن نہ دیتا تو انسان کی ترقی رک جاتی اور علم اگلی نسلوں تک منتقل نہ ہوتا۔

فلسفہ مسلمانوں کا علم نہیں ہے۔ اسلام کی بعثت سے پہلے معلوم انسانی تاریخ کے عظیم ترین فلسفی یونان میں پیدا ہو چکے تھے۔ دنیا میں افلاطونی مثالیت (Platonic Idealism) ارسطو[1] کی منطق (Aristotlian Logic) وغیرہ کا غلبہ تھا۔ مسلمانوں نے فلسفہ کو کفر قرار نہ دیا بلکہ اس کی تعلیم حاصل کی۔ ابونصر محمد بن محمد فارابی[2] پہلا مسلمان عالم تھا جو یونان کے فلسفہ کا شارع بنا اور تاریخ فلسفہ میں ارسطو کو معلم اول اور فارابی کو معلم ثانی کہا جاتا ہے۔

ہمارے علما نے فلسفہ یونان کو سمجھا۔ اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تا کہ مسلم دنیا میں پڑھا جا سکے اور پھر اس پر عالمانہ تنقید کی۔ امام غزالیؒ[3] نے تہافتہ الفلاسفہ لکھی۔ اس میں انہوں نے یونان کے فلسفہ پر سخت تنقید کی جس کا جواب یونان کے بجائے مسلم دنیا کے نامور فلسفی ابن رشد[4] نے

---

[1]۔ ارسطو یونان کا ممتاز فلسفی، مفکر اور ماہر منطق تھا، جس نے سقراط اور افلاطون جیسے اساتذہ کی صحبت پائی۔

[2]۔ ابونصر محمد الفارابی (872ء-950ء) ایک مشہور ریاضی دان، طبیب، فلسفی، سائنسدان، علم نجوم کا ماہر اور موسیقار تھا۔ فارابی ارسطو اور افلاطون سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے ارسطو کی اکثر کتابوں کی شروحات لکھیں، اسی وجہ سے اسے 'معلّم ثانی' بھی کہا جاتا ہے۔

[3]۔ ابوالحامد محمد بن محمد الغزالیؒ (1058ء-1111ء) اسلام کے نہایت مشہور مفکر، صوفی اور متکلم تھے۔ آپؒ کی کتابوں میں احیاء العلوم الدین ایک بلند پایہ تصنیف ہے جو کہ ہر دور میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہی ہے۔ آپؒ نے فلسفہ کو دین بننے سے روکا۔

[4]۔ Averroes: ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد (1126ء-1198ء) ایک ماہر فلسفی، ریاضی دان، ماہر علم فلکیات، ماہر فن طب اور قانون دان تھا۔ ابن طفیل اور ابن اظہر جیسے مشہور عالموں سے دینیات، فلسفہ، قانون، علم الحساب اور علم فلکیات کی تعلیم حاصل کی۔ خلیفہ یعقوب یوسف کے عہد میں اشبیلیہ اور قرطبہ کا قاضی رہا۔

دیا۔ ان کی کتاب کا نام تہافتہ التہافہ ہے۔ اس کے بعد امام ابن تیمیہؒ نے فلسفہ یونانی پر کاری ضرب لگائی۔ اس شرح اور تنقید کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں نے فلسفہ یونان کو پڑھا۔ اسے آگے منتقل کیا لیکن اس سے مرعوب نہ ہوئے۔

یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے یونان کے اس بے بہا علم کو مغرب تک پہنچایا۔ جرمن فلسفی کانٹ[1] کی کتاب (Critique of Pure Reason) امام غزالیؒ کے فلسفے کی شرح لگتی ہے۔ یہی حال مسلمانوں نے ارسطو کی منطق کے ساتھ کیا۔ مثالیت (Idealism) نے بھی عرب تجربیت (Empiricism) سے اثر قبول کیا۔ پھر کیا ہوا کہ مسلمان سو گئے اور پرانی کتب ہی مدارس میں پڑھاتے رہے جبکہ زمانہ وسطیٰ (Middle Period) کے بعد نئے فلسفے متعارف ہوئے جن کا ہم نے مطالعہ و تدارک نہ کیا۔ تحریک اصلاح (Reformation) اور صنعتی انقلاب کے پیچھے نئی نئی سائنسز اور فلسفوں کا ظہور ہوتا رہا مگر مسلمان ان سے لاپرواہ رہے۔

مسلمان تخیلاتی (speculative) نہیں بلکہ عملی (practical) تھے۔ قران پاک نے انسان کو تجربیت و مشاہدہ (observation) سکھایا۔ قرآن پاک نے بار بار کہا: کیا تم آسمان نہیں دیکھتے؟ کیا تم زمین نہیں دیکھتے؟ کیا تم جانور نہیں دیکھتے؟ یہ وہ تعلیمات تھیں جنھوں نے مسلمانوں کو عملی سائنس کی طرف مائل کیا۔ طبیعات میں ہم نے روشنی کا مطالعہ کیا۔ ابوالہیثم[2] نے جدید فزکس کی بنیاد رکھی۔ الخوارزمی[3] نے نویں صدی عیسوی میں دنیا کو جدید ریاضی کا علم

---

[1]۔ Immanuel Kant: ایمانویل کانٹ (1724ء-1804ء) ایک جرمن فلسفی اور مشہور ترین مفکر تھا۔ کانٹ نے فلسفے کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ وقت کی حاکم قوتوں کے بارے میں سوال پیدا کیے۔ عقل اور آزادی کو اپنی سوچ کا محور قرار دیا۔ اسکے خیالات اب بھی مستقبل کے لیے مشعل راہ ہیں۔

[2]۔ ابوعلی الحسن ابن الہیثم (965ء-1039ء) عراق کے تاریخی شہر بصرہ میں پیدا ہوئے۔ طبعیات، ریاضی، انجنئرنگ، فلکیات اور علم الادویات کے مایہ ناز محقق تھے۔ ان کی وجہ شہرت آنکھوں اور روشنی کے متعلق تحقیقات ہیں۔

[3]۔ عبداللہ بن محمد بن موسیٰ خوارزمی (780ء-850ء) ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ مشہور زمانہ کتاب الجبر والمقابلہ جسے انہوں نے لوگوں کے روزمرہ ضروریات اور معاملات کے حل کے لیے تصنیف کیا جیسے میراث، وصیت، تقسیم، تجارت، خرید و فروخت، کرنسی کا تبادلہ (ایکسچینج)، کرایہ، عملی طور پر زمین کا قیاس (ناپ)، دائرہ اور دائرہ کے قطر کا قیاس وغیرہ۔ خوارزمی پہلے سائنسدان تھے جنھوں نے علم حساب اور علم جبرا کو الگ الگ کیا۔

دیا۔ ابن سینا[1] وزہراوی[2] نے جدید طب (میڈیسن) اور جراحت (سرجری) کی بنیاد رکھی۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مسلمان سائنسدانوں نے دنیا کو جدید سائنس دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تسخیر کائنات اور تسخیر ذات میں فرق نہ کرتے تھے۔ ان کے ہاں اس دنیا اور اس دنیا کی تفریق نہ تھی۔ وہ مادہ اور روح کی تقسیم کے قائل نہ تھے۔ وہ قدیم وجدید علم کی بحث کو بے خبری سمجھتے تھے۔ سائنسی علوم کی تحصیل سے مسلمان ٹیکنالوجی میں ماہر تھے۔ فرانس کے عظیم بادشاہ شارلیمان[3] کو گھڑی عباسی خلیفہ ہارون الرشید[4] نے بھجوائی تھی۔

پھر کیا ہوا؟ جو لوگ مافوق البشری رازوں کے امین، انسانی حقوق کے علمبردار اور جدید سائنس کے اصل خالق تھے خواب غفلت میں کھو گئے۔ وہ یونانی اثرات کی وجہ سے لا حاصل مذہبی بحثوں میں الجھ گئے۔ انہوں نے زندگی کو روحانی اور دنیاوی دائروں میں تقسیم کر دیا اور مادی ترقی وفروغ کو خلافِ اسلام تحریک قرار دینے لگے۔ انہوں نے فطری علوم (سائنسز) کو نظر انداز کر دیا اور ایسے جھوٹے تصوف کے نشے میں دھت ہو گئے جو خالص وجدانی اور باطنی درجہ بندی کے نظام کو تجربیت (empiricism) کے برعکس ہونے کا پرچار کرتا ہے جو کہ جدید سائنس کی حقیقی بنیاد ہے۔ وہ مذہبی رسوم کی بال کی کھال اتارنے اور لا حاصل مدرسانہ بحثوں میں الجھ گئے۔ جبکہ انہیں جدید دور کے چیلنجوں کا جواب دینے اور علم کی سرحدوں کو آگے بڑھانے کے لیے سنجیدہ ذہنی کاوشیں کرنے کی ضرورت تھی۔ وقت نے ان کا انتظار نہیں کیا اور

---

[1]۔ Avicenna: علی الحسین بن عبداللہ بن الحسن بن علی بن سینا المعروف ابن سینا (980ء-1037ء) دنیائے اسلام کے ممتاز طبیب اور فلسفی ہیں۔ ان کا لقب الشیخ الرئیس ہے۔ اسلام کے عظیم تر مفکرین میں سے تھے اور مشرق کے مشہور ترین فلسفیوں اور اطباء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

[2]۔ ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی (936ء-1013ء) اندلس سے تعلق رکھنے والے علم جراحت کے بانی، متعدد آلات جراحی کے موجد اور مشہور مسلم سائنسدان تھے۔ آپ کی مشہور کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف ہے۔

[3]۔ Charlemagne: شارلیمان (742ء-814ء) فرانس اور روم کا بادشاہ تھا۔

[4]۔ ہارون رشید (763-809ء) پانچویں اور مشہور ترین عباسی خلیفہ تھے۔ وہ 786 سے 24 مارچ 809ء تک مسند خلافت پر فائز رہے۔ ان کا دور سائنسی، ثقافتی اور مذہبی رواداری کا دور کہلاتا ہے۔

وہ قوموں کی برادری سے بہت پیچھے رہ گئے۔

عہد اول اور عہد متوسط میں مسلمانوں نے اپنی ذات و کائنات کو بدل ڈالا۔ اس لیے کہ وہ اس کی امنگ رکھتے تھے۔

گر بر فلکم دست بُدی چون یزدان
برداشتمی من این فلک را ز میان
از نو فلکی دگر چنان ساختمی
کازادہ بکام دل رسیدی آسان
(اگر مجھے قدرت ہوتی جیسی کہ خدا کو حاصل ہے)
(میں اس آسمان (حالاتِ دنیا) کو درمیان سے ہٹا دیتا)
(اور آسمان کو نئے سرے سے ترتیب دے کر ایسا بنا دیتا)
(کہ میرے دل کی تمنا پوری ہو جاتی)
(رباعیات عمر خیام)

بیا تا گل برافشانیم و می در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشکافیم و طرحی نو در اندازیم
(آئیں کہ ہم پھول بچھائیں اور شراب پیالوں میں ڈالیں)
(آسمان کی چھت کو توڑ ڈالیں اور نئی دنیا بنائیں)
(دیوان حافظ: غزل شمارہ: ۳۷۴)

جب تک یہ امنگ رہی وہ نئی کائناتیں تخلیق کرتے رہے اور پھر یوں ہوا کہ

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے
(بال جبریل: ساقی نامہ)

حوالہ جات

۱۔ بال جبریل، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: تاج کمپنی، ۱۹۳۵ء۔

۲۔ بانگ درا، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔

۳۔ تاریخ الامم والملوک: تاریخ طبری، امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ ترجمہ ڈاکٹر محمد صدیق ہاشمی۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ جامع ترمذی، امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ ترجمہ مولانا افضل احمد۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۶ء۔

۵۔ دیوان حافظ، حافظ محمد شیرازیؒ۔ لاہور: پروگریسو بکس، ۲۰۱۰ء

۶۔ رعبایات عمر خیام، حکیم عمر خیام نیشا بوریؒ۔ تہران: انتشارات امیر کبیر، ۲۰۰۰ء۔

۷۔ سنن ابن ماجہ، امام حافظ ابی عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہؒ ترجمہ مولانا محمد قاسم امین۔ لاہور: مکتبہ العلم، ۲۰۱۰ء۔

۸۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابن ہشام، حضرت ابو محمد عبدالملک ابن ہشامؒ؛ حضرت محمد بن اسحاق بن یسارؒ ترجمہ سید یٰسین علی حسنی نظامی دہلوی۔ لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۹۴ء۔

۹۔ صحیح بخاری، امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۱۰۔ صحیح مسلم، امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج نیشاپوری ترجمہ علامہ وحید الزمان۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۱۱۔ ضرب کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: کتب خانہ طلوع اسلام، ۱۹۳۶ء۔

۱۲۔ کنزل العمال، امام علاء الدین علی متقی ابن حسام الدینؒ ترجمہ مولانا احسان اللہ شائق۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۱۳۔ The Story of Civilization by W. J. Durant.New York: MJF Books, 1993.

۳

اسلام کے انسانیت پر احسانات



ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
(نسخہ ہائے وفا: رقیب سے)

اسلام نے تمام شعبہ ہائے حیات میں رہنمائی کر کے انسان کو بے شمار فوائد سے ہمکنار کیا۔ اسلامی سکالرز نے تخلیقی ذہانت کو بروئے کار لا کر کارہائے نمایاں کرنے کے علاوہ قدیم یونانی اہل دانش کے بیشتر اہم سائنسی اور فلسفیانہ متون کو بھی عربی تراجم کے ذریعے محفوظ کر لیا۔ مسلمان دانشوروں نے یونانی علوم کے ڈھانچے اور ساخت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں متعدد ایسے اہم اضافے کیے جو رومن عہد میں بھی برقرار رہے۔ مسلمانوں نے بارہویں اور تیرہویں صدی میں ان تصانیف کے بیشتر حصے کا لاطینی زبان میں جو ترجمہ کیا اس نے یورپی نشاۃِ ثانیہ کی بیداری میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کے واقعات اس امر کے گواہ ہیں کہ مسلمانوں کے علوم وفنون بڑے پیمانے پر تراجم کے ذریعے مغرب میں مقبول ہو رہے تھے۔ جب اسلامی دنیا میں حالات خراب ہوئے تو ان تراجم نے ہی یورپ کو مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے میں ان کی مدد کی۔ امریکی مؤرخ اور فلاسفر وِل ڈیورانٹ کے مطابق 700ء سے 1200ء تک پانچ صدیوں کے دوران اسلام دنیا کو قوت و اقتدار، نظم وضبط، طرز حکمرانی، آداب معاشرت، علم وفضل اور فلسفے کے فروغ میں رہنمائی فراہم کرتا رہا۔

انسانی تہذیب پر اسلام کے اثرات کو اخلاقی اثرات اور ذہنی اثرات میں منقسم کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ دونوں حصوں کا محتاط تجزیہ، اسلامی ثقافت کی ترقی و برتری کے حقائق سامنے لاتا ہے۔

ا۔ اخلاقی اثرات

زندگی بہت اہمیت رکھتی ہے اور اس کی اقدار اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اقدار رہنما اصول یا طرز عمل کا معیار ہیں جنہیں ایک مہذب اور منصف معاشرہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا

ہے۔ یہ وہ اصول ہیں جنہیں ہم دیگر افراد کے ساتھ، اپنے دوستوں کے ساتھ اور اپنے خاندان کے ساتھ تعامل کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ ان بستیوں اور گروہوں کے ساتھ بھی ہمارے طرزِ عمل کی رہنمائی کرتے ہیں جن میں ہم رہتے ہیں۔ جن کے ہم ممبرز ہیں۔ جن کے ساتھ ہم تجارت کرتے ہیں اور ایک پیشہ ورانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اخلاقیاتی اقدار، اخلاقی معیاروں، اخلاقی ذمہ داری اور اخلاقی شناخت کے تصورات کی حامل ہوتی ہیں۔ اخلاقی معیارات، طرزِ عمل کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ اخلاقی ذمہ داری ہمارے ضمیر کا حوالہ دیتی ہے اور اخلاقی شناخت اس امر کا حوالہ دیتی ہے کہ کون صحیح یا غلط اقدام کرنے پر قدرت رکھتا یا رکھتی ہے۔ جب ان خیالات کی انسانوں کے ساتھ تجسیم کی جائے تو وہ مندرجہ ذیل کے کام کرتے ہیں:

- افراد کے مابین معقول رویے اور ہم آہنگی کی ضمانت دیتے ہیں۔
- ہمیں اچھے لوگ بننے میں مدد دیتے ہیں تا کہ ہم ایک اچھا معاشرہ تشکیل دے سکیں۔
- ہمارا اس قادرِ مطلق کے ساتھ اچھا تعلق قائم کراتے ہیں جس نے ہمیں تخلیق کیا۔

اخلاقیاتی اقدار زندگی کے ہر فلسفے کا جوہرِ حقیقی ہیں۔ ایک چینی محاورہ ہے کہ اگر دل میں سچائی ہو تو کردار میں حسن پیدا ہو جائے گا۔ اگر کردار میں حسن ہو گھر میں یگانگت پیدا ہو جائے گی۔ گھر میں یگانگت ہو گی تو قوم میں نظم وضبط پیدا ہو جائے گا۔ جب قوم میں نظم وضبط ہو گا تو دنیا میں امن ہو جائے گا۔

اسلام نے انسانی زندگی میں اقدار کی غیر معمولی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ اس نے نہ صرف سابق مذاہب کی پیش کردہ اخلاقی اقدار کی توثیق کی ہے بلکہ ان میں گہرائی اور حُسن کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اس نے ان کے لیے روحانی بنیاد فراہم کی اور اعلیٰ وارفع اقدار کے لیے فطری وتخلیقی تحرک بھی فراہم کیا۔ اسلام نے انسانی نفسیات کو گہرائی میں جا کر چھیڑا ہے تا کہ اسے نہ صرف غصے، حسد، حرص اور دیگر منفی انسانی صفات کے تاریک سایوں سے صاف کیا جا سکے بلکہ صبر، محبت، رحم، ایثار اور ذاتی وقار کی روشنی سے منور بھی کیا جا سکے۔

(ا)۔ خوف خدا

اسلامی انقلاب کا انسانی وجود کے نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں پر گہرا اور دائمی اثر ہوا تھا۔ اسلام سے پہلے فلسفے اور مذہب نے انسانی زندگی پر کوئی زیادہ گہرا اثر نہیں ڈالا تھا۔ عمومی بات کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ انفرادی اور معاشرتی زندگیاں مذہب یا فلسفے سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی تھیں۔

زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کائنات کو تخلیق کرنے کے بعد دنیاوی معاملات سے لاتعلق اور لاپرواہ ہو گیا ہے۔ ان کے دل یا تو خدا کے خوف اور محبت سے خالی ہو گئے تھے یا خدا کا خوف اور محبت ان کی زندگیوں کو سنوارنے کے لیے قابل عمل تخلیقی قوتیں نہیں تھیں۔ یونانی فلسفے کی زیادہ تر تعلیمات میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں ایک منفی تصور پایا جاتا تھا اور وہ کبھی کبھار ہی خدا کی بے پایاں محبت، رحم اور معافی کا ذکر کرتے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بے ہنگم تصورات اور غیر صحت مندرویوں پر کسی مثبت ثقافت وتہذیب کی عمارت نہیں کھڑی کی جاسکتی۔

اسلام نے بنی نوع انسان کو یونانی فلسفے کی مہلک معلومات اور بیمار ولاغر عرفان (Gnosticism) سے نجات دلا کر ایسے خدا سے متعارف کرا دیا جو جسم وروح میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ خون کے ہر قطرے کے اندر محسوس ہوتا تھا۔ اسلام کا خدا نہایت مہربان اور رحم کرنے والا۔ رزق دینے والا۔ حفاظت کرنے والا۔ سلامتی عطا کرنے والا۔ اور جل جلالہٗ کی شان رکھتا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے اندر اس کی صفات پیدا کریں۔ خود کو اس کے رنگ میں رنگ لیں کیونکہ وہ بہترین رنگ رکھتا ہے۔ (سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۳۸)

تصور یہ ہے کہ خدا پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ وہی قطعی طور پر اس کو چلاتا ہے اور یہ کہ اسی نے شعورِ زندگی عطا کیا ہے اور وہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ خدا پر ایمان لانا انسانی زندگی کے لیے لازمی اور خلقی ہے۔ یہ ایمان ان کی رگوں میں حیات آفریں خون کی طرح گردش کر رہا ہے اور ان کے دل ودماغ کو منور کر رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک متقی و پرہیزگار اور باوقار تصور انسانیت ابھرا ہے، جو ان کے شعور اور محبت کے اندر سرایت کر گیا ہے۔ قرآن اس کا اظہار یوں کرتا ہے۔

(ا)۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى.(سورۃ النازعات،آیت:۴۰)

(اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا)

(ب)۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا. (سورۃ فاطر،آیت:۲۸)

(صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں)

(ج)۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. (سورۃ الحجرات،آیت:۱۳)

(درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی شعور کی وضاحت فرمائی، جب ایک بار ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: اے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے کچھ نصیحت فرمایئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ یہ ہر چیز کا منبع ہے۔

(۲)۔ اخلاقی جرأت

روحانی جرأت نے ایک مومن کو روحانی شعور اور غیر معمولی قوتِ ارادی عطا کر دی اور اسے محاسبۂ نفس کے تصور سے بھی مسلح کر دیا تاکہ وہ اپنی غلطیوں اور ناکامیوں کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔ یہ ایک مسلسل مشق کا عمل ہے۔ اسے 'نفسِ لوامہ'[۱] کہا جاتا ہے۔ (یہ ہمیشہ توبہ کرتے رہنے کا شعور ہے)۔ جب بھی مومن سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے، یہ اسے کچوکے لگاتا ہے اور اسے تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے بھی برائی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ اس شعور نے لوگوں کو اس بات کے لیے بھی تیار کر دیا کہ وہ اعتراف گناہ کر کے خود کو سزا کے لیے پیش کر دیں۔ اس محاسبۂ ذات نے ان میں اخلاقی جرأت پیدا کر کے راست بازی اور لائق بھروسہ ہونے کے اعلیٰ ترین معیارات قائم کر دیئے۔ اس طرح لوگوں میں ایسا تقویٰ اور حسنِ اخلاق پیدا ہوا جو نجی زندگی اور باہر کے معاملات میں ہر جگہ یکساں طور پر موجود رہا۔ چنانچہ انسانوں کے لیے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری قوتوں کے سامنے سر جھکائیں۔ بادشاہ،

۱۔ انسانی ضمیر جو انسان کو غلط کاموں پر ملامت کرتا ہے، نفس لوامہ کہلاتا ہے۔

علماء اور رؤساء سب نے اللہ تعالیٰ کی عاجز مخلوق جیسے رویئے اپنا لیے۔ اللہ پاک کی عظمت اور جلالت نے بنی نوع انسان کو ان سب زمینی خداؤں کے شکنجے سے آزاد کرا دیا۔ تمام دنیاوی حُسن اور شاہی درباروں کی شان وشوکت اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے ماند پڑ گئی۔

تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ عرب فاقہ کش قیصر و کسریٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رستم ایران (ایران کا سپہ سالار) کے پاس حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جب وہ رستم کے دربار میں پہنچے تو دربار سجا تھا۔ تاج وتخت تھا۔ ریشم وحریر تھا۔ یاقوت ومرجان تھے۔ یہ اللہ والا غربت کے ہاتھوں تنگ تھا۔ مختصر سا لباس تھا۔ نیم مردہ سا گھوڑا تھا۔ محل میں وہ گھوڑے سے نہیں اترے۔ مخمل وکمخواب (velvet) کے فرش پر چلتے گئے۔ حتیٰ کہ گھوڑے کو دربار کے گاؤ تکیہ سے باندھ دیا۔ نیزے کو فرش پر مارتے مارتے رستم تک پہنچے۔ (تاریخ الامم والملوک، ج:۲، ص:۱۰۷) ارشاد فرمایا:

ہم کو اللہ پاک نے اس لیے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر اسلام کے عدل میں لے آئیں۔ (تاریخ الامم والملوک، ج:۲، رقم الحدیث:۲۰۷)

اعلیٰ ترین راستبازی، دنیاوی مال ومتاع سے بے اعتنائی، اللہ تعالیٰ سے محبت اور آخرت کی تمنا نے مسلمانوں کو حق گو اور جرأت مند بنا دیا۔ وہ جنت کی محبت سے سرشار تھے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا کی زندگی اور اس کی مادی اشیا کو حقارت ونفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہیں اسلام کے اعلیٰ تصورات اتنے مرغوب تھے کہ وہ گرد و پیش کی دنیا سے بے گانہ ہو گئے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی
(بالِ جبریل: طارق کی دعا)

(۳)۔ تمنّائے موت

غزوہ احد میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ شریک تھے۔ ایک موقع پر دشمن کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو سامنے دیکھا تو فرمانے لگے کہ

اے سعد (رضی اللہ عنہ)! خدا کی قسم جنت کی خوشبو احد پہاڑ کے اس طرف سے آ رہی ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے اسی (۸۰) سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے۔ جسم ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی کوئی شناخت نہ کر سکا۔ ان کی بہن نے ان کی انگلی کے پور سے شناخت کیا۔ (صحیح بخاری، ج:۲، رقم الحدیث:۷۹)

غزوہ بدر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بڑھو! اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان ہے۔ تو حضرت عمر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس کی وسعت زمین و آسمان ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں! کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میری تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! ہاں! آپ اس کو پالو گے۔ وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے۔ پھر فرمانے لگے: اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا۔ پھر تمام کھجوروں کو پھینک دیا اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی۔ (سنن کبریٰ للبیہقی، ج:۹، رقم الحدیث:۱۷۰۴)

موت کے آئنے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
(ضرب کلیم: امامت)

(۴)۔ قبول اطاعت

اس پاکیزہ فکر نے انسان کو مکمل سپردگی عطا کی۔ اپنی ذاتی خواہشات سے دستبردار ہو کر وہ اللہ تعالیٰ کے غلام بن گئے۔ اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیا۔ جنگ اسی کے لیے، صلح اسی کے لیے۔ محبت اسی کے لیے۔ نفرت اسی کے لیے۔ ایمان کا ایک لمحہ ان کی کایا پلٹ دیتا تھا۔ اچھی چیز بری بن جاتی تھی۔ بری چیز اچھی بن جاتی تھی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے۔ فضالہ بن عمیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

شہید کرنے کے ارادے سے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فضالہ کیا کرنے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ کچھ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دست مبارک اس کے سینے پر رکھا۔ فضالہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ جیسے ہی سینے سے اٹھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ کو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبوب۔ واپسی پر مجھے وہ عورت ملی جس سے دل لگی کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ آؤ باتیں کریں۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(زاد المعاد، ج:۲، ص:۲۳۲)

(۵)۔ معرفت

انسان کو خدا اور اس کی صفات سے آگاہی حاصل ہونے، زندگی کی ابتدا اور انتہا کا گہرا شعور حاصل ہونے اور صحیح زندگی گزارنے کا واضح لائحہ عمل معلوم ہونے سے حقیقت کا وجدانی علم حاصل ہوگیا۔ بنی نوع انسان کو کسی اور فلسفے یا دین کی تلاش کے لیے غیر متعلقہ اور لا حاصل کوششوں سے نجات دلا دی۔ اس کی قوت اور توانائی ضائع ہونے سے محفوظ ہوگئی۔ اس طرح اسے بلند مقاصد کے حصول کی جدوجہد کے لیے وافر وسائل دستیاب رہے۔ مسلمانوں نے اپنی ان توانائیوں کو اپنے دنیا کے مسائل اور دینی امور کی تکمیل کے لیے استعمال کیا اور ایک حیرت انگیز تہذیب پیدا کر لی جس نے اس کی اخلاقی قدروں اور مادی سہولتوں کو یکجا کر دیا۔

معرفت الٰہی دو قسموں کی ہے۔ 'علمی' (cognital) اور 'حالی' (emotional) اول الذّکر یعنی 'علمی معرفت' اس دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک فرماتا ہے:

وَّذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ. (سورۃ الذاریات، آیت:۵۵)
(نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کو فائدہ دیتی ہے)

معرفت اللہ تعالیٰ کے ذریعے زندگی ہے۔ یہ اپنے انتہائی داخلی خیالات کو اللہ تعالیٰ کے سوا (غیر اللہ) سے ہٹا لینے کا نام ہے۔ ہر شخص کی قدر و قیمت اسے حاصل معرفت کے تناسب سے ہے۔ جسے معرفت حاصل نہیں وہ بالکل ناچیز ہے۔ معرفت، دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلوب انسانیت کے لیے روحانی روشنی کی ترسیل ہے۔ اللہ تعالیٰ از راہِ عنایت و کرم انسان کے دل کو

منور کر دیتا ہے اور اس کو مخلوق کی آلائشوں سے صاف رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے دل میں ان چیزوں کی قیمت رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں۔ (کشف المحجوب، ص: ۲۵۵)

عجب آن نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است
(پیام مشرق: پیام)

(عجب یہ نہیں ہے کہ آپ مسیحاؑ کی طرح بیماروں کو ٹھیک کرنے کا اعجاز رکھتے ہیں)
(عجب بات تو یہ ہے کہ تیرا بیمار اور زیادہ بیمار ہو جاتا ہے)

(۶)۔ اجتماعی ذمہ داری

اسلامی شعور و احساس نے اجتماعی ذمہ داری کا تصور دیا ہے۔ اسلام اور بیشتر دیگر مذاہب میں فرق یہ ہے کہ اس نے صرف عبادات کرنے اور معاشرتی ذمہ داریاں دنیاوی حکمرانوں پر چھوڑ دینے کا حکم دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے طریق ہائے عمل، باہمی تعلقات، فرد بمقابلہ خاندان و معاشرہ و قوم اور مابین اقوام، حقوق اور ذمہ داریوں کا بھی احساس دلایا ہے۔ قرآن مجید اعلان کرتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (سورۃ التوبہ، آیت: ۷۱)
(اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں)
اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (سورۃ الماعون، آیت: ۱-۲)
(تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا)
حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مومن بندوں کی مثال ان کی آپس میں محبت اور اتحاد اور شفقت میں جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کے اعضاء میں سے کسی عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس کے سارے جسم کو نیند نہیں آتی اور

بخار چڑھ جانے میں اس کا شریک ہو جاتا ہے۔(صحیح مسلم، ج:۳، رقم الحدیث:۲۰۸۵)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے اس بنیادی امتیاز کو واضح کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: آگاہ رہو! تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ پس وہ امیر جو لوگوں پر نگہبان بنایا گیا ہے (روز قیامت) اس سے لوگوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے مکان اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے۔(سنن ابوداؤد، ج:۲، رقم الحدیث:۱۱۶۱)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس فرض کی ایک بڑی خوبصورت وضاحت کی ہے کہ معاشرہ ہر ایک فرد کے رویئے کے بارے میں جوابدہ ہے۔ ارشاد مبارک ہے کہ اس شخص کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم ہے اور اس شخص کی جو اللہ تعالیٰ کی حدود میں پڑنے والا (اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ورزی کرنے والا) ہے۔ اس قوم کی سی ہے جو ایک جہاز میں بیٹھے ہوں۔ قرعہ سے جہاز کی منزلیں تقسیم کر لی جائیں۔ کچھ لوگ اوپر والی منزل میں ہوں اور کچھ نیچے والی منزل میں ہوں۔ جب نیچے والوں کو پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ جہاز کے اوپر والے حصے میں جا کر پانی لیتے ہیں۔ اگر وہ یہ خیال کر کے کہ ہمارے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اپنی نچلی منزل میں ایک سوراخ سمندر میں کھول لیتے ہیں تاکہ پانی لے سکیں۔ اگر اوپر والے نیچے والوں کو اس احمقانہ تجویز سے نہیں روکیں گے تو جہاز غرق ہو جائے گا اور دونوں گروہ ڈوب جائیں گے۔ اگر ان کو روکیں گے تو دونوں بچ جائیں گے۔

(صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث:۲۳۹۳)

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کریں۔ مظلوم کی مدد اس طرح کہ اسے تشدد سے بچا لیں اور ظالم کی مدد اس طرح کہ اسے ظلم کرنے سے باز رکھیں۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہے یا مظلوم ہے۔ لوگوں نے پوچھا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر وہ مظلوم ہے تو اس کی مدد کرنا صحیح ہے۔ ہم ایک ظالم کی مدد

کس طرح کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسے دوسروں پر ظلم کرنے سے روک کر۔
(صحیح بخاری، ج:۳، رقم الحدیث:۱۸۷۹)

(۷)۔ عشق کا نقطۂ ارتکاز

بنی نوع انسان نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں اپنے لیے ایک 'رول ماڈل' (عملی نمونہ) پا لیا تھا جو ان کی دائمی محبت وعقیدت کا مرکز تھا۔ محبت ایک ملکوتی جذبہ اور ایک تند و تیز قوت ہے جو اس مادی دنیا میں ہزاروں طریقوں سے اپنا اظہار کر لیتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اپنا ایک تاثر نہ رکھتی ہو۔

یہ جذبۂ عشق دنیاوی جاہ وحشمت اور چمک دمک میں گم ہو گیا۔ انسانیت صدیوں ایک ایسے انسانی پیکر سے محروم رہی جو اس کی محبت وعقیدت کا مرجع ومرکز بن سکتا تاوقتیکہ اسے حُسن، قوت و وقار کا نمونۂ کامل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں دکھائی دے گیا۔ جو بنی نوع انسان کی توجہ اور محبت کا نقطۂ ماسکہ بن گیا تھا۔ جس کسی نے اسے دور سے دیکھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کے سحر سے مرعوب ومغلوب ہو گیا اور جب اس نے قریب آ کر شرف ملاقات حاصل کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شیدا بن گیا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ کی ایک شاندار نعت کے اشعار درج کروں جو میری رائے میں حقیقت کے قریب تر ہیں:

بَلَغَ العُلیٰ بکمَالِهِ
کَشَفَ الدُجیٰ بجمالِهِ
حَسُنَت جمِیع خِصَالِهِ
صَلُوا عَلیهِ وآلِهِ

(انسانی عظمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں اپنے کمال تک پہنچی)
(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن و کمال کی روشنی سے اندھیرے چھٹ گئے)
(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تمام اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں)
(اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل پر سلام بھیجتے ہیں)

مرزا غالب نے بھی خوب کہا ہے:

حق جلوہ گر زطرزِ بیانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
(حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان میں ذات خداوندی جلوہ گر ہے)
(واقعی کلام حق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوتا ہے)
غالب ثنائے خواجہ بہ یزدان گزاشتم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم است
(غالب ہم حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑتے ہیں)
(اس لیے کہ صرف وہی ذات ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ جانتی ہے)

ایک انصاری عورت جس کا باپ، بھائی اور شوہر احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے اور شہید ہو گئے تھے۔ اسے خبر ملی تو وہ اپنے بیٹوں کی بجائے گھر سے نکل کر پوچھنے لگی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ اس نے کہا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس نے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ لیا تو بولی: اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلامت ہیں تو دنیا کی ہر مصیبت ہیچ ہے۔ (شرح حدیث، مشکوٰۃ المصابیح، ج:۱، رقم الحدیث:۶)

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا۔ سب کہنے لگے کہ کہو یہ پسند ہے کہ (نعوذ باللہ) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہاری جگہ ہوں؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاؤں مبارک میں کانٹا بھی چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں۔ وہ سب ہنس دیئے۔ (تاریخ الامم والملوک، ج:۴، ص:۶۳)

حضرت عروہ بن مسعود ثقفی (کفار مکہ کا سفیر) نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا: اے لوگو! خدا کی قسم، میں نے بہت سے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں۔ نجاشی[1] کا دربار بھی دیکھا ہے۔ خدا کی قسم! میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہیں جتنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ خدا کی

۱۔ نجاشی زمانہ قدیم میں حبشہ موجودہ ایتھوپیا کے بادشاہ کا لقب تھا۔

قسم! جب وہ تھوکتے ہیں لوگ اس کو اپنے جسم پر مل لیتے ہیں۔ جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے لڑتے رہ جاتے ہیں۔ جب بات کرتے ہیں تو لوگ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ فرط ادب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے۔ (زادالمعاد، ج:۲،ص:۱۲۵)

انسانیت کے اپنی محبت کے اظہار کے لیے ایک نقطہ مل گیا تھا۔ جہاں وہ اپنے اعلیٰ جذبات قربان کر سکتے تھے۔ فطری جذبے کی تسکین کر سکتے تھے۔ جذباتی انتشار سے بچ گئے۔ پاکیزگی اور لطف وعنایت نے ایک عمدہ شکل دیکھی۔ محبت و اطاعت کی نئی روایات قائم ہوئیں۔ محبت کے تخلیقی عمل سے کمالات نے جنم لیا۔ محبت فاتح عالم بنتی چلی گئی۔ حضرت اقبالؒ نے کیا صحیح ارشاد فرمایا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

(مسلمانوں کا رہنما وہ شخص ہو سکتا ہے جس کی نگاہ بلند ہو۔ جس کا سخن دلنواز ہو۔ جان پرسوز ہو یعنی وہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فنا ہو چکا ہو)
(بالِ جبریل: غزل)

(۸)۔ شخصی وقار

نفسیاتی اور اخلاقی عوامل نے انسانی طرز عمل اور رویوں کو نئی تبدیلیوں سے آشنا کر دیا۔ بنی نوع انسان کو حیاتِ نو مل گئی اور اس کی عزت و احترام بحال ہو گیا۔ ایک عظیم انسان دوست انقلاب نے عرب قوم کی کایا پلٹ کر رکھ دی جو اس وقت تک انتہائی پسماندہ اور جاہل قوم شمار ہوتی تھی۔ عمر جو ایک چرواہا ہوتے تھے اس تعلیم اور تربیت کی بدولت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن گئے اور اپنی غیر معمولی شخصیت کی وجہ سے دنیا کو حیران کر دیا۔ تقویٰ اور انتظامی قابلیت کے لیے وہ ایک نمونۂ عمل بن گئے۔ خالد بن ولید ایک عام نوجوان تھے جنہوں نے بعد میں روم فتح کیا اور سیف اللہ کہلانے لگے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نہایت نرم دل انسان تھے لیکن انہوں نے ہرقل کو شام سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایک عام دانش مند انسان تھے وہ

گورنر مصر بن گئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایک عام آدمی تھے جنہوں نے جنگ مدائن میں عراق اور ایران، دونوں کو فتح کر لیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو ایک غلام خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے ملک ایران کے حکمران بن گئے لیکن ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک چھوٹے قد کے آدمی تھے ایک عالم اور قانون دان بن گئے جو اگلی نسلوں کے لیے علم و دانش کا منبع قرار پائے۔

یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کیسے ہوا؟ ایسا لگتا ہے جیسے کہ دعوت اور عشق کی تاریں پھیلا دی گئیں۔ ان میں ایمان کی برقی رو آ گئی۔ یہ رو اہل ایمان کے جسد میں دوڑ گئی جس سے مردہ دل زندہ ہو گئے اور جلد ہی پوری دنیا اس کے جلوے سے منوّر ہو گئی۔ یہ عظمت و قوت بنی نوع انسان پر اسلام کا ایک احسانِ عظیم تھا۔ اس نے افراد اور قوموں کو انقلاب سے آشنا کیا۔ چرواہوں کو حکمران بنا دیا۔ انسانی زندگی کی کایا پلٹ گئی اور چرواہے عام حکمران نہیں بلکہ غیر معمولی اور مثالی حکمران بن گئے۔

ان کے علاوہ دیگر عظیم لوگوں نے بھی امتِ مسلمہ کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ انصاف اور سچائی کے علمبردار بنے۔ ان کی ذاتی خواہشات اور عبادت و ریاضت نے انہیں عدل گستری کے فریضے سے غافل نہیں ہونے دیا۔ وہ بنیادی فوائد سے دور رہے اور حصولِ اقتدار کے کبھی متمنی نہ ہوئے۔ تاہم جب انہیں سرکاری منصب کی ذمہ داری قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو انہوں نے اسے ایک مقدس امانت سمجھا۔ وہ کسی خاص نسل یا علاقے کی نمائندگی نہیں کرتے تھے بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی میں دلچسپی رکھتے تھے اور انہوں نے انسانی وقار اور احترام کا علم بلند رکھا۔

۲۔ علمی خدمات

(ا)۔ سائنسی افکار

سائنسی فکر کا مطلب تحقیق کے انضباطی طریق کار کا اطلاق ہے جو معروضی اور مقصدی اور اصولی طریقوں پر مبنی ہو۔ اسے علم کی نئی شاخوں کی تخلیق اور اس عمل کی تسہیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تحقیق کا ایک منظم طریقہ ہے جو فطرت کے محتاط مشاہدے اور سوچ بچار سے ظہور پذیر

ہوتا ہے۔ عقلِ خداداد قرآنی تحریک برائے علمی تحقیق کا ساتھ دیتی ہے۔ قرآن مجید نے اس اسلامی مقصد کی طرف پیش قدمی کے لیے طریق کار کی تشکیل نو کی طرف دعوت ایسے دی ہے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِیۡ خَلَقَ. (سورۃ العلق، آیت:۱)
(اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے سب کو پیدا کیا)

یہ وہی وحی ہے جو اعلان کرتی ہے کہ ساری 'تخلیق کردہ' دنیا کا مطالعہ کرنا 'خالق' کی معرفت حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ فطرت تک رسائی کے لیے اس نئے طریق کار نے مسلمانوں کو رازہائے فطرت کی بصیرت حاصل کرنے کے لیے ایک تخلیقی قوت فراہم کردی ہے۔ قرآن مجید انسانی ذہانت کو مظاہر فطرت کی گہری بصیرت حاصل کرنے کا نہ صرف جذبہ عطا کرتا ہے بلکہ اسے مختلف اسلوب ہائے فکر اور استدلال کے مختلف انداز بھی فراہم کرتا ہے۔ قرآن پاک کے نقطۂ نظر سے فطرت اللہ تعالیٰ کی ایک واضح نشانی (آیت) ہے جو اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ ایک مرتب نظام کی نشاندہی کرتی ہے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۱۶۴)
(بیشک آسمان اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے لگاتار آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لیکر سمندر میں تیرتی ہیں، اس پانی میں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں)
قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوۡنَ. (سورۃ الانعام، آیت:۵۰)
(کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟)
اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۴۴)
(کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟)

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۞ وَإِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۞ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۞ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ.

(سورۃ الغاشیہ، آیات: ۱۷-۲۰)

(تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے بلند کیا گیا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے نصب کیا گیا ہے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ یہ کس طرح بچھائی گئی ہے)

قرآن پاک کے پیدا کردہ تجسس نے قرونِ اولیٰ کے ذہین مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی تخلیقی فکر کو صحیح معنوں میں بروئے کار لائیں۔ ان میں یہ تخلیقی فکر اور طریقۂ کار ان کی طبع زاد کتابوں میں جو انہوں نے لکھیں اور تراجم میں جو انہوں نے کیے اور قدیم یونانی، ہندوستانی اور ایرانی تہذیبوں کے سائنسی ورثے کے تحفظ میں، جس کا انہوں نے اہتمام کیا، صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی کاوشیں دو نمایاں تخلیقی طریق ہائے کار میں ظہور پذیر ہوئیں جنہوں نے بنی نوع انسان کی مستقبل کی پیش رفتوں میں بے پناہ کردار ادا کیا۔ ایک تو انہوں نے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ایجاد کی اور دوسرا یہ کہ انہوں نے تخلیقی اور تجزیاتی ذہنوں کی آبیاری کی۔

مسلمانوں نے تمام قوموں کی مثبت اور تخلیقی کاوشوں کا خیر مقدم کیا، انہیں سمجھا اور جانا اور پھر ان کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کے تصورات کو اسلامی عالمی تناظر کے ڈھانچے میں ضم کر لیا۔ فلپ ہٹی[1] رقم طراز ہے:

اسلام کی وحدانیت اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی استعداد کے باعث انسانی فکر میں پہلی بار ثابت ہوا ہے کہ دینیات، فلسفہ اور سائنس بالآخر ایک اکائی کے طور پر متحد ہو گئے تھے۔ اس طرح ان کا یہ کارنامہ بہت اہم تھا کیونکہ اس نے سائنسی اور فلسفیانہ فکر اور بعد کے زمانے کی دینیات پر بہت اثرات مرتب کیے۔ یہ سائنس کے ارتقا کے اسباب میں سے ایک ہے۔ غالباً یہ خدا کے ان احکامات کی وجہ سے ہے کہ قوانین فطرت کی تفتیش کی جائے۔

(The Arabs, p. 111)

---

[1]۔ Philip Khuri Hitti: فلپ خوری ہٹی (1886ء-1978ء) ایک امریکی مستشرق تھا جو لبنان میں پیدا ہوا۔ 1915ء میں کولمبیا یونیورسٹی کے مشرقی علوم کے شعبے میں لیکچرر مقرر رہوا۔ اس کے بعد پرنسٹن یونیورسٹی امریکا چلے گیا۔

اسلام کی آمد سے پہلے لوگ اشیائے فطرت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسے 'شرک' قرار دے دیا (اس کا مطلب خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا ہوتا ہے) اور اپنے پیروکاروں پر زور دیا کہ وہ ہرگز اشیائے فطرت کو نہ پوجیں بلکہ ان کا مطالعہ کریں۔ اس حکم کے نتیجے میں سائنسی سوچ اور طریق ہائے کار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسلام سے پہلے تجربات اور مشاہدے کا کوئی باقاعدہ تصور نہیں تھا۔ کائنات انسان کے لیے ایک پوجا کی شے تھی نہ کہ تفتیش اور تحقیق کا موضوع۔ اسلام کا یہی عظیم کارنامہ تھا جس نے زمین پر بنی نوع انسان کی تاریخ مکمل طور پر بدل دی۔ اس سیاق وسباق میں انسائیکلوپیڈیا بریٹنیکا (تاریخ ندارد) کا ایک اقتباس یہ ہے: مذاہب میں ایک وسیع پیمانے پر پھیلایا ہوا ایک سلسلہ اشیائے فطرت ہے جو قوتوں کے ساتھ خدائی صفات منسوب کرتا (دیوی دیوتا بناتا) ہے۔ اس مظہر کی وضاحت کے لیے ان اشیا کی درجہ بندی کی گئی ہے وہ یہ کہ ان میں سے کچھ آسمانی (celestial) کچھ فضائی (atmospheric) اور کچھ ارضی (earthly) ہیں۔ اس درجہ بندی کو انڈو آرین مذہب نے خود تسلیم کیا ہے: 'سُریا' (سن گاڈ) آسمانی ہے۔ 'اندرا' (آندھی، بارش اور جنگ وجدل کی دیوی) فضائی ہے۔ 'اگنی' (آگ کا دیوتا) زیادہ تر زمینی سطح پر کام کرتا ہے۔

(Encyclopedia Britannica, Vol. 14, p. 785)

اسلام نے دنیا کو سائنسی طریق کار دیا۔ اسلام سے پہلے لوگ قدیم روایتی علم کو کسی تجربے کی بنیاد پر پرکھے بغیر قبول کر لیا کرتے تھے۔ ممتاز برطانوی مفکر اور فلاسفر برٹرینڈ رسل[1] کا کہنا تھا کہ یونانی لوگ تجربے اور مشاہدے کے مخالف تھے۔ وہ اپنی کتاب 'The Impact of Sciensces on Society' میں لکھتا ہے: جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ واقعات کو مشاہدے کی بنا پر پرکھتے ہیں۔ قدیم اہل دانش سے مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن یہ بالکل ایک جدید تصور ہے جو سترہویں صدی سے پہلے بمشکل ہی پایا جاتا تھا۔ ارسطو کا موقف تھا کہ عورتوں کے دانت مردوں کے دانتوں سے کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کی دوبار شادی ہوئی تھی لیکن اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ وہ اپنی بیویوں

---

[1]۔ Bertrand Arthur William Russell: برٹرینڈ آرتھر ولیمز رسل (1872ء-1970ء) ایک معروف محقق، مورخ، سائنسدان، ماہر ریاضیات، ماہر طبیعیات، مدرس اور فلسفی تھے۔

کے دانت خود گن لیتا۔

(The Impact of Sciences on Society, p.17)

ماہر معاشرتی بشریات (social anthropologist) رابرٹ بریفالٹ[1] یہ اعلان کرنے کی حد تک چلا گیا ہے کہ جدید سائنس مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ سائنسی تحقیق یونانیوں سے شروع ہوئی لیکن یہ مسلمان عرب ہی تھے جنھوں نے سائنسی طریق، یعنی 'تجربے کے عمل' کا طریقہ مشاہدے کا عمل اور ناپنے کا طریقہ دریافت کیا۔ اس طرح یورپ میں جدید سائنس کی بنیاد استوار ہوگئی۔ رابرٹ بریفالٹ کے مطابق: ہماری سائنس کا قرضہ جو عربوں کا قرضہ ہے وہ چونکا دینے والے انقلابی نظریات کی دریافتوں پر مشتمل نہیں ہے؛ سائنس نے اس سے کہیں زیادہ قرضہ عرب ثقافت کو ادا کرنا ہے، بلکہ اس کا وجود ہی عرب ثقافت کا مرہونِ منت ہے۔ قدیم دنیا جیسا کہ ہم جانتے ہیں سائنس سے پہلے کی دنیا تھی۔ یونانیوں کے علومِ فلکیات اور ریاضی جو غیر ملکی درآمد کاری تھے، یونانی ثقافت کے اندر کبھی کماحقہٗ رچ بس نہ سکے۔ ٹھیک ہے کہ یونانیوں نے انہیں ترتیب دی، ان کو عمومی بنایا اور ان کی نظریہ سازی بھی کی۔ لیکن صبر وتحمل کے طور طریقوں پر مشتمل تفتیش، مثبت علم کی جمع بندی، سائنس کے باریک بینی کے طریقے، تفصیل طلب اور طویل مدتی مشاہدات اور تجرباتی تحقیق وغیرہ یونانی مزاج کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ صرف قدیم کلاسیکی دنیا (چہارم تا یکم صدی قبل مسیح) کے سکندریہ میں کچھ سائنسی کام ہوسکا تھا لیکن جس علم کو ہم سائنس سے تعبیر کرتے ہیں وہ یورپ میں ایک نئے جذبۂ تفتیش، طریق ہائے تحقیق، تجربات ومشاہدات، پیمائش اور ریاضی کی ترقی کے ذریعے آئی۔ جن سے اہل یونان بے خبر تھے۔ پوری دنیا کو اس جذبۂ تفتیش وتحقیق اور طریق ہائے کار سے عربوں نے متعارف کرایا تھا۔

(Making of Humanity, p. 190)

قرآن مجید کائنات میں پیدا کردہ تمام اشیا پر غور وفکر کرنے پر بہت زور دیتا ہے۔ یہی اشیا ہیں جنہیں ہم آج سائنس کہتے ہیں۔ یہ باضابطہ اور منضبط طریق کار ہمیں خدا پاک کے قریب لے

---

[1]۔ Robert Stephen Briffault: رابرٹ سٹیفن بریفالٹ (1874ء-1948ء) ایک فرانسیسی ماہر سرجن تھا۔ جس نے بطور social anthropologist اور ایک ناول نگار کے شہرت حاصل کی۔

جاتا ہے۔ تاریخ اسلام اس حقیقت کی گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اولین دور میں سائنسی علوم میں بے پناہ ترقی کی تھی۔ برٹرینڈ رسل اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مسلمانوں نے سائنسی علوم اور تعلیم کو بہت فروغ دیا اور انہوں نے سائنس میں دنیا کی اس وقت رہنمائی کی جب یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت ہندوستان سے سپین تک ایک شاندار اسلامی تہذیب اپنی ترقی کی منازل طے کر رہی تھی۔ وہ کہتا ہے: ہم 'تاریک دور' کے الفاظ، 600ء سے 1000ء تک کے زمانے پر پردہ ڈالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں چونکہ مغربی یورپ پر ہمارا غیر ضروری ارتکاز تھا۔ چین کے اس زمانے میں ٹینگ خاندان (Tang Dynasty) کا دور، چینی شاعری کے عروج کا دور اور کئی پہلوؤں سے بہت ہی قابل ذکر عہد شامل تھا۔ ہندوستان سے سپین تک اسلام کی شاندار تہذیب فروغ پا رہی تھی۔ عیسائیت کو اس وقت جو شکست ہوئی وہ تہذیب کو شکست نہیں ہوئی تھی بلکہ معاملہ بالکل برعکس تھا۔

(The History of Western Philosophy, p.372)

(۲)۔ طبی علوم

عہد متوسط کے دوران طبی شعبے میں مسلمانوں نے زبردست خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کی نوعیت بہت غیر معمولی تھی۔ الرازی[۱] بلاشبہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا طبیب تھا اور دائمی شہرت پانے والے اطباء میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی تصانیف کے لاطینی زبان میں وسیع پیمانے پر تراجم ہوئے۔ یہ تراجم 'Rhaze' کے نام سے ہوئے اور اسلامی دنیا سے باہر بھی ان کے اثرات مرتب ہوئے۔ الرازی کی تصنیف کتاب المنصوری، دس (۱۰) جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ یونانی دواؤں پر لکھی گئی ہے۔ لاطینی زبان میں یہ 'Liber ad Almanisorem' کے عنوان سے چھپی۔ اس کی ایک اور غیر معمولی تصنیف 'الجدری والحسبہ' چیچک اور خسرہ کے امراض کے بارے میں ہے اور اس موضوع پر انتہائی مستند کتاب ہے جو آج بھی زبردست افادیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ اس کا لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور یہ

[۱]۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی (854ء-925ء) مسلمان سائنسدان، ماہر طبیعیات، ہیئت دان اور فلسفی تھے۔

1498ء اور 1866ء کے درمیان چالیس (۴۰) سے زائد مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کی ایک جامع اور معروف کتاب 'الحاوی' بیس (۲۰) جلدوں پر مشتمل ہے۔ شاہِ سسلی (Charles I, King of Sicily) کے حکم پر سسلی کے یہودی طبیب فراج بن سالم[1] نے اس کا 'Continens' کے عنوان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ الرازی نے امراضِ نسواں (gynecology) اور زچہ بچہ (obstetrics)، امراضِ چشم (ophthalmology) اور امراضِ گردہ (nephrology) پر بھی کتابیں لکھیں۔ وہ ایک نامور سرجن بھی تھا اور اس نے سرجری میں سیٹن[2] کا طریقہ کار بھی متعارف کروایا۔

الرازی نے ایک مخصوص 'ڈوری' (sutures) بنائی جو اس نے مویشیوں سے حاصل کی تا کہ ریشوں (tissues) کو جوڑا جا سکے۔ وہ پہلا معالج تھا جس نے زخموں کے علاج کے لیے ڈوری استعمال کی۔ اس نے علم کیمیا کے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے چند مرکبات بھی تیار کئے مثلاً مرکری سالٹس، لیڈ اور کاپر سالٹس جو پہلی دفعہ علاج میں استعمال ہوئے۔ اس کی عملی کامیابیوں کا بہت سا حصہ ان مرکبات کو آزمائشی طور پر بندروں پر استعمال کرنے پر مشتمل تھا۔ وہ اس معاملے میں بھی پہلا معالج تھا کہ اس نے مرہموں میں سفید لیڈ استعمال کیا اور پارا کو بطو رجلاب استعمال کیا۔ اس کے علم اور تجسس نے طب کے شعبے میں اسے سب سے بلند مقام دلوا دیا جب کہ دیگر معاشرے اس کی پیش رفتوں کے ساتھ قدم ملانے کے لیے اس کے تراجم میں سر کھپاتے رہ گئے۔

---

[1] فرج بن سالم (تیرہویں صدی عیسوی) سسلی کا یہودی طبیب اور مترجم تھا۔ سسلی کے بادشاہ چارلس اول نے اسے عربی زبان کی طب کی کتب کو لاطینی میں ترجمہ کرنے کے ذمہ داری سونپ دی تھی۔ فرج نے بڑی ہی کامیابی سے عربی زبان کی طب کی کتب خاص طور پر رازی کی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

[2] 'Seton Stitch' سرجری کا طریقہ کار ہے۔ اس طریقہ کار میں زخم میں سے ایک سرجیکل ڈوری گزار دی جاتی ہے تا کہ یہ ڈوری ایک راستہ بنائے جو زخم میں سے باہر چلا جائے۔ اس راستہ کے ذریعے پیپ اور دوسرا مواد زخم سے باہر نکلتا رہتا ہے اور زخم مندمل ہوتا رہتا ہے۔

علی ابن العباس المجوسی[1] جسے مغرب میں 'ہالی عباس' (Haly Abbas) کہا جاتا تھا ایک معتبر عالم تھا۔ اس نے 'کتاب الملیکی' تصنیف کی، جس کا لاطینی نام 'Liber Regius' تھا۔ یہ ایک مبسوط انسائیکلوپیڈیا تھی جس میں میں طب کے نظریات (theory of medical science) اور عمل پر لکھا گیا تھا۔ یہ اس وقت تک معیاری کتاب رہی جب تک ابن سینا کی شاہکار تصنیف 'Canon' نے اس پر سبقت حاصل نہیں کر لی تھی۔ المجوسی پہلا معالج تھا جس نے نظامِ رگِ شعری (Capillary System) کے بارے میں لکھا اور یہ تفصیلات بھی بیان کیں کہ بچہ کیسے جنم لیتا ہے۔

ابن سینا کا شمار مسلم دنیا کے مشہور دانشوروں میں ہوتا تھا۔ اسے ارسطو کے بعد ذہین ترین شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس کی عظیم الشان کتاب 'القانون فی الطب' ہے[2]۔ لاطینی زبان میں اس کا نام 'Canon of Medicine' ہے۔ یہ عربوں کی نظم بندیٔ علم کی مہارت تامہ کی مظہر ہے۔ یہ میڈیکل انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں سات سو ساٹھ (۷۶۰) دواؤں اور امراض پر تحقیق شامل ہے۔ اس میں پورے جسم کے امراض بشمول پانی کے ذریعے پھیلنے والی بیماریوں کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر 'پتھالوجی'[3] اور 'فارماکوپیا'[4] سے متعلق ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں گیراڈ آف کریمونا[5] نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے یورپ کے اہل علم کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی میں یہ یورپ کی مختلف زبانوں میں سینکڑوں بار شائع ہوئی۔

---

[1]۔ Ali ibn al-Abbas al-Majusi: علی بن العباس المجوسی (دسویں صدی عیسوی) ایک ماہر طبیب تھے۔ طب میں ان کی مشہور زمانہ کتاب کامل الصناعۃ الطبیہ الضروریہ، یہ کتاب، الکتاب الملکی (شاہی کتاب) کے نام سے مشہور ہے۔

[2]۔ قوانین ادویات

[3]۔ طب کے ذیلی موضوع Pathology میں امراض کی فطرت، کسی بھی متعلقہ بیماری کی ساخت، اس بیماری کا جسمانی اعضاء، نسیج اور خلیات پر اثر اور اس بیماری کی وجہ سے پیدا (یا ناپید) ہونے والے مظاہر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

[4]۔ ادویات بنانے کے علم کو دستور الادویہ (pharmacopia) کہتے ہیں۔

[5]۔ Gerard of Cremona: گیراڈ آف کریمونا (1114ء - 1187ء) ایک اطالوی مترجم تھا، جس نے بے شمار سائنسی کتب کا عربی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

القانون پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپی یونیورسٹیوں کے کل طبی نصاب کا نصف حصہ تھا اور تقریباً 1650ء تک مغرب کی یونیورسٹیوں میں نصابی کتاب کے طور پڑھائی جاتی رہی ہے۔

(The Arabs, p. 110)

الزہراوی ایک نامور جراح (surgen) تھا جس نے التصریف لکھی۔ اس کتاب میں تمام آلات جراحی کی اشکال اور طریقہ ہائے جراحت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب نے مشرق اور مغرب کے فن جراحی کے ارتقاء میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ الزہراوی پہلا سرجن تھا جس نے خون کی نالیوں کے سرجیکل آپریشنز (جراحت) کیے۔ مثلاً اس نے کٹی ہوئی شریانوں کی سلائی کی اور انہیں اس حال میں جوڑا، جب ان میں خون جاری تھا۔ اس نے پہلی بار زخموں کو جوڑنے کے لیے ریشمی دھاگا استعمال کیا اور دانتوں کے علاج کے لیے سونے کے رباطی بندھن (ligaments) استعمال کیے۔ اس نے پلاسٹک کی سلائی اور متعدد دیگر آلات جراحی کو ترقی دی جس سے حکماء (طبیب) پہلے آگاہ نہ تھے۔ اس نے ان آلات کی تصاویر بنوائیں۔ ان کے سائز اور انہیں بنانے کے لیے استعمال ہونے والے سامان (material) کی تفصیلات بتائیں۔

زہراوی نے مثانے کی پتھری نکالنے کے لیے عمل جراحی اور حلق کے غدود نکالنے کے فن کو ترقی دی۔ علاوہ ازیں اس نے بوقت پیدائش 'جنین' (embryo) کی پوزیشن معمول کے مطابق نہ ہونے کی بنا پر بچے کو تسلے (basin) میں جنوانے (deliver) کا طریقہ وضع کیا۔ اس نے خواتین کا آپریشن کرنے کے وقت خواتین نرسوں کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا کیونکہ خواتین نرم دل ہوتی ہیں اور مریض ان کے ساتھ زیادہ انس محسوس کرتی ہیں۔ ابن سینا کی 'القانون' اور زہراوی کی علم جراحت (سرجری) پر تصنیف 'التصریف' سترہویں صدی عیسوی تک پورے یورپ میں نصابی کتب کے طور پر پڑھائی جاتی رہیں۔

الزہراوی کی سرجری سے متعلق کتاب التصریف کا گیراڈ آف کریمونا نے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف ایڈیشن چھپے۔ وینس میں 1497ء میں باسل میں 1541ء میں اور آکسفورڈ میں 1778ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ کئی صدیوں تک یورپ کے

میڈیکل سکولوں میں بطور نصاب پڑھایا جاتا رہا۔

(The Arabs, p.577)

بغداد کے علی بن عیسیٰ الکحال[1] (لاطینی نام Jesu Occulist) نے امراض چشم پر ایک شاندار کتاب لکھی۔ اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب یورپ میں اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک امراض چشم کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی رہی۔ حنین بن اسحاق[2] نے امراض چشم پر دس مضامین لکھے۔ اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی جس میں امراض چشم پر تمام مطلوبہ معلومات یکجا کر دی گئی تھیں۔

ابوالہیثم جو مغرب میں 'Alhazen' کے نام سے معروف تھا۔ اسے بصریات (optics) میں سند مانا جاتا تھا۔ دنیا نے اس جیسا ماہر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اس موضوع پر 'اقلیدس'[3] اور بطلیموس[4] کے نظریات کی تصحیح کی۔ اس کی تصنیف 'Opticae Thesaurus' نے علم بصریات پر لکھنے والے 'راجر بیکن'[5]، لیونارڈ ڈاونچی[6]، جان کیپلر[7] اور عہد متوسط کے کئی اور مغربی مصنفین کو متاثر کیا۔ ابوالہیثم نے بصارت کے قدیم نظریہ کو بدل دیا کہ شعاع ہماری آنکھ سے نکل کر کسی چیز سے ٹکراتی ہے تو ہم اس چیز کو دیکھتے ہیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ روشنی اس چیز

۱۔ Ali ibn Isa al-Kahhal: علی بن عیسیٰ الکحال (گیارہویں صدی عیسوی) مشہور ماہر امراض چشم تھا۔

۲۔ Hunayn Ibn Is-haaq: حنین بن اسحاق (809ء-873ء) ایک فلاسفر، سائنسدان، طبیب اور مترجم تھا۔

۳۔ Euclid: اقلیدس ایک یونانی ریاضی دان تھا جو مصری شہر اسکندریہ میں تیسری صدی قبل مسیح میں رہا۔ اس کی کتاب ایلیمنٹس ریاضی کی تاریخ کی مشہور ترین اور سب سے زیادہ دیر تک پڑھائی جانے والی نصابی کتاب ہے۔

۴۔ Ptolemy: بطلیموس (100ء-170ء) ایک مشہور یونانی ماہر فلکیات، جغرافیہ دان اور ریاضی دان تھا۔

۵۔ Roger Bacon: راجر بیکن (1214ء-1294ء) ایک انگریز فلسفی اور راہب تھا۔ یہ ایک عرصہ تک پیرس میں ارسطو کے فلسفے پر لیکچر دیتا رہا۔ اسے 1277ء میں کیتھولک کلیسا نے مجرم قرار دیا اور قید میں ڈال دیا وہیں وفات پائی۔

۶۔ Leonardo da Vinci: لیونارڈو ڈاونچی (1452ء-1519ء) ایک اطالوی عالم، سائنسدان، حساب دان، موجد، تشریح دان، مصور، مجسمہ ساز، معمار، ماہر نباتیات، موسیقار اور مصنف تھا۔ انہیں نشاۃ ثانیہ کے مرکزی کردار سمجھا جاتا ہے۔

۷۔ Johannes Kepler: جان کیپلر (1571ء-1630ء) ایک جرمن ماہر فلکیات، ریاضی دان اور سترھویں صدی عیسوی کے سائنسی انقلاب کی ایک بہت اہم شخصیت تھا۔ وہ سیاروں کی حرکت کے قوانین دریافت کرنے کے لیے مشہور تھا۔

سے ٹکرا کر ہماری آنکھ تک پہنچتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں۔

ابن رشد نے طب پر سولہ (۱۶) معتبر کتابیں لکھیں جن میں ایک 'کلیات فی الطب' ہے۔ یہ دواؤں کے عمومی اصولوں سے متعلق ہے۔ لاطینی میں اس کا ترجمہ 'Colliget' کے عنوان سے چھپا ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت، معیار اور افادیت کی بنا پر یورپ میں کئی بار شائع ہوئی۔

ابن کتینہ ایک بربری حکیم تھا۔ اس نے طاعون (plague) پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی اور وہ اس سے پہلے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں پر فوقیت حاصل کر گئی۔ اس کی پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں تدوین اور ترجمہ ہوا۔ اس کتاب میں طاعون (plague) کے متعدی مرض ہونے کا انکشاف کیا گیا اور علاج بھی بتایا گیا۔ اس سے قبل یونانی اطباء اس سے آگاہ نہیں تھے۔

ابن نفیس[1] قاہرہ میں منصوری ہسپتال کا منتظم تھا جو اس وقت دنیا کا بہترین ہسپتال تھا۔ ابن نفیس نے 'نظام دوران خون' (minor circulatory system) دریافت کیا۔ دائیں طرف کے دوران خون (پھیپھڑوں کے حوالہ سے) سے متعلق ابن نفیس کی تصانیف ولیم ہاروے[2] کی کتاب 'De Motu Cordis' (1628ء) سے پہلے کی ہیں۔ دونوں نظریات دوران خون کی وضاحت سے متعلق ہیں۔ دونوں مل کر گردش خون پر روشنی ڈالتی ہیں اور یہ قلبی افعال کی اولین اور بہترین مشرقی اور مغربی تحقیقات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ابن نفیس کی معروف ترین طبی تحریروں میں سے ایک کتاب 'جامع' کے عنوان سے تھی جو دس (۱۰) جلدوں پر مشتمل تھی۔

ابن مساویہ[3] نے دنیا میں سب سے پہلے آنکھوں کی امراض (ophthalmology) کی

---

[1]۔ ابوالحسن علاء الدین علی بن ابی الحزم المعروف ابن نفیس (1213ء-1288ء) مشہور مسلمان طبیب اور فلسفی تھے۔

[2]۔ William Harvey: ولیم ہاروے (1578ء-1657ء) ایک انگریز سائنسدان تھا جس نے خون کی گردش اور دل کے افعال پر کام کیا۔

[3]۔ Ibn Masawayh: یوحنا بن مساویہ (777ء-857ء) ایک نسطوری عیسائی طبیب اور بغداد کے ایک ہسپتال کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے متعدد موضوعات بشمول امراض چشم، بخار، دردِ سر، مالیخولیا، غذائیات اور طبی اقوال سے متعلق علمی مقالے لکھے۔

کتاب عشر مقالات فی العین (آنکھ پر دس مضامین) لکھی۔

(The Arabs, p.364)

(۳)۔ علم کیمیاء

علم کیمیا (Chemistry) کو بطور سائنس بلا شک وشبہ مسلمانوں نے متعارف کروایا۔ سائنس کے اس شعبہ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ خدمات سرانجام دیں اور اسے کاملیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچایا۔ مسلمانوں کو ان کی دریافتوں اور ان کے فہم کیمیاء کی وجہ سے سترہویں صدی تک سند سمجھا جاتا رہا ہے۔ جابر بن حیان[1] اور الرازی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انہیں عہدِ متوسط کے سب سے بڑے کیمیا دان کہا جاتا تھا۔

جابر بن حیان کو جدید کیمیاء کا باپ کہا جاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام مادوں (matters) کی ابتداء کا سراغ لگایا جائے تو وہ ایک سادہ سا ذرہ ہوگا جو چمک اور آگ پر مشتمل ہوگا اور مادے کی ناقابل تقسیم اکائی (unit) ہوگی۔

اس نے انیس (۱۹) عناصر دریافت کیے اور وزن مخصوص (measurements of specific weights) کی صحیح پیمائشیں کیں۔ متعدد کیمیائی تعامل (chemical processes) مثلاً عمل کشید (distillatiion) مائع کو قلموں کی شکل میں جمانا (crystallization) اور عمل تصعید (sublimation) کے تجربات کیے۔ وہ اس لحاظ سے بھی پہلا شخص تھا جس نے سرکہ (vinegar) کو عمل کشید کے ذریعے 'Acetic acid' میں تبدیل کیا۔ مادے کی محلول حالت سے اس کی اضافی حل پذیری یا عدم حل پذیری متعارف کروائی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے گلاس ٹیوبز اور بوتلیں بڑے پیمانے پر استعمال کیں اور اس نے اپنی تحقیق میں جانچ پڑتال کی اہمیت پر زور دیا تھا۔

---

[1]۔ Geber: ابوموسیٰ جابر بن حیان (721ء-806ء) تاریخ کا سب سے پہلا کیمیا دان اور عظیم مسلمان سائنسدان تھا۔ جس نے سائنسی نظریات کو دینی عقائد کی طرح اپنایا۔ دنیا آج تک اسے بابائے کیمیا کے نام سے جانتی ہے۔

اس نے کیمیا کے دو نہایت اہم تعاملات 'تکلیس'[۱] (calcination) اور 'تقلیل'[۲] (reduction) کی سائنسی طور پر وضاحت کی۔ اس نے عمل ہائے 'تبخیر' (evaporation)، 'تصعید' (sublimation)، 'تقطیر' (filtration)، 'کشید' (distillation) اور 'قلماؤ' (crystallization) کو نمایاں طور پر ترقی دی۔ سائنسی مؤرخ ہولمیارڈ[۳] اپنی کتاب 'Makers of Chemistry' میں کہتا ہے کہ جابر بن حیان کیمیائی تعامل کے دوران رونما ہونے والے تغیرات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ وضاحت کرتا ہے کہ دھاتوں کو کس طرح 'تکلیس' کے ذریعے آلائشوں سے پاک کیا جا سکتا ہے اور کن کن طریقوں سے دھاتوں کی تکلیس کی جا سکتی ہے۔

(Makers of Chemistry, p. 59)

جابر بن حیان نے کیمیائی مادے بشمول شنگرف 'cinnabar' (پارے کا سلفائیڈ) اور سنکھیا (arsenic oxide) تیار کرنے کے طریقے کی تفصیل بتائی۔ اس نے مرکری آکسائیڈ (mercury oxide) بنایا اور وہ خام سلفیورک ایسڈ (crude sulfuric acid) اور نائیٹرک ایسڈ (nitric acid) بنانے کے طریقوں سے خوب آگاہ تھا۔ ایسے کیمیائی مادوں پر اس کے مقالے کئی یورپی زبانوں بشمول لاطینی میں چھپے۔ جدید کیمیا نے جابر بن حیان کی وضع کردہ کئی سائنسی و فنی اصطلاحات کو اختیار کیا ہے۔ اس نے دھاتوں کی ارضیاتی تشکیل (geologic formation of metals) کا نظریہ بھی پیش کیا اور کیمیا کے بہت سے عملی اطلاقات بتائے۔ مثلاً دھاتوں کو مصفیٰ (refinement) کرنا، فولاد بنانا، کپڑے اور چمڑے کو رنگنا، کپڑوں کی وارنشنگ کرکے انہیں واٹر پروف بنانا اور مینگنیز ڈائی آکسائیڈ

۱۔ calcination: عمل تکلیس ایک کیمیائی عمل ہے جس میں ہوا یا آکسیجن میں بہت زیادہ درجے کی حرارت پہنچائی جاتی ہے جو 550-1150 ڈگری سینٹی گریڈ تک ہوتی ہے۔ اسے انتہائی ٹھوس مواد کی thermal decomposition کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ reduction: تقلیل، اس کیمیائی تعامل میں کسی چیز کے ایٹم میں سے آکسیجن کو ہٹا دیا جاتا ہے یا پھر ہائیڈروجن کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

۳۔ Eric John Holmyard: ارک جون ہولمیارڈ (1891ء-1959ء) ایک ماہر تاریخ دان برائے سائنس وفنون تھا۔ وہ ایک عرصہ تک مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی سرگرمیاں بھی سرانجام دیتا رہا۔

(manganese dioxide) کو شیشے رنگنے کے لیے استعمال کرنا۔ علاوہ ازیں اس نے مسودوں کے لیے سستی اور چمکیلی روشنائی (ink) تیار کرنے اور شیشہ سازی کے لیے مینگنیز ڈائی آکسائیڈ (manganese dioxide) کے استعمال کرنے کے طریقوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

(Makers of Chemistry, p. 59)

جابر بن حیان نے ایک نہایت نفیس وحساس (precise) ترازو بنایا جو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی صحیح وزن کرسکتا تھا۔ اس نے کیمیائی امتزاجوں (combinations) کو عناصر کے باہمی ارتباط سے تعبیر کیا اور انہیں ایسے اجزا (particles) قرار دیا جو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ 'محدب شیشے' کے بغیر نہیں دیکھے جاسکتے اور اتنے مہین ہونے کے باوجود اپنی خصوصیات برقرار رکھتے ہیں۔ اس نے یہ تصریحات جان ڈالٹن[1] سے دس صدیاں پہلے کی تھیں۔ اس نے نئی پیداواروں (products) کا تعین کیا۔ جن میں الکلیاں (alkalines)، تیزاب (acids)، نمکیات (salts)، روغنیات (paints) اور چکنائیاں (greases) شامل تھیں۔ اس نے گندھک کا تیزاب (Sulfuric acid)، نمک کا تیزاب (nitro-hydrochloric acid) بنائے (جنہیں وہ بعض دھاتوں کو حل کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا)۔ اسی طرح اس نے کاسٹک سوڈا (caustic soda) اور متعدد سالٹس (salts) تیار کیے۔ مثلاً سلفیٹس (sulphates)، نائیٹریٹس (nitrates)، پوٹاشیم (potassium) اور سوڈیم کاربونیٹس (sodium carbonates)۔ دھاتوں اور نمکیات پر اس کی تحقیق کی بنا پر بعد ازاں ڈھلائی کی طریقے (foundry techniques) اور ٹائلوں اور ظروف کو چمکانے کے نسخے تیار کرنے میں مدد ملی۔

(Introduction to Islamic Civilisation, p. 113)

جابر بن حیان کی وفات کے تقریباً ایک صدی بعد الرازی نے علم کیمیا کی بنیادیں استوار کیں۔ جن سے جدید دور میں بڑی مدد ملی۔ الرازی نے اپنی کتاب 'رازوں کا راز' (Secret of

[1]۔ John Dalton: جان ڈالٹن (1766ء-1844ء) ایک برطانوی ماہر کیمیا، ماہر طبیعیات اور ماہر موسمیات تھا جو جدید ایٹمی نظریہ کے لیے ابتدائی کام کرنے کی وجہ سے معروف ہوا۔

Secrets) میں اشیائے فطرت کی ایک نہایت مفید 'درجہ بندی' (classification) پیش کی۔ اس نے مادوں کو زمینی، نباتاتی اور حیوانی مادوں میں تقسیم کیا اور ان میں کچھ مصنوعی طور پر حاصل کردہ مادوں کو بھی شامل کیا۔ مثلاً لیڈ آکسائیڈ (lead oxide)، کاسٹک سوڈا (caustic soda) اور مختلف مخلوط دھاتیں (alloys)۔ آگے چل کر اس نے اپنے تجربات کی فہرست سازی اور توضیحات کیں۔ پہلے اس نے اپنے استعمال میں لائے گئے مواد (materials) کی وضاحت کی، پھر اوزار/ ساز و سامان (apparatus)، طریق کار اور تجربوں کے حالات پر روشنی ڈالی۔ الرازی نے (جدید مفہوم کی حامل) لیبارٹری قائم کی، ڈیزائننگ کی اور تفصیلات اکٹھی کیں اور بیس سے زیادہ آلات استعمال کیے۔

(Science and Technology in Islam, p. 79)

مسلمہ المجریطی[1] میڈرڈ (Madrid) میں رہنے والا ایک اندلسی تھا۔ اس کو اپنی ایک تصنیف 'رتبۃ الحکیم' (دانشوروں کے مراتب) کی وجہ سے شہرت ملی جس میں اس نے اور باتوں کے علاوہ قیمتی دھاتوں کے فارمولے اور ان دھاتوں کی تطہیر (purification) کے لیے بھی ہدایات دیں۔ المجریطی وہ پہلا شخص بھی تھا جس نے تحفظ مادہ (mass conservation) کے تصور کا ذکر کیا۔ یہ لیوائزیر[2] سے آٹھ صدیاں پہلے کی ایک اہم دریافت تھی۔

(۴)۔ علم الادویات

مسلم دنیا میں علم کیمیاء کی ترقی نے فن علم الادویہ (pharmacology) کو بھی فروغ دیا۔ الرازی نے اپنی تحریروں میں علم الادویات کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا اور کیمیائی

---

[1]۔ Maslama al-Majriti: مسلمہ المجریطی (950ء-1007ء) کا نام ابوالقاسم مسلمہ بن احمد ہے۔ المجریطی ماہر ریاضی دان تھے اور اندلس میں ریاضی دانوں کے امام کہلاتے تھے۔ علم فلکیات، کیمیا اور دیگر علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ کیمیا میں ان کی کتب رتبۃ الحکم اور غایۃ الحکیم بہت مشہور ہیں۔

[2]۔ Antoine-Lauret de Lavoisier: لیوائزیر (1743ء- 1790ء) ایک فرانسیسی کیمیا دان تھا۔ اسے اٹھارہویں صدی عیسوی کے کیمیائی انقلاب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ تاریخ کیمیا اور تاریخ حیاتیات پر بھی اس کے گہرے اثرات تھے۔ عوامی لٹریچر میں اسے بابائے جدید کیمیا قرار دیا گیا ہے۔

مرکبات کو علاج معالجے کے لیے استعمال کیا۔ اس کے پیشرو سابور بن سہل[۱] نے علم الادویات پر لکھنا شروع کردیا تھا جس میں اس نے مختلف بیماریوں کے علاج اور دواؤں کی بہت سی اقسام پر روشنی ڈالی۔ تقریباً ایک صدی کے بعد البیرونی[۲] نے علم الادویہ پر نہایت بیش قیمت کتاب 'کتاب الصیدانہ' لکھی جس میں دواؤں کے خواص کی مکمل معلومات تھیں۔ اس میں علم الادویات کے کردار اور دوا ساز کے کردار اور فرائض کا بھی ذکر تھا۔ ابن سینا نے تقریباً سات سو (۷۰۰) معجونیں اور دیگر مرکبات تیار کیے اور ان کی تیاری کے طریقے اور ان کے خواص اور فوائد و اثرات بتائے۔ دواؤں کے بارے میں بغداد کے ابن مساویہ اور سپین کے ابن الوافد[۳] کی تصانیف لاطینی زبان میں پچاس سے زائد بار شائع ہوئیں۔ ان کے لاطینی میں نام یہ تھے:

De Medicinis Universalibus by Mesue the, Younger

Medicamentis Simplicibus by Abenguefit.

(Science and Medicine in the Legacy of Islam)

الزہراوی نے عمل تصعید (sublimation) اور عمل کشید (distillation) کے ذریعے دوا سازی میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ اس کی کتاب 'Liber Servitoris' یہ بتاتی ہے کہ سادہ اور پیچیدہ دوائیں کیسے بنائی جاسکتی ہیں۔ الزہراوی نے مردہ سنگ[۴] (Litharge)، سفید سیسہ (white lead) کشتہ سیسہ (lead sulphide)، کشتہ تانبا (burnt copper)، کیڈمیا[۵]

۱۔ Sabur Ibn Sahl: سابور بن سہل (نویں صدی عیسوی) ایک ماہر علم الدویات تھا۔

۲۔ Abu Rayḥan Muhammad ibn Aḥmad Al-Biruni: ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (973ء-1084ء) ایک نامور مسلمان محقق اور سائنس دان تھے۔ البیرونی نے ریاضی، علم ہیئت، تاریخ اور جغرافیہ میں ایسی عمدہ کتابیں لکھیں جو اب تک پڑھی جاتی ہیں۔

۳۔ Ibn al-Wafid: ابن الوافد (997ء-1074ء) ایک ماہر طبیب اور علم الدویات تھا۔ اس کا تعلق ہسپانیہ کے شہر طلیطلہ (Toledo) سے تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تحقیقی کتاب کا نام کتاب الدویۃ المفردہ ہے۔

۴۔ Litharge لیڈ آکسائیڈ (PbO) کی قدرتی معدنی شکلوں میں سے ایک ہے۔

۵۔ کیڈمیا، زنک (جست) کا ایک آکسائیڈ ہے جو ان بھٹیوں کے اطراف میں جمع ہوجاتا ہے جن میں تانبا یا پیتل پگھلایا گیا ہو اور زنک بخارات میں بدل جاتی ہے۔

(cadmia)، مارکاسائیڈ (marcaside)، زرد سنکھیا (yellow arsenic)، چونا (lime) اور مختلف قسم کی پھٹکڑیاں (various vitriols)، نمکیات (salts) خام شورہ (natron) اور دیگر مادے تیار کرنے کی تراکیب بتائیں۔ اس نے مقطر اور کشید کردہ مصنوعات (علاوہ ازیں شراب) بھی تیار کیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں عمل کشید، بطور ذریعہ دوا سازی شروع ہو چکا تھا۔

(A History of Industrial Chemistry, p. 140-141)

ابوالمنصور الموفق[1] نے 'Foundations of the True Properties of Remedies' لکھی جس میں اس نے 'آرسینس آکسائیڈ' (arsenious oxide) اور 'سیلیسک ایسڈ' (silicic acid) پر روشنی ڈالی اور سوڈیم کاربونیٹ (sodium carbonate) اور پوٹاشیئم کاربونیٹ (potassium carbonate) میں امتیاز کیا۔ تانبہ کے مرکبات (copper compounds) کے زہریلے اثرات بالخصوص کاپروٹرائل (copper vitriol) کی طرف توجہ دلائی اور مرکبات پر بھی روشنی ڈالی۔ اس نے سمندر کے پانی کو پینے کے لیے میٹھے میں تبدیل کرنے کا طریقہ کشید کا بھی ذکر کیا۔

(*Makers of Chemistry, p. 68*)

'مارٹن لیوے'[2] کے مطابق مسلمانوں کی دوا سازی کی کتب نے نہایت احتیاط سے عملی تحقیق و تفتیش کے اصول اختیار کیے جو دوا فروشی اور علاج معالجہ کرنے والوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئے۔ لیوے اس نے دوا سازی میں مسلمانوں کی خدمات کا یوں ذکر کیا:

(i)۔ دوا سازی کی تراکیب: جن میں بہت سی اقسام کی دوائیں، گولیاں، دافع عفونت دھونیاں، سفوف، شربتیں، روغن، مالش کا تیل اور منجن تیار کرنا شامل ہیں۔

(ii)۔ زہریات (poisons) کی کتابیں لکھی گئیں۔

(iii)۔ بیماریوں کی علامات پر کتابیں جن میں طبی فوائد کے حامل پودوں کی فہرستیں ہیں۔ یہ حروف تہجی

---

[1]۔ Abu Mansur Muvaffak Harawi: ابومنصور الموفق ہروی (دسویں صدی عیسوی) کا ایک ماہر طبیب تھا۔

[2]۔ Martin Levey: مارٹن لیوے (1913ء-1970ء) امریکی تاریخ دان برائے کیمیا تھا۔

کی ترتیب سے بنائی گئی ہیں تا کہ قاری دوسری زبانوں میں بھی دوائیں شناخت کر سکیں۔

(iv)۔ جدول کے طور پر مرتب شدہ کتب جن کی وجہ سے طویل موضوعات مختصر ہو گئے اور وہ فوراً اور آسانی سے تلاش کیے جا سکتے تھے۔ جب کہ ان کے اقتباسات ویسا ہی کام دے سکتے تھے۔

(v)۔ مفرد دواؤں (Materia Medica) کی فہرستیں جن میں علاجیات وشفائیات سے متعلق مختلف مصنفین کی آراء، دواؤں کی تیاری اور اس شعبے میں متعلقہ مواد کی تفصیلات شامل ہیں۔

(vi)۔ دستیاب نہ ہونے والی دواؤں کی متبادل ادویہ بتا دی گئیں۔ میڈیکل سپیشلٹیز (medical specialties) پر کتابیں مہیا کر دی گئیں خواہ وہ الگ نسخے کی صورت میں ہیں یا دواؤں کی بڑے حجم کی انسائیکلو پیڈیاز کے حصے کے طور پر ہیں۔

(Early Arabic Pharmacology, p. 68-70)

(۵)۔ ریاضی

اسلامی دنیا نے آٹھویں صدی عیسوی سے ریاضیاتی علوم (Mathematics) میں نمایاں اضافے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے یونان اور ہندوستان کی ریاضیاتی پیش قدمیوں کو ملا جُلا کر اور اس میں اپنی پیش رفتوں کو بھی شامل کر کے اس علم کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اسلام نے چونکہ انسانی شکل کی مصوری ونمائش کی ممانعت کی تھی اس لیے مسلمانوں نے عمارتوں کی تزئین و آرائش کے لیے پیچیدہ اقلیدسی اشکال (complex geometric patterns) کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ اس کے نتیجے میں ریاضی ایک ہنر (art) بن گیا۔

810ء کے آس پاس بغداد میں قائم ہونے والے بیت الحکمہ نے یونان اور ہندوستان کی ریاضی کی ضخیم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ نویں صدی میں ذہین ریاضی دان الخوارزمی بیت الحکمہ کا اولین مہتمم (Rector) تھا۔

الخوارزمی جس کا نام لاطینی زبان میں 'الگورتمی' (Algoritmi) لیا جاتا تھا، نے ریاضی کے فروغ میں زبردست کردار ادا کیا اور الجبرا اور علم مثلثات (Trignometry) میں اختراعات کی بنیاد رکھ دی۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف 'الکتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ'

(The Compendious Book on Calculation by Completion and Balancing)

ریاضی کی کتاب ہے جو لگ بھگ 830ء میں لکھی گئی تھی۔ 'الجبرا' کی اصطلاح مساوات کے بنیادی طریق ہائے کار میں سے ایک سے ماخوذ ہے جو الخوارزمی نے اپنی کتاب 'الجبر' میں بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب 'سابقہ حالت پر واپس لانے کا عمل' (restoration) ہے۔ وہ اس طرح کہ مساوات کی دونوں جانب ایک عدد کا اضافہ کر دیا جاتا ہے تا کہ رقموں کو تقویت دی جائے یا منسوخ کر دیا جائے۔ اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ رابرٹ چسٹر[1] اور گیراڈ آف کریمونا نے Liber algebrae et almucabala کے نام سے کیا۔ کتاب نے کثیر رقمی مساواتوں کو سیکنڈ ڈگری تک حل کرنے کا ایک جامع طریقہ پیش کر دیا۔ تقلیل کرنے اور متوازن (balancing) کرنے کے بنیادی طریقوں پر بحث کی۔ الخوارزمی نے خطی اور چوکور مساواتوں کو بھی حل کیا۔

(The Arabic Hegemony, p. 252)

یونانی تصور ریاضی سے ہٹ کر الجبرا کا آغاز ایک انقلابی اقدام تھا جو اساسی طور پر اقلیدسی (geometrical) تھا۔ الجبرا ایک وحدانی نظریہ تھا جو عددِ ناطق (rational numbers)، عددِ غیر ناطق (irrational numbers) اور اقلیدسی مقداروں (geometrical magnitudes) کو الجبری اعداد کے طور پر لانے کا متقاضی تھا۔ اس نے ریاضی کو نہ صرف کلی طور پر نئی جہت دے دی (جو پہلی جہت سے بہت ہی وسیع تھا) بلکہ اس نے اس مضمون کو مستقبل میں ترقی دینے کے لیے ایک آلہ بھی مہیا کر دیا۔ الخوارزمی نے تقلیل (reduction) اور متوازن (balancing) کے لیے بنیادی الجبرائی طریقے متعارف کرائے اور کثیر رقمی مساوات کو سیکنڈ ڈگری تک حل کرنے کے لیے ایک جامع طریقہ مہیا کر دیا۔ اس طرح اس نے ایک طاقتور تجریدی ریاضیاتی زبان تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ زبان اب بھی پوری دنیا میں استعمال ہوتی ہے اور اس نے ریاضی کے قضیات (mathematical

---

[1] Robert of Chester: رابرٹ چسٹر بارہویں صدی کا ماہر مترجم تھا جس نے خوارزمی اور جابر بن حیان کی عربی کتب کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

problems) کا تجزیہ کرنے کا بہتر طریقہ فراہم کردیا ہے۔

الخوارزمی کی دوسری بڑی تصنیف 'کتاب الجمع والتفریق بحساب الہند' تھی جو اندازاً 825ء میں لکھی گئی۔ اس کتاب نے پورے مشرق وسطیٰ اور یورپ میں ہندوعربی نظامِ ہندسہ پھیلا دیا۔ اس کا لاطینی زبان میں نام 'Algorithmi de numero indorum' ہے۔ الخوارزمی کا لاطینی زبان میں نام 'الگورتھمی' تھا۔ اسی سے 'الگورتھم' کی اصطلاح وجود میں آئی۔ ریاضی کے لیے اس کا اہم ترین کردار یہ تھا کہ اس نے ہندوعربی نظامِ اعداد (9-1 اور O) کی ترویج کے لیے پرزور وکالت کی۔ جس نے ہندوستانی ریاضی کی شکل اختیار کرلی۔ اسے اس نے ایسی قوت اور صلاحیت قرار دیا جس سے ریاضی میں انقلاب آسکتا ہے۔ اسے پوری دنیا نے اختیار کرلیا۔ اس کی کتاب 'زج سند ہند' (Zij al-Sindhind) میں بھی sines اور cosines کے مثلثاتی تفاعل کے پیمانے (tables) موجود تھے۔ اس کی طرف 'کروی مثلثات' (Spherical trignometry) کی ایک کتاب بھی منسوب ہے۔

الکرجی[۱] نے الجبرا کو اس کے اقلیدسی (geometrical) ورثے سے آزاد کرا کر اور نظریۂ الجبری علم الاحصاء (Algebric calculus) متعارف کرا دیا۔ اس طرح الجبرا کی سرحدیں مزید آگے دھکیل دی گئیں۔

الکرجی اپنے حاصل کردہ نتائج ثابت کرنے کے لیے ریاضیاتی استقراء (mathematical induction) کا طریقہ استعمال کرنے والا پہلا شخص تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ اگر اعداد صحیحہ کا ایک مجموعہ پہلے عدد صحیح تک درست ہے تو اسے زیر بحث عددِ صحیح کے معاملے میں بھی درست ہونا چاہیے۔ بہ الفاظ دیگر اعداد کے دیئے گئے مجموعے کا ثبوت پہلے عدد صحیح تک درست ثابت کر کے یہ ثابت کردیا کہ اگر یہ سابقہ اعدادِ صحیح کے معاملے میں درست ہے تو اسے زیر بحث عددِ صحیح کے معاملے میں بھی درست ہونا چاہیے۔ اس نے 'ثنائی مسئلے' (Binominal theorem) کو ثابت کرنے کے لیے ریاضیاتی استقرا (mathematical induction) کو استعمال کیا۔ یہ ایک فارمولا ہے جس کی مدد سے کسی بھی دوعددی جزو کے اضعاف کے بغیر کسی

[۱] ابوبکر بن محمد بن الحسین الکرجی (953ء-1029ء) ایک ماہر ریاضی دان اور انجینیر تھے۔

تفصیلی حساب کے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ یہ صرف جمع تفریق ضرب اور مثبت عددِ سالم کے اوپر لگی ہوئی علامت یا نشانی (جو یہ ظاہر کرے کہ اس کی کتنے درجے کی قوت ہے) سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً (Y+X)۔ عددی سروں (Co-efficients) کی اس وقت ضرورت پڑتی ہے جب ایک دو رقمی (binomial) کو پھیلا کر متشاکل مثلث بنایا جائے۔ اسے عام طور پر 'پاسکل ٹرائینگل' (Pascal's Triangle) کہا جاتا ہے۔ یہ سترہویں صدی عیسوی کے ایک ریاضی دان بلز پاسکل[1] سے منسوب ہے۔ اگرچہ دیگر ریاضی دانوں نے اس کا صدیوں پہلے مطالعہ کیا تھا جن میں الکرجی بھی شامل تھا۔

عمر خیام[2] نے بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جذر اور جذر الکعب نکالنے کے ہندوستانی طریقوں کی تعمیم (generalized) کر کے اس میں چوتھی، پانچویں اور اس سے بڑی بڑی جذریں شامل کر لیں۔ اس نے مکعبی قضیوں (cubic problems) کا باضابطہ تجزیہ کر کے انکشاف کیا کہ دراصل مساوات (equations) کی بہت سی مختلف اقسام ہیں۔ اس نے 1070ء میں ایک نہایت ذی اثر کتاب

'Treatise on Demonstration of Problems of Algebra'

لکھی جس میں الجبرا کے اصول مرتب کیے گئے تھے جو آخر کار یورپ پہنچ گئے۔ خاص طور پر اس نے مکعبی مساوات کے سوال حل کرنے کے عمومی طریقے وضع کر لیے حتیٰ کہ انہیں اعلیٰ درجوں تک پہنچا دیا۔ اس کتاب میں اس نے دو رقمی مقداروں (binomical coefficients) کی مثلثی ترتیب پر روشنی ڈالی جو آگے چل کر پاسکل کی مثلث کہلانے لگی۔ 1077ء میں خیام نے 'شرح ما اشکل من مصادرات کتاب اقلیدس' لکھی جس کا انگلش میں ترجمہ 'On the Difficulties of Euclids Definitions' کے نام سے کیا گیا۔

---

[1]۔ Blaise Pascal: بلیز پاسکل (1623ء-1662ء) ایک فرانسیسی ریاضی دان طبعیات دان، موجد، مصنف اور مسیحی فلسفی تھا۔ اس نے مائعات پر تحقیقات کیں اور دباؤ اور خلا کے تصورات کو واضح کیا۔ اس نے کیلکو لیٹر پر بھی کام کیا۔ مکینیکل کیلکو لیٹر کے پہلے دو موجدوں میں سے ایک تھا۔

[2]۔ عمر خیام (1048ء-1131ء) علم ہیئت اور علم ریاضی کا بہت بڑا فاضل تھا۔ شعر وسخن میں بھی اس کا پایا بہت بلند ہے۔

طوسی[1] علم المثلثات (trigonometry) کو ایک الگ ریاضیاتی شاخ کے طور پر لینے والا پہلا شخص تھا جو فلکیات سے غیر مماثل ہے۔ مثلث میں حادہ زاویئے کے تفاعل (sine) پر یونانی اور ہندوستانی تحریروں کو توسیع دیتے ہوئے کروی مثلثیات (spherical trignometry) کی اولین وسیع تشریح کی۔ جس میں کروی مثلثیات میں قائمۃ الزاویہ مثلث کے چھ واضح غیر مماثل کیسوں کی فہرست شامل تھی۔ ریاضی میں اس کی گرانقدر خدمات میں ایک خدمت یہ تھی کہ اس نے مستوی مثلثوں کے حادہ زاویوں کے تفاعلات (sines) کے مشہور قانون کی تشکیل کی:

(Sin C)/c=(Sin B/b=(Sin A)/a

اگرچہ کروی مثلثوں کے لیے 'sine law' دسویں صدی عیسوی کے ایرانی عالم ابوالوفا[2] اور ابو نصر منصور[3] دریافت کر چکے تھے۔

ثابت ابن قرا[4] نے ایک عام کلیہ وضع کیا جس سے اعداد متحبہ (Amicable) اخذ کیے جا سکتے تھے۔ یہ ایسے اعداد کا جوڑا ہیں جن کے لیے ایک عدد کے تقسیم کنندوں کا حاصل جمع دوسرے عدد کے مساوی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 220 کے صحیح تقسیم کنندے 1، 2، 4، 5، 10، 11، 20، 22، 44، 55 اور 110 ہیں۔ 284 کے صحیح تقسیم کنندے 1، 2، 4، 71 اور 142 ہیں

---

[1] ۔خواجہ محمد بن محمد بن حسن طوسی (1201ء۔1274ء) المعروف محقق طوسی ایک عالم، شاعر اور سائنسدان تھا۔

[2] ۔ابوالوفاء ایک عظیم ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا جس نے بے شمار کتابیں لکھیں اور یونانی زبان سے عربی زبان میں ریاضی کی کتب کا ترجمہ بھی کیا۔

[3] ۔ابونصر منصور بن علی بن عراق (970ء-1036ء) ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ ان کی کتب رسالہ فی اصلاح شکر من کتاب منلاوس فی الکریات، المجسطی الشاہی اور الدوائر التی تحد الساعات الزمانیہ ہیں۔

[4] ۔Thabit ibn Qurra: ثابت بن قرا (826ء- 901ء) ایک عرب ریاضی دان، ماہر طب وفلکیات اور مترجم تھا۔ فلکیات میں اسے بطلیموسی نظام کے اولین مصلحین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابن قرا مکینیات کی ایک شاخ سکونیات کا بانی تھا۔

جن کا حاصل جمع 220 ہے۔ اس کلیے کو بعد میں بہت دیر سے فرمیٹ[1] اور ڈیکارٹ[2] دونوں نے از سر نو دریافت کیا۔

ابوالہیثم نے بصریات، طبیعیات، الجبرا اور جیومیٹری کے درمیان ربط قائم کرنے پر عظیم الشان کام کرنے کے علاوہ ایک ایسا طریقہ بھی وضع کیا جسے اب 'مسئلہ ابن الہیثم' (Alhazen's problem) کہا جاتا ہے۔ آخر کار اس نے اسے 'چوتھی قوتوں' کے مجموعے کا فارمولا اخذ کرنے کی طرف رہنمائی کی۔ جبکہ اس سے پہلے صرف مربعوں اور مکعبوں کے مجموعے کے فارمولے بیان کیے گئے تھے۔ اس کے طریقے کو فوری تعمیم (generalized) کر کے اعدادِ صحیح کی قوتوں کے حاصلِ جمع کا فارمولا تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس نے انٹیگرل پاورز (integral powers) کے حاصل جمع کے اپنے نتیجے کو اس کام کے لیے استعمال کیا جسے انٹیگریشن (integration) کہا جاتا ہے۔ جس میں سالم مربعوں اور 'چوتھی قوتوں' کے حاصل جمع کے فارمولوں نے اس کے لیے 'مکافی مجسم' (paraboliod) کے حجم کو شمار کرنے میں آسانی پیدا کر دی۔

ابو کامل[3] نے الجبرا پر کتاب لکھی۔ یہ کتاب مربع مساواتوں کے حل الجبرا کے جیومیٹری پر اور دیا فنطسی تحلیل (diophantine equations) کی مساوات پر اطلاق سے متعلق ہے۔ اسے پہلا ریاضی دان سمجھا جاتا ہے جس نے غیر منطقی اعداد کو بطور حل اور مساوات کے 'عددی سر' (coefficients) کے طور پر استعمال اور قبول کیا۔ اس کے ریاضیاتی طریق کار کو بعد ازاں

---

[1] ۔Pierre de Fermat: پائری ڈی فرمٹ (1601ء-1665ء) ایک فرانسیسی قانون دان اور ریاضی دان تھا۔ اس نے تجزیاتی جیومیٹری امکانیات اور بصریات میں قابل ذکر تحقیق کی۔

[2] ۔Rene Descartes: رینے ڈیکارٹ (1596ء-1650ء) ایک فرانسیسی سائنسدان اور ریاضی دان تھا جس نے ریاضی میں Analytic geometry میں نمایاں کام کیا۔

[3] ۔ابو کامل شجاع بن اسلم بن محمد بن شجاع الحاسب (850ء-930ء) ایک مصری انجینئر اور حساب دان تھا۔ اسے خوارزمی کے بعد سب سے بڑا حساب دان مانا جاتا ہے۔ وہ تیرہویں صدی عیسوی تک یورپ کے سائنسدانوں کے لیے ریفرنس رہا۔

اطالوی ریاضی دان فبیو ناشی[1] نے اختیار کیا اور اس قابل بنایا کہ وہ یورپ کو الجبرا سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کرے۔ وہ پہلا مسلمان ریاضی دان تھا جو الجبرائی مساوات کو بہ آسانی ’X2‘ (تا X 8) حل کرتا ہے اور وہ ’غیر مخطط ہمزاد مساوات (non-linear simultaneous equations) کو تین متغیرہ مقداروں کے سیٹ حل کر سکتا تھا۔ اس نے سب قضیوں کو خطیبانہ انداز میں لکھا اور اس کی بعض کتابوں میں ریاضیاتی ترقیم موجود نہیں۔ مثال کے طور پر وہ (X5(i.e،X2X2X کے لیے عربی اظہار ’مل مل شئے‘(mal mal shay) (مربع مربع چیز) استعمال کرتا ہے۔ اس نے الخوارزمی کی تصانیف کی اصلاح کی اور جیومیٹری کو حروف تہجی کے طور پر مرتب کیا۔ اس کی تحقیق میں چوکور مساوات ’ضرب‘ الجبرائی مقداریں اور جذروں کی جمع اور منفی بھی شامل ہیں۔

(۶)۔ علم فلکیات

علم فلکیات خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں شروع ہوا۔ یہ ’سریا سدھانتا‘[2] سے بہت متاثر تھا جو ہندوستان سے بغداد لائی گئی اور اس کا محمد بن ابراہیم الفزاری[3] اور الخوارزمی نے عربی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں عہد ساسانی میں مرتب کردہ پہلوی جدول کے گوشواروں (Pahlavi tables (zij)) اور یونانی علم فلکیات کی کتب کے عربی زبان میں تراجم کیے گئے۔ بطلیموس کی تصنیف الماجسٹ[4] کے بھی عربی میں کئی تراجم ہوئے۔

---

[1]۔ Leonardo Pisano Bigollo: لیونارڈو بوناکسی (1170ء۔1250ء) المعروف فبیو ناشی ایک اطالوی ریاضی دان تھا۔ وہ عہد متوسط کا ایک نہایت ذہین ریاضی دان شمار ہوتا تھا۔ اس نے مغربی دنیا میں ہندوعربی شماریاتی نظام متعارف کروایا۔

[2]۔ Surya Siddhanta: سُریا سدھانتا ہندوستانی علم فلکیات کے متعلق متعدد مقالوں کا نام ہے۔ اس میں روشنی پھیلانے والی چیزوں کی حرکات کا تعین کرنے کے قواعد بیان کئے گئے ہیں جو آسمان میں ان کے حقیقی مقامات کی تصدیق کرتے ہیں۔

[3]۔ محمد ابن ابراہیم انفزاری ایک مسلمان فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔

[4]۔ Al-magest: الماجسٹ دوسری صدی کا ریاضیاتی اور فلکیاتی مقالہ ہے جو ستاروں کی ظاہری حرکات اور سیاروی راستوں کے بارے میں ہے۔ یہ رومن عہد کے مصری سکالر بطلیموس نے یونانی زبان میں لکھا۔

الخوارزمی نے فلکیات پر ایک گرانقدر مقالہ لکھا اور اپنے گوشوارے (zij) مرتب کیے جن پر دو صدیوں کے بعد ایک سپینی ماہر فلکیات مسلمہ المجریطی نے نظر ثانی کی اور اڈیلارڈ آف باتھ[1] نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کر دیا۔ یہ گوشوارے بعدازاں فلکیاتی سرگرمیوں کی بنیاد بنے جبکہ یونان اور ہندوستان کے فلکیات کے تمام یونانی گوشوارے کی جگہ نئے گوشوارے نے لے لی۔

مامون الرشید[2] نے اپنی سلطنت میں متعدد مقامات پر جدید ترین آلات سے لیس رصدگاہیں قائم کر رکھی تھیں جن سے سورج کے نقاط اعتدالین (equinoxes)، گہن، دمدار سیاروں کا ظہور اور دیگر آسمانی مظاہر دیکھے جا سکتے تھے۔ زمین کا حجم بحر احمر کے ساحلوں سے ایک زاویہ ناپنے سے معلوم کر لیا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپ پوری دل جمعی سے زمین کے چپٹی ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا۔

ابوالحسن کا دوربین ایجاد کرنا فلکیاتی مشاہدات کی طرف نہایت اہم قدم تھا۔ الخوارزمی کی کامیابیوں میں سے اہم ترین کامیابی ارض پیمائی کے سلسلے میں تھی۔ یہ زمین کے حجم اور اس کے محیط کے تعین کا طریق کار تھا۔ زمین ناپنے کا عمل میدانِ 'سنجر' (ایران) اور 'پامیرا' (شام) میں کیا گیا۔ اس کا حاصل نتیجہ 3256 عربی میل نکلا جو سماوی نصف النہار کے ایک درجے کی لمبائی تھی۔ یہ حیرت انگیز طور پر ایک صحیح نتیجہ تھا۔ یہ اس جگہ کے درجے کی حقیقی لمبائی سے تقریباً 2877 فٹ زیادہ تھا۔ اس پیمائش نے وہ تخمینہ مہیا کر دیا جو زمین کے قُطر کی لمبائی 6500 میل ظاہر کرتا تھا جبکہ اس کا محیط 20,400 میل بنتا تھا۔ یہ حالیہ جدید پیمائش (values)، 111.3 کلومیٹر فی درجہ قطر اور 40,068 کلومیٹر محیط کے بہت قریب تھا۔

(Mathematical Geography, p. 187 - 188)

---

[1] ـ Adelard of Bath: اڈیلارڈ (1080ء-1152ء) انگلش فلاسفر تھا۔ اس کی وجہ شہرت عربی زبان سے لاطینی اور جرمن میں کتب کے ترجمہ کرنے سے ہے۔

[2] ـ مامون الرشید بن ہارون الرشید (786ء - 833ء) ساتواں عباسی خلیفہ تھا۔ اس کی دانائی، عزم، بردباری، علم دوستی، رائے، تدبیر، ہیبت، شجاعت، عالی حوصلگی اور فیاضی کی وجہ سے علم کے مختلف شعبہ جات نے بہت ترقی کی۔

جابر بن سنان البتانی[1] ایک ممتاز ماہر فلکیات تھا۔ اس کے گوشواروں (tables) کے ترجمے نے کئی صدیوں تک یورپ کو فلکیاتی تحقیقات کے لیے ایک بنیاد فراہم کی۔

اس نے سورج کے حلقہ نما گرہنوں (annular eclipses) کا امکان ثابت کیا اور دائرۃ البروج کی خمیدگی، مداری سال (tropical year) کی طوالت، موسموں کے اختتام اور سورج کے بیضوی مدار کی اوسط کا نہایت درستی سے تعین کیا۔ فلکیات میں البتانی کے کارہائے نمایاں میں سے ایک شمسی سال کے دورانیے کا صحیح تعین تھا جو 365 دنوں، 5 گھنٹوں، 46 منٹوں اور 24 سکینڈوں پر مشتمل نکلا۔ اس نے بطلیموس کے اخذ کردہ نتائج کو درست کیا اور سورج اور چاند کے نئے گوشوارے (tables) مرتب کیے جو طویل عرصے تک مستند مانے جاتے رہے۔ اس کی بعض پیمائشیں کاپرنیکس[2] کی لی ہوئی پیمائشوں سے بھی زیادہ درست نکلیں جو کئی صدیاں بعد لی گئی تھیں۔ البتانی کی کتابیں مغرب کی سائنس اور فلکیات کے ارتقاء کے لیے نہایت اہم ذریع سمجھی جاتی ہیں۔ کاپرنیکس، البتانی کے تحقیقی کام کا اتنا معترف تھا کہ اس نے اپنی کتاب De Revolutionibus orbium coelestium میں اس کا 23 بار حوالہ دیا۔ البتانی کا ذکر 'Commentariolus'[3] میں بھی آیا ہے۔ جان کیپلر اور گیلیلیو[4] نے اس کے بعض مشاہدات میں دلچسپی لی اور اس کا معلوماتی مواد (observational data) جیوفزکس (geophysics) میں آج تک استعمال ہو رہا ہے۔

(Dictionary of Scientific Biography, Vol.1, p. 507-516)

---

[1] ۔Albategnius: جابر بن سنان البتانی (858ء-929ء) کا شمار دنیا کے عظیم ترین فلکی سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ وہ اہم نظریات ہیں جو انہوں نے اس میدان میں وضع کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جبر، حساب اور مثلثات میں بھی کافی نظریات متعارف کروائے۔

[2] ۔Nicolaus Copernicus: نکولس کاپرنیکس (1473ء-1543ء) ایک معروف ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔ اس نے پہلی دفعہ زمین کی بجائے سورج کا کائنات کے مرکز ہونے کا نظریہ پیش کیا۔

[3] ۔Commentariolus چالیس صفحات پر مشتمل نظام اجرام فلکی کے بارے میں ایک مختصر خاکہ ہے جس میں اجرام فلکی کا مرکز زمین کی بجائے سورج قرار دیا گیا ہے۔

[4] ۔Galileo Galilei: گیلیلیو (1564ء-1642ء) ایک اطالوی ماہر فلکیات اور فلسفی تھا جس نے اشیا کی حرکات، دوربین، فلکیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ اسے جدید طبیعیات کا باپ کہا جاتا ہے۔

البیرونی کی کتاب 'القانون المسعودی' علم فلکیات کی قاموس (encyclopedia) ہے جس میں البتانی کے مشاہداتی مواد (observational data) کو بطلیموس کے 'ساکت شمسی اوج' (immobile solar apogee) کو رد کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے گرہن کی معلومات (observational data) کو 1749ء میں 'رچرڈ ڈنتھورن'[1] نے چاند کے اسراع (acceleration) کے تعین میں مدد کے لیے استعمال کیا۔ اس کا مشاہداتی مواد (observational data) ڈیٹا وسیع تر فلکیاتی تاریخی ریکارڈ میں شامل ہو گیا اور آج بھی جیوفزکس (geophysics) اور فلکیات میں استعمال ہوتا ہے۔

(Historical Eclipses and Earthis Rotation, p. 431)

ملک شاہ سلجوقی[2] نے نیشاپور میں (1974ء یا 1975ء) میں ایک رصدگاہ قائم کی جہاں عمر خیام اور ابو الفتح الخازنی[3] نے ایسے فلکیاتی مشاہدات کیے جن کی بنا پر عیسوی تقویم (Gregorian calendar) سے 600 سال قبل ایک اصلاح شدہ کیلنڈر وجود میں آ گیا تھا۔ اس کیلنڈر کو 'التاریخ جلالی'[4] کہا جاتا تھا۔ یہ مدارینی سال (tropical year) کی طوالت کے بالکل صحیح تعین پر مبنی ہے۔ عیسوی کیلنڈر (Gregorian calendar) 3,330 سالوں میں ایک دن کی غلطی دکھاتا ہے جبکہ خیام کا التاریخ جلالی کیلنڈر 5000 سال میں ایک

---

[1]۔ Richard Dunthorne: رچرڈ ڈنتھورن (1711ء-1775ء) ایک برطانوی ماہر فلکیات اور مساحت کار تھا جو کیمبرج میں کام کرتا تھا۔

[2]۔ I-Malik Shah : ملک شاہ اول سلجوق (1055ء-1092ء) سلجوقی سلطنت کا تیسرا حکمران تھا جو اپنے والد الپ ارسلان کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا اور 1072ء سے 1092ء تک حکمران رہا۔

[3]۔ Al-Khazini: ابوالفتح عبدالرحمن ابوجعفر الخازنی (گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی) کے ایک عظیم سائنسدان ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام میزان الحکمہ ہے جس میں تمام پیمانے جمع کیے گئے اور وزن کی وجوہات بیان کی گئیں ہیں۔ الخازنی نے فزکس اور میکینکل میں بھی کام کیا اور فلکیاتی ٹیبل بھی بنائے۔ ہوا اور پانی میں اجسام کا وزن کرنے کے لیے خاص پیمانے بنائے۔

[4]۔ تاریخ الجلالی المعرف جلالی کیلنڈر دراصل ایرانی قدیم شمسی کیلنڈ کی نئی شکل ہے جسے عمر خیام اور اسکے ساتھیوں نے سلطان جلال الدین ملک شاہ اول سلجوقی کے کہنے پر بنایا تھا۔ سلطان جلال الدین کے نام پر کیلنڈر کا نام جلالی تقویم کیلنڈر رکھا گیا تھا۔

دن کی غلطی گنجائش ہے۔

سمرقند میں ایک فلکیاتی کیلنڈر 'تقویم الغ بیگ'[1] 1437ء میں مرتب کیا گیا۔ یورپ میں اسے بہت پسند کیا گیا اور اٹھارہویں صدی میں انگلستان میں اسے شائع کیا گیا۔ فلکیات کے شعبے میں مسلمانوں کی خدمات ستاروں کے ناموں سے عیاں ہیں۔ کئی ستاروں کے سرکاری نام اور فلکیات کی فنی اصطلاحیں ان کے عربی مخرج سے وضع کی گئی ہیں۔ ان کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(The Arabs, p.572 - 573)

ستاروں کے نام

ستاروں کے نام/فنی اصلاح	عربی ماخذ
عقرب (Acrab)	عقرب
الگیدی (Algedi)	الجدی - دادا
الطائر (al-Ta'ir)	الطیر - اڑنے والا
دینب (Deneb)	ذنب - دم
فرقد (Pherkad)	فرقد - بچھڑا
نادر (Naadir)	نذیر - مبلغ

علم فلکیات میں عربوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے رابرٹ بریفالٹ نے کہا:

> Arab astronomy did not forestall Copernicus or Newton, though without it there would have been no Copernicus and Newton.
>
> (*The Making of Humanity, p. 190*)

(اگرچہ عرب ماہرین فلکیات نے کاپرنیکس یا نیوٹن کی پیش بینی نہیں کی تھی لیکن اس کے بغیر کوئی کاپرنیکس اور نیوٹن نہ ہوتا)

علم فلکیات میں عرب دانشوروں نے بہت پیش رفت کی تھی جس کے نتیجے میں نظام بنے اور وہ

[1] مرزا الغ بیگ (1394ء - 1449ء) ایران کی تیموری سلطنت کا تیسرا حکمران اور امیر تیمور کا علم دوست پوتا تھا جو 1447ء سے 1449ء تک حکمران رہا۔ سمرقند کی گورنری کے دوران اس نے ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کی۔

آج تک موجود ہیں۔

(۷)۔ جغرافیہ

مسلمانوں نے جغرافیے میں بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ مسلمان جغرافیہ دانوں کی دریافتوں (innovations) کا آغاز ان کی جانب سے زمین کے گول ہونے کا ثبوت لانے سے ہوا۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ زمین 'دائرہ نما چیز' (circular object) ہے اور تمام اطراف سے پانی سے گھری ہوئی ہے۔ سلطنت روما نے اس تصور کو رد کر دیا۔ بعد میں مسیحی کلیسا اور ان کے آباؤ اجداد نے 'لاکتانتیوس'[1] کی زیر قیادت زمین کے دائرہ نما چیز ہونے کے نظریئے کو شدت کے ساتھ اختیار کر لیا۔ مسیحی کلیسا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین چپٹی ہے جبکہ اس کا دوسرا رخ غیر آباد ہے، ورنہ لوگ خلا میں جا گرتے۔ مسلمانوں نے زمین کی گولائی کا نظریہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ابن خرداد بہ[2] اور الادریسی[3] نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ''زمین گیند کی طرح گول ہے۔ پانی بھینچ کر اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور قدرتی طور پر اس کے اوپر اور تسلسل کے ساتھ رہتا ہے۔ زمین اور پانی دونوں کائنات میں اس حالت میں رہتے ہیں جیسے انڈے کے اندر سفیدی اور زردی رہتے ہیں۔ وہ مرکز میں موجود رہتے ہیں اور انہیں تمام اطراف سے ہوا (فضا) نے گھیرا ہوا ہے۔

(Nozhat Al Mushtak fi Ikhtrak Al-Afak, p. 7)

الادریسی نے دنیا کے نقشے بنائے۔ یہ عہد متوسط میں نقشہ نگاری کے سب سے بڑے نقشے تھے جو مکمل ترین، صحیح ترین اور مفصل نقشے تھے۔ اتنے جامع و مفصل نقشے دنیا میں پہلی بار وجود میں آئے تھے۔ بیشتر مسلم سائنسدانوں کی طرح الادریسی نے زمین کے گول ہونے کا ادّعا کیا اور

---

[1]۔ Lucuis caecilius firmiamus lactanius: لاکتانتیوس (250ء-325ء) ایک مسیحی مصنف تھا جو بعد میں پہلے مسیحی رومن بادشاہ قسطنطین اول کا ایک مشیر بن گیا۔

[2]۔ ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ بن خرداد بہ (820ء - 912ء) خلافت عباسیہ کا ایک انتظامی جغرافیہ دان، بیوروکریٹ اور مصنف تھا۔

[3]۔ الادریسی (1099ء-1154ء) ایک اندلسی عرب نقشہ نویس، جغرافیہ دان اور سیاح تھا۔

کہا کہ یہ حقیقت نا قابل تردید ہے۔

(The Story Of Civilization, Vol. 13. p. 358.)

مسلمانوں نے زمین کی گولائی کا دعویٰ کاپرنیکس سے بہت پہلے کر دیا تھا۔ الادریسی نے سسلی کے نارمن بادشاہ راجر دوئم[1] کے لیے ایک جدول 'نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق'[2] تیار کی۔ اس نے یہ جدول دربار میں قیام کر کے اٹھارہ سال میں مکمل کی۔ جہاں وہ دن رات نقشہ سازی اور توضیحات نگاری میں مصروف رہتا۔ اس کے نقشوں نے کولمبس[3] اور واسکوڈے گاما[4] کے بحری اسفار میں ان کی بڑی مدد کی۔

مامون الرشید نے زمین کے ابعاد (dimensions) کی پیمائش کا فیصلہ کیا اور یہ کام فلکیات دانوں اور جغرافیہ دانوں کی دو جماعتوں کے سپرد کیا۔ ان جماعتوں کو دو مختلف اطراف، ایک کو مشرق اور دوسری کو مغرب کی جانب بھیجا۔ پھر انہیں طول البلد کا ایک درجہ (ان خطوط کی کل تعداد 360 ہوتی ہے) ناپنے کے لیے کہا۔ ان دو جماعتوں کی اوسط پیمائش تقریباً 56.66 میل نکلی جبکہ موجودہ سائنس کی اوسط پیمائش 56.93 میل ہے۔ ان دو جماعتوں نے قطر (موٹائی) کی بھی پیمائش کی جو تقریباً 41,248 کلومیٹر ہے جب کہ اس وقت کے حساب سے یہ 40,070 کلومیٹر ہے۔ یعنی مامون الرشید کی جماعتوں کی پیمائش میں غلطی 3 فیصد سے زیادہ نہیں۔

(Treasures of Astronomy, p. 25)

۱۔ Roger II: راجر دوئم (1099ء–1154ء) سسلی کا بادشاہ تھا۔

۲۔ Tabula Rogeriana: نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق دنیا کی معلومات اور نقشہ جات پر مشتمل کتاب ہے جسے مشہور مسلمان جغرافیہ دان الادریسی نے تیار کیا۔

۳۔ Christopher Columbus: کرسٹوفر کولمبس (1451ء–1506ء) ایک بحری مہم جو تھا جس نے 1492ء میں امریکہ کو دریافت کیا۔

۴۔ Vasco da Gama: واسکوڈے گاما (1460ء–1524ء) ایک پرتگالی بحری قزاق تھا جس نے جنوبی افریقہ کے گرد گھوم کر ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا۔

ابوعلی حسن مراکشی[۱] نے دنیا کے نقشوں پر طول بلد اور عرض بلد کے خطوط لگائے تاکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اوقاتِ نماز مقرر کرنے میں مدد ملے اور اس سے انہیں جغرافیائی نقشے میں خطوط لگانے میں آسانی حاصل ہوگئی۔ اسلامی نقشے اور بحری سائنسز (marine sciences) کے بارے میں مسلمانوں کی مطبوعات نے مغربی دنیا کی جہاز رانی کو نمایاں طور پر متاثر کیا ہے۔

علی بن عمر الکاتبی[۲]، قطب الدین شیرازی[۳] اور الفراغ علی تاریخ انسانی کے اولین سائنسدان تھے، جنہوں نے سورج کے گرد زمین کی ممکنہ مداروی حرکت کا حوالہ دیا اور کہا کہ رات اور دن میں زمین ایک چکر پورا کرتی ہے۔ جارج سارٹن[۴] جسے بیشتر لوگ بابائے تاریخ سائنس سمجھتے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب 'Introduction to the History of Science' میں لکھا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی کے دوران ان تین سائنسدانوں کی تحقیق نوٹس میں آئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ ان عوامل میں سے ایک ہے جنہوں نے کاپرنیکس کی 1543ء میں اعلان کردہ تحقیق کو متاثر کیا۔

(Introduction to the History of Science, vol. 1, p. 46)

البیرونی نے موجودہ پاکستان کے علاقے (Rohtas Fort) میں زمین کے قطر (radius) کی پیمائش کی جو عہد حاضر کے تسلیم شدہ قطر سے صرف 15 کلومیٹر کم ہے۔

مسلمانوں نے اپنے علم جغرافیہ کی بدولت سمندری راستوں اور سیاحت پر کنٹرول حاصل کرلیا تھا۔ مشہور پرتگیزی ملاح واسکوڈے گاما نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان وہ بحری راستہ

---

[۱] ۔ابوعلی حسن مراکشی (تیرہویں صدی عیسوی) ایک نامور جغرافیہ دان، حساب دان اور ماہر فلکیات تھے۔

[۲] ۔علی بن عمر بن علی الکاتبی المعروف نجم الدین الکاتبی القزوینی (1203ء-1277ء) مسلمان جغرافیہ دان، ماہر فلسفہ و منطق، ماہر علم فلکیات اور ریاضی دان تھا۔ علم منطق پر اس کی کتاب الرسالہ الشمسیہ فی القواعد، سائنسی علوم اور مابعد از طبیعات پر کتاب حکمت العین معروف ہیں۔

[۳] ۔قطب الدین محمود شیرازی (1236ء-1311ء) ایک ماہر فلکیات، ریاضی دان، طبیب، ماہر فزکس، ماہر علم موسیقی، فلاسفر اور صوفی تھا۔ اس نے ان تمام شعبہ جات میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

[۴] ۔George Alfred Leon Sarton: جارج الفریڈ لی اون سارٹن (1884ء-1956ء) ایک امریکی کیمیا دان اور مورخ تھا جسے شعبہ سائنس کی تاریخ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

دریافت کرلیا جوراس امید[1] کی طرف سے ہوکر جاتا تھا۔ یہ عظیم بحری دریافت مسلم عرب ملاح احمد بن ماجد[2] کی مدد سے ممکن ہوئی تھی جس نے 1498ء میں واسکوڈے گاما کو افریقہ سے ہندوستان تک پہنچنے میں رہنمائی کی۔ اسے اس ملاح کی خدمات موزمبیق[3] کے مسلم سلطان نے فراہم کی تھیں۔

(Encyclopedia Britannica Vol 7, p. 761)

مسلمانوں کا نئی دنیا، امریکہ کی دریافت میں بھی اہم کردار تھا۔ کولمبس نے امریکہ 1506ء میں دریافت کیا تھا۔ امریکی سکالر فلپ ہٹی لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے زمین کے گول ہونے کے نظریے کو جس کے بغیر امریکہ کی دریافت ممکن نہ تھی۔ اس نظریئے کا علمبردار ایک مسلمان سائنسدان ابوعبیدہ مسلم البالینی تھا جس نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے نظریات دسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں خوب پھیلے اور مشہور ہوئے۔ اس طرح زمین کے گول ہونے کا نظریہ عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوکر 1410ء میں یورپ میں شائع ہوا۔ اس کو پڑھ کر کولمبس نے اس نظریہ سے واقفیت حاصل کی۔

(The Arabs, p. 570)

(۸)۔ قانون

مسلمانوں نے قانون (فقہ) اور اصول قانون (اصول فقہ) کے شعبوں میں بھی نمایاں اور قابل قدر خدمات انجام دیں۔ سابق تہذیبوں کے اپنے مخصوص طور طریقے ہی قانون ہوتے

۱۔ Cape of Good Hope: راس امید جنوبی افریقہ کے ساحلوں پر واقع راس (rocky) ہے۔ واسکوڈے گاما نے افریقہ کے گرد گھوم کر انڈیا اور یورپ کے درمیان سمندری راستہ دریافت کیا جس کے بعد یہ علاقے یورپی قابض قوتوں کی نو آبادیاں بن گیا۔

۲۔ شہاب الدین احمد بن ماجد (پندرہویں صدی عیسوی) ایک عرب جہاز راں تھا جس نے واسکوڈے گاما کی ہندوستان کا راستہ دریافت کرنے میں اس کی مدد کی۔ اس نے علم بحریات پر ایک ایسی کتاب تصنیف کی تھی جس میں بحر ہند، بحر قلزم، خلیج فارس، بحیرہ چین کے مغربی حصے اور مجمع الجزائر میں جہاز رانی کی ہدایات درج ہیں۔

۳۔ جمہوریہ موزمبیق افریقہ کے جنوب مشرق میں واقع ایک ملک ہے جس کا دارالحکومت ماپوتو ہے۔ اس کی سرحدیں مشرق میں بحر ہند، شمال میں تنزانیہ، شمال مغرب میں ملاوی اور زیمبیا، مغرب میں زمبابوے اور جنوب مغرب میں جنوبی افریقا اور سوازی لینڈ سے ملتی ہیں۔

تھے۔ تاہم قانون اب بطور ایک سائنس (مجرد وجود اور قوانین وقواعد سے جداگانہ تشخص کی حامل) ہے جو اسلام سے پہلے موجود نہیں تھا۔ فقہ خالصتاً ایک مسلم دریافت ہے۔

روم، یونان، چین، ہندوستان اور عراق میں اسلام کی آمد سے بہت پہلے قانون کے کئی شعبے موجود تھے لیکن فقہ، حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تصنیف 'کتاب الرائے' سے شروع ہوئی۔ ان کے شاگرد حضرت امام ابویوسفؒ[۱] نے کتاب الاصول لکھی اور حضرت امام شافعیؒ[۲] نے انسانی تاریخ میں پہلی بار اپنی کتاب الرسالہ فی اصول الفقہ میں اصول قانون، قانون سازی، تعبیر کے اصولوں وغیرہ پر باقاعدہ سیر حاصل بحث کی۔

مسلم فقہا نے تاریخ میں پہلی بار 'نیت' (ارادہ) کی اہمیت واضح کی اور اس تصور پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے بنیادی الفاظ اس حدیث (صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث:۱) 'إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ' (اعمال کا دارومدار نیت پر ہے) سے ماخوذ ہیں۔ فقہا نے 'سخت مواخذے' (culpability without criminal intention) کی حوصلہ شکنی کی۔ یہ نظریہ 'نیت' ہے اور یہ فوجداری اصول قانون میں ایک مسلمہ حقیقت رکھتا ہے کیونکہ قانون ایسے اقدام کو جرم نہیں مانتا جس میں ارادۂ جرم شامل نہ ہو۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریاست مدینہ کے لیے اولین تحریری دستور دیا۔ یہ تحریری دستور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیار کرایا، باون (۵۲) شقوں پر مشتمل ہے۔ اس میں متعدد اصول طے کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً حکمران اور رعیت کے علیحدہ علیحدہ حقوق وفرائض، قانون سازی، انصاف کا قیام، نظام دفاع، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک، دوطرفہ بنیاد پر سماجی بیمہ کاری اور اس دور کے دیگر تقاضوں کا بندوبست وغیرہ۔

---

[۱]۔ امام ابویوسفؒ (735ء-798ء) امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد اور حنفی مذہب کے امام تھے۔ آپؒ کا اصل نام یعقوب بن ابراہیمؒ تھا۔ آپؒ تاریخ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جن کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے خطاب سے نوازا گیا۔

[۲]۔ محمد بن ادریس بن العباس شافعیؒ (768ء-820ء) ایک مشہور ومعروف فقیہ تھے۔ جنہوں نے ایک نئے مسلک شافعی کی بنیاد ڈالی۔ آپؒ کی کتاب الرسالہ اصول فقہ کی پہلی کتاب ہے۔

مسلمانوں نے ہی پہلی بار مختلف اقوام کے تقابلی قوانین کا باضابطہ مطالعہ کیا۔ انہوں نے متنوع بیرونی قوانین کے بنیادی اصولوں کے اسلامی قوانین سے فرق و امتیاز پر بحث کی۔ نیز اسلام کے قانونی پہلوؤں کی مختلف تعبیرات کے مابین اصول فقہ کے لحاظ سے امتیاز کا بھی جائزہ لیا۔

عام طور پر جنگی حالات میں قانون معطل ہوجاتا ہے۔ ایسے وقت میں کسی سے معقول اور منصفانہ رویہ اپنانے کی کم سے کم توقع کی جاتی ہے۔ اس لیے برسرپیکار ریاستوں کے فرمانرواؤں نے ہمیشہ اسے اپنا استحقاق سمجھا کہ وہ دشمن کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں۔ مسلمانوں نے پہلی بار عمومی بین الاقوامی قانون (Public International Law) کو ریاستی حکمرانوں کی متلون مزاجی پر مبنی قانون سے الگ کیا اور اسے خالصتاً قانونی بنیادوں پر استوار کیا۔ بین الاقوامی قانون کا ضابطہ کار حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ایک استاد حضرت امام زید بن علی زین العابدینؒ نے اپنی تصنیف 'کتاب المجموعہ' میں متعارف کرایا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ایک شاگرد حضرت امام محمد الشیبانیؒ[1] نے اس موضوع پر دو کتابیں کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر لکھیں۔ جن کا انگریزی ترجمہ امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے عیسائی پروفیسر مجید خدوری نے کیا اور دستیاب ہے۔ حضرت امام سرخسیؒ نے اس کتاب کی شرح چار جلدوں میں لکھی۔ یہ کتاب Oppenheim کی کتاب بین الاقوامی قانون (International Law) سے بھی بڑی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ بین الاقوامی قانون پر پہلی باقاعدہ کتاب ولندیزی عالم ہوگو گروشئیش[2] نے 1645ء میں لکھی تھی جس کا نام

De Jure Belli ac Pacis

(Law of War and Peace) ہے۔

مسلم فقہا نے حقوق اور فرائض کے باہمی تعلق کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اگر انسان کے حقوق و فرائض کو لازم و ملزوم نہ کیا جائے تو بنی نوع انسان ایک غارت گر جانور، بھڑیا یا

[1] ۔ امام محمد بن حسن شیبانیؒ (749ء-805ء) امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور مشیر خاص تھے۔ امام ابویوسفؒ کے بعد آپؒ جید شاگرد تھے۔ استاد کے نظریات کو تدوین کرنے میں ان کی محنت بھی شامل تھی۔ آپؒ نے بین الاقوامی قانون پر کتاب السیر لکھی۔

[2] ۔ Hogo Grotius: ہوگو گروشئیش (1582ء-1645ء) ایک ولندیزی ماہر قانون تھا۔

شیطان بن جائے گا۔

اسلام قوانین کو فطرت انسانی کی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھائی اور برائی کے درمیان فرق و امتیاز کی تصریح کرتا ہے۔ قرآن پاک چند چیزیں لازماً کرنے (معروف) اور چند چیزوں سے لازماً اجتناب کرنے (منکر) کا حکم دیتا ہے۔ معروف کا مطلب ہے کہ 'اچھائی' وہ ہے جس کے اچھا ہونے کا علم ہر کسی کو ہے۔ اس لیے اس کا حکم دیا گیا ہے (یا اسے ترجیح دینے کے لیے کہا گیا ہے) جب کہ منکر کے معنی ایک ایسی چیز ہے جس کی ہر کوئی مذمت کرتا ہے اس لیے وہ ممنوعہ ہے۔ اسلامی قوانین کا بہت بڑا حصہ اسی نظریئے پر استوار ہے۔

عمومی طور پر جو مادی ترغیبات یا موانع (sanctions) ایک قانون کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں، وہ اسلام میں بھی اسی طرح ہیں جیسے دیگر نظامہائے قانون میں ہوتے ہیں۔ تاہم پیغمبر اسلام حضور نبی کریم ﷺ نے ان میں ایک زائد ترغیب شامل کر دی ہے جو مادی ترغیب کی بہ نسبت شاید زیادہ موثر ہے اور وہ روحانی ترغیب ہے۔

اسلام نے انصاف کے نظام کے قیام کے لیے جملہ لوازم فراہم کرتے ہوئے اپنے پیروکاروں کے ذہنوں میں موت کے بعد قائم ہونے والے روز محشر، اللہ تعالیٰ کی عدالت کے فیصلوں اور دنیا میں کیے گئے اعمال کے نتیجے میں نجات یا جہنم کے فیصلوں کے تصورات راسخ کیے ہیں۔ اس طرح ایک مومن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض پورے کرے جبکہ اسے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا بھی پورا موقع دیا گیا ہے۔ حرام سے روکا گیا ہے باوجودیکہ حرام میں کئی ترغیبات ہیں۔ مادی جواز اور روحانی جواز، ایک دوسرے کی اثر انگیزی کے لیے باعث تقویت بنتے ہیں۔ روحانی جواز قوانین کی زیادہ سے زیادہ پابندی کرنے اور کروانے، حقوق و فرائض کا زیادہ سے زیادہ احترام کرنے اور کروانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے لیے قرآن پاک وحی الٰہی ہے جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے اس کے مقدس متن کی توضیح وتشریح فرمائی۔ ان توضیحات وتشریحات کو بطور 'حدیث' قلم بند کرنے کی ہدایات دیں۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات ناقابل تنسیخ ہیں۔ یہ

نظریاتی سختی (doctrinal rigidity) نظریہ اجتہاد کے تحت اس وقت نرم و لچکدار بن جاتی ہے جب انسانوں کو دِقت طلب واقعات و حالات سے توافق اختیار کرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ قوانین خواہ وہ کتاب الٰہی سے ماخوذ ہوں یا ارشادات نبوی ﷺ سے اخذ کئے گئے ہوں۔ وہ ہرگز یکساں درجے کے حامل نہیں ہیں۔ ان میں سے صرف چند ایک ہی بطور فریضہ (obligatory) عائد ہوتے ہیں جبکہ دیگر قوانین سفارشات کا درجہ (recommendatory) رکھتے ہیں جو افراد کو خاصی گنجائش دیتے ہیں۔ قانون کی تعبیر و توضیح کی جا سکتی ہے۔ تعبیرات و توضیحات ایسے امکانات پیدا کر دیتی ہیں کہ قانونِ خداوندی، خصوصی حالات سے موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ اکثریت کو جب بھی اور جیسی بھی ضرورت ہو وہ اس کے لیے قانون سازی (legislation) کرسکتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اس کے لیے قاعدہ وضع فرما دیا ہے:

لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِی علی ضلالَۃٍ. (مشکٰوۃ المصابیح، ج:۵، رقم الحدیث:۳۱۷)

(میری امت کسی غلط رائے پر متفق نہیں ہوگی)

اسلام قانون سازی میں انسانی عقل پر اعتماد کرتا ہے۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (ﷺ) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ کے رسول (ﷺ) کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (ﷺ) راضی ہیں۔

(سنن ابوداؤد، ج:۳، رقم الحدیث:۱۹۹)

باالفاظ دیگر ایک فرد کی عقل عام پر مبنی کوشش نہ صرف قانون کے ارتقاء کا ذریعہ ہے بلکہ وہ

حضور نبی کریم ﷺ کی دعائے برکات کا مستحق بھی بن جاتی ہے۔

اسلام شہریوں کے مختلف گروہوں کی قانونی خودمختاری کا احترام کرتا ہے۔ یہ ہر مذہبی گروہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ اس کی اپنی عدالتیں ہوں جن کی سربراہی ان کے منصفین کریں تا کہ ان کے انسانی معاملات پر ان کے اپنے دیوانی اور فوجداری قوانین کا اطلاق ہو۔

اسلام نے مسلمانوں کے مابین قیام انصاف کے لیے تزکیۃ الشہود[1] کا تصور متعارف کرایا تا کہ گواہ کے قابل اعتبار ہونے کا تعین کیا جا سکے۔ مزید برآں قرآن پاک (سورۃ النور، آیت: ۴) میں ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کی عصمت سے متعلق کوئی الزام لگاتا ہے اور عدل کے تقاضوں کے مطابق اس کا ثبوت نہیں دیتا تو وہ نہ صرف سزا کا حق دار ہوتا ہے بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے عدالتوں کے سامنے گواہی دینے کے لیے بھی نااہل قرار دے دیا جاتا ہے۔

اسلام نے 'عرف' پر مبنی عام طور پر مقبول، 'معروف' کی منظوری دے دی ہے۔ جس سے قانون کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔ 'معروف' کا تصور مسلمانوں کو ان رواجوں اور معمولات سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے جن کا کسی گروہ (community) میں رواج رہا ہے تا کہ مشترکہ بھلائی کے کاموں کو فروغ مل سکے۔ اس 'جاذبانہ رویئے' (assimilative behaviour) نے اسلامی قانون کو خوبیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک (سورۃ الانعام، آیات: ۸۴-۸۵) اعلان کرتا ہے کہ سابقہ انبیا و رسل علیہم السلام پر جو وحی الٰہی اترتی تھی وہ مسلمانوں کے لیے بھی جائز و بجا ہے لیکن اس کا دائرہ صرف اس وحی تک محدود ہے جس کا مستند ہونا شک وشبہے سے بالاتر ہو۔

(۹)۔ دیگر شعبہ جات

مسلمانوں نے فنون لطیفہ (Fine Arts) اور مخصوص قسم کی مصوری (paintings) اور خوشنویسی کو بہت ترقی دی ہے۔ انہوں نے کڑھائی (embroidery) اور قالین بافی سے آغاز کیا اور اسے ترقی دی۔ لکڑی، ہاتھی دانت اور ہڈیوں پر کندہ کاری شروع کی۔ مسلمانوں

---

[1] ۔ تزکیۃ الشہود کے معنی یہ ہیں کہ عدالت اپنے اطمینان کے لیے گواہ کے قابل اعتماد ہونے کی تحقیقات کر لے۔

نے خوش نویسی، مصوری، شیشہ گری، ظروف سازی اور پارچہ بافی جیسے بصری فنون کو بے پناہ ترقی دی۔ خطاطی کے نمونے اسلامی آرٹ میں بے حد وحساب موجود ہیں۔ اس کے دو بڑے رسم الخط علامتی کوفی اور نسخ ہیں جنہیں دیواروں، گنبدوں، محرابوں اور منبروں کی اطراف میں طغروں (tughras) اور دھات کاری میں استعمال کر کے ان کے حسن کو بڑھانے میں مدد لی گئی ہے۔ خوشنویسی کے لیے استعمال ہونے والی زبانوں میں زیادہ تر عربی، فارسی (پرانی)، ترکی اور اردو ہیں۔

اسلامی دنیا میں پینٹنگ (رنگوں کے امتزاج اور استعمال) کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل منقش تحریر کا مصغر (miniature) ہے۔ رنگوں اور سونے کے پانی سے مزین مخطوطوں اور قلمی نسخوں کا مصغر، فارسی مصغر کی مقبول روایت ہے جو عثمانی مصغر اور مغل مصغر کو بہت متاثر کرتی ہے۔ توضیحی کتابوں (illustrated) کے بڑے شاہکار، فارسی شاعری کی قدیم کتابیں ہیں۔ ان میں فردوسی کا شاہنامہ اسلام، گلستان سعدی، دیوان حافظ اور دیگر بہت سی دیگر کتب شامل ہیں۔

قالین سازی ایک معروف اسلامی فن ہے۔ ان کی مہارت مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ ہنر، فرش کی پوشش (floor coverings) سے لے کر تعمیراتی تزئین تک اور گدیوں سے لے کر گاؤ تکیوں، تھیلوں اور ہر شکل اور سائز کی بوریوں تک، مذہبی رسومات میں استعمال ہونے والی اشیا بالخصوص جائے نمازوں تک ہر چیز میں اپنے جلوے دکھا رہا ہے۔

قدیم ترین پبلک اسلامی عمارات جیسے کہ قبۃ الصخریٰ[1] کی اندرونی دیواریں بازنطینی طرز کی کاشی کاری سے مزین کی گئی تھیں مگر ان میں انسانی شکلیں نہیں بنائی گئیں۔ تاہم صیقل شدہ چمکدار رنگوں کی اسلامی روایت کی حامل منفرد ٹائلیں جو اندرونی اور بیرونی دیواروں اور گنبدوں پر لگی ہوئی ہیں وہ نویں صدی عیسوی سے بننا شروع ہوئی تھیں۔ مغل، پچی کاری (parchin

[1]۔ Dome of the Rock: قبۃ الصخریٰ یروشلم/ بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے قریب موجود ایک تاریخی چٹان کے اوپر سنہری گنبد کا نام ہے۔ روایات کے مطابق معراج کی رات حضور نبی کریم ﷺ اس چٹان سے براق پر سوار ہو کر آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کثیر سرمائے سے چٹان کے اوپر گنبد تعمیر کرایا جسے قبۃ الصخرہ کہا جاتا ہے۔

kari) کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ ایسی تزئین تھی جو جڑاؤ نیم گراں بہا پتھروں کے پینلز (panels) سے اور بعض صورتوں میں جڑاؤ جواہرات لگا کر کی جاتی تھی۔ جیسا کہ تاج محل[۱] میں دکھائی دے رہی ہے۔

کاغذ چین میں ایجاد ہوا تھا لیکن 751ء میں 'طلاس' کی جنگ (موجودہ کرغستان) میں چین کی شکست کے بعد یہ کام ساری اسلامی دنیا میں پھیل گیا۔ اسلامی دنیا میں کاغذ کے پہلے کارخانے کی بنیاد سمرقند (ازبکستان) میں ڈالی گئی۔ اس سے کاغذ سازی کے وقت کو کم اور معیار کو بلند تر کر دیا گیا۔ پھر مشینری کو اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال بنائے اور کاغذ کی شیٹ کو بھی معقول حد تک دبیز (thicker) بنا دے۔ اس طرح کاغذ سازی ایک بڑی صنعت میں تبدیل ہو گئی۔ شروع شروع میں پانی سے چلنے والی 'پلپ ملیں' (pulp mills) ہوتی تھیں جس میں کاغذ کی تیاری کے لیے 'ٹرپ ہیمر' (trip hammers) (انسان یا جانور کی قوت سے) استعمال ہوتا تھا۔ بعدازاں اس کی جگہ چین کے روایتی کھرل یا ہاون دستے نے لے لی۔

(Papermaking, p. 139)

مسلمانوں نے کاغذ بنانے کے نئے نئے طریقے وضع کر کے انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ کاغذ کی تجارتی پیمانے پر تیاری پہلے مراکش میں شروع ہوئی پھر سپین اور یورپ میں چلی گئی۔ کاغذ کے بغیر اتنے وسیع پیمانے پر کتب کی اشاعت ممکن نہ تھی جو علم کی ترقی کا سبب بنیں۔ کاغذ کی پیمائش کا بنیادی پیمانہ 'ream' بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔

(http:/www. etymonline, com)

اگر موجودہ دور میں آپ اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل میں جائیں تو آپ کو ہر دوسرا آدمی غیر ملکی صلاح کار (consultant) دیکھنے کو ملے گا۔ ایک وقت تھا کہ جب مغرب کو ماہرین اور مشیر ہم (مسلمان) مہیا کرتے تھے۔ اوفاریکس نے سونے کے سکے ڈھلوانے کے لیے بغداد سے سکہ

۱۔ تاج محل بھارتی شہر آگرہ میں دریائے جمنا کے جنوبی کنارے پر واقع سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا محل ہے جو مغل شہنشاہ شاہجہان نے 1632ء میں اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کے مقبرے پر تعمیر کروایا تھا۔

گر بلائے تھے۔ وہ سکے اب بھی برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں جس میں ایک طرف تو بادشاہ کا نام لکھا ہوا ہے تو دوسری طرف عرب سکہ گر کا نام ہے۔

۳۔ مغرب کو ترسیل علم

علوم کی یہ شاخیں جن کی مسلمانوں نے آبیاری کی، سسلی، سپین اور روم کے راستے یورپ پہنچیں اور پھلی پھولیں۔ گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک عہد متوسط کا یورپ، اسلامی تہذیب کو جذب کرتا رہا جہاں یہ علوم چوٹی پر پہنچے ہوئے تھے۔ یورپ اور اسلامی دنیا کے متعدد نقاط اتصال تھے۔ یورپ کو ترسیلِ اسلامی علوم کے بڑے بڑے مقاماتِ اتصال سسلی اور سپین میں بالخصوص طلیطلہ (Toledo) میں تھے۔

بعدازاں 1085ء میں اس شہر کی سپینی عیسائیوں کے ہاتھوں فتح اور 1091ء میں نورمین[1] کے ہاتھوں اس کی استرداد[2] ہو جانے پر ایک زبردست نورمین عرب بازنطینی کلچر وجود میں آ گیا۔ مسلم جغرافیہ دان الادریسی نے

The Book of Pleasant Journey into Faraway Lands (Tobula Rogeriana)

لکھی۔ یہ کتاب عہد متوسط میں عظیم ترین جغرافیائی مقالوں میں سے ہے۔ الادریسی نے یہ کتاب سسلی بادشاہ راجر دوئم کے لیے لکھی تھی۔ صلیبی جنگوں نے بھی یورپ اور لیوانٹ[3] کے درمیان تبادلوں میں زیادہ گہما گہمی بڑھا دی۔

۱۔ Norman: نورمین دسویں اور گیارہویں صدی کا ایک خاندان تھا جس نے فرانس کے علاقے نورمینڈی (Normandy) کو اپنا نام دیا۔

۲۔ Reconquista: استرداد عیسائیوں کی ساڑھے سات سو سال طویل ان کوششوں کو کہا جاتا ہے جو انہوں نے جزیرہ نما آئبیریا سے مسلمانوں کو نکالنے اور ان کی حکومت کے خاتمے کے لیے کیں۔ استرداد کا آغاز 722ء میں معرکہ کوواڈونگا سے ہوا اور اختتام 1492ء میں سقوط غرناطہ سے ہوا۔

۳۔ Levant مشرق وسطیٰ کے ایک بڑے علاقے کے لیے استعمال ہونے والی ایک غیر واضح تاریخی اصطلاح ہے۔ اس میں بحیرہ روم، مشرق میں صحرائے عرب کے شمالی حصوں اور بالائی بین النہرین اور شمال میں کوہ ثور کے درمیان کا علاقہ شامل سمجھا جاتا ہے۔

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں بے شمار یورپی باشندے حصول علم کے لیے اسلامی مراکز میں آئے۔ جن میں فبیو ناشی، اڈیلارڈ آف باتھ اور قسطنطین افریقہ[۱] جیسے اہل علم شامل تھے۔ ان طلبہ نے طب (medicine)، فلسفہ (philosophy)، ریاضی (mathematics)، تکوین نگاری (Cosmography) اور دیگر علوم وفنون سیکھے اور پڑھے۔ عربوں نے بیت الحکمت (House of Wisdom) میں متعدد یونانی کتب کے تراجم کئے اور انہیں ترقی بھی دی۔ پھر عہد متوسط میں ان علوم کا ازسرنو یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

ان یونانی کتب کے لاطینی تراجم متعدد مقامات پر کیے گئے۔ طلیطلہ (Toledo)، سپین (Spain) اور سسلی (Sicily) یورپ کو ترسیل علم کے اہم ترین مقامات بنے۔ برگنڈو پی سا[۲] نے ارسطو کے متعدد مضامین ترکی میں شام کی سرحد کے قریب مقام انطاکیہ (Antioch) سے دریافت کیے اور ان کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ سٹیفن آف پائزے[۳] نے لگ بھگ 1127ء میں عربی کے 'مینوئل آف میڈیکل تھیوری' کا (Arab manual of medical theory) لاطینی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

(wikipedia: Islamic contributions to Medieval Europe)

گیراڈ آف کریمونا نے ذاتی طور پر عربی زبان کی ۸۷ کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا جن میں المجسٹ (Al-magest) بھی شامل تھی۔ الخوارزمی کی کتاب 'الجبرا والمقابلہ'، جابر بن

۱۔ Constantine the African: قسطنطین افریقہ (گیارہویں صدی عیسوی) ایک ماہر طبیب تھا۔

۲۔ Burgundio of Pisa: برگنڈو پی سا (بارہویں صدی عیسوی) ایک مشہور اطالوی قانون دان تھا۔

۳۔ Stephen of Pisa or Stephen the philosopher or Stephen of Antioch: سٹیفن آف پائزے (بارہویں صدی عیسوی) ایک اطالوی مترجم تھا جس نے عربی زبان کی سائنس کی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

سنان البتانی کی کتاب 'Elementa Astronomica'، الکندی[1] کی تصنیف 'On Optics'، احمد بن محمد بن کثیر الفرغانی[2] کی کتاب 'On Elements of Astronomy and the Celestial Motions'، فارابی کی کتاب 'On the Classification of Sciences'، الرازی کی 'The Chemical and Medical Works'، ثابت ابن قرا، حنین بن اسحاق، ابراہیم الزرقالی[3]، جابر بن الفلاح[4]، بنوموسیٰ، ابوکامل الحاسب، الزہراوی اور ابن الہیثم کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ جابر بن حیان کی کتاب 'الکیمیا' کا ترجمہ رابرٹ آف چیسٹر نے 1144ء میں کیا تھا۔ Book of Seventy کا ترجمہ گیراڈ آف کریمونا نے کیا تھا۔ الکیمیکل ورکس آف محمد ابن زکریا رازی کا لاطینی میں ترجمہ بارہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ کیا گیا تھا۔

الخوارزمی کے ریاضی کی کتب کے تراجم نے یورپ کو بہت متاثر کیا۔ یورپ میں الجبرا کی ابتدائی دور کی کتب میں تسلیم کیا گیا کہ اس براعظم میں الجبرا کی بہت سی اولین کتابیں الخوارزمی کے تراجم اور دیگر اسلامی مصنفین کی کتابیں تھیں۔ 'الگورتھم' (Algorithm) کے الفاظ الخوارزمی کے لاطینی نام الگورزمی (Algorismi) اور لفظ الجبرا کی کتاب کے عنوان 'کتاب الجبر والمقابلۃ' سے ماخوذ ہیں۔ یہ الفاظ بھی عربی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اور دیگر عربی فلکیاتی اور ریاضیاتی تصانیف مثلاً البتانی اور محمد بن ابراہیم الفزاری کی کتاب Great Sindhind (جو سریا سدھانتا اور براہم گپتا پر مشتمل ہے) کا بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

(The Crest of the Peacock, p. 306)

---

[1]۔ al-Kindus: ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی (801ء-873ء) کا شمار اسلامی دنیا کے اوّلین حکما اور فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے ریاضی، طبیعیات، فلسفہ، ہیت، موسیقی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم پر اعلیٰ پائے کی کتب تحریر کیں۔

[2]۔ Alfraganus: ابوالعباس احمد بن محمد بن کثیر افرغانی (805ء-870ء) جو مغرب میں الفرغانی کے نام سے مشہور ہے۔

[3]۔ Ibrahim al-Zarqali: ابراہیم الزرقالی (1029ء-1087ء) اپنے دور کا سب سے بڑا ماہر فلکیات تھا۔

[4]۔ Jabir ibn Aflah: جابر بن فلاح (1100ء-1150ء) ایک ماہر فلکیات اور ریاضی دان تھا۔

ابن معاد الجیانی[1] کی تصنیف 'The Book of Unknown Arcs of a Sphere' کا یورپی ریاضی پر بہت اثر تھا۔ 'رگیو منتانوس'[2] کی کتاب 'On Triangles' یقیناً بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی کیونکہ اس میں جابر بن الفلاح کی کتاب میں سے لیا گیا مواد شامل ہے۔ اس امر کی نشاندہی سولہویں صدی عیسوی میں جیرولاموکاردانو[3] نے کی ہے۔

(http://www-history.mcs.st-andrews.ac.uk)

ابو الفتح الخازنی کی کتاب 'زج السنجری' (Zij Sanjari) فلکیات پر اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے۔ اس کا تیرہویں صدی عیسوی میں گریگوری کونیڈیز[4] نے یونانی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ بازنطینی سلطنت میں اس کا بہت شوق سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ بطلیموسی نظام[5] میں بے پناہ ترامیم ہوئیں جو البتانی اور ابن رشد نے کیں۔ ان کے نتیجے میں مؤید الدین العرضی[6]، الطوسی اور ابن الشاطر[7] بطلیموسی نظام سے منفرد نظام مرتب کیے جن کو بعد ازاں 'کاپرنیکس نظام'[8] میں

۱۔ Ibn Mu'adh al-Jayyani: ابن معاد الجیانی (989ء-1079ء) ایک ماہر ریاضی دان، اسلامی مفکر و عالم اور اندلس کے قاضی تھے۔

۲۔ Regiomontanus: رگیومنتانوس (1436ء-1476ء) ایک معروف ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔

۳۔ Gerolamo Cardano: جیرولاموکاردانو (1501ء- 1576ء) ایک اطالوی ماہر ریاضی، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، فلکیات، جغرافیہ، جواہرات اور مصنف تھا۔

۴۔ Gregory Choniades: گریگوری کونیڈیز (1240ء-1320ء) ایک بازنطینی یونانی ماہر فلکیات تھا جس نے ایران میں قیام کے دوران فارسی زبان، ریاضی اور علم فلکیات سیکھا۔

۵۔ نظام فلکیات کا ایک ایسا نظریہ جس میں زمین کو کائنات کا مرکز تصور کیا جاتا ہے اور تمام اجرام فلکی اس کے گرد گردش کرتے ہیں، کو بطلیموسی نظام کہتے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کی بنیاد بطلیموس نے ڈالی تھی۔

۶۔ Mu'ayyad al-Din al-Urdi: مؤید الدین العرضی (تیرہویں صدی عیسوی) ایک ماہر فلکیات تھے۔

۷۔ Ibn al-Shatir: الحسن بن علی بن ابراہیم بن محمد بن المطعم (1304ء-1375ء) کو ابن الشاطر کے لقب سے جانا جاتا ہے۔ وہ ماہر ریاضی دان، آلات رصد اور فلکیات کے سائنسدان تھے۔

۸۔ Copernican heliocentrism: کاپرنیکس نظام فلکی، عظیم ماہر فلکیات کاپرنیکس کے نظریات پر مشتمل ہے۔ کاپرنیکس کے اس نظام کے مطابق کائنات کا مرکز زمین کی بجائے سورج ہے اور بشمول زمین دیگر اجرام فلکی اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔

ضم کر دیا گیا۔

ابن سینا کی القانون فی الطب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے پورے یورپ شائع کیا گیا۔ یورپ میں سولہویں صدی عیسوی تک یہ کتاب طب کی نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی۔ یورپ میں اسے پینتیس (۳۵) سے زائد بار چھاپا گیا۔ الرازی نے Comprehensive Book of Medicine (جامع الکتاب الادویہ) لکھی جس میں خسرہ (measles) اور چیچک (small pox) کی محتاط انداز میں تفصیل بیان کر کے ان کے درمیان فرق واضح کیا۔ یہ کتاب بھی یورپ میں بہت مقبول ہوئی۔ الزہراوی نے کتاب التصریف لکھی جو علم الجراحت (سرجری) کا انسائیکلوپیڈیا تھی۔ اس کا لاطینی میں ترجمہ 1100ء میں غالباً گیراڈ آف کریمونا نے کیا۔ یہ کتاب صدیوں تک یورپی میڈیکل سکولوں میں پڑھائی جاتی رہی۔

(Arabian Medicine, p. 87)

ابوالہیثم نے کتاب المناظر (Book on Optics) لکھی جس میں اس نے بصارت اور نور کے بارے میں ایک نظریہ وضع کیا۔ اس کے لاطینی ترجمے نے بہت سے متاخر یورپی سائنسدانوں کی تصانیف کو متاثر کیا جن میں راجر بیکن اور جان کیپلر بھی شامل تھے۔

(https://www.jstor.org)

مسلمانوں نے یورپ کو براستہ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ بہت سے پھلوں اور سبزیوں سے متعارف کرایا اور بعض دور دراز چین اور ہندوستان سے لائی ہوئی اشیا سے بھی انہیں آشنا کرایا جن میں خرشوف (Artichoke)، پالک اور بینگن شامل تھے۔

پارچہ بافی کے نئے انداز اور نیا مواد بھی متعارف کرایا گیا جن میں مخمل، ریشمی کپڑا اور ساٹن شامل تھی۔ اسی طرح اسلامی فنونِ زیبائش اور دیگر نہایت بیش قیمت اشیا پورے عہد متوسط میں یورپ کو پہنچائی جاتی رہیں۔

اسلامی ظروف سازی یعنی روزمرہ کے استعمال کے برتن اپنے معیار کے لحاظ سے اتنے اچھے ہیں کہ انہیں اب بھی یورپین برتنوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے قالین، خواہ وہ سلطنت

عثمانیہ، مشرقی بحیرۂ روم یا مصر کی مملوک ریاست مصر یا شمالی افریقہ میں بنتے تھے یورپ میں دولت اور فارغ البالی کی نمایاں علامت سمجھے جاتے تھے۔ ایسے قالین، مشرقی عناصر کے یورپی پینٹنگ کے اندر ادغام اور بالخصوص وہ قالین جو مذہبی موضوعات کے مظہر ہیں بہت دلچسپ مثال پیش کرتے ہیں۔

یورپی موسیقی میں استعمال ہونے والے متعدد جدید آلات موسیقی عرب کے آلات سے متاثر ہیں جن میں 'ریبک' (rebec) (تین تارا، وائلن کی جدّ) جو رباب (rebab) سے ماخوذ ہے۔ قطارہ (qitara) سے گٹار (guitar)، نقارہ (naqareh) سے 'نیکر' (naker) بنا۔ شاہم (shawm) اور گلزینا (dulzaina) جو نرسل سے بننے والا 'ضمر' (zamr) اور 'الزرنا' (al-zurna) ہے، شامل ہیں۔

(Historical facts for the Arabian Musical Influence, p. 141 - 142)

یورپی عہد متوسط کی ٹیکنالوجی نے اسلامی دنیا کی ٹیکنالوجی کو اختیار کر لیا تھا۔ ان میں مختلف فلکیاتی آلات بھی شامل تھے۔ مثلاً 'یونانی' اصطرلاب (astrolabe) جو دراصل عربوں کا ترقی یافتہ آلہ تھا۔ جسے ایسا نظر فریب بنا دیا گیا تھا کہ یہ 'Quadrans Vetus' کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ ایک 'جامع گھنٹہ نما ربع محیط' (Universal horary quadrant) تھا۔ جسے کسی بھی عرض بلد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح 'سافیۂ' (Saphaea) تھی جو ایک ہمہ گیر اصطرلاب (astrolabe) تھی۔ یہ ابراہیم الزرقالی کی ایجاد تھی۔ یہ فلکیاتی آلۂ سدس (Sextant) تھا۔ اسی طرح مختلف آلات جراحی (بشمول قدیم اشکال کے ترقی یافتہ اوزار) اور مکمل نئی ایجادات، ترقی یافتہ گراری دار آبی گھڑیاں اور خودکار آلات شامل تھے۔

(Studies in Medieval Islamic Technology, p.23)

خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی پیچیدہ آبی گھڑیوں اور خودکار آلات نے یورپی ہنرمندوں کو بے حد متاثر کیا۔ جنہوں نے اولین مکینیکل گھڑیال تیرہویں صدی عیسوی میں بنائے تھے۔

(History of Project management, p. 5)

مشرق وسطیٰ اور مشرقی نصف کرہ سے بڑے پیمانے پر قدیم اشیا اور نئی ٹیکنالوجی کی درآمدکاری

نے نشاۃ ثانیہ(renaissance) سے ہمکنار ہونے والے یورپ پر بہت اچھے اثرات مرتب کیے۔ یہ تاریخ عالم میں ٹیکنالوجیز کی سب سے بڑی منتقلیوں میں سے ایک تھی۔

اینڈریو واٹسن کہتا ہے کہ 700ء اور 1100ء کے درمیان ایک زبردست زرعی انقلاب آیا جس نے فصلوں کی بہت بڑی تعداد (اٹھارہ فصلیں) اور ٹیکنالوجیز سپین سے عہد متوسط کے یورپ میں پھیلا دیں۔ مثلاً گنے سے چینی بنانا، آبی گھڑیال، پھل کا گودا محفوظ کرنا، کاغذ سازی، ریشم، فلنگ ملیں، مل ٹیکنالوجی، سکشن پمپ، رہٹ کا پہیہ اور نظام آبپاشی کے لیے چین پمپ وغیرہ۔ زرعی انقلاب کے دوران مسلمانوں کی خدمات نئے آلات کی ایجاد میں کم تھیں بمقابلہ ان کے وسیع پیمانے پر استعمال کے، جو زمانہ قبل از اسلام میں صرف محدود رقبے اور کم پیمانے پر استعمال ہوتے تھے۔ ان دریافتوں نے بڑے صنعتی کام ممکن بنا دیئے جو پہلے انسانی ہاتھوں کی قوت سے یا بوجھ کھینچنے والے جانوروں کی مدد سے کیے جاتے تھے۔ چنانچہ عہد متوسط کے یورپ میں ان میں سے بیشتر کام مشین سے کئے جانے لگے۔

(https://www.wsfcs.k12.nc.us)

میگوئیل آسن پلاسیوس[۱] نے خیال ظاہر کیا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی ادبی تصنیف دانتے[۲] کی Divine Comedy میں 'آخرت' کے بہت سے نمایاں اوصاف اور سلسلۂ واقعات براہِ راست یا بالواسطہ اسلامی عقیدہ معاد پر مبنی عربی تصانیف سے ماخوذ ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفر معراج کے بارے میں تصنیف (کتاب المعراج) کا 1264ء میں یا The Book of Mohammad's کی کتاب Ladder Liber Scale Machometi سے پہلے لاطینی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ دانتے یقینی طور پر مسلم فلسفے سے آگاہ تھا۔ اس نے فراموش کردہ غیر مسیحی فلسفیوں کی یونانی اور عظیم لاطینی فلاسفروں کے ہمراہ ایک

۱۔ Miguel Asin Palacios: میگوئیل آسن پلاسیوس (1871ء- 1944ء) ایک نامور ہسپانوی مستشرق، اسلامیات اور عربی زبان کا معلم، کیتھولک پادری تھا جس نے ڈیوائن کامیڈی پر تحقیقی کتاب اسلام اور ڈیوائن کامیڈی لکھ کر شہرت حاصل کی۔

۲۔ Durante degli Alighieri: دانتے الگیری (1265ء- 1321ء) اٹلی کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تمثیلی نظم طربیہ خداوندی 'ڈیوائن کامیڈی' میں شاعر کی روح دوزخ اعراف اور جنت کا سفر کرتی ہے۔

فہرست مرتب کی ہے۔اس نے ابن رشد سکول آف فلاسفی (Averroism school of philosophy) کے بانی ابن رشد کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس نے مغربی یورپ میں سیکولر افکار کے عروج میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

(Islam and Divine Comedy, p. 513)

امام غزالیؒ کا بھی عہد متوسط کے مسیحی فلسفیوں پر بہت گہرا اثر تھا۔صوفی سکالر مارگریٹ سمتھ[۱] کے مطابق اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام غزالیؒ کی تصانیف ان اولین کتابوں میں سے ہیں جنھوں نے یورپی سکالرز کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ مسیحی مصنفین میں سے سب سے بڑا آدمی جو امام غزالیؒ سے متاثر ہوا، وہ سینٹ ٹامس ایکوناس[۲] تھا۔اس نے مسلم مصنفین کے زیر اثر ہونے کا اعتراف کیا۔ دراصل اس نے یونیورسٹی آف نیپلز میں تعلیم حاصل کی تھی جہاں اس وقت اسلامی لٹریچر اور کلچر غالب تھا۔

(Al-Ghazali, p. 105 - 132.)

قرآن کا بہت سا حصہ پرانی قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ہے اور تاریخ کو علم کا ایک حصہ مانتا ہے۔اس لیے مسلمانوں میں ہیروڈوٹس[۳] کے بعد پہلی بار یعقوبی[۴]، طبری[۵]، مسعودی[۶]،

۱۔Margaret Smith: مارگریٹ سمتھ (1884ء–1970ء) ایک عیسائی صوفی سکالر تھی۔

۲۔Thomas Aquinas: ٹامس ایکوناس (1225ء–1274ء) ایک مسیحی فلسفی اور عالم دین تھا۔اس نے اپنے وقت کے بہترین استادوں سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی اور شہنشاہ فریڈرک دوئم کا درباری بن گیا۔لیکن 1243ء میں اس نے درویشی اختیار کر لی۔اس نے اپنی مذہبی فلسفیانہ تصانیف میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فطرت پرستی اور عقل پرستی کو مسیحی عقائد سے بہ آسانی ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔Herodotus: ہیروڈوٹس (425BC–481BC) ایک قدیم یونانی مؤرخ تھا جسے ابوالتاریخ کہا جاتا ہے۔

۴۔احمد ابن ابو یعقوب ابن جعفر ابن وہب ابن ودیع الیعقوبی المعروف یعقوبی (متوفی 897ء) ایک مسلمان جغرافیہ دان اور مسلم دنیا کے قرون وسطی کے پہلے مورخ تھے۔تاریخ یعقوبی اسلامی تاریخ پر ان کی مشہور ترین کتاب ہے۔

۵۔ابو جعفر محمد بن جریر طبری (838ء–923ء) مشہور مسلم مفسر اور مورخ تھے۔

۶۔ابوالحسن علی بن حسین بن علی مسعودی (896ء–956ء) مشہور مسلم مؤرخ، جغرافیہ دان اور سیاح تھے۔

ابن خلدون[1] اور البیرونی جیسے تاریخ دان پیدا ہوئے۔ ابن خلدون پہلا مسلمان تاریخ دان تھا جس نے فلسفہ تاریخ کے اصول وضع کیے اور تاریخ پر تنقید کے اصول متعارف کرائے۔

ابن خلدون نے اپنی کتاب (مقدمہ) میں تاریخ انسانی میں پہلی بار ارتقائے تاریخ کے اصولوں کی توضیح وتشریح کی اور انہیں غور وخوض کے لیے پیش کیا۔ اس نے تاریخ پر موسم، ماحول، اخلاقیات اور روحانیت کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا اور قوموں کے عروج و زوال کے اصول بھی واضح کیے۔ اس لیے بجا طور پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جدید تاریخ اور عمرانیات کی بنیادیں رکھیں۔ ٹائن بی کے بقول اس کا 'مقدمہ' اپنی نوعیت کا عظیم ترین کارنامہ ہے جسے کسی ذہن نے کسی زمان ومکان میں تخلیق کیا ہو۔

(A Study of History, v. 3, p.)

مسلمانوں کا مغرب پر سب سے بڑا احسان سائنسی اور استخراجی (inductive) طریقہ تحقیق ہے۔ رابرٹ بریفالٹ نے لکھا ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی اور راجر بیکن بنیادی طور پر عربوں کے علم کے زیر اثر آگے بڑھے۔

(Making of Humanity, p.200)

مغرب میں پندرہویں صدی عیسوی تک سائنس اور فلسفہ کی تعلیمات کو مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ارسطو اور ابن سینا کی تعلیمات یہاں ممنوع تھیں۔ برونو[2] کو جلا دیا گیا۔ کیپلر کو سزا دی گئی۔ گیلیلیو کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نظریات سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔ اس کے برعکس مسلمان معاشرے میں سائنس اور مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی گئی۔ جس کے سبب یہاں سائنس اور فلسفہ نے ترقی پائی اور پھر مغرب نے بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

مغربی دانشور عام طور پر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب اسلامی تصوف سے بہت متاثر ہوا

---

[1]۔ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (1332ء-1406ء) ایک مورخ، فقیہ، فلسفی اور کامیاب سیاستدان تھے۔ انہیں فلسفہ، تاریخ اور عمرانیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ مقدمہ فی التاریخ (مقدمہ ابن خلدون) ہے۔

[2]۔ Giordano Bruno: گیوردانو برونو (1548ء-1600ء) ایک اطالوی فلسفی اور ریاضی دان تھا جو اپنی جوانی میں راہب تھا لیکن روشن خیالی کے باعث کلیسا نے اس پر کفر کا الزام لگایا اور اسی جرم کی پاداش میں اسے زندہ جلا دیا گیا۔

ہے۔ گوئٹے[1] پر ایران کی صوفیانہ شاعری کا بہت گہرا اثر ہے۔ اسی طرح دانتے کی Divine Comedy پر ابن عربیؒ[2] کا اثر ہے۔

(A History of Muslim Philosophy, vol. 2, p.1338 - 40)

مختصراً یہ کہ مسلمانوں کی ذہنی اور تعلیمی کامیابیوں کا مغربی ذہن پر گہرا اثر تھا۔ مسلم دنیا سے منتقل ہونے والے علم نے مغرب پر گہرے اثرات مرتب کیے مثال کے طور پر:

(i)۔ اس سے انسان دوستی کی تحریک (Humanistic Movement) شروع ہوئی۔

(ii)۔ تاریخی علوم (Historical Sciences) شروع ہوئے۔

(iii)۔ سائنسی تجربہ و مشاہدہ شروع ہوا۔

(iv)۔ فلسفہ اور عقیدہ میں باہمی تفہیم پیدا ہوئی۔

(v)۔ تصوف کی تحریک نے جنم لیا۔

(vi)۔ کانٹ تک مغرب اسلامی فکر سے متاثر رہا وغیرہ۔

---

[1]۔ Johann Wolfgang von Goethe: گوئٹے (1749ء-1832ء) ایک جرمن ادیب تھا جو شاعری، ڈراما، ادب، فلسفہ، الٰہیات، غرض بے شمار اصناف میں لکھتا رہا۔

[2]۔ شیخ اکبر محی الدین محمد بن العربی الحاتمی الطائی الاندلسیؒ (1165ء-1240ء) دنیائے اسلام کے ممتاز صوفی، عارف، محقق اور علوم کا بحر بیکنار رہیں۔ اسلامی تصوف میں آپؒ کو شیخ اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپؒ کی تصانیف میں فصوص الحکم اور الفتوحات مکیہ بہت مشہور ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بال جبریل، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: تاج کمپنی، ۱۹۳۵ء۔

۲۔ پیام مشرق، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۲۳ء۔

۳۔ تاریخ الامم والملوک: تاریخ طبری، امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ ترجمہ ڈاکٹر محمد صدیق ہاشمی۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ زادالمعاد، حافظ ابوعبداللہ بن قیم جوزیؒ۔ دارالسلام، لندن، ۲۰۰۳ء۔

۵۔ سنن ابو داؤد، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

۶۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۷۔ صحیح مسلم، امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج نیشاپوری ترجمہ علامہ وحیدالزمان۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۸۔ ضرب کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: کتب خانہ طلوع اسلام، ۱۹۳۶ء۔

۹۔ کشف المحجوب، حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ منقولہ حضرت خواجہ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ ترجمہ ایف ڈی گوہر۔ لاہور: احمد ربانی ایم اے، ۱۹۷۲ء۔

۱۰۔ مشکوٰۃ المصابیح، حضرت شیخ ولی الدین الخطیب التبریزیؒ ترجمہ مولانا محمد صادق خلیلؒ۔ لاہور: مکتبہ محمدیہ، ۲۰۰۵ء۔

۱۱۔ نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض۔ لاہور: فرید بک، ۲۰۱۰ء۔

۱۲۔ A History of Industrial Chemistry by F. S. Taylor. London: Heinmann, 1957.

۱۳۔ A History of Muslim Philosophy by M. M. Sharif. Otto Harrassowitz: Kempten, 1963.

۱۴۔ A Study of History: Abridgement of Volumes I to VI. by A. J. Toynbee. New York: Oxford University Press, 1947.

۱۵۔ al-Ghazali: The Mystic by Margaret Smith. London: Luzac & Co., 1946.

۱۶۔ Arabian Medicine and Its Influence on the Middle Ages by D. Campbell. London: Routledge, 2000.

۱۷۔ Dictionary of Scientific Biography by W. Hartner. New York: Charles Scribner's Sons, 1970

۱۸۔ Early Arabic Pharmacology: An Introduction Based on Ancient and Medieval Sources by M. Levey. Leiden: Brill, 1973.

۱۹۔ Encyclopedia Britannica. Chicago: The University of Chicago, 1988.

۲۰۔ Historical Eclipses and Earth's Rotation by F. Richard Stephenson. New York: Cambridge University Press, 1997.

۲۱۔ Historical Facts for the Arabian Musical Influence by Henry George Farmer. London: Ayer Publishing, 1988.

۲۲۔ History of Project Management by Y. Chiu. Netherlands: Eburon Press, 2010.

۲۳۔ Introduction to Islamic Civilisation by R. M. Savory. New

Dehli: Vikas, 1980.

۲۴۔ Introduction to the History of Science by Goerge Sarton. New York: Huntington, 1975.

۲۵۔ Islam and Divine Comedy by M. A. Palacios. London: Frank & Cass, 1968.

۲۶۔ Makers of Chemistry by E. Holmyard. Oxford: Clarendon Press, 1931.

۲۷۔ Mathematical Geography by E. S. Kennedy. Routledge, 1996.

۲۸۔ Nozhat Al Mushtak fi Ikhtrak Al-Afak by al Idrisi. Romae in Typographia Medicea, 1592.

۲۹۔ Papermaking: The History and Technique of an Ancient Craft by Dard Hunter. New York: Dover Books, 1978.

۳۰۔ Science and Medicine in the Legacy of Islam by M. Meyerhof. London: Oxford University Press, 1931.

۳۱۔ Science and Technology in Islam, The Touch of Midas by M. A. Kettani. Manchester: Manchester University Press, 1984.

۳۲۔ Studies in Medieval Islamic Technology: From Philo to al-Jazari - from Alexandria to Diyar Bakr by D. R. Hill. London: Routledge, 1998.

۳۳۔ The Arabic Hegemony: A History of Mathematics by C. B. Boyer. John Wiley & Sons, 1991.

۳۴۔ The Arabs: A Short History by Philip Hitti. London: Macmillan, 2000.

۳۵۔ The Crest of the Peacock: Non-European Roots of Mathematics by George Gheverghese Joeph. London: Princeton University Press, 2010.

۳۵۔ The History of Western Philosophy by Bertrand Russell. London: G.Allen & Unwin Ltd.Segal, A. (1996, June). Why Does the Muslim World Lag in Science? The Middle East Quarterly, 3(2), 61-70.

۳۶۔ The Impact of Science on Soceity by Bertrand Russell. London: Routledge Taylor & Francis Group, 1976.

۳۷۔ The Making of Humanity by R. Briffault. London: G.Allen & Unwin Ltd, n.d.

۳۸۔ The Story of Civilization by W. J. Durant. New York: MJF Books, 1993.

۳۹۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Islamic_contributions_to_Medieval_Europe

۴۰۔ http://www-history.mcs.st-andrews.ac.uk/Biographies/Al-Jayyani.html

۴۱۔ https://www.jstor.org/stable/230255?seq=1#page_scan_tab_contents

۴۲۔ https://www.wsfcs.k12.nc.us/cms/lib/NC01001395/Centricity/Domain/8062/watson_AAR_and_its_diffusion.pdf

۴

جدید عصری علوم کا ارتقا



The new Philosophy calls all in doubt,
The Element of fire is quite put out
(فلسفہ نو شبہے کی طرف بلاتا ہے)
(شعلہ آتش ہو چکا ہے ٹھنڈا)

قرون اولیٰ کے مسلمان بڑی کامیابی سے اپنے وقت کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہوئے اورانہوں نے انسانی فکر وعمل کی سرحدوں کو آگے دھکیل کر دم لیا۔ وہ بڑا عرصہ مہذب دنیا پر چھائے رہے اور ذہنی ارتقاء کے تقریباً سب شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کرنے لگے۔ لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ انحطاط پذیر ہوتے چلے گئے اور بالآخر گہری نیند میں ڈوب گئے۔ جب وہ اپنے زمانے کے چیلنجوں سے مقابلے کی صلاحیت سے محروم ہوئے تو مغرب اور بالخصوص یورپ نے ان کے ذہنی اور سائنسی ورثے سے خوب فائدہ اٹھایا اور ان کی دریافتوں کو مزید آگے بڑھانے لگے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مسلمانوں نے یونانی علم میں مہارت حاصل کرکے اسے مزید آگے بڑھایا تھا۔ آیئے اس امر کی تحقیق کریں کہ عہد متوسط اور جدید دور میں مغرب میں کیا بنیادی علمی وفکری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں:

۱۔ سائنس کا ظہور

جدید مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ عالمی نقطۂ نظر سے سائنسی انقلاب ایک انقلابی تبدیلی تھی۔ 1611ء میں انگریز شاعر جان ڈون[۱] نے لکھا:

The new Philosophy calls all in doubt,
The Element of fire is quite put out;
The Sun is lost, and th’earth, and no man's wit
Can well direct him where to look for it.
(*An Anatomy of the World*)

---

[۱]۔ John Donne: جان ڈون (1572ء–1631ء) ایک برطانوی شاعر اور گرجا کا کلرک تھا۔

(فلسفہ نو شبہے کی طرف ہے بلاتا)
(شعلہ آتش ہو چکا ہے ٹھنڈا)
(آفتاب ہو گیا ہے کہیں گُم)
(عقل حیراں ہے کہاں سے اسے لائیں)

سائنسی انقلاب سے جدید سائنس کا ظہور ہوا۔ جب ریاضی (Mathematics)، فزکس (Physics)، فلکیات (Astronomy)، حیاتیات (Biology) اور کیمیا (Chemistry) میں ہونے والی پیش قدمی نے انسان، معاشرے اور فطرت کے بارے میں پہلے مرّوج نظریات تبدیل کر دیئے۔ یورپ میں سائنسی انقلاب، نشاۃٔ ثانیہ[1] (Renaissance) کے اواخر میں آیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہا۔ اس نے ذہنی اور معاشرتی تحریک کو متاثر کیا جسے روشن خیالی (Enlightenment) کہا جاتا ہے۔ 1543ء میں کاپرنیکس کی 'De Revolutionibus Orbium Coelestium' (On the Revolutions of Heavenly Spheres) شائع ہوئی تو اسے عام طور پر سائنسی انقلاب کا آغاز کہا گیا۔ سائنسی انقلاب کا پہلا مرحلہ گیلیلیو کی کتاب 'Dialogue Concerning the Two Chief World Systems' کی اشاعت سے مکمل ہوا۔ نیوٹن[2] کی کتاب Principia[3] کی اشاعت کو اس انقلاب کی تکمیل سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں قوانین حرکت اور کششِ ثقل (universal gravitation) کے فارمولے بیان کئے گئے ہیں۔

سائنسی انقلاب یونانی علوم پر مبنی تھا جسے رومن/ بازنطینی (Roman/Byzantine) اور عہد

[1]۔ Renaissance: نشاۃ ثانیہ قرون وسطیٰ میں یورپ سے اٹھنے والی ایک تحریک تھی جو چودہویں عیسوی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک جاری رہی۔ اس کی ابتدا اٹلی سے ایک ثقافتی تحریک کے طور پر ہوئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے یورپ تک پھیل گئی۔

[2]۔ Sir Isaac Newton: سر آئزک نیوٹن (1673ء-1727ء) ایک مشہور معروف طبیعیات دان، ریاضی دان، ماہر فلکیات، فلسفی اور کیمیا دان تھا جس کا شمار تاریخ کی انتہائی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔

[3]۔ 'پرنسپیا' سر آئزک نیوٹن کی ایک بہت معتبر کتاب ہے جس کا پورا نام 'Mathematical Principles of Natural Philosophy' ہے۔ اس میں نیوٹن کے قوانین حرکت اور قانون کشش بیان کئے گئے ہیں۔

متوسط کے اسلامی علوم نے مزید ترقی و نفاست سے ہمکنار کیا۔ اس کا بطور انقلاب اس لیے حوالہ دیا جاتا ہے کہ اس عہد کی بصیرتوں اور دریافتوں نے فطرت کی ایک نئی انقلابی سوچ کو ابھارا اور یونانی سوچ کی جگہ لے لی جسے اس سے پہلے غلبہ حاصل رہا تھا۔

سترہویں صدی عیسوی میں 'سائنسی طریق کار' (systematic experimentation) کی واضح تصریح اور اس کا اطلاق ہو رہا تھا اور اس دور کی عالمی سائنسی برادری میں باضابطہ تجربات کی ایک تحقیقی روایت رفتہ رفتہ جگہ بنا رہی تھی۔ فطرت کو سمجھنے کے لیے ارسطا طالیسی استخراجی طریق کار (Aristotelian deductive approach) کی جگہ استقرائی طریق کار (inductive approach) کے استعمال کا فلسفہ لے رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں معلوم حقائق (known facts) کی بہتر تفہیم اور مزید آگے بڑھنے کے نئے امکانات پیدا ہونے لگے۔ اس طرح تجربیت (Empiricism)، سائنس کا ایک بہترین جزو بن گئی۔

فرانسس بیکن[۱] نے جسے بابائے تجربیت (father of empiricism) کہا جاتا تھا، سائنسی انقلاب کی فلسفیانہ بنیاد وضع کی۔ اس نے سائنسی تحقیق کے لیے استقرائی طریق ہائے کار قائم کر کے انہیں مقبولیت عامہ کی راہ پر ڈال دیا۔ اسی لیے اسے 'بیکونین طریق کار' (Baconian method) یا صرف 'سائنسی طریقہ' کہا جانے لگا۔ وہ تحصیل علم (سماوی اور انسانی) کے طریق کار کی اصلاح کی پُرزور وکالت کرتا تھا جس کا نام اس نے 'Instauration Magna' (عظیم عمل بحالی) رکھا۔ اس کی کتاب 'Novum Organum'[۲] 1620ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اس نے دعویٰ کیا کہ انسان فطرت کا ترجمان اور وزیر ہے۔ 'علم' اور 'قوت انسانی' ہم معنی ہیں۔ اثرات، آلات اور معاونین (helps) سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کچھ کرتے ہوئے صرف ایک طریقہ 'لاگو' (apply) کرتا ہے، باقی ماندہ کام فطرت کرتی ہے جو

۱۔ Francis Bacon: فرانسس بیکن (1561ء-1626ء) ایک برطانوی وکیل اور فلسفی تھا۔ وہ 1582ء میں بار کا رکن بنا اور 1584 میں رکن پارلیمنٹ منتخب ہوا۔ اس کی شہرت کی وجہ اس کی فلسفیانہ اور ادبی تحریریں ہیں۔

۲۔ Novum Organum Scientiarum بیکن کے فلسفیانہ نظریات پر مشتمل کتاب ہے جو پہلی دفعہ 1620ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں وہ منطق کی ایک نئی قسم کی تفصیل بتاتا ہے جسے وہ 'قیاس' کے پرانے طریقوں سے برتر سمجھتا ہے اسے اب 'بیکونین طریقہ' کہا جاتا ہے۔

اندرونی طور پر کارکردگی دکھاتی ہے۔فطرت سے صرف اس وقت کام لیا جاسکتا ہے جب اس کے اصول وضوابط کے مطابق کام کیا گیا ہواور صرف یہی طریقِ کار ہے جس کے ذریعے 'تخلیق پر انسان کی سلطنت' قائم کی جاسکتی ہے۔

ولیم گلبرٹ[1] اس طریقہ کار (methodology) کے ابتدائی وکیلوں میں سے تھا۔اس نے مروج ارسطا طالیسی فلسفے اور یورنیورسٹی تدریس کے متکلمانہ طریقے کی پُرزور مخالفت کی۔اس کی کتاب 'De Magnete' میں جو 1600ء میں چھپی سخت گیرانہ طریقے کی حمایت کی گئی ہے اور استقرائی طریق کے تجربات کی وضاحت کرتے ہوئے مقناطیسیت کے قدیم نظریات کو مسترد کیا گیا ہے۔

گیلیلیو نے واضح طور پر کہا کہ قوانین فطرت ریاضیاتی ہیں۔اس نے اپنی کتاب ' The Assayer میں لکھا ہے کہ فلسفہ اس عظیم کتاب میں لکھا گیا ہے جسے ریاضی کی زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔اس کے حروف، مثلثیں (triangles)، دائرے (circles) اور دیگر جیومیٹرائی اشکال (geometric figures) ہیں۔

(Renaissance Genius, p. 219.)

اس کی کتابیں سائنس کی، فلسفہ اور مذہب دونوں سے بالآخر ہونے والی علیحدگی کی طرف ایک قدم تھیں جو کہ انسانی فکر میں ایک اہم قدم تھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں یورپی سائنسدان زمین کے طبیعیاتی مظہر کی پیمائش کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مقداری (quantative) پیمائشوں کا اطلاق کرنے لگے۔گیلیلیو نے پرزور طریقے سے یہ موقف اختیار کیا کہ ریاضی نے ایک قسم کا ناگزیر تیقن (necessary certainty) مہیا کیا ہے جس کا خدا کے تیقن سے تقابل کیا جاسکتا ہے۔

سائنسی انقلاب نے سائنسی تفتیش وتحقیق کی ادارہ سازی کی طرف رہنمائی کی جس کے لیے ایسی سوسائٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا جوان افکار اور تجربات کی نشرواشاعت کا بندوبست کریں۔

---

[1]۔ William Gilbert: ولیم گلبرٹ (1544ء۔1603ء) ایک انگریز معالج، ماہر طبیعیات اور فلسفی تھا۔

ایسی اولین سوسائٹی، رائل سوسائٹی آف لندن[۱] تھی۔ 'فلاسوفیکل سوسائٹی آف آکسفورڈ' (Philosophical Society of Oxford) کے نام سے ایک گروپ قائم کیا گیا جو چند قواعد کے تحت کام کرتا تھا۔ یہ گروپ 'بوڈلیین' (Bodleian) لائبریری کے تحت ہی تھا۔ 1666ء میں فرینچ اکیڈمی آف سائنسز تشکیل پائی جس کے قواعد 1699ء میں لوئی چودھواں[۲] نے وضع کیے۔ اس کے بعد اس کا نام رائل اکیڈمی آف سائنس (Royal Academy of Sciences) رکھ دیا گیا۔ سوسائٹی نے اپنی مطبوعات 'فلاسوفیکل ٹرانزیکشنز' (Philosophical Transactions) کا آغاز 1665ء سے کیا۔ اس طرح اسے دنیا کا قدیم ترین اور طویل ترین سائنسی رسالہ بننے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ یہ پہلا رسالہ تھا جس نے 'ماہرانہ نظرِ ثانی' (peer review) کی روایت قائم کی۔

چند نئے نظریات نے جن میں سے کچھ اپنے اپنے شعبوں میں انقلابی نوعیت کے تھے، سائنسی انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تقریباً پانچ ہزار برسوں سے زمین کا 'ارض مرکز' (geocentric model) ماڈل بطور مرکز کائنات مقبول چلا آرہا تھا جسے تمام سائنسدان مانتے تھے۔ کاپرنیکس کی 1543ء میں لکھی ہوئی کتاب کے 'شمس مرکز تصور' (heliocentric model) کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی کہ سورج مرکز کائنات ہے۔ کیپلر اور گیلیلیو کی دریافتوں نے اس نظریئے کو ثقاہت دے دی۔ کیپلر ایک ماہر فلکیات تھا جس کا نظریہ یہ تھا کہ سورج کے گرد سیارے 'دائروی گردش' (circular orbits) نہیں کرتے بلکہ بیضوی (elliptical) شکل میں گھومتے ہیں۔ اس نے اپنے اس انکشاف کو سیاروی حرکت کے دیگر قوانین کے ساتھ ملا کر نظامِ شمسی کا ایک ماڈل بنایا جو کہ کاپرنیکس کے اصل سسٹم کی ایک اصلاح تھا۔ گیلیلیو کے اہم کارناموں میں اس کی کتاب 'میکانیات' (Mechanics)، دوربین

۱۔ فطری علوم کو فروغ دینے کے لیے صدر کونسل اور فیلوز پر مشتمل یہ سوسائٹی جسے عام طور پر رائل سوسائٹی (Royal Society of London) کہا جاتا ہے ایک علمی انجمن برائے سائنس ہے۔ یہ اب تک وجود میں آنے والی تمام سوسائٹیوں سے قدیم ترین ہے۔ اس کی بنیاد کنگ چارلس دوم نے نومبر 1662ء میں رکھی تھی۔

۲۔ Louis XIV: لوئی چودھواں (1638ء-1715ء) فرانس کا بادشاہ تھا جو 1643ء سے لے کر 1715ء تک حکمران رہا۔

کی مدد سے اس کے مشاہدات اور 'شمس مرکز نظام' (heliocentric system) کے اثبات کے لیے اس کی تحریریں شامل تھیں۔ کیپلر اور گیلیلیو کی دریافتوں کے مجموعے کی بدولت 'شمس مرکز نظام' نے قبولیت عامہ حاصل کرلی۔

نیوٹن کی کتاب 'Principia' نے حرکت اور کششِ ثقل کے قوانین وضع کیے۔ جنھوں نے اگلی تین صدیوں کے لیے طبیعیاتی کائنات (physical universe) سے متعلق سائنسی فکر کو غالب کردیا۔ نیوٹن نے کیپلر کے قوانین حرکتِ سیارگاں سے اشتقاق اور اپنے ریاضیاتی بیانِ کششِ ثقل سے کائنات کے 'شمس مرکز ماڈل' کے بارے میں آخری شکوک بھی رفع کردیئے۔ اس کے قوانین حرکت نے میکانیات کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کردی۔ اس کے 'کشش ثقل کے قانون' (law of universal gravitation) نے ارضی اور سماوی میکانیات کو یکجا کر کے ایک عظیم نظام پیش کردیا جس کی بدولت وہ پوری دنیا کو ایک ریاضیاتی فارمولے میں بیان کرنے کے قابل ہوگیا۔ 'پرنسپیا' (Principia) میں نیوٹن نے نظریہ کششِ ثقل (gravitation) اور حرکت کے تین ہمہ گیر قوانین وضع کیے، جنھوں نے صنعتی انقلاب کے دوران کئی پیش قدمیاں کیں۔

یونانی طبیب 'جالینوس'[1] یورپی طب پر ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک چھایا رہا تاوقتیکہ ایک اطالوی طبیب آندریاس وزالیوس[2] نے تجربات پیش کرکے 'جالینوسی ماڈل' (Galenic model) کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ اس کی کتاب 'De humani corpris fabrica' علم تشریح الاعضا برائے انسان کے بارے میں بہت معتبر تصنیف ہے۔ ایسی ہی ایک معتبر کتاب ولیم ہاروے نے لکھی جو 1628ء میں 'De Motu Cordis' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ہاروے نے انسانی دل کی ساخت کا تجزیہ کرکے شریانوں کا ایسا نظام پیش کیا اور دکھایا کہ ان کی دھڑکن کا انحصار بائیں مجوف حصے (left ventricle) کے سکڑاؤ پر ہوتا ہے جبکہ دائیں مجوف

---

[1] Claudius Galenus: جالینوس (129ء - 216ء) ایک یونانی طبیب اور فلسفی تھا۔ اس نے تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف طب، منطق، صرف ونحو، اخلاقیات، فلسفہ اور ادب پر لکھیں۔

[2] Andreas Vesalius: آندریاس وزالیوس (1514ء۔ 1564ء) ایک ماہر تشریح الابدان اور طبیب تھا۔ اسے جدید علم تشریح الابدان کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

حصے کا سکڑاؤ اپنے خون کے دباؤ کو 'ریوی شریان' (pulmonary artery) میں دھکیل دیتا ہے۔ ہاروے نے مشاہدہ کیا کہ دونوں جوف تقریباً بیک وقت حرکت کرتے ہیں نہ کہ اپنے اپنے طور پر متحرک ہوتے ہیں جیسا کہ اس کے پیشروؤں نے سمجھ رکھا تھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کے دوران علم کیمیا، سائنسی فکر کا اہم پہلو بنتا چلا گیا۔ 'جورجیوس ایگریکولا'[1] نے خام دھاتوں کے استخراج کے پیچیدہ طریق کار پر روشنی ڈالی۔ اس سلسلے میں ایک ضخیم کتاب 'De re Metallica' لکھی جو 1556ء میں شائع ہوئی۔ رابرٹ بوائل[2] نے دھاتوں کو مصفا (صاف) کرنے کے جدید ترین طریقوں کی وضاحت کی۔ 'قانون بوائل' بتاتا ہے کہ مطلق دباؤ (absolute pressure) اور گیس کے حجم میں 'برعکس متناسب' (inversely proportional) تعلق ہوتا ہے بشرطیکہ درجہ حرارت بند نظام کے اندر یکساں رہے۔ اس نے 1661ء میں 'The Sceptical Chymist' لکھی جس میں اس نے بتایا کہ ہر امرِ واقعہ متحرک ذرات کے باہمی ٹکراؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ذرات (ایٹمز) سالمات (molecules) اور کیمیائی تعامل کے چند قدیم ترین تصورات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ جدید کیمسٹری کی تاریخ کی ابتدا بن گئی۔

بصریات (optics) کے شعبے میں کیپلر نے 1604ء میں 'Astronamiae Pars Optica' (Optical Part of Astronomy) لکھی جس میں اس نے 'کلیہ مربعِ معکوس' (inverse-square law) کی تفصیل بیان کی۔ یہ کلیہ روشنی کی شدت (intensity of light)، مسطح اور کروی شیشوں کے انعکاس (reflection by flat and curved mirrors) اور مہین سوراخ والے کیمروں (pinhole cameras) کے اصولوں کا تعین کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بصریات (optics) کے فلکیاتی مضمرات مثلاً اختلافِ منظر اور اجرام فلکی کی

---

[1] Georgius Agricola: جورجیوس ایگریکولا (1494ء-1555ء) ایک جرمن سکالر اور سائنسدان تھا جسے علم المعدنیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

[2] Robert William Boyle: رابرٹ بوائل (1627ء-1691ء) ایک برطانوی سائنسدان اور مؤجد تھا۔ اسے اس کے قانون بوائل کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ رابرٹ بوائل کو جدید کیمیا کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

ظاہری ضخامت کا بھی تعین کرتا ہے۔ 'ولبرورداسنلیوس'[1] نے اپنی 1621ء میں لکھی ہوئی کتاب 'Snells law' میں ریاضیاتی قانونِ انعطاف (reflection) ثابت کیا۔ بعدازاں ڈیکارٹ نے قانونِ انعکاس دریافت کیا اور نیوٹن نے روشنی کے انعطاف کی تحقیق کرتے ہوئے ثابت کیا کہ روشنی ذرّات پر مشتمل ہے جو نسبتاً کثیف مادے کی طرف رفتار بڑھاتے ہوئے منعطف ہوتے ہیں۔ مگر اسے 'انکسارِ روشنی' (differaction of light) کی وضاحت کرنے کے لیے ذرات کو لہروں کے ساتھ ملانا پڑا۔

ولیم گلبرٹ نے اپنی کتاب 'De Magnete' میں انکشاف کیا کہ متعدد مادے برقی خصوصیات کے اظہار کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ رابرٹ بوائل نے ولیم گلبرٹ کی بنائی ہوئی اس فہرست میں برقی خصوصیت رکھنے والے کئی اور مادوں کا اضافہ کر دیا۔ 'اوٹو فان گوئرک'[2] نے ایک ابتدائی قسم کا ساکت جنریٹر ایجاد کیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں محققین نے الیکٹروسٹیٹک جنریٹر (electrostatic generator) کی رگڑ سے بجلی پیدا کرنے کے عملی طریقے وضع کر لیے۔ 1729ء میں سٹیفن گرے[3] نے ثابت کر دکھایا کہ بجلی کو دھاتی تاروں (فلامنٹس) میں سے گزارا جا سکتا ہے۔

اس عہد میں سائنسی تحقیق کے لیے متعدد آلات، پیمائش کے پیمانے اور شمار کنندہ (Stephen Gray) بنائے جا چکے تھے جو علمِ سائنس کی توسیع کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔ جان نیپئر[4] نے 'لوگارتھم' جدول متعارف کروائے اور 'ایڈمنڈ گنٹر'[5] نے اولین 'اینالاگ آلہ' بنایا جو گنتی کرنا آسان بنا دیتا تھا۔ پاسکل نے 1642ء میں مشینی کیلکولیٹر ایجاد کیا۔ 1642ء میں مشینی

---

[1] ۔Willebrord Snellius: ویلبر وورداسنلیوس (1580ء-1626ء) ایک ماہر ریاضی دان اور فلکیات تھا۔

[2] ۔Otto von Guericke: آٹو فان گوئرک (1602ء-1681ء) ایک جرمن سائنسدان، موجد اور سیاست دان تھا۔

[3] ۔Stephen Gray: سٹیفن گرے (1666ء-1736ء) ایک انگریز ماہر فلکیات اور برقیات تھا۔

[4] ۔John Napier: جان نیپئر (1550ء-1617ء) ایک ماہر ریاضی دان، طبیعات دان اور ماہر فلکیات تھا۔

[5] ۔Edmund Gunter: ایڈمنڈ گنٹر (1581ء-1626ء) ایک انگریز ماہر ریاضی دان، جغرافیہ دان اور ماہر فلکیات تھا جسے لاگرتھم کا آلہ متعارف کروانے کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

کیلکو لیٹروں کو ترقی دینے کی مہم شروع کی، پہلے یورپ میں اور پھر دنیا بھر میں یہ کام شروع کر دیا۔ لائبنیز [۱] مشینی کیلکولیٹروں کے شعبے کے ذہین ترین موجدوں میں سے ایک بن گیا اس نے ثنائی نمبر نظام (binary number system) کو بھی نفاست سے ہمکنار کیا جو عملاً جدید کمپیوٹر سازی کی بنیاد ہے۔

سب سے پہلا ورکنگ سٹیم انجن اس کے موجد 'ٹامس سیوری' [۲] نے 1698ء میں پیٹنٹ کرایا اور دعویٰ کیا کہ یہ کانوں میں پانی باہر پمپ کرسکتا ہے جبکہ ٹامس نیوکامن [۳] نے پانی نکالنے کے لیے اس سے بہتر عملی سٹیم انجن بنایا جس نے بالآخر صنعتی انقلاب کی طرف رہنمائی کی۔ 1778ء میں جیمز واٹ [۴] اور میتھو بولٹن [۵]، نیوکامن کے سٹیم انجن کی کارکردگی بڑھا کر اسے مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ نیا انجن اس سے صرف 20 سے 25 فیصد زیادہ کوئلہ فی 'ہارس پاور' استعمال کرتا تھا۔ ابراہام ڈاربی اول [۶] نے بلاسٹ فرنیس میں اعلیٰ درجے کا لوہا تیار کرنے کا طریقہ متعارف کروایا جس میں نباتاتی یا حیوانی مادوں سے بنے ہوئے 'چارکول' کی بجائے معدنی کوئلے سے آگ لگائی جاتی تھی۔ یہ لوہا بنانے کی طرف ایک بڑا قدم تھا۔ یہ لوہا صنعتی انقلاب کے لیے خام مال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

۱۔Gottfried Wilhelm Leibniz: گوٹفریڈ ویلہم لائبنیز (1646ء-1716ء) ایک جرمن ریاضی دان اور فلسفی تھا۔ تاریخ ریاضی اور تاریخ فلسفہ میں اس کا ایک نمایاں مقام ہے۔

۲۔Thomas Savery: ٹامس سیوری (1650ء-1715ء) ایک انگریز انجنیئر اور موجد تھا جس نے سب سے پہلے سٹیم انجن متعارف کروایا۔

۳۔Thomas Newcomen: ٹامس نیوکامن (1664ء-1729ء) ایک انگریز موجد تھا جس نے پہلا عملی سٹیم انجن متعارف کروایا۔

۴۔James Watt: جیمز واٹ (1736ء-1819ء) ایک برطانوی موجد او مکینیکل انجینئر تھا جس نے بھاپ کے انجن کو خاطر خواہ ترقی دی۔

۵۔Matthew Boulton: میتھو بولٹن (1728ء-1809ء) ایک انگریز کارخانہ دار اور جیمز واٹ کا کاروباری شراکت دار تھا۔

۶۔Abraham Darby-I: ابراہیم ڈاربی اول (1678ء-1717ء) ایک انگریز موجد تھا جس نے انتہائی اعلیٰ معیار کا لوہا تیار کرنے کا طریقہ کار متعارف کروایا۔

صنعت کاری نے پارچہ بافی (textile industry) کے شعبے میں انقلاب برپا کر دیا۔ پہلے پہل کپڑا گھروں میں (بطور گھریلو صنعت) بنایا جاتا تھا۔ 1764ء میں 'ہرگریوز'[۱] نے گھومنے والا ایسا پرزہ (spinning jenny) بنایا جس سے ایک آدمی بیک وقت دھاگے کی متعدد چرخیاں تیار کرنے کے قابل ہو گیا۔ ادھر ہنری بسمر[۲] نے 1850ء کے عشرے میں بڑے پیمانے پر فولاد سازی کے لیے ایک سستا طریق کار وضع کر لیا۔ لوہا اور فولاد، دونوں اس صنعت کو مزید بڑھانے کے لیے بہت اہم عناصر تھے جن سے آلات، اوزار، مشینیں، جہاز، عمارتیں اور بنیادی ڈھانچے بننے لگے۔

سٹیم انجن کی ایجاد سے پہلے خام مال اور تیار شدہ ساز و سامان خشکی پر گدھوں اور گھوڑوں سے کھینچے جانے والی ویگنوں کے ذریعے اِدھر سے اُدھر پہنچایا جاتا تھا اور نہروں اور دریاؤں میں کشتیوں کے ذریعے بھیجا جاتا تھا۔ رابرٹ فلٹن[۳] نے اوّلین تجارتی پیمانے پر کامیاب طور پر بھاپ سے چلنے والی کشتی بنائی اور اس کے بعد بھاپ سے چلنے والے جہاز بنے جو بحر اوقیانوس کے آر پار سامان ڈھونے لگے۔ رچرڈ ٹریویتھک[۴] نے پہلا ریلوے سٹیم 'لوکوموٹیو' (انجن) تیار کیا۔ 1830ء میں لیور پول (Liverpool) اور مانچسٹر (Manchester) ریلوے نے اولین باقاعدہ ٹائم ٹیبل کی حامل پسنجر سروس شروع کی۔ 1850ء میں برطانیہ کے پاس 6000 میل سے زیادہ طویل ریل روڈ ٹریک تھا جبکہ 1820ء کے لگ بھگ جان میک ایڈم[۵] نے

۱۔ James Hargreaves: جیمز ہرگریوز (1720ء-1778ء) ایک برطانوی مصور اور مؤجد تھا جس نے پہلے پہل گھومنے والا پرزہ (spinny jenny) متعارف کروایا۔

۲۔ Henry Bessemer: ہنری بسمر (1813ء-1898ء) ایک انگریز مؤجد تھا جس نے اعلیٰ معیار کا سٹیل تیار کرنے کا طریقہ کار متعارف کروایا۔

۳۔ Robert Fulton: رابرٹ فلٹن (1765ء-1815ء) ایک امریکی انجنیئر اور مؤجد تھا جس نے پہلی دفعہ بھاپ سے چلنے والی کشتی متعارف کروائی۔

۴۔ Richard Trevithick: رچرڈ ٹریویتھک (1771ء-1833ء) ایک برطانوی مؤجد اور کان کن انجنیئر تھا۔

۵۔ John Loudon McAdam: جان لودون میک آدم (1756ء-1836ء) ایک سکاٹش انجنیئر اور روڈ بلڈر تھا جس نے سڑکیں تعمیر کرنے کا انتہائی مؤثر طریقہ macadamisation متعارف کروایا۔

سڑکوں کی تعمیر کا نیا طریق کار وضع کر لیا تھا اس طرح کچے اور کیچڑ والے راستوں کی بجائے ہموار پختہ اور زیادہ دیر پا سڑکیں وجود میں آ گئیں۔

1837ء میں ولیم کک[1] اور چارلس ویٹ سٹون[2] نے پہلی تجارتی برقی ٹیلی گراف پیٹنٹ کرائی اور 1866ء میں بحر اوقیانوس کے آر پار ٹیلی گراف کیبل بچھا دی گئی۔ صنعتی انقلاب کی بدولت بینکوں اور صنعتی فنانسروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور فیکٹری سسٹم بھی وجود میں آ گیا۔ جن کا دارومدار مالکان اور منتظمین پر تھا۔ 1770ء کے عشرے میں ایڈم سمتھ[3] نے 'ویلتھ آف نیشنز' (Wealth of Nations) شائع کر دی جس نے آزاد تجارت، ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت اور سرکاری مداخلت سے آزادی پر مبنی اقتصادی نظام کو فروغ دیا۔ صنعت کاری کا عمل وسیع سے وسیع تر ہونے لگا جو برطانیہ سے لے کر یورپ تک، بشمول بلجیئم، فرانس، جرمنی اور امریکہ تک پھیل گیا۔

سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ایک نیا علم طبیعیات ظہور پذیر ہوا۔ نیوٹن نے طبیعات کے پرانے تصورات کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا اور حرکت کے قوانین دریافت کر کے سائنسی انقلاب کی بنیادیں ڈال لیں۔ کاپرنیکس اور گیلیلیو نے نظام شمسی اور حرکتِ سیارگاں کے پرانے تصورات تبدیل کر دیئے۔ انجن کی ایجاد نے انسان کی زندگی کو آشنائے انقلاب کر دیا۔ پرنٹنگ پریس نے عوام کے لیے علم بآسانی دستیاب کر دیا۔ پنسلین (Penicillin) جیسی دواؤں نے زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ وسیع تر کر دیا۔ فن حرب (جنگی اسلحہ) میں

[1] William Fothergill Cooke: ولیم فوتھرجل کک (1806ء-1879ء) ایک انگریز مؤجد تھا جو برقی ٹیلی گراف کا شریک مؤجد تھا۔ اس نے بطور شراکت دار John Lewis Ricardo کے ساتھ دنیا کی پہلی عوامی برقی ٹیلی گراف کمپنی کی بنیاد رکھی۔

[2] Charles Wheatstone: چارلس ویٹ سٹون (1802ء-1875ء) ایک انگریز سائنسدان اور مؤجد تھا جو برقی ٹیلی گراف کا William Fothergill Cooke کے ساتھ شریک مؤجد تھا۔

[3] Adam Smith: آدم سمتھ (1723ء-1790ء) ایک برطانوی ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔ اس کی وجہ شہرت اس کی کتاب The Wealth of Nations ہے۔ سمتھ نے سونے چاندی کی بجائے تعلیم یافتہ، ہنرمند اور محنتی افراد کو کسی ملک کی اصل دولت قرار دیا۔

'الفریڈ نوبیل'[۱] کے ایجاد کردہ دھماکہ خیز ہتھیاروں نے تلواروں اور نیزوں کی جگہ لے لی۔ سائنسدانوں نے ذرّے (ایٹم) کا دل چیر کر نیوکلیئر (nuclear) اور تھرمو نیوکلیئر انرجی (thermonuclear energy) کو بندھن سے آزاد کر دیا۔ بڑے بڑے بحری جہازوں نے چھوٹی بادبانی کشتیوں کی جگہ لے لی اور پھر ہوائی جہاز وجود میں آ گئے۔ چند روز پہلے زمین سے پانچ کروڑ پچاس لاکھ میل دور مریخ (Mars) پر انسانی مشین اتر کر نئے فوٹو بھیج رہی ہے۔

عراق اور افغانستان کی جنگوں کو لے لیجئے۔ جن طیاروں نے 'تورابورا'[۲] پر بمباری کی انہوں نے امریکہ سے اڑان بھری تھی اور راستے میں کہیں رکے بغیر افغانستان میں تباہی و بربادی پھیلا دی۔ امریکہ میں نصب ٹیلی کمیونیکیشن کے ترقی یافتہ آلات کے ذریعے قندھار میں طالبان کی باہمی گفتگو بہ آسانی سنی جانے لگی۔ عراق جنگ میں امریکیوں نے دریائے فرات اور دریائے دجلہ کے صرف ان ستونوں پر بمباری کی جن پر مواصلاتی تاریں لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے یہ کام ایک ماہر سرجن کی طرح کیا جو مریض کا بڑی احتیاط سے آپریشن کرتا ہے اور غیر ضروری چیر پھاڑ سے گریز کرتا ہے۔ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے کہ وہ طیاروں اور مزائلوں کو تباہ و برباد کر دے اور دشمن کی توپوں میں کیڑے پڑیں اور ان مادی قوانین کو بھول گئے جو اس دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں۔ دراصل ہم ان قوانین کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔

۲۔ نئی جمہوری فکر

عہدِ روشن خیالی[۳] کے دوران 'معاہدۂ عمرانی' یا معاہدۂ سیاسی ظہور پذیر ہوا جس میں ماخذ معاشرہ

---

[۱]۔ Alfred Bernhard Nobel: الفریڈ نوبل (1833ء-1896ء) سویڈن کا کیمیادان، انجنیئر، فوجی جنگی ساز و سامان تیار اور ڈیزائن کرنے والا اور ڈائنامائیٹ کا موجد تھا۔ نوبل انعام اسی کے نام سے موسوم ہے۔

[۲]۔ مشرقی افغانستان میں موجود پہاڑی سلسلے کو تورابورا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں موجود غاروں کو طالبان اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ امریکہ نے افغانستان پر حملے کے دوران ان پہاڑوں پر انتہائی خطرناک ہتھیاروں کا استعمال کیا۔

[۳]۔ Enlightenment: عہد روشن خیالی، یا محض روشن خیال طرزِ عمل یا عہد معقولیت 1620ء سے لے کر 1780ء تک کے عشرے کو قرار دیا گیا ہے جس میں مغربی یورپ کی ثقافتی اور ذہنی قوتوں نے حاکمانہ رویے کی بجائے معقولیت، تجزیہ اور انفرادیت کے اظہار پر زور دینا شروع کیا۔

اور فرد پر حاکمیت کے جواز کے بارے میں سوالات ابھرے۔ معاہدۂ عمرانی (social contract) کے علمبرداروں کا نظریہ تھا کہ افراد واضح طور پر یا معنوی طور (tacitly) پر اپنی چند آزادیوں سے رضا مندی سے دستبردار ہو کر حکمران یا مجسٹریٹ کے اختیار کے سامنے سرنگوں ہوئے ہیں یا ایک اکثریت کے فیصلے کے سامنے سرنگوں ہوئے ہیں تا کہ ان کے باقی ماندہ حقوق کو تحفظ حاصل رہے۔ اس لیے فطری اور قانونی حقوق کے درمیان تعلق کا سوال، معاہدۂ عمرانی کے نظریئے کا ایک اہم پہلو ہے۔ اسے مجموعی فلاح کے لیے انفرادی قربانی کا اقرار بھی کہا جاتا ہے۔

نظریۂ معاہدۂ عمرانی کے ماخذ رواقی (Stoic) فلسفے اور رومن اور کلیسا کے قانون میں پائے جاتے ہیں۔ تاہم سترہویں صدی عیسوی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے دوران یہ حکومتوں کے سیاسی جوازوں کے سلسلے میں ایک نمایاں نظریئے کے طور پر اُبھر آیا تھا۔ نظریئے کا آغاز انسان کی اس کیفیت کے جائزے سے ہوتا ہے جس میں کوئی سیاسی نظم نہیں (یعنی وہ حالت فطری پر ہے)۔ اس میں فرد کے کام صرف ان کی ذاتی قوت اور ضمیر کے تابع یا تحت ہوتے ہیں۔ پھر یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک معقول فرد اپنی فطری رضا مندی کا کیوں اظہار کرے گا یا سیاسی نظام کے فوائد کے حصول کے لیے اپنی آزادی سے کیوں دستبردار ہوگا۔

'فرانسسکو سواریز'[1] اور ہوگو گروشئیش کو غالباً معاہدۂ عمرانی کے ابتدائی قائلین میں سے سمجھا گیا ہے۔ اس نے فطری قانون کے بارے میں اپنا نظریہ مطلق العنان بادشاہ کے آسمانی حقوق کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر کوئی فطری طور پر کسی حکومت کی اطاعت سے مبرا ہے اور یہ کہ عوام 'Sui juris' (اپنی ذاتی عملداری) میں ہیں اور بطور بنی نوع انسان حقوق رکھتے ہیں۔

ٹامس ہابز[2] نے اپنی کتاب 'Leviathan' میں کہا کہ حالت فطرت میں افراد کی زندگیاں الگ

---

[1]۔ Francisco Suarez: فرانسیکو سواریز (1548ء-1617ء) سپین کا ایک فلسفی اور ماہر دینیات تھا۔ اس کا شمار تحریک مکتبہ سلمانکا کی نمایاں شخصیات میں شمار ہوتا تھا۔

[2]۔ Thomas Hobbes: ٹامس ہابز (1588ء-1679ء) ایک برطانوی فلسفی تھا جس نے سیاسی فلسفے پر اپنے کام کے باعث شہرت پائی تھی۔

تھلگ، ناقص، ناگوار، وحشیانہ اور مختصر ہوتی تھیں۔ ان کی ایسی حالت تھی جس میں ذاتی مفاد اور ناپیدگی حقوق ومعاہدات کی وجہ سے باہمی روابط یا معاشرت وجود میں آنا ممکن نہیں تھی۔ زندگی نراجیت (anarchic) سے عبارت تھی (بغیر قائد یا تصورِ حاکمیت کے تھی)۔ اس حالت فطرت میں افراد 'غیر سیاسی اور غیر معاشرتی' تھے۔ اس حالت فطرت کے پیچھے پیچھے معاہدۂ عمرانی آ گیا۔ یہ معاہدہ ایک ایسا وقوعہ تھا جس کے دوران افراد اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے اپنے بعض انفرادی حقوق ترک کر دیئے تا کہ دوسرے بھی اپنے ایسے حقوق ترک کر دیں۔ اس کے نتیجے میں ریاست قائم ہوگئی جو ایک مطلق العنان (sovereign entity) وجود رکھتی تھی جس نے سماجی روابط کو باضابطہ بنانے کے لیے قانون تخلیق کرنا تھے۔ اس طرح انسانی زندگی 'سب کی سب کے خلاف جنگ' نہ رہی۔

جان لاک[۱] نے اپنے 'دوسرے مقالہ حکومت' (Second Treatise of Government) میں اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ حالت فطرت میں لوگ لازماً پابند اخلاق ہوں گے۔ اپنی زندگیوں یا املاک کی خاطر ایک دوسرے کو ضرر نہیں پہنچاتے ہوں گے۔ لیکن حکومت کی موجودگی کے بغیر ان کے پاس زخمی کیے جانے، غلامی سے بچنے اور اپنے حقوق کے تحفظ کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ انہیں خوف زدگی کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ جان لاک نے دلیل دی کہ افراد کو ایک ایسی ریاست کی تشکیل پر رضا مند ہونا پڑتا تھا جو ان کی زندگیوں، ان کی آزادی اور وہاں آباد لوگوں کی املاک کے تحفظ کے لیے ایک غیر جانبدار جج مہیا کرتی۔ اس نے مزید کہا کہ حکومت کے وجود کا جواز شہریوں کی طرف سے اس اقدام میں سے نکلتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی دفاع کا حق حکومت کو تفویض کر دیتے ہیں۔ اس کے نظریئے کے مطابق حکومت اپنے اختیارات عوام کی منشا میں سے اخذ کرتی ہے (عوام نے اپنے جو اختیارات حکومت کو تفویض کر دیئے ہوتے ہیں، وہی حکومت کے وجود کا جواز بن جاتے ہیں)۔

۱۔ John Locke: جان لاک (1632ء - 1704ء) ایک برطانوی فلسفی اور فزیشن تھا۔ وہ روشن خیالی کے ممتاز علمبرداروں میں سے تھا۔ اس نے نظریہ تجربیت پیش کیا۔ اس نظریہ کے مطابق تجربہ ہی تمام عالم اور ادراک کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

ژان ژاک روسو[1] نے اپنی کتاب معاہدۂ عمرانی میں آزادی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آزادی صرف اسی وقت ممکن ہے جب عوام کی براہ راست حکومت ہو۔ وہ پوری قانون سازی کر سکتے ہوں۔ جہاں عوامی حاکمیتِ اعلیٰ نا قابلِ تقسیم اور نا قابلِ منتقلی ہو۔ اس کی اشتمالیت (collectivism) اس کے بصیرت افروز تصورِ منشائے عمومی (General Will) میں بھرپور طور پر واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی شہری مغرور ومتکبر بنتے ہوئے اپنے حقیقی مفاد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اسے اس قانون کی اطاعت کا رویہ اپنانا ہوگا جو شہریوں نے بحیثیت قوم اجتماعی طور پر بنایا تھا۔ اس طرح قانون انفرادی آزادی کو محدود نہیں کرتا بلکہ یہ آزادی کا مظہر ہوتا ہے۔

چارلس لوئی ڈی مونٹیسکیو[2] نے اپنی کتاب 'The Spirit of the Laws' میں مقننہ (مجلس قانون ساز)، انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین تقسیم اختیارات کا نظریہ پیش کیا تا کہ تمام اختیارات ایک ہی بادشاہ یا کسی حکمران کے ہاتھ میں بے جا طور پر مرتکز نہ ہوں۔ اس طرح اس نے تحدید وتوازن (checks and balances) کے نظام کی پرزور وکالت کی جس کا دنیا کے متعدد دساتیر میں اہتمام کیا گیا ہے۔

انقلاب فرانس (1789ء-1799ء) نے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا اور ان آزادانہ اور انقلابی نظریات سے سرشار ہو کر ایک جمہوریہ قائم کر دی۔ اس انقلاب کو تاریخ انسانی کے اہم ترین واقعات میں سے شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے جدید تاریخ کے دھارے پر بے پناہ اثرات مرتب کیے تھے۔ انقلاب فرانس نے جاگیردارانہ نظام پر کاری ضرب لگائی جس کی وجہ سے فرد کو آزادی ملی۔ غیر منقولہ جائیداد کی بڑے پیمانے پر تقسیم عمل میں آئی۔ بالائی طبقے میں جنم

---

[1]۔ Jean-Jacques Rousseau: ژاں ژاک روسو (1712ء-1778ء) انسانی مساوات کا مبلغ اور ایک فلسفی تھا۔ جس کی تحریریں فرانس میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بنیں۔

[2]۔ Charles-Louis de Montesquieu: چارلس لوئی ڈی مونٹیسکیو (1689ء-1755ء) عہد روشن خیالی میں ایک فرانسیسی قانون دان اور سیاسی فلاسفر تھا۔ اسے نظریہ علیحدگی اختیارات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق قانون بنانے والے (مجلس قانون ساز)، قانون پر عمل درآمد کروانے والے (انتظامیہ) اور اس قانون کے مطابق فیصلہ کرنے والے (عدالت) افراد یا ادارے علیحدہ علیحدہ ہونے چاہیں۔

لینے (اشرافیہ) کی بنا پر ملنے والی مراعات منسوخ ہوئیں اور مساوات عمل میں آ گئی۔ بعد میں چلنے والی تقریباً تمام تحریکیں انقلاب فرانس کو اپنے لیے روشنی کا مینار سمجھتی رہیں۔ اس کے مرکزی نعرے Liberte, Egalite and Fraternite (آزادی، مساوات اور اخوت) جدید تاریخ کے بڑے بڑے بحرانوں کے دوران (ازمنہ وسطیٰ میں بجائے جانے والے) طُرّم (clarion call) کی آواز بن گئے۔ ان سے 1917ء کے انقلابِ روس نے بھی جوش اور ولولہ حاصل کیا۔

عالمی سطح پر انقلاب فرانس نے جمہوری مملکتوں کے ظہور کی رفتار تیز تر کر دی۔ یہ تمام جدید سیاسی نظریات کے ارتقاء کے لیے نقطۂ ماسکہ (focal point) بن گیا۔ جس نے دیگر نظریات کے علاوہ لوگوں کو کشادہ دلی (Liberalism)، انقلابیت (Radicalism)، قومیت (Nationalism)، اشتراکیت (Socialism)، مساواتِ زن و مرد (Feminism) اور مذہب و ریاست کی علیحدگی (Secularism) کی اشاعت و تبلیغ کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اس انقلاب سے متعلقہ دستاویزات میں 'اعلانِ حقوقِ انسان' (Declaration of the Rights of Man) کی دستاویز بھی نہایت اہم ثابت ہوئی جس نے حقوق انسانیت کے میدان کو وسیع تر کر کے اس میں عورتوں اور غلاموں کو بھی شامل کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اگلی صدی میں 'انسدادیت' (Abolitionism) اور عالمگیر حق رائے دہی (universal suffrage) کی تحریکوں کو زبردست تقویت ملی۔

اس ذہنی پس منظر نے آزاد خیالی پر مبنی جمہوریت (liberal democracy)، دستوریت (constitutionalism) اور قانون کی حکمرانی کے تصورات کی طرف رہنمائی کی۔ لبرل ڈیموکریسی ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ایک نمائندہ حکومت لبرل ازم کے ایسے اصولوں کے تحت کام کرتی ہے جن میں مختلف اور قابل شناخت سیاسی پارٹیوں کے مابین منصفانہ، آزادانہ اور مبنی بر مقابلہ انتخابات (الیکشن) ہوں۔ حکومت کے مختلف شعبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم ہو۔ روزمرہ کی زندگی میں ایک کھلے معاشرے کے طور پر قانون کی حکمرانی ہو۔ انسانی حقوق کا مساویانہ تحفظ ہو۔ سب کے لیے شہری حقوق، شہری آزادیاں اور سیاسی

آزادیاں ہوں۔ آزادی پسند جمہوریتیں اختیارات حکومت کے تعین کے لیے دستور پر انحصار کرتیں اور معاہدہ عمرانی کے تقدس کو ملحوظ رکھتی ہیں۔ آزادخیالی پر مبنی جمہوریت بیسویں صدی عیسوی کے دوران مسلسل نشوونما پاتی رہی۔ اس طرح دنیا کا ایک غالب سیاسی نظام بن گئی۔

قانون کی حکمرانی ایک اصول ہے۔ قوم کو اس اصول کی اطاعت کرنی چاہیے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ قوم سرکاری حکام کے من پسند فیصلوں کی اطاعت کرنا شروع کر دے۔ یہ اصول ابتداء میں معاشرے کے اندر قانون کو 'حاکمِ مجاز' (authority) ماننے کا ایک حوالہ دیتا ہے۔ یہ خاص طور پر رویئے پر ایک قدغن ہوتا ہے جس میں حکومت کا رویہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس اصطلاح کو البرٹ وین ڈائسی[۱] نے مقبولیت عامہ دلوائی تھی اگرچہ اس کا سراغ ارسطو کے افکار میں تلاش کیا جا سکتا ہے جس نے لکھا تھا کہ 'قانون کو حکمران' ہونا چاہیے۔ قانون کی حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص بشمول قانون سازی کرنے والوں کے، قانون کا تابع ہے۔

1610ء میں برطانونی پارلیمنٹ کے دارالعوام (House of Commons) نے شاہِ انگلستان جیمز اول[۲] کو ایک خط بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ ہز میجسٹی (His Majesty) کی رعایا حکمرانی قانون سے رہنمائی پاتی ہے اور وہ اسی کے تابع ہیں جو سربراہ اور ارکان دونوں کو بتاتا ہے کہ کون سا حق ان سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ وہ کسی غیر یقینی یا آمرانہ شکل کی حکومت کے تابع اور اس سے ہدایت و رہنمائی پاتے ہیں۔ 1607ء میں چیف جسٹس سر ایڈورڈ کوک[۳] نے کہا کہ قانون ایک سنہری اصول اور ذریعہ ہے جو رعایا کے مقدمات کے فیصلے صادر کر سکتا ہے اور وہی ہز میجسٹی کو سلامتی اور امن عطا کرتا ہے۔ اس بات پر بادشاہ بہت ناراض ہوا اور بولا پھر اُسے اس قانون کا تابع ہونا چاہیے جس کی توثیق کرنا غداری ہے۔ ایڈورڈ کوک نے ایک سابقہ

---

[۱]۔ Albert Venn Dicey: البرٹ وین ڈائسی (1835ء-1922ء) ایک برطانوی قانون دان اور دستوری نظریہ ساز تھا۔

[۲]۔ James Charles Stuart: جیمز چارلس سٹوارٹ (1566ء-1625ء) سکاٹ لینڈ، انگلستان اور آئرلینڈ کا بادشاہ تھا۔ وہ جیمز ششم کے لقب سے سکاٹ لینڈ کا بادشاہ جبکہ جیمز اول کے لقب سے انگلستان اور آئرلینڈ کا بادشاہ بھی تھا۔

[۳]۔ Sir Edward Coke: سر ایڈورڈ کوک (1552ء-1634ء) ایک برطانوی قانون دان اور جج تھا جو بعد ازاں سیاستدان بن گیا۔

قانون دان ہنری بریکٹن[1] کے الفاظ میں کہا:

Quod rex non debed esse sub homine sed sub Deo et lege

(بادشاہ کوکسی انسان کے تابع نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدااور قانون کا تابع ہونا چاہیے)[2]۔

اس سیاسی سیاق و سباق میں دستوریت (constitutionalism) کے معنی ایک مجموعۂ تصورات (complex of ideas)، رجحانات اور طرز ہائے عمل (patterns of behavior) ہے جواس اصول کا مظہر ہوتا ہے کہ حکومت کا اختیار ایک مجموعۂ بنیادی قوانین سے ماخوذ اور اسی کے اندر محدود ہے۔ایک سیاسی تنظیم اس حد تک حسب دستور ہے جہاں تک اس کے اندر شہریوں کے مفادات اور ان کی آزادیاں، بشمول اس میں موجود اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لیے اداراتی میکانیاتِ تحفظ اقتدار (Institutional mechanisms of power control) پائی جاتی ہوں۔

(Controlling the State, p. 4)

اس سیاسی فکر کے ظہور کے نتیجے میں مغرب نے حقوق اللہ، رشتہ داریوں اور مذہبی حکومتوں کے سیاسی ہدایت ناموں کا مکمل طور پر قلع قمع کر کے رکھ دیا اور ان کی جگہ مسلسل انتخابات اور تحدید و توازن کے لیے شعبہ ہائے ریاست کے مابین تقسیم اختیارات، عدلیہ کی آزادی، دستوریت اور قانون کی حکمرانی کے اصولوں پر استوار، نمائندہ جمہوریتیں قائم کر لیں۔آج کا مغربی سیاسی نظام جمہوریت، عدلیہ کی آزادی، حقوق انسانی کے احترام، فلاحی ریاست اور سیکولرازم کی مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے جہاں اصل میں لوگوں کی اپنی حکومت ہے جس کا مقصد صرف اور

---

[1]۔ Henry de Bracton: ہنری دی بریکٹن (1210ء-1266ء) ایک انگریز قانون دان تھا۔

[2]۔ بادشاہ جیمز اول نے ایک تنازعے میں خود کو ایک جج کی حیثیت دے کر زمین کی ملکیت کے دعویداروں کا موقف سنا اور انہیں سزا دی۔ جب کیس چیف جسٹس آف دی کورٹ آف کامن پلیز (Chief Justice of the Court of Common Pleas)، ایڈورڈ کوک (Edward Coke) کے پاس گیا تو اس نے بادشاہ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ مقدمہ صرف وہ سن سکتا ہے جس نے قانون کی تربیت حاصل کی ہو اور وہ خود بھی قانون کی حکمرانی کے تابع ہوں۔

صرف اعوام کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشحال بناتا ہے۔

۳۔ معاشرتی علوم کا عروج

معاشرتی علوم، تعلیم و تعلّم کی وہ شاخ ہے جو معاشرے اور معاشرت کے اندر پائے جانے والے افراد کے باہمی تعلقات پر بحث مباحثہ کرتی ہے۔ ان علوم میں زیادہ اہم معاشیات، سیاسیات (Political Science)، جمعیت شناسی (Demography) اور عمرانیات (Sociology) ہیں۔ وسیع مفہوم میں ان میں مطالعۂ انسانیت مثلاً علم البشر، تاریخ اور قانون شامل ہیں۔

جدید معاشرتی علوم کا ماخذ مغربی فلسفے کا مشترک ذخیرہ ہے لیکن یہ یقینی طور پر انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں سائنس کے اثباتی فلسفے کے ساتھ اس بنیاد پر شروع ہوئے کہ معاشرے کا مطالعہ معیار بند اور معروضی انداز میں ہی کیا جا سکتا ہے جبکہ اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ ابتدائی علمِ معاشرت عہد متوسط کے اسلام (ابن خلدون) کی تصانیف میں پایا جاتا ہے لیکن 'انسان' کا سائنسی تجزیہ زیادہ تر عہدِ روشن خیالی کے بعد ہونا شروع ہوا تھا اور اس پر عہدِ انقلابات کے نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ جدید معاشرتی علوم انسانی رویئے کی بین الکلیاتِ (interdisciplinary) علمی اور تقابلِ علمی (cross-disciplinary) کی تحقیقات کا مجموعہ ہیں۔

نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے اوائل (چودھویں صدی عیسوی) میں 'ژان بوریدان'[۱] اور نکول ارسمہ[۲] نے زر (money) اور مالیات (finance) پر لکھا اور 'سینٹ اینٹونائن آف فلورنس' نے پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں تحقیق کے انہی خطوط کی پیروی کی۔ سترہویں صدی میں ٹامس ہابز نے استدلال پیش کیا کہ مسلمات (axioms) سے استخراجی

---

[۱]۔ Jean Buridan: ژان بوریدان (1295ء - 1363ء) ایک فرانسیسی پادری تھا جس نے یورپ میں کوپرنیکن انقلاب کی بنیاد رکھی۔

[۲]۔ Nicole Oresme: نکول ارسمہ (1325ء - 1382ء) ایک فرانسیسی فلاسفر تھا جس نے بیک وقت اکنامکس، ریاضی، طبعات، فلکیات، فلسفہ پر متاثر کن کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ ایک بہترین مترجم بھی تھا۔

(deductive) دلائل ایک سائنسی نظام کی تخلیق کرتا ہے۔لہٰذا اس کی تصنیف 'Leviathan' ایک سیاسی دولت مشترکہ کی ایک سائنسی توضیح ہے۔تاہم اٹھارہویں صدی عیسوی تک معاشرتی علوم کو فلسفۂ اخلاق کہا جاتا رہا۔

آگسٹ کومٹے[1] کا استدلال یہ تھا کہ تصورات تین ترقی پذیر منازل میں سے گزرتے ہیں؛ دینیاتی منزل (theological)،فلسفیانہ منزل (philosophical) اور سائنسی منزل۔اس نے ان منازل کے درمیان فرق و امتیاز کی توضیح یہ کی کہ پہلی منزل کی جڑیں مفروضے (assumption) میں پیوست ہوتی ہیں۔دوسری منزل تنقیدی سوچ میں ہوتی ہے اور تیسری منزل مثبت مشاہدے (positive observation) کے اندر ہوتی ہے۔کومٹے نے تجویز پیش کی کہ معاشرتی برائیوں کی اصلاح 'عمرانیاتی اثباتیت' (sociological positivism) کے ذریعے کی جاسکتی ہے جس کے خدوخال اس نے 'The Course in Positive Philosophy 1842' اور 'A General View of Positivism 1844' میں بیان کردیئے۔اس نے پیش گوئی کی کہ 'اثباتیت کی منزل' (positivist stage) قیاسی، دینیاتی اور مافوق الطبیعیاتی (metaphysical) منازل کے بعد فہم انسانی کے ارتقاء کا حتمی عہد (final era) ہوگی۔سوچ کا یہ انداز جس کو ہنوز بہت سے لوگ ماننے سے انکاری ہیں، ایک خلاصہ بیان کرتا ہے۔جس نے جدید معاشرتی علوم کو آگے بڑھایا تاکہ اس کے لیے ایک تجرباتی بنیاد (empirical basis) تلاش کی جاسکے۔

(Dictionary of the Social Sciences)

کارل مارکس[2] یہ دعویٰ کرنے والے اولین مصنفوں میں سے تھا کہ اس کے طریق ہائے تفتیش

---

[1]۔Auguste Comte: آگسٹ کومٹے (1798ء-1857ء) ایک فرانسیسی فلسفی تھا جس نے پیراڈوکسی اور مثبتیت کے اصولوں کی بنیاد رکھی۔اسے جدید معنوں میں سائنس کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے۔

[2]۔Karl Marx: کارل مارکس (1818ء-1883ء) ایک مشہور فلاسفر، ماہر معاشیات، صحافی، سوشیالوجسٹ اور سوشلسٹ انقلابی تھا۔جس نے Das Kapital اور The Communist Manifesto جیسی شاہکار کتابیں لکھیں۔

تاریخ کے سائنسی نظریئے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چارلس ڈارون اورگریگر مینڈل[۱] نے معاشرتی نظریئے کے توضیحی بیانیے کو شدید دھچکا قرار دیا۔ ڈارون کے کام میں اس قسم کی تحقیق کو انسانی تعلقات کی تحقیق کے ساتھ جوڑنے کی پہلی کوشش سگمنڈ فرائڈ[۲] نے ذہن کی کارکردگی کے نظریئے میں کی تھی۔ جب کہ ولیم جیمز[۳] نے تجرباتی نفسیات پر اپنے کام میں کی تھی۔ آیئے علوم کی بعض شاخوں کی چند مثالوں پر غور کریں:

(۱)۔ علم البشریات

علم البشر یا 'بشریات' (Anthropology) انسان کے بارے میں ایک 'نظریۂ کلیت' (totality of human) ہے یعنی ہستی انسان کی کلیّت کا علم۔ یہ شاخِ علم معاشرتی علوم، انسانی خصوصیات (humanities) اور انسانی حیاتیات (human biology) کے مختلف پہلوؤں کے انضمام (integration) کا مطالعہ کرتی ہے۔ بشریاتی معاشرتی علوم (anthropological social sciences) اکثر اشاراتی درجے کی تفصیلات تک جا پہنچتے ہیں جبکہ اس کے برعکس کیمیاء (Chemistry) یا طبیعیات (Physics) سے ماخوذ عام قوانین سے انسان کے بارے میں عمومی معلومات حاصل ہوتی ہیں یا وہ زیادہ عمومی اصولوں کے ذریعے انفرادی کیسوں میں وضاحت پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ علم نفسیات کے کئی شعبوں میں ہوتا ہے۔ علم کی یہ شاخ، جدید دنیا میں ایک بڑے شعبۂ مطالعہ کے طور پر ظہور پذیر ہو چکی ہے۔

(Journal of the History of Ideas 59 (3), p. 389 - 403)

(۲)۔ علم سیاسیات

علم سیاسیات (Political Science) ایک تعلیمی اور تحقیقی شعبۂ علم ہے جو سیاسیات کے نظریہ اور سیاست کے طریق ہائے کار، سیاسی نظاموں اور سیاسی رویوں کی تفصیلات اور

---

[۱]۔ Gregor Mendel: گریگور مینڈل (1822ء-1884ء) ایک سائنسدان تھا جسے جینیاتی سائنس کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[۲]۔ Sigmund Freud: سگمنڈ فرائڈ (1856ء-1939ء) کو جدید نفسیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

[۳]۔ William James: ولیم جیمز (1842ء-1910ء) امریکی ماہر نفسیات، فلاسفر اور سرجن تھا۔

تجزیہ کا مطالعہ کرتا ہے۔

سیاسیات کے شعبے اور ذیلی شعبوں میں سیاسی معیشت، سیاسی نظریہ اور فلسفہ، شہریت (civics) اور تقابلی سیاسیات، سیاسی ارتقا، بین الاقوامی تعلقات اور عوامی پالیسی (public policy) شامل ہیں۔ سیاسیات میں بین الاقوامی تعلقات اور بڑی طاقتوں اور سپر طاقتوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ پچھلے ابواب میں مغرب اور مسلم دنیا میں سیاسی فکر کے ارتقا کی تفصیلات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

(۳)۔ علم نفسیات

نفسیات (Psychology) ایک تعلیمی اور اطلاقی شعبہ ہے جس میں رویوں اور ذہنی طریق ہائے کار کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایسے علم کے انسانی سرگرمیوں کے متعدد دیگر دوائر (spheres) پر بھی اطلاق کا حوالہ دیتی ہے جن میں افراد کی روزمرہ کی زندگی کے مسائل اور ذہنی عوارض کا علاج شامل ہے۔ لفظ سائیکالوجی (نفسیات) قدیم یونانی 'psyche, ψυχή' (سائیکی)۔ روح، ذہن) اور 'logy' (study) سے ماخوذ ہے۔ 1870ء کے عشرے تک نفسیات فلسفے کی ایک شاخ تھی پھر یہ جرمنی اور امریکہ میں ایک مستقل سائنسی شاخ بن گئی۔ اس کا تجرباتی مطالعہ 1879ء میں اس وقت سے شروع ہوا جب 'ویلہم وونٹ'[1] نے اس کی اولین تجربہ گاہ قائم کی جو جرمنی میں صرف نفسیاتی تحقیق کے لیے مخصوص کر دی گئی۔

جدید علم نفسیات 'رینے ڈیکارٹ' اور برطانوی حامی اصولِ تجربی، براعظمی عقلیت پسند اور داعیٔ مکاتب فلسفہ فرانسس بیکن کی تصانیف سے متاثر ہوا۔ اس کے دورِ متاخر کی تجربی نفسیات پر بے پناہ اثرات تھے۔

۔ جان لاک کے An Essay Concerning Human Understanding, (1689)

---

[1]۔ Wilhelm Wundt: ویلہم وونٹ (1832ء-1920ء) ایک جرمن ڈاکٹر، فلسفی اور پروفیسر تھے جنہیں بجا طور پر جدید علم نفسیات کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

- جارج برکلے[۱] کے Treatise Concerning the Principles of Human Knowledge, (1710)
- ڈیوڈ ھیوم[۲] کے (1740) A Treatise of Human Nature
- ڈیوڈ ہرٹلے[۳] کی کتاب (1749) Observations on Man
- جان سٹوارٹ مل[۴] کی (1843) A System of Logic
- بروچ سپینوزا[۵] کی (1662) On the Improvement of the Understanding,
- لائبنیز کی (1765) New Essays on Human Understanding,

علم کی اس شاخ کی پیشرو فاضلانہ کتابیں ہیں۔ ڈنمارک کے فلسفی سورن کیئر کگارڈ[۶] نے بھی اپنی تصانیف:

The Concept of Anxiety (1844)

The Sickness Unto Death (1844)

---

[۱]۔ George Berkeley: جارج برکلے (1685ء - 1753ء) ایک آئرش فلاسفر تھا جسے نظریہ عدم مادیت (Immaterialism) کی ترقی کی بنا پر جانا جاتا ہے۔ جس کے مطابق اس دنیا میں کوئی بھی چیز مادی طور پر اپنا وجود نہیں رکھتی بلکہ تمام اشیاء ہمارے ذہنی خیالات ہیں۔

[۲]۔ David Hume: ڈیوڈ ھیوم (1711ء-1776ء) ایک سکاٹش فلاسفر، تاریخ دان اور ماہر معاشیات تھا۔

[۳]۔ David Hartley: ڈیوڈ ہرٹلے (1705ء-1757ء) ایک انگریز فلاسفر اور Associationist school of psychology کے بانی تھے۔

[۴]۔ John Stuart Mill: جان سٹوارٹ مل (1806ء۔1873ء) ایک برطانوی فلسفی تھا جس کے تصورِ آزادی نے 'فرد بمقابلہ لامحدود ریاستی کنٹرول' کا جواز پیش کیا۔

[۵]۔ Baruch Spinoza: بروچ سپینوزا (1632ء-1677ء) ایک ممتاز ولندیزی فلسفی تھا۔

[۶]۔ Soren Aabye Kierkegaard: سورن اے بی کیئر کگارڈر (1813ء-1855ء) ایک ڈنمارکی فلسفی، شاعر اور مذہبی مصنف تھے۔

کے ذریعے انسان شناسی، متعلق وجود اور جدید مکاتبِ نفسیات کو متاثر کیا۔

کانٹ[1] نے اپنی 'Metaphysical Foundations of Natural Science, (1786)' میں دعویٰ کیا کہ نفسیات شاید ایک باقاعدہ فطری سائنس نہیں بن پائے گی کیونکہ دیگر اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے مشاہدات کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

(Journal of History of Behavioural Sciences, p. 353- 377.)

کانٹ نے انسانی سوچ، احساس، خواہش اور عمل کی تجربی تحقیق کے لیے ایک متبادل تصور پیش کیا۔ اس کی تصنیف 'Anthropology from a Pragmatic Point of View (1798)' متعدد پہلوؤں سے ایک تجربی نفسیات کی طرح لگتی ہے۔ ارنسٹ ہینرخ ویبر[2] اور گستاف تھیوڈور فیکنر[3] نے خارجی تہیجات کی طبعی مقداروں اور ان سے واقع ہونے والی شدتوں (intensities) کے درمیان ریاضیاتی کیفیات کو ناپنے کی بھی کوشش کی تھی۔

'فزیالوجی' بشمول 'نیوروفزیالوجی' پیشہ ورانہ مہارت کا علم ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس سے متعلق چند نئی دریافتیں ہوئیں جو چارلس بیل[4]، فرینکوائیس میجنڈی[5]،

---

[1]۔ Immanuel Kant: ایمانویل کانٹ (1724ء-1804ء) ایک جرمن فلسفی اور مشہور ترین مفکر تھا۔ کانٹ نے فلسفے کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ وقت کی حاکم قوتوں کے بارے میں سوال پیدا کیے۔ عقل اور آزادی کو اپنی سوچ کا محور قرار دیا۔

[2]۔ Ernst Heinrich Weber: ارنسٹ ہینرچ ویبر (1795ء-1878ء) ایک جرمن ڈاکٹر تھا جسے تجرباتی نفسیات کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

[3]۔ Gustav Theodor Fechner: گستاف تھیوڈور فیکنر (1801ء-1835ء) ایک جرمن فلسفی، طبیب اور ماہر تجرباتی نفسیات تھا۔ اس کا شمار تجرباتی نفسیات کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔

[4]۔ Sir Charles Bell: سر چارلس بیل (1774ء- 1842ء) ایک سکاٹش سرجن، ماہر علم تشریح الابدان (anatomy)، ماہر علم فعلیات (physiologist)، ماہر علم اعصابیات، آرٹسٹ اور فلسفی تھا۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں حسی اعصاب اور حرکی اعصاب کے درمیان فرق دریافت کرنے کی بنا پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔

[5]۔ Francois Magendie: فرینکوائیس میجنڈی (1783ء-1855ء) ایک فرانسیسی ماہر فزیالوجسٹ تھا جسے تجرباتی فزیالوجی کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جوہانز ملر[۱]، ایمل ڈوبوائس ریمنڈ[۲]، پائری پال بروکا[۳]، کارل ورنیک[۴]، گستاف فرٹش[۵]، ایڈورڈ ہٹزگ[۶]، ڈیوڈ فیریئر[۷]، ہرمن ہیلمہولٹز[۸] اور ویلہم وونٹ کے زیر اثر ہوئی تھیں۔ آخرالذکر نے اپنی تاریخی کتاب

Grundzuge der physiologischen Psychologie (Principles of Physiological Psychology) 1874

میں لکھی اور 1879ء میں ایک لیبارٹری کی بنیاد بھی رکھی جس کا مقصد 'Original Research in Experimental Psychology' تھا۔

سگمنڈ فرائڈ نے مریضوں کے غیر شعوری اور فرضی عقائد و خواہشات کو بے نقاب کرنے اور خوابوں کی تعبیر کرنے کے طریقے وضع کئے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے مریضوں کے اعصابی نظام میں گڑبڑ اور جذباتی ہیجانات (hysteria) کا اصل سبب یہی ہیں۔ اس نے اس طریق

۱۔ Johannes Peter Muller: جوہانز پیٹر ملر (1801ء-1858ء) ایک جرمن فزیالوجسٹ، comparative anatomist، ichthyologist اور Herpetologist تھے۔

۲۔ Emil du Bois-Reymond: ایمل ڈوبوائس ریمنڈ (1818ء-1896ء) ایک جرمن ڈاکٹر اور فزیالوجسٹ تھا جس نے nerve action potential دریافت کیا۔

۳۔ Pierre Paul Broca: پائری پال بروکا (1824ء-1880ء) ایک فرانسیسی ڈاکٹر، فزیالوجسٹ اور ماہر علم تشریح الابدان (anatomy) تھا۔

۴۔ Carl Wernicke: کارل ورنیک (1848ء-1905ء) ایک جرمن ڈاکٹر، ماہر علم تشریح الابدان (anatomy)، ماہر نفسیات اور ماہر اعصابی امراض (neuropathologist) تھا۔

۵۔ Gustav Theodor Fritsch: گستاف تھیوڈور فرٹش (1838ء-1927ء) ایک جرمن ماہر علم تشریح الابدان (anatomy)، ماہر عمرانیات، سیاح اور ماہر طبیعات (physiologis) تھا۔

۶۔ Eduard Hitzig: ایڈورڈ ہٹزگ (1838ء-1907ء) ایک جرمن ماہر علم اعصابیات (neurologist) ماہر اعصابی نفسیات (Neuropsychiatry) تھا۔

۷۔ Sir David Ferrier: سر ڈیوڈ فریئر (1843ء- 1928ء) ایک سکاٹش ماہر نفسیات اور ہر علم اعصابیات (neurologist) تھا۔

۸۔ Hermann Ludwig Ferdinand von Helmholtz: ہرمن لوڈویگ فرڈینینڈ وون ہیلمہولٹز (1821ء-1894ء) ایک جرمن ڈاکٹر اور طبیعیات دان تھا جس نے کئی سائنسی شعبوں میں کام کیا۔

کارکوتحلیل نفسی (psychoanalysis) کا نام دیا۔ اور ایک فرد کے جنسی ارتقاء کے سفر، اس کے خفیہ ایجنڈے، بری خواہشات اور احساساتِ جرم کی نوعیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ چیزیں کسی فرد کی شخصیت اور اس کے رویئے کے بعض پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کارل گستاف یونگ[1]، فرائڈ کا رفیق کار تھا۔ اس نے بعد میں اسے اس بنا پر چھوڑ دیا کہ وہ جنسیت (sexuality) پر بہت زیادہ زور دیتا تھا۔ اس نے 'لاشعور' (unconscious) کے تصورات پر غور کرنا شروع کیا اور ذہن کے اُن کاموں کی تصریح کی۔ جو 'انا' (Ego) سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہ ہیں: شعورِ ذات (Conscious self)، احساس (Sensation)، قوتِ لامسہ (Feeling)، ذہانت (Intellect) اور وجدان (Intuition)۔ یونگ ایک تجربی نفسیات پر اصرار کرتا تھا۔ جس میں نظریات کا حقائق پر مبنی ہونا ضروری تھا نہ کہ نفسیات دان کے مفروضات یا توقعات پر۔

ولیم جیمز نے 1875ء میں ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک چھوٹی سی تجرباتی نفسیات کی لیبارٹری قائم کی جبکہ اس نے 1878ء میں ایک کتاب

The Senses and the Brain and their Relations to Thoughts

لکھی جس میں اس نے یہ استدال پیش کیا کہ شعور کوئی ضمنی علامت نہیں بلکہ ایک ارتقائی عمل ہے ورنہ اس نے طبعاً انسانوں کے اندر پیدا ہونے کو منتخب نہیں کرنا تھا۔ اس کی دوسری کتاب

The Varieties of Religious Experiences

بعد میں شائع ہوئی تھی۔ بعدازاں جلد ہی کئی یونیورسٹیوں میں تجرباتی نفسیات (experimental psychology) کی لیبارٹریاں کھل گئیں۔ 1890ء میں ولیم جیمز کی 'The Principles of Psychology' بالآخر شائع ہوگئی۔ جس نے بہت سے ایسے سوالوں کے جوابات کی بنیادیں استوار کردیں جن پر امریکی ماہرین نفسیات نے آنے والے برسوں میں توجہ مرکوز رکھنا تھی۔

---

[1]۔ Carl Gustav Jung: کارل گستاف یونگ (1875ء-1961ء) ایک سوئس ماہر نفسیات تھا جس نے تجزیاتی نفسیات کی بنیاد رکھی۔

جان ڈیوی[۱]، جیمز ہیڈن ٹفٹس[۲]، جارج ہربرٹ میڈ[۳] اور جیمز رولینڈ اینجل[۴] نے علم نفسیات کی تشکیلِ نو کرنا شروع کی۔ جس میں معاشرتی ماحول اور ذہن کی فعالیت اور رویے پر بہت زیادہ توجہ دی گئی جبکہ پہلے 'وونٹ' کی نفسی طبیعیات (psychophysics) سے متاثرہ فعلیاتی نفسیات (psychophysics) پر انحصار کیا جاتا تھا۔ پھر انہوں نے مل کر شکاگو سکول آف سائیکالوجی کی بنیاد رکھی۔ 1892ء میں امریکن سائیکالوجیکل ایسوسی ایشن قائم ہوگئی جس سے ساختیت (Structuralism) اور فعلیت (Functionalism) کی صورت گری ہوئی۔ فرانس میں نفسیات کو بنیادی تقویت علم الامراض ذہنی (Psychopathology) کے شعبے سے ملی جبکہ برطانیہ میں پہلا علمی رسالہ جو نفسیات کے موضوع کے لیے مخصوص کیا گیا اس کی بنیاد 1876ء میں ڈالی گئی۔ اس کا عنوان ذہن (Mind) تھا۔ 'کرداریت' (Behaviourism) بیسویں صدی عیسوی میں نفسیات میں تحقیق کے لیے ایک مائل بہ عروج تجرباتی ماڈل تھا۔ اس کے زیادہ تر اسباب ایسے مشروط نظریات کی تخلیق اور ان کا کامیاب اطلاق تھا جنہیں انسانی رویئے کے لیے سائنسی ماڈل بنایا گیا تھا۔ تاہم نوم چومسکی[۵] کا دعویٰ ہے کہ زبان محض عملی مشروطیت (operant conditioning) سے نہیں سیکھی جا سکتی۔ عوام فقروں کی بے شمار اقسام وضع کر سکتے ہیں جن کی اپنی اپنی ساخت اور اپنے اپنے معنی ہو سکتے ہیں اور یہ محض فطری زبان کے تجربے سے پیدا نہیں ہوتے۔ لہٰذا یقیناً کچھ داخلی ذہنی ساختیں اور دماغ کی حالتیں ہوتی ہیں جنہیں 'کرداریت' (Behaviourism) نے خیالی قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔

۱۔ John Dewey: جان ڈیوی (1859ء-1952ء) ایک امریکی فلسفی، ماہر نفسیات، تعلیمی اور سماجی اصلاح کار تھا۔

۲۔ James Hayden Tufts: جیمز ہیڈن ٹفٹس (1862ء-1942ء) ایک بااثر امریکی فلسفی اور شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر تھا۔

۳۔ George Herbert Mead: جارج ہربرٹ میڈ (1863ء- 1931ء) ایک امریکی فلسفی، ماہر سماجیات، ماہر نفسیات اور شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر تھا۔

۴۔ James Rowland Angell: جیمز رولینڈ اینجل (1869ء-1949ء) ایک امریکی ماہر نفسیات اور استاد تھا۔

۵۔ Noam Chomsky: نوم چومسکی (پیدائش 1928ء) ایک یہودی امریکی ماہر لسانیات، فلسفی، مؤرخ، سیاسی مصنف اور لیکچرر رہے۔

(۴)۔ علم عمرانیات

عمرانیات یا 'سوشیالوجی' (Sociology) معاشرے اور بنی نوع انسان کے طرزِ عمل کا ایک باضابطہ مطالعہ ہے۔ لفظ 'Socio' لاطینی لفظ 'Socius' بمعنی 'ساتھی' یا عمومی طور پر معاشرہ سے لیا گیا ہے اور اس کا لاحقہ 'logy' یونانی ماخذ (Logos) سے ہے جس کے معنی ہیں 'کا مطالعہ'۔

آگسٹ کومٹے کو عموماً بابائے سوشیالوجی سمجھا جاتا ہے تاہم اس شاخِ علم کی باضابطہ تشکیل ایمل دُرکائیم[1] نے کی۔ جس کے لیے اس نے 1915ء میں یونیورسٹی آف بورڈو (University of Bordeaux, France) میں اولین یورپین ڈیپارٹمنٹ آف سوشیالوجی قائم کیا اور قواعدِ عمرانیات شائع کئے۔ درکائیم کی کتاب 'Suicide' (1897ء) نے عمرانیاتی تجزیئے کو نفسیات یا فلسفے سے ممیز کیا۔ آج 'درکائیم، مارکس اور میکس ویبر[2] کا 'سائنس آف سوسائٹی' کے مفہوم میں معاشرتی علم کے تین بڑے معماروں میں ذکر آتا ہے۔ کارل مارکس نے آگسٹ کومٹے کی اثباتیت[3] کو مسترد کیا ہے تاہم وہ سائنس آف سوسائٹی کو تاریخی مادیت پر تعمیر کرتا تھا۔ میکس ویبر اور جیورگ سمل[4] نے 'سوشیالوجیکل اینٹی پازیٹوازم' (sociological anti-positivism) کو فروغ دے کر معاشرتی فکر کے تین طریق ہائے عمل کو مدغم کیا بالخصوص درکائیمین اثباتیت (Durkheimian positivism) اور ساختیاتی فعلیت (Structural functionalism)، مارکس کی تاریخی مادیت (Marxist historical materialism) اور نظریۂ آویزش (conflict theory) اور ویبر کی ضدِ اثباتیت (Weberian antipositivism) اور ورسٹیہن تجزیہ (Verstehen analysis)۔ 1920ء کے عشرے

---

[1] ۔ David Emile Durkheim: ڈیوڈ ایمل درکائیم (1858ء-1917ء) ایک فرانسیسی ماہر سماجیات تھا جس کا نام جدید علم سماجیات کے معمار کارل مارکس (Karl Marx) اور میکس ویبر (Max Weber) کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

[2] ۔ Maximilian Carl Emil Weber: کارل ایمیل میکس میلین ویبر (1864ء-1920ء) ایک جرمن فلسفی، ماہر معاشیات اور جدید معاشریات کے بانیوں میں سے ہے۔

[3] ۔ Positivism: مثبیت یا اثباتیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے مطابق صرف واقعی علم (Positive Science) کو اصلی علم سمجھا جاسکتا ہے اور وہی علم جو سائنسی طریقہ (Scientific Method) سے حاصل ہو قبول ہوسکتا ہے۔

[4] ۔ Georg Simmel: جارج سمل (1858ء-1918ء) ایک جرمن فلاسفر، ماہر سماجیات اور نقاد تھا۔

میں شکا گو سکول نے علامتی باہمی تعلقات (Symbolic interactionism) وضع کی اور فرینکفرٹ سکول نے مارکس، فرائڈ اور نطشے کے افکار پر مبنی تنقیدی نظریہ پیش کر دیا۔ عمرانیات جدیدیت مثلاً صنعتی ارتقاء، شہری آبادیوں پر پڑنے والے دباؤ، لادینیت اور بڑھتے ہوئے سلسلۂ توجیہات کے چیلنجز کے علمی ردعمل کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

۴۔ نئے معاشی افکار

مغرب میں اقتصادیات/ معاشیات علم کی کوئی علیحدہ شاخ نہیں تھی بلکہ یہ صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) تک فلسفے کا ایک حصہ رہی۔ تاہم اقتصادی یا معاشی فکر کی تاریخ قدیم یونانی فلسفیوں سے ماخوذ ہے۔ افلاطون کے مکالمے (The Republic) میں ایک مثالی شہری ریاست کا تصور دیا گیا ہے۔ جس کا انتظام وانصرام فلسفی بادشاہوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کتاب میں کارکنوں اور پیداوار کے شعبوں کی تخصیص کی گئی ہے۔ افلاطون پہلا مفکر تھا جس نے پیسے کا نظریۂ قرض (Credit theory of money) بیان کیا۔ اس نے ایسے معاشرے کے قیام پر بھی زور دیا، جس میں تمام وسائل مشترکہ ملکیت میں ہوں۔ ارسطو نے اپنی کتاب 'Politics' (350 قبل مسیح) میں طبقۂ امراء کی چندسری حکومت (Oligarchy) کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ وسائل کی مشترکہ ملکیت طبقۂ امراء کی ایک لعنت (anathema) ہے۔ لہٰذا یہ بہت بہتر ہوگا کہ ساری جائیداد نجی (private) ہو مگر اس کا استعمال عام ہو۔ قانون سازوں کو خصوصی اقدام کے طور پر مردوں میں فیض رسانی (benevolent disposition) کا مزاج پیدا کرنا چاہیے۔ ارسطو سود کو سخت ناپسند کرتا اور کہتا تھا کہ اجارہ داری (monopoly) کے ذریعے دولت کمانا ایک ڈھلائی ہوئی تحقیر (cast scorn) ہے۔

ٹامس ایکوناس ایک اطالوی ماہر دینیات (theologian) اور معاشیات نویس تھا۔ اس نے اپنے مقالہ 'Summa Theologica' میں منصفانہ قیمتوں کے تصور پر روشنی ڈالی۔ ڈنس سکاٹس[1] نے اپنی کتاب 'Sententiae' میں محنت کشوں کی مزدوری، اخراجات اور منصفانہ

[1]۔ Duns Scotus: ڈنس سکاٹس (1266ء-1308ء) زمانہ وسطیٰ کے دینیاتی فلسفہ کے تین ماہرین میں سے ایک تھا جس نے کیتھولک چرچ اور سیکولر سوچ دونوں کو متاثر کیا۔

قیمتوں کے تعین میں عوام کے کردار پر اظہار خیال کیا۔ژان بوریدان کا استدلال تھا کہ مارکیٹ پرائس (market price) کا تعین مجموعی، نہ کہ انفرادی مانگ اور رسد کرتی ہیں۔نکول ارسمہ نے دولت کے ماخذ، نوعیت، قانون اور تبدیلیوں سے متعلق لکھا۔'سینٹ اینٹونائن آف فلورنس' نے اپنی کتاب 'Summa Theologica' میں لکھا کہ تجارتی معاملات میں مداخلت کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے کیونکہ وہ اجتماعی مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد اس کی ذمہ داری ہے۔

کولمبس اور دیگر مہم جوؤں نے نئی دنیا اور ایشیا کے ساتھ تجارت کے لیے نئے نئے راستے کھولے۔جس سے تجارت کو فروغ ملا۔نئی دولت ہاتھ آنے سے بادشاہوں کو زیادہ طاقتور فوجی ریاست بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ 'تجارتی نظریۂ زر'[1] (Mercantilism) کے تحت اپنی حیثیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھا سکیں۔ یہ بادشاہ ریاست کی فوجی قوت استعمال کرکے اس امر کی ضمانت حاصل کرنا چاہتے تھے کہ مقامی مارکیٹوں اور رسد کے ذرائع کو ان محاصل کے ذریعے تحفظ ملے تاکہ برآمدات (Export) کی حوصلہ افزائی اور درآمدات (Import) کی حوصلہ شکنی ہو۔ بہ الفاظ دیگر فاضل برآمدات (Export) کے ذریعے ایک مثبت تجارتی توازن قائم ہونا چاہیے۔جسے اکثر فوجی قوت کی پشت پناہی حاصل ہوتی تھی۔

ٹامس مور [2] نے اپنی کتاب 'Utopia' میں ایک مثالی معاشرے کا نقشہ پیش کیا۔جس میں زمین سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔تعلیم ہمہ گیر اور مذہبی رواداری عام ہے۔اس کتاب نے قانون امدادِ غربا[3] (English Poor Laws) کا جذبہ ابھارا اور کمیونزم (Communism) اور

---

[1] ۔اس ماڈل کے مروج ہونے کے باوجود تجارتی نظریۂ زر (Mercantilism) کی اصطلاح 1763ء تک وضع نہیں ہوئی تھی۔

[2] ۔Sir Thomas More: سر ٹامس مور (1478ء-1535ء) ایک انگریز وکیل، سماجی فلسفی، مصنف اور نشاط ثانیہ کا معروف انسان دوست تھا جسے کیتھولک کلیسا نے اعزازی طور پر سینٹ ٹامس مور کا خطاب بھی دیا تھا۔

[3] ۔English Poor Laws ناداروں کی امداد کا ایک نظام تھا جو انگلینڈ (England) اور ویلز (Wales) میں چلا آ رہا تھا۔ یہ عہد متوسط کے اواخر میں اور ٹیوڈروں (Tudor) کے زمانے میں شروع ہوا اور اسے 1587-98ء میں قانونی شکل ملی۔

سوشلزم (Socialism) کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔ کا پرنیکس نے 'مقداری نظریۂ دولت' اور 'قانونِ گریشم' (بُری دولت اچھی دولت کو دفع کر دیتی ہے) سے متعلق پہلی معروف دلیل پر مبنی کتاب شائع کی۔ ژان بودن[۱] نے 'Reply to Malestroit' شائع کی۔ جس میں اس نے افراطِ زر (inflation) کا تجزیہ کیا اور اس کے بارے میں دعویٰ کیا کہ یہ جنوبی امریکہ سے سونا اور چاندی درآمد (import) کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس کے ذریعے اس نے مقداری نظریۂ دولت کی تائید کی۔ لیونارڈس لیمیئس نے 'On Justice and Law' شائع کی جس میں اس نے کہا کہ انشورنس کی قیمت خطرے پر مبنی ہوتی ہے۔

1622ء میں ایڈورڈ مسیلڈن[۲] اور جیرارڈ میلینس[۳] نے غیر ملکی تبادلے (exchange) کے بارے میں جبکہ ٹامس من[۴] نے بیان کیا کہ تجارت دولت بڑھانے کا واحد طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں اس نے متعدد طریق ہائے کار پر روشنی ڈالی۔ ولیم پیٹی[۵] نے اقتصادیات پر فرانسس بیکن کے استدلال پر سائنسی روایت کا اطلاق کیا جو صرف قابل پیمائش مظاہر کو استعمال کرنے اور مقدار کے ٹھیک اور صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس طرح اس کو اولین سائنٹیفک اکانومسٹ (scientific economist) ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ رچرڈ کینٹیلن[۶] نے اپنے 'Essay on the Nature of Commerce in General'

۱۔ Jean Bodin: ژان بودن (1530ء-1596ء) ایک فرانسیسی قانون دان، سیاسی فلسفی پیرس کی پارلیمنٹ کا رکن اور قانون کا پروفیسر تھا۔

۲۔ Edward Misselden: ایڈورڈ مسیلڈن (1608ء- 1654ء) ایک انگریز تاجر تھا جو Mercantilist group of economic thought گروپ کا ممبر تھا۔

۳۔ Gerard de Malynes: جیرارڈ میلینس (1585ء- 1641ء) غیر ملکی تجارت میں ایک آزاد تاجر، ہسپانوی نیدرلینڈ کا انگریز کمشنر اور تجارتی معاملات پر حکومتی مشیر تھا۔

۴۔ Sir Thomas Mun: سر ٹامس من (1571ء- 1641ء) ایک انگریز مصنف برائے معیشت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔

۵۔ Sir William Petty: سر ولیم پیٹی (1620ء-1687ء) ایک انگریز ماہر معاشیات، سائنسدان، فلاسفر، مؤجد، برطانیہ کی پارلیمنٹ کا رکن اور رائل سوسائٹی کا چارٹر ممبر تھا۔

۶۔ Richard Cantillon: رچرڈ کینٹیلن (1680ء-1734ء) ایک فرانسیسی ماہر معیشت اور مصنف تھا۔

میں دلیل دی کہ ایک آزادانہ تصحیح وترمیم پر مبنی منڈیوں کا نظام، متناسب منافع، نظم وضبط کا قیام اور باہمی طور پر قابل قبول قیمتوں کے تعین میں مددگار رہے گا۔

جان لاک نے اپنے دوسرے مقالے Second Treatise On Civil Government میں کہا کہ حکومت کو نہ صرف عوام کی املاک میں مداخلت سے گریز کرنا چاہیے بلکہ اسے مثبت انداز میں ان کے تحفظ کی ضمانت دینے کا بھی بندوبست کرنا چاہیے (باب 5، دفعات 26۔ 27)۔ ڈیوڈ ھیوم نے اپنی کتاب 'Essays: Moral, Political and Literary' میں زراندوزانہ مفروضات کی مذمت کرتے ہوئے اس دلیل میں یہ بات شامل کی کہ تجارتی توازن کو موافق بنانے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنا ناپسندیدہ بات ہے۔ 'فرینسوا کوئز'[1] نے اس یقین کا اظہار کیا کہ تجارت اور صنعت دولت کے ماخذ نہیں بلکہ فاضل زرعی پیداواریں ہیں جو کرایوں، اجرتوں اور خریداریوں کی صورت میں معیشت کے اندر رواں دواں ہیں، وہی حقیقی اقتصادی محرک ہوتی ہیں۔

1776ء میں ایڈم سمتھ نے

An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations

لکھی جس میں اس نے فطری آزادی کے ایک نظام کے قیام کے لیے کہا۔ جس میں ایک فرد معاشرے کے لیے مفید اشیاء کی تخلیق کرتا ہے۔ حتیٰ کہ معاشرے کے اندر رہنے والا خودغرض شخص بھی، جب ایک مسابقتی مارکیٹ میں پابندیوں کے تحت کام کر رہا ہو، سب کی بھلائی کا کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا تصورِ آزاد معیشت، محفوظ املاک، سرمائے کی فراہمی، مارکیٹ کی توسیع اور تقسیم، محنت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس تاجرانہ نظریۂ زر کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ جبکہ نظریہ زراندوزی تمام شر پسندانہ انسانی کارروائیوں کو منظم کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ سمتھ کے استدلال کے مطابق اتحادتجار ناپسندیدہ ہوتے ہیں کیونکہ ان میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ اشیا اور خدمات کے معیار اور ان کی پیداوار کی مقدار کو محدود کرلیں۔ اس نے اجارہ داری کی حمایت کے لیے ہر قسم کی سرکاری مدد کی مخالفت کی اور کہا کہ غیر مرئی ہاتھ کو بے قید معیشت کے اصولوں

---

[1] Francois Quesnay: فرینسوا کوئز (1694ء-1774ء) ایک فرانسیسی ماہر معیشت اور ڈاکٹر تھا۔

پر مبنی اقتصادی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

جیریمی بینتھم[۱] نے اقتصادیات میں تصورِ افادیت کا اضافہ کیا۔ ڈیوڈ ریکارڈو[۲] نے اپنی کتاب

On the Principles of Political Economy and Taxation

میں بین الاقوامی تجارت کی راہ میں رکاوٹوں پر تنقید کرتے ہوئے وہ طریقہ بتایا جس سے آمدنی کو آبادی کے اندر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس نے کارکنوں، مالکانِ زمین اور سرمایہ داروں کے درمیان فرق واضح کیا اور کہا کہ کارکن وہ ہوتے ہیں جو ایک سطح پر ایک مقررہ اجرت پاتے ہیں، جس پر وہ زندہ رہ سکتے ہیں۔ مالکانِ زمین جو ایک کرایہ کماتے ہیں اور سرمایہ دار جو سرمائے کے مالک ہوتے ہیں اور ایک منافع کماتے ہیں جو کہ آمدنی کا باقی ماندہ حصہ ہوتا ہے۔ اس نے زراعت کی پیداوار میں کمی کے اصول کی بھی وضاحت کی۔ 1848ء میں جان سٹوارٹ مل نے

Principles of Political Economy

لکھی جو متعدد یونیورسٹیوں میں بطور نصابی کتاب پڑھائی جاتی رہی۔ جان سٹوارٹ مل نے تجارت اور فنیاتی ایجادات (technological innovation) کے مسلسل بڑھتے ہوئے مواقع سے متعلق ایڈم سمتھ کے نظریئے اور آبادی کی فطری تحدید سے متعلق ٹامس مالتھس[۳] کے نظریئے کا درمیانی میدان تلاش کرنے کی کوشش کی۔

کارل مارکس نے متذکرہ بالا ماہرین اقتصادیات کو قدیمی ماہرین معیشت قرار دیتے ہوئے ان کے نظریات کو نظام سرمایہ داری کا نام دیا اور سوشلزم کو ایک متبادل راستے کے طور پر پیش

---

[۱]۔ Jeremy Bentham: جیریمی بینتھم (1748ء-1832ء) ایک برطانوی فلسفی، قانون دان اور سماجی اصلاح کار تھا۔ اسے جدید افادیت پسندی کہ صحیح اور غلط کا معیار یہ ہے کہ 'زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ خوشی نصیب' ہونی چاہیے، کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[۲]۔ David Ricardo: ڈیوڈ ریکارڈو (1772ء-1823ء) برطانوی ماہر معاشیات تھا۔

[۳]۔ Thomas Robert Malthus: ٹامس رابرٹ مالتھس (1766ء-1834ء) معروف برطانوی ماہر معاشیات تھا۔ اس نے آبادی کے لیے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق جلد یا بدیر قدرت حرکت میں آتی ہے، تباہی اور زلزلوں کے ذریعے آبادی پھر سے وسائل کے مطابق ہوجاتی ہے۔

کیا۔ اقتصادی اور سیاسی نظریہ جو ’دی کمیونسٹ مینی فسٹو‘ (The Communist Manifesto)اور ’داس کیپٹل‘ (Das Kapital) میں پیش کیا۔ اس میں اس نے انیسویں صدی عیسوی کے نظام سرمایہ داری کا انقلابی نظریہ فراہم کیا۔ 1844ء میں فریڈرک اینجلز[1] نے

Conditions of the Working Class in England

شائع کی جس میں مانچسٹر کے محنت کشوں کو ’ہمارے دور کی معاشرتی بدحالی کی انتہائی غیر پوشیدہ حالت‘ کے طور پر پیش کیا۔

مارکس نے ’دی کمیونسٹ مینی فیسٹو‘ (The Communist Manifesto) میں لکھا کہ اب تک سارے موجود معاشرے کی تاریخ طبقاتی جنگوں کی تاریخ ہے۔ آزاد آدمی اور غلام، دولت منداور نادار، جاگیردار اور مزارعہ، سردار اور پیادہ، مختصراً، ظالم اور مظلوم ایک دوسرے کے خلاف پیہم برسرِ پیکار رہے۔ جدید بورژوا معاشرے (bourgeois society) نے پرانے طریقوں کی بجائے نئے طبقوں اور نئے حالاتِ جبر کو جنم دے دیا ہے۔ مارکس نے یہ سوال کر کے محنت کے لحاظ سے قیمت کے تعین کے نظریئے کو سر کے بل کھڑا کر دیا کہ خود مزدور (کام کرنے والے لوگوں) کو وجود میں لانے کے لیے سماجی طور پر لازماً درکار وقت کتنا ہوتا ہے۔ مارکس اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ یہ لوگوں کے لیے قلیل ترین مقدار ہے جس کے اندر رہ کر وہ گزارا کرتے ہیں اور معیشت کو رواں کرنے کے لیے مطلوب ہنر وجود میں لاتے ہیں۔ اس کے بعد اس طرح سے لوگوں کو پیداوار کے ثمر سے اور ان ذرائع سے بھی بیگانہ کر دیا جاتا ہے۔ جن سے وہ اپنی قوتِ امکانی (potential) کو بڑھا سکیں اور خود کو نفسیاتی طور پر بحال کر سکیں۔ ان کے ساتھ یہ ناانصافی لیبر مارکیٹ میں انہیں تابع ومحکوم رکھ کر کی جاتی ہے۔

آجر اپنے کارکنوں پر جبر کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ محنت کراتے ہیں۔ ایسی مشینری بنانے پر سرمایہ کاری کرتے ہیں جن میں مزدور کی ضرورت نہ رہے۔ اپنا منافع بڑھاتے اور پیداوار کو پھیلاتے چلے جاتے ہیں مگر صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں جو ان ذرائع پیداوار کے

[1] ۔Friedrich Engels: فریڈرک اینگلز (1820ء-1895ء) جرمنی کا انقلابی مفکر تھا جس نے کارل مارکس (Karl Marx) کے ساتھ مل کر سائنسی سوشلزم کی بنیاد رکھی۔ اس نے تک جرمنی، فرانس، اور بیلجیم میں انقلابی تحریکیں چلائیں اور مارکس کے ساتھ مل کر کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں کمیونسٹ مینی فسٹو (1848ء) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اندرنجی ملکیت رکھتے ہیں۔ محنت کش طبقے اس دوران رفتہ رفتہ خستہ حالی سے دو چار ہوتے رہتے ہیں۔ جب بے روزگاروں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے تو ان کی ریز روفوج بھی مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ بے روزگاری، مانگ (demand) میں کمی لانا شروع کر دیتی ہے کیونکہ عوام کی اشیاء خریدنے کی سکت (purchasing power) پیچھے رہ جاتی ہے اور فروخت نہ ہو سکنے والی اشیاء کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اقتصادی کساد بازاری (economic depression) کی صورت میں نکلتا ہے۔ منڈیوں میں ضرورت سے زیادہ بھرے ہوئے مال کی نکاسی ہو جائے تو نئے مال کی آمد کا چکر شروع ہونے سے پہلے معیشت پھر سے برسنا گرجنا شروع کر دے گی۔ مارکس کا خیال تھا کہ ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ سرمایہ داروں اور کارکنوں کے دو برعکس رجحانات کے درمیان کشیدگی اور چپقلش میں شدت بڑھتی چلی جائے گی بالآخر مارکس کی خیالی تصویر کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت ایک انقلاب آ جائے گا اور اس کے نتیجے میں غیر طبقاتی معاشرہ تخلیق ہو جائے گا۔

مارکس نے معیشت دانوں میں ایک رجحان پیدا کرنا شروع کر دیا جو عملی اقدام کے قائل ہو گئے۔ ان میں روزا لکسمبرگ[۱]، مارٹا بیٹریس ویب[۲] اور سڈنی ویب[۳] شامل تھے۔ جنہوں نے فیبین سوسائٹی (Fabian Society) کی بنیاد ڈالی اور لندن سکول آف اکنامکس قائم کیا۔

الفریڈ مارشل[۴] یونیورسٹی آف کیمبرج کا پہلا پروفیسر تھا جس نے 'Principles of

---

[۱]۔ Rosa Luxemburg: روزا لکسمبرگ (1871ء-1919ء) ایک فلسفی، ماہر معاشیات، پولینڈ اور لیتھویانا کی سماجی جمہوریت پارٹی، جرمن سماجی و جمہوری پارٹی، جرمنی کی سماج و جمہور پارٹی اور جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی کی رکن اور پولینڈ کی یہودی تحریکوں کی کارکن تھی۔

[۲]۔ Martha Beatrice Webb: مارٹا بیٹرس ویب (1858ء-1943ء) ایک انگریز ماہر سماجیات، اقتصادیات، سوشلسٹ، مزدوروں کی مؤرخ، سماجی اصلاح کار اور لندن سکول آف اکنامکس کی بانی تھی۔

[۳]۔ Sidney James Webb: سڈنی جیمز ویب (1859ء-1947ء) ایک برطانوی سوشلسٹ، ماہر اقتصادیات، سماجی اصلاح کار اور لندن سکول آف اکنامکس کا شریک بانی تھا۔

[۴]۔ Alfred Marshall: الفریڈ مارشل (1842ء-1924ء) اپنے دور کا قابل ترین ماہر معاشیات تھا۔ اس نے پہلی دفعہ costs of production, marginal utility,supply and demand کے نظریات متعارف کروائے۔

'Principles of Political Economics' لکھی۔ یہ اس وقت رائج جان سٹوارٹ مل کی 'Economy' کی نصابی کتاب کی متبادل تسلیم کر لی گئی۔ اس کتاب میں مارشل نے 'پولیٹیکل اکانومی' (political economy) کی اصطلاح ترک کر کے اپنی 'Economics' کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی۔ آج کل اس مضمون کے لیے یہی اصطلاح مروّج ہے۔

جان مینارڈ کینز[1] کیمبرج یونیورسٹی میں الفریڈ مارشل کا شاگرد تھا اور اس نے ورسائی کانفرنس (Versailles Conference) میں برطانوی حکومت کے مالیاتی نمائندے کے طور پر شرکت کی جہاں اس نے کئے جانے والے فیصلوں سے سخت اختلاف کیا تھا۔ اس کے مشاہدات اس کی کتاب Economic Consequences of Peace (1919) میں ریکارڈ شدہ ہیں۔ کینز نے یہ موقف پیش کیا کہ اگر فاتحین جبر کر کے جنگ کا تاوان شکست خوردہ محوری ممالک پر ڈال دیں تو ایک عالمی بحران آ جائے گا۔ یہ بحران ایک نئی عالمی جنگ کا سبب بن جائے گا۔ کینز نے تجویز دی کہ جرمنی پر تاوان کی رقم کم کر کے اسے حقیقی طور پر نیچے کی سطح پر لایا جائے۔ کوئلے کی بڑھتی ہوئی بین الحکومتی انتظامیہ کے تحت براعظمی پیداوار اور انجمن اقوام عالم (League of Nations) کی وساطت سے ایک ٹریڈ یونین کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اتحادی ملکوں کے درمیان قرضے کی مجرائی (ادائیگی اور معافی) کا انتظام کیا جائے۔ بین الاقوامی کرنسی کے تبادلے کی مکمل اصلاح کی جائے۔ ایک بین الاقوامی قرضہ فنڈ قائم کر کے روس اور مشرقی یورپ کے تجارتی تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

عظیم کساد بازاری (The Great Depression) جو 1929ء سے شروع ہوئی بڑھتے بڑھتے 1939ء میں جنگ عظیم دوئم چھڑنے پر منتج ہوئی۔ یہ جنگ ویسے ہی رونما ہوئی جیسے کینز نے اس کی پیشین گوئی کی تھی۔ عظیم کساد بازاری کے دوران ہی کینز نے اپنی نہایت اہم کتاب 'Theory of Employment, Interest and Money 1936' شائع کر دی۔ اس کساد بازاری (The Great Depression) کو وال سٹریٹ کریش آف

[1]۔ John Maynard Keynes: جان مینارڈ کینز (1883ء-1946ء) ایک انگریز ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔ اس نے کئی سالوں تک رائل کمیشن برائے ہندوستانی کرنسی اور مالیات کے لیے کام کیا۔ اس کی کوششوں سے آئی ایم ایف وجود میں آیا۔

1929ء[۱] نے آگ لگائی تھی۔ اس کے نتیجے میں امریکہ میں بیروزگاری میں زبردست اضافہ ہونے لگا۔ یورپی مقروضوں سے قرضے واپس مانگ لیے گئے اور پوری دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔ روایتی معیشت دانوں نے اخراجات کو فوراً سکیڑ (tightening) دینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ جب تک تاجروں کا اعتماد اور منافع کی سطح بحال نہیں ہو جاتی یہ سکڑاؤ برقرار رکھا جانا چاہیے۔ لیکن کینز کی دلیل دوسری تھی۔ اس نے پیسے کی سپلائی سے بڑھ کر صارف کے رجحان، سرمایہ کاری کی ترغیب، سرمائے کی ضمنی کارکردگی، سیالیت کی ترجیح (liquidity preference) اور ضارب (multiplier) کے تبدل پذیر اثر کی نشاندہی کی جو کہ معیشت کی مجموعی کارکردگی، روزگار اور قیمتوں کی سطح کا تعین کرتے ہیں۔ کینز نے کہا کہ روزگار کا انحصار 'مجموعی اخراجات' پر ہوتا ہے جو کہ صارف کے روزمرہ کے خرچ اور نجی شعبے میں تجارتی سرمایہ کاری پر مشتمل ہے۔ اس نے سود کی شرح کم کرنے اور بے روزگاری سے نمٹنے کے لیے آسان قرضے دینے کی تجویز دیتے ہوئے کہا کہ خسارے کے اخراجات قرضہ لے کر پورے کیے جائیں جو کہ دھکے سے چلنے والی اقتصادی سرگرمی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مالیاتی انتظام اور فعال مالیاتی پالیسی، دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مداخلت کارانہ مالیاتی اور محاصلاتی پالیسیاں جن کی کینز کے حامی ماہرین معیشت نے سفارش کی شکاگو یونیورسٹی کے ماہرین معیشت کے ایک گروپ کے حملے کا نشانہ بنیں۔ جنہیں 1950ء کے عشرے میں مجموعی طور پر شکاگو سکول آف اکنامکس کہا جاتا تھا۔ انہوں نے پھر سے منڈی کی سرگرمیوں کا آزادانہ نقطہ نظر پیش کیا اور کہا کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور انہیں اپنے معاملات خود طے کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ ملٹن فرائڈمین[۲] جو کہ بیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں شکاگو سکول آف اکنامکس کے ممتاز ترین ماہرین میں سے تھا۔ اس نے

---

[۱]۔ Wall Street Crash of 1929: وال سٹریٹ کریش 1929ء متحدہ امریکہ کی سٹاک مارکیٹ کے کریش کو کہا جاتا ہے جس میں عظیم کساد بازاری نے یورپی صنعت وحرفت کو بری طرح متاثر کیا اور امریکی سٹاک مارکیٹ بھی کریش کر گئی۔

[۲]۔ Milton Friedman: ملٹن فرائڈمین (1912ء-2006ء) امریکی ماہر اقتصادیات تھا جسے اقتصادی سائنس میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

'Monetary History of the United States (1963)' لکھی۔جس میں اس نے کہا کہ عالمی کساد بازاری فیڈرل بنک کی پالیسیوں کا نتیجہ تھی۔ بے قید سرکاری پالیسی معیشت میں سرکاری مداخلت سے کہیں زیادہ مفید عمل ہے۔حکومتوں کو غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرنی چاہیے تاکہ طویل المیعاد اقتصادی افزائش عمل میں آئے اوراس کے لیے پیسے کے پھیلاؤ میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہے۔ چونکہ عمومی قیمتوں کا تعین پیسے سے ہوتا ہے اس لیے فعال مالیاتی (آسان قرضے) یا محاصل (ٹیکس اور اخراجات) پالیسی غیر ارادی منفی اثرات ڈال سکتی ہے۔ معقولیت پسند صارفین جس آمدنی کو اپنی مستقل آمدنی سمجھیں گے، اس میں سے ایک متناسب رقم ہی خرچ کریں گے اور اچانک کہیں سے آجانے والی رقم میں سے بیشتر حصے کو اپنی بچت میں جمع کریں گے اور یہ کہ معقول صارفین پیش بینی کر سکیں گے کہ بعد میں ٹیکسوں میں لازماً اضافہ ہوجائے گا جس سے پبلک مالیات متوازن ہوجائیں گی۔ یہ وہ معاشی افکار ہیں جن کی وجہ سے آج کی عالمی معیشت بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک سیکنڈ میں ہزاروں ارب روپے کی تجارت ہوتی ہے اور جدید سائنس کی وجہ سے یہ تجارت زیادہ تر کمپیوٹر پر ہوتی ہے۔

۵۔ نیا اصول قانون

قانون، قواعد کا ایک ایسا نظام ہے جو معاشرتی اداروں کے ذریعے انسانی رویئے کو قابو میں لاتا ہے۔قوانین تین طریقوں سے بنائے جا سکتے ہیں۔ انہیں ایک اجتماعی مجلس قانون ساز، یا اکیلا رکنِ مجلس قانون ساز یا انتظامی اختیارات رکھنے والا حاکم بذریعہ قواعد واحکامات بناتا ہے یا ججز بذریعہ واجب التعمیل نظائر (binding precedents) بناتے ہیں۔ قانون سیاست، اقتصادیات، تاریخ اور معاشرے کو مختلف طریقوں سے متشکل کرتا ہے۔ لوگوں کے مابین تعلقات کو بطور مصالحت کنندہ منضبط کرتا ہے اور بیک وقت وہ معاشرے کی ایک پیداوار بھی ہوتا ہے۔ قانون کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ قانون (فقہ) فلسفہ قانون (اصول فقہ) اور مدتوں سے چلا آنے والا مطبوعہ قانون (black letter law)۔

فلسفہ قانون (اصول فقہ) کے ابتدائی آثار مختلف مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں جبکہ رسمی مکاتبِ قانون سلطنت روما کے تحت تخلیق ہوئے اور 'Justinian Corpus Juris Civilis' تک

جا پہنچے۔ فطری قانون کے قدیم نظریہ سازوں کا دعویٰ تھا کہ کچھ ایسے قوانین ہیں جو کائنات کے اندر مرتسم و منقش (Jus natural) ہیں۔ پس انسان کے بنائے قوانین کو حتی الوسع ان کے قریب ترین ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ 'Lex iniusta non est lex' پر مبنی ہے جس کے معنی ہیں کہ ایک غیر منصفانہ قانون، صحیح قانون نہیں ہوتا۔

ٹامس ایکوناس نے قوانین کی چار اقسام کی نشاندہی کی ہے: دائمی، فطری، انسانی اور سماوی۔ اول الذکر ماورائے عقل یا وجدانی قوانین ہوتے ہیں۔ جنہیں صرف خدا تعالیٰ جانتا ہے۔ فطری قانون معقول انسانی مخلوق کی دائمی قانون میں شرکت کے حوالے سے ہوتے ہیں اور انہیں عقل کے ذریعے دریافت کیا جاتا ہے۔ سماوی قانون کا اظہار مذہبی کتابوں کے ذریعے ہوتا ہے اور یہ بنی نوع انسان کے لیے خدا تعالیٰ کا ایک مثبت قانون ہوتا ہے۔ انسانی قانون کو عقل کی مدد حاصل ہوتی ہے اور یہ انسانوں کے مشترکہ مفاد کے لیے بنایا جاتا ہے۔ فرانسسکو ڈی ویٹوریا[1] شاید پہلا آدمی تھا جس نے نظریہ "Jus gentium" (عوام کے حقوق) متعارف کرایا اور اس کی وضاحت کی۔ ہوگو گروشئیش فطری قانون کے خالص عقلی نظام کا بانی تھا۔ اس کا استدلال تھا کہ قانون معاشرتی تحرک اور عقل، دونوں کی پیداوار ہے۔ کانٹ کا یقین تھا کہ ایک اخلاقی حکم ایسے قوانین کا متقاضی ہوتا ہے 'جو عالمگیر قوانین فطرت میں سے چنے گئے ہوں'۔

کانٹ پر نطشے نے تنقید کی اور اصول مساوات کو مسترد کرتے ہوئے اس ایقان کا اظہار کیا کہ قانون رغبتِ اقتدار میں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس پر اخلاقی یا غیر اخلاقی کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ بیسویں صدی عیسوی میں لون لووائس فلر[2] نے اس امر پر زور دیا کہ قانون میں ایک داخلی اخلاقِ اقتدار ہوتا ہے جو ان معاشرتی قواعد کے پار چلا جاتا ہے جن سے جائز قانون بنائے جاتے ہیں۔

---

[1]۔ Francisco de Vitoria: فرانسسکو ڈی ویٹوریا (1483ء - 1546ء) ایک سپینی رومن کیتھولک فلاسفر، ماہر دینیات اور قانون دان تھا۔ وہ فلسفے کی ایک روایت سکول آف سلامانکا کا بانی تھا۔

[2]۔ Lon Luvois Fuller: لون لووائس فلر (1902ء - 1978ء) ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک ممتاز پروفیسر تھا۔ اس کو امریکی قانون برائے معاہدات کے سلسلے میں اہم کردار کا حامل تسلیم کیا جاتا ہے۔

دوسری طرف اجابیت پسندوں (Positivists) کا استدلال یہ تھا کہ قانون کچھ ایسی چیز ہے جسے حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔قوانین اس وقت جائز طور پر بنایا جاتا ہے جب وہ معاشرتی لحاظ سے قبول کردہ قواعد سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جیریمی بینتھم کے نقطۂ نظر کے مطابق قوانین اس طرح وضع کئے جانے چاہئیں کہ وہ ممکنہ طور پر افراد کی سب سے بڑی تعداد کے لیے بہترین نتائج دے سکیں۔اس کے شاگردوں جان سٹوأرٹ مل اور جان آسٹن[1] نے اس نظریئے کو قبول کرلیا۔جان آسٹن نے قانون کی یہ تصریح کی کہ یہ وہ احکامات ہوتے ہیں، جن کی پشت پر حاکمیت اعلیٰ کی طرف سے سزا کی دھمکی (Threat of Sanctions) ہوتی ہے۔ان احکامات کا رُخ ان عوام کی جانب ہوتا ہے جو اطاعت گزاری کی عادت رکھتے ہیں۔

ہینس کیلسن[2] قانون کی توضیح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ شیرازہ بند طور طریقے ہیں۔وہ اس کے ساتھ ہی ان طور طریقوں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے سے انکار کرتا ہے۔یعنی قانونی سائنس کو قانونی سیاسیات سے علیحدہ رکھا جانا چاہیے۔اس کے 'خالص نظریۂ قانون' (Pure Theory of Law) کا مرکز ایک بنیادی قاعدہ (Grundnorm) ایک تصوراتی قاعدہ ہے بلکہ یوں کہیے کہ ایک مفروضہ ہے جسے شاہی نظام کے ایک قانون دان نے دلیل کی بنیاد بنایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک قانونی نظام کی تمام زیریں سطحیں جو دستوری قانون سے شروع ہوتی ہیں، ان کے بارے میں یہ رائے ہے کہ انہوں نے اپنا اختیار حاکم مجاز سے لیا ہے۔لہٰذا قانونی روایات کے وجوب کو آخری سرے یعنی کسی مافوق الانسان ذریعے مثلاً خدا، ریاست یا قوم تک جا پہنچے بغیر ہی طے شدہ سمجھا جا سکتا ہے۔

تاہم ہربرٹ لایونل ایڈالفس ہارٹ[3] جیسے قانونی ایجابیت پسندوں (positivists) نے

---

[1]۔John Austin: جان آسٹن (1790ء۔1859ء) ایک برطانوی ماہر قانون تھا، جس کی مطبوعات نے 'برطانوی اصولِ قانون' پر بے پناہ اثرات ڈالے۔

[2]۔Hans Kelsen: ہینس کیلسن (1881ء-1973ء) ایک آسٹرین قانونی فلسفی اور سیاسی فلسفی تھا جو 1940ء میں ترک وطن کر کے امریکہ چلا گیا تھا۔

[3]۔Herbert Lionel Adolphus Hart: ہربرٹ لایونل ایڈالفس ہارٹ (1907ء-1992ء) ایک معروف برطانوی قانونی وسیاسی فلاسفر تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں اصول قانون کا پروفیسر اور بریز نیوز کالج آکسفورڈ کا پرنسپل بھی رہا۔

آسٹن اور کیلسن پر تنقید کرتے ہوئے یہ استدلال کیا ہے کہ قانون کو معاشرتی اقدار کا ایک نظام سمجھا جانا چاہیے اور یہ کہ تکلفاتِ نافذہ (Sanctions) قانون کے لیے ضروری تھے۔ قانون جیسے معیاری معاشرتی مظہر کی بنیاد غیر معیاری معاشرتی حقائق میں پیوست نہیں کی جا سکتی۔ ہارٹ نے مزید کہا کہ قانون ایک مجموعۂ قواعد ہے جو قدیم ترین قواعد (rules of conduct) طرز ہائے عمل اور ثانوی قواعد (ایسے قواعد جو حکام کے لیے ہیں کہ وہ کس طرح قدیم ترین قواعد پر عمل درآمد کرائیں) پر مشتمل ہے۔ ثانوی قواعد طریق ہائے عدل (rules of adjudication) میں منقسم ہیں (تا کہ قانونی تنازعات حل کرائے جا سکیں) ان میں قواعد تغیر (rules of change) (جو قانون میں ردوبدل کرنے کی اجازت دیتے ہیں) اور قاعدۂ شناخت (rule of recognition) (جو قانون کے جائز ہونے کی شناخت کرتا ہے) شامل ہیں۔ قاعدۂ شناخت (rule of recognition) حکام کے روزمرہ کا طرز عمل ہے (بالخصوص بیرسٹرز اور ججز کا طرز عمل) جو کہ چند حقائق کی نشاندہی کرتا ہے اور فیصلے بطور ماخذ قانون صادر کرتا ہے۔

جان بارڈلے رالس[1] کا نظریۂ انصاف ایک خاکے (device) کو استعمال کرتا ہے جسے تخلیقی موقف کہتے ہوئے وہ ہم سے سوال کرتا ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے بنیادی اداروں کو باقاعدہ بنانے کے لیے انصاف کے کون سے اصولوں کا انتخاب کریں گے، اگر ہم لاعلمی کے پس پردہ بیٹھے ہوئے ہوتے؟ تصور کیجیے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں؟ ہماری صنف کیا ہے؟ ہمارے پاس کتنی دولت ہے؟ ہمارا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ یا ہماری شناخت کے خدوخال کیا ہیں؟ تا کہ ہم اپنے حق میں کسی تعصب سے کام نہ لے سکیں۔ رالس دلیل دیتا ہے کہ اس تخلیقی موقف سے ہم بالکل انہی سیاسی آزادیوں کا ہر ایک کے لیے انتخاب کریں گے مثلاً آزادئ اظہار اور حق رائے دہی وغیرہ۔

فلسفۂ قانون کے اصولوں (Jurisprudential doctrines) کی بنیاد پر قانون کے دو بڑے بڑے نظام ظہور پذیر ہوئے ہیں: شہری قانون (civil law) اور رواجی قانون یا

---

[1]۔ John Bordley Rawls: جان بارڈلے رالز (1921ء - 2002ء) ایک امریکی اخلاقیات اور سیاسی فلسفے کا استاد تھا۔ وہ ہارورڈ اور آکسفورڈ کی پروفیسر شپ پر بھی فائز رہا۔

قانون عامہ(common law)۔اول الذکر قانون ایسا نظامِ قانون ہے جو آج دنیا بھر میں بیشتر ممالک میں استعمال ہوتا ہے۔اس قانون میں جن ماخذ کو مستند سمجھا جاتا ہے وہ ابتدائی طور پر قانون سازی اور رواج تھے۔شہری قانون کی تبویب (codification) جو کافی حد تک رومن لاء پر مبنی تھی، اس کے ساتھ ساتھ بعض اثرات مذہبی قوانین (جیسے کہ کلیسا کا قانون) کے بھی تھے جو عہد روشن خیالی (Enlightenment) تک پورے یورپ میں پھیلتے رہے۔ پھر انیسویں صدی عیسوی میں فرانس نے اپنے قوانین کو مع اپنے 'کوڈ سول'[1] اور جرمنی نے اپنے قوانین کو مع اپنے [2] کے جدید بنالیا ہے۔ان دو ملکوں کے مجموعہ ہائے قوانین نے براعظم یورپ کے تمام ملکوں (بشمول یونان) کے قانونی نظاموں پر بے پناہ اثرات مرتب کئے بلکہ جاپانی اور کوریائی قانونی روایات کو بھی متاثر کیا۔آج جن ملکوں میں شہری قانون کے نظام کام کر رہے ہیں ان میں روس اور چین سے لے کر وسطی اور لاطینی امریکہ تک شامل ہیں۔

'قانونِ عامہ' یا 'رواجی قانون' (common law) کے تحت بنے ہوئے قانونی نظاموں میں عدالتوں کے فیصلوں کو قطعی طور پر قانون مانا جاتا ہے۔ جو مجلس قانون ساز (پارلیمنٹ) کے طریق کار کے مطابق بنے قوانین (قوانین موضوعہ) کے مساوی ہوتے ہیں۔ان کے تحت ضابطے انتظامی شاخ وضع کرتی ہے۔قانون میں عدالتی فیصلوں کی یہ مساوی حیثیت اصول نظائر (stare decisis) کی رُو سے ہوتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے ماتحت عدالتوں کے لیے واجب التعمیل ہیں اور اسی عدالت کے مستقبل کے فیصلے بھی قابل تعمیل ہوں گے تاکہ مماثل مقدمات (similar cases) کے نتائج بھی مماثل ہونے کی ضمانت حاصل ہوسکے۔

'قانون عامہ' (Common law) نے ہنری دوم [3] کے دور میں (1100ء کے اواخر میں) فروغ پایا۔ جب اس نے ایسے ججوں کو تعینات کیا جو ملک کے لیے ایک مشترکہ اداراتی اور متحدہ نظام قانون وضع کرنے کا اختیار اور صلاحیت رکھتے تھے۔قانونِ عامہ کے ارتقا کے

۱۔Code Civil des Francais: فرانس کا سول کوڈ

۲۔Burgerliches gesetzbuch: جرمنی کا سول کوڈ

۳۔Henry-ii: ہنری دوئم (1133ء–1189ء) انگلستان کا بادشاہ تھا جو 1154ء سے 1189ء تک برسر اقتدار رہا۔

لیے اگلا بڑا قدم 1215ء کا منشورِ عظیم میگنا کارٹا تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ بادشاہ کے ہمراہی ججوں کی عدالتیں اپنے اجلاس اور فیصلے ایک خاص جگہ پر منعقد کریں نہ کہ ملک کی نا قابل پیشنگوئی جگہوں پر اجلاس کر کے اپنی پسند کا انصاف بانٹتے پھریں۔ جب قانونِ عامہ کا نظام نا قابل یقین حد تک ضابطہ بند، سخت گیر اور بے لچک ہو گیا تو اس قانون کے پہلو بہ پہلو ایک با ضابطہ ادارۂ نصفت (Equity) بھی وجود میں آ گیا۔ اس نے اپنی کورٹ آف چانسری تشکیل دے دی۔ شروع شروع میں 'نصفت' (Equity) کو اکثر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اسے ڈانوا ڈول قسم کا قانون قرار دیتے ہوئے کہا جاتا کہ اس کا سائز چانسلر کے قدموں کے برابر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عدالت ہائے نصفت (Equity) ٹھوس اصولوں پر استوار ہوتی چلی گئیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں دونوں نظاموں کو 'نظام قضا'[1] کے تحت یکجا کر دیا گیا۔ اس طرح قانونِ عامہ اور نصفت کی تاریخی طور پر الگ الگ عدالتیں اکٹھی ہو گئیں۔ قانونِ عامہ نے ابتداً انگلینڈ میں جنم لیا۔ جسے بعد میں بہت سے ملکوں نے اختیار کر لیا۔ ایک دفعہ اسے پوری سلطنت برطانیہ میں آزمانے کے بعد، ماسوائے چند مستثنیات (few exceptions) کے، سب ملکوں نے تسلیم کر لیا۔ امریکہ، آسٹریلیا، ہندوستان اور پاکستان میں بھی یہی قانون رائج ہے۔

قانون کے پیچیدہ ہو جانے کی وجہ سے اس کی متعدد زمرہ بندیاں (classifications) کرنا پڑیں۔ آج عمومی طور پر اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: فوجداری قانون (Criminal law) اور دیوانی قانون (Civil law)۔ اول الذکر قانون اس طرزِ عمل سے متعلق ہے جسے معاشرے کے لیے ضرر رساں سمجھا جاتا ہے جس میں قصوروار فریق کو جیل بھجوا دیا جاتا ہے یا اس پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے۔ دیوانی قانون (اس قانون کو متذکرہ بالا شہری قانون کے دائرہ سماعت کے ساتھ گڈ مڈ نہ کیا جائے) افراد یا اداروں کے مابین تنازعات دور کرانے جیسے معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نقصان کی تلافی کے لیے تعمیل، مختص، استقرارِ حق (classifications) اور جیتنے والے فریق کے مالی نقصان کے ازالہ کا انتظام کیا

---

[1] The Judicature Acts 1875ء کے عشرے میں شروع ہونے والے ایکٹس آف پارلیمنٹ کا ایک سلسلہ تھا۔

جاتا ہے۔ دیوانی قانون نے معاہدات خاص کو جنم دیا ہے۔ مثلاً قانون معاہدات (Contract law)، قانونِ جائیداد (Property law)، قانونِ وقف (Trust law)، قانون ازالۂ نقصان (Tort law)، قانون دستوری (Constitutional law)، قانون انتظامی (Administrative law) اور بین الاقوامی قانون (International law) وغیرہ مہیا کئے ہیں۔

متذکرہ بالا نظریاتی اور عملی پیش قدمیوں نے خصوصی اداروں کے قیام کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اس کے نتیجے میں ایک نمائندہ پارلیمنٹ (representative parliament)، ایک جوابدہ منتظمہ (accountable executive)، آزاد عدالتیں اور انتظامی معاملات کو مناسب طور پر چلانے والی ایک تنظیم (bureaucracy) اور قانونی پیشہ وجود میں آ گیا۔

۶۔ حقوقِ انسانی کا احترام

انسانی حقوق کی اصطلاح کو جنگ عظیم دوئم کے بعد اور اقوام متحدہ کی بنیاد ڈالے جانے پر بہت شہرت حاصل ہوگئی۔ اس نے 'فطری حقوق' (natural rights) یا 'حقوق انسانی' (rights of man) کی جگہ لے لی۔ انسانی حقوق کے تصور کے تاریخی ماخذ پیچھے قدیم یونان اور روم سے جا ملتے ہیں۔ جہاں اس پر یونان اور یونانی رواقیت (Hellenic Stoicism) کے قبل از جدید فطری قوانین پر مبنی نظریات کے حوالے سے بحث کی جاتی تھی۔ ان نظریات میں اس فطری قانون کی موجودگی کا اعتراف کیا جاتا تھا جو چند ہمہ گیر حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔

1215ء کے منشور عظیم میگنا کارٹا (Magna Carta) میں فیصلہ کیا گیا کہ عوام بنیادی حقوق رکھتے ہیں۔ مغربی معاشرے کے قلب ماہیت (metamorphosis) تیرہویں صدی سے شروع ہو کر 'امنِ ویسٹ فالیہ، 1648' (Peace of Westphalia) کے معاہداتِ امن پر دستخط ثبت ہونے تک جاری رہی۔ نشاۃ ثانیہ شروع ہونے اور جاگیرداری کے انحطاط پذیر ہونے کے نتیجے میں آزادی اور مساوات کے کشادہ دلانہ تصورات ابھرنے لگے۔ جن سے جدید دور کے تصوراتِ انسانی حقوق کی بنیادیں استوار ہو گئیں۔ ٹامس ایکوناس اور ہوگو گروشیئش کی تعلیمات منشورِ عظیم 'میگنا کارٹا'، محضر نامۂ حقوق (Petition of Rights)

اور انگلستان کے بندوبستِ دستوری (English Bill of Rights) سب نے اس امر کی توثیق کر دی کہ بنی نوع انسان کو چند دائمی اور نا قابل انتقال حقوق فطری طور پر عطا ہوئے ہیں۔

گیلیلیو اور نیوٹن کی دریافتوں، ٹامس ہابز کی مادیت، ڈیکارٹ کی عقلیت، فرانسس بیکن اور جان لاک کی تجربیت اور عہد روشن خیالی میں انسانی عقل پر بڑھتے ہوئے اعتماد نے انسانی معاملات کے تصورِ کاملیت (perfectibility) کی طرف رہنمائی کر دی۔ جان لاک، مونٹیسکیو، والٹیئر [1] اور روسو جیسے فلسفیوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ حالت فطرت کے دوران افراد کو چند حقوق بطور بنی نوع انسان ہونے کے حاصل تھے۔ مہذب معاشرے (سول سوسائٹی) میں داخل ہونے پر (بوجۂ معاہدۂ عمرانی) بنی نوع انسان نے ریاست کو صرف وہ حقوق تفویض کئے تھے جو ان فطری قوانین پر عمل درآمد کے لیے ناگزیر تھے، نہ کہ تمام حقوق ہی اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ ان فطری حقوق کے نفاذ میں ریاست کی ناکامی کی صورت میں عامۃ الناس کو بغاوت کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ اس طرح 'نظریۂ نا قابلِ انتقال حقِ انسان' (inalienable right of man) ایک بنیادی اخلاقی اور معاشرتی الہام (social gospel) بن گیا۔

اس بھرپور ذہنی شعور اور گرم جوشی بمعہ 1688ء کے انگلستان میں سنہری انقلاب (Glorious Revolution) کی عملی مثال اور نتیجتاً بندوبست دستوری (Bill of Rights) نے انقلابی شورش کی لہر کے لیے منطقی جواز فراہم کر دیا۔ جس نے شمالی امریکہ اور فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ٹامس جیفرسن [2] نے اعلان کیا کہ اس کے ہم وطن آزاد لوگ ہیں اور وہ اپنے ان حقوق کے دعویدار ہیں جو انہیں قوانین فطرت سے ملتے ہیں۔ یہ کسی چیف مجسٹریٹ کا عطیہ نہیں ہیں۔ شاعرانہ اعلانِ آزادی میں جو 4 جولائی 1776ء کو 13 امریکی نوآبادیوں کی طرف سے ہوا، کہا گیا کہ 'ہم ان صداقتوں کو اظہر من الشمس قرار دیتے ہیں کہ تمام انسان برابر پیدا کئے گئے اور

---

[1]۔ Francisco de Vitoria: فرانسسکو ڈی ویٹوریا (1483ء-1546ء) ایک سپینی رومن کیتھولک فلاسفر، ماہر دینیات اور قانون دان تھا۔ وہ فلسفے کی ایک روایت سکول آف سلامانکا کا بانی تھا۔

[2]۔ Thomas Jefferson: ٹامس جیفرسن (1743ء-1826ء) امریکہ کا تیسرا صدر تھا جو 1801ء سے 1807ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ وہ متحدہ امریکہ کا بانی قائد اور اعلان آزادی کو قلمبند کرنے کا اعزاز بھی اسے ہی حاصل ہوا۔

انہیں ان کے خالق نے چند ایک نا قابل انتقال حقوق عطا کئے ہیں۔ جن میں زندگی، آزادی اور خوشیوں کی تلاش کے حقوق بھی شامل ہیں۔ فرانسیسی اعلانِ حقوق انسان اور حقوق شہریت (The French Declaration of the Rights of Man and of the Citizen) میں انگلستان اور امریکہ کی آزادیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

(Encyclopedia Britannica, article: Human Rights)

تحریک عالمگیر حقوقِ انسان (Universal Human Rights Movement)، جنگ عظیم دوئم کے بعد اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ اس نے چند قانونی دستاویزات کو جنم دیا۔ ان میں سے زیادہ نمایاں اقوام متحدہ کا چارٹر، عالمگیر اعلانِ انسانی حقوق (Universal Declaration of Human Rights, 1948)) ہے۔

اقوام متحدہ کا منشور انسانی حقوق کے بارے میں براہ راست کچھ نہیں کہتا۔ اس کے اندر چند ایک حوصلہ افزا اور ترغیبی دفعات ہیں۔ مثلاً انسانی حقوق کے احترام میں اضافہ، انسانی حقوق کے حصول کے لیے دست تعاون بڑھانا، انسانی حقوق کا عالمی سطح پر احترام بڑھانے کے اقدامات کرنا وغیرہ۔ 1946ء میں اقوام متحدہ کی معاشی و معاشرتی کونسل نے کمیشن برائے انسانی حقوق (یو این کمیشن) قائم کیا۔ 1948ء میں اس کمیشن نے ایک مسودہ برائے ڈیکلریشن تیار کیا جسے بنیاد بنا کر جنرل اسمبلی نے اس سال بطور 'عالمی اعلانِ انسانی حقوق' کی قرارداد تیار کی۔ 48 ممالک نے اس کی حمایت کی اور 8 نے رائے شماری میں حصہ لینے سے گریز کیا۔ (اس وقت اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد 56 تھی)۔ یہ قرارداد (ڈیکلریشن) 1976ء میں 'ICCPR' اور 'ICESCR' کے لیے ایک سپرنگ بورڈ (springboard) تھی۔ یہ سب کارنامے انسانی حقوق کے ان نظریہ سازوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھے جن کا سلسلہ ٹامس ہابز سے شروع ہو کر آج کل کے علمبردارانِ حقوق انسانی کی مساعی (efforts) کی بدولت آگے بڑھ رہا ہے۔

عالمگیر اعلان انسانی حقوق 'UNDHR' انسانوں کو درج ذیل حقوق اور آزادیوں سے نوازتا اور ان کا اعلان کرتا ہے:

(i)۔ حق برائے زندگی، آزادی اور سلامتی (آرٹیکل ۳)

(ii)۔ آزادی از غلامی و اطاعتِ جبری ((آرٹیکل ۴)

(iii)۔ آزادی از اذیت یا رسوا کن سلوک (آرٹیکل ۵)

(iv)۔ حقِ شناخت بطور ایک فرد، بہ نگاہِ قانون (آرٹیکل ۶)

(v)۔ حقِ مساوات در نگاہِ قانون و مساوی، تحفظِ قانونی (آرٹیکل ۷)

(vi)۔ حقِ مؤثر مداوا، اگر حقوق کی پامالی ہوئی ہو (آرٹیکل ۸)

(vii)۔ آزادی از بے جا گرفتاری، نظر بندی یا ملک بدری (آرٹیکل ۹)

(viii)۔ حقِ جائز و مروجہ انداز سماعت رو برو غیر جانبدار ٹریبونل (آرٹیکل ۱۰)

(ix)۔ یہ حق کہ جرم ثابت ہونے سے قبل بے گناہ سمجھا جائے اور نافذ بہ ماضی فوجداری قانون سے تحفظ (آرٹیکل ۱۱)

(x)۔ حقِ خلوت، خاندان، گھر یا خط و کتابت اور عزت و ناموس کا تحفظ (آرٹیکل ۱۲)

(xi)۔ حقِ آزادی نقل و حرکت اور رہائش (آرٹیکل ۱۳)

(xii)۔ ظلم و ستم سے تحفظ کے لیے پناہ گاہ کی تلاش کا حق (آرٹیکل ۱۴)

(xiii)۔ حقِ قومیت (آرٹیکل ۱۵)

(xiv)۔ حقِ شادی بیاہ اور خاندان سازی (آرٹیکل ۱۶)

(xv)۔ حقِ ملکیتِ املاک (آرٹیکل ۱۷)

(xvi)۔ حقِ آزادئ فکر، ضمیر اور مذہب (آرٹیکل ۱۸)

(xvii)۔ حقِ آزادئ رائے اور آزادئ اظہار (آرٹیکل ۱۹)

(xviii)۔ حقِ پُرامن اجتماع اور انجمن سازی (آرٹیکل ۲۰)

(xix)۔ حقِ شمولیت در حکومت (آرٹیکل ۲۱)

(xx)۔ حقِ معاشرتی تحفظ (آرٹیکل ۲۲)

(xxi)۔ حقِ محنت اور انتخابِ ملازمت (آرٹیکل ۲۳)

(xxii)۔ حقِ آرام وتفریح طبع (آرٹیکل ۲۴)

(xxiii)۔ حقِ معیارِ زندگی، مناسب صحت اور خوشحالی (آرٹیکل ۲۵)

(xxiv)۔ حقِ تعلیم (آرٹیکل ۲۶)

(xxv)۔ ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق (آرٹیکل ۲۷)

(xxvi)۔ معاشرتی اور بین الاقوامی نظم میں سہولت کاری کا حق (آرٹیکل ۲۸)

یہ حقوق اور ان کا ایک ایسی ہمہ گیر دستاویز میں اظہار جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تیار کی اور اس پر ووٹ دیا اس سے اس کی عالمی اہمیت کی عکاسی اور ان دانشوروں کی محنت کے عملی اطلاق کا اظہار رہوا۔

تحریک انسانی حقوق بنی نوع انسان کے وقار کے تحفظ اور اس کو سر بلند رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہے۔ انسانی وقار جس کا اظہار اقوام متحدہ کے منشور کے دیباچے میں بطور ایک نصب العین کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ 'ہم اقوام متحدہ کے لوگ بنیادی انسانی حقوق، ان کے وقار اور قدر و منزلت کی توثیق کرنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں'۔

یہ اصطلاح عالمی اعلان انسانی حقوق کے دیباچے اور پہلے آرٹیکل میں بھی شامل ہے: ہر گاہ کہ انسانی خاندان کے تمام ارکان کے پیدائشی وقار کی شناخت یہ ہے (دیباچہ)؛ کہ تمام انسان بلحاظ اپنے وقار اور حقوق کے آزاد اور مساوی پیدا ہوئے ہیں۔ (آرٹیکل ۱)۔ وقار (Dignity) لاطینی لفظ 'Dignitas' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں 'قدر و قیمت'۔ اس کا ایک لُغوی مفہوم قدرتی طور پر موجود ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ افراد سے دوسرے لوگوں کی مرضی کے مطابق محض اوزاروں اور اشیا جیسا سلوک نہ کیا جائے۔ اس کے اندر مضمر معنی یہ ہیں کہ سیاسی، معاشرتی اور قانونی لحاظ سے افراد کے پسندیدہ عقائد، طرز زندگی، رویوں اور پبلک امور میں ان کے طریق کار کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے۔

یہ عقیدہ کہ انسانی حقوق ایک شخص کے وقار میں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے دو ضمنی معنی

ہیں: یہ تصور کہ بنیادی حقوق کسی اتھارٹی کے عطا کردہ نہیں ہیں۔ اس لیے وہ چھینے نہیں جا سکتے اور یہ تصور کہ ہر فرد کے حقوق ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی انسانی حقوق میں آزادیوں کی مائل بہ طوالت فہرست میں اب یہ امور بھی شامل ہو چکے ہیں: تنخواہ، حالاتِ کار (work conditions)، ٹریڈ یونینز، معیار زندگی، آرام و فراغت، بہبود و معاشرتی تحفظ، عورتوں اور بچوں کے حقوق اور ماحول۔

- بین الاقوامی اقرارِ شہری و سیاسی حقوق (International Covenant on Civil and Political Rights, 1976(ICCPR))
- بین الاقوامی حقوق معاش(International Covenant on Economic)
- معاشرتی اور ثقافتی حقوق((Social and Cultural Rights, 1976 (ICESCR))
- یورپین میثاقِ تحفظ انسانی حقوق(European Convention for the Protection of Human Rights)
- میثاق برائے انسداد امتیازات ہمہ اقسام بر خلاف حقوقِ نسواں (Convention for Elimination of All Forms of Discrimination Against Women, 1979)
- اقرارنامہ برائے انسداد اذیت (Convention Against Torture) مع متعدد معاہدات جو بین الاقوامی تنظیم محنت (International Labour Organization) نے کرائے تھے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں عالمی اور علاقائی معاہدات وجود میں آ چکے ہیں۔ ان پر عمل کرنے کے لیے کمیشن، کمیٹیاں اور عدالتیں بن چکی ہیں۔ عہد حاضر میں حقوق انسانی کے بغیر سیاسیات اور معاشیات پر بات کرنا ممکن نہ ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ جدید تہذیب کے پچھلے پانچ سو سالہ عمل کو اگر ہم دو لفظوں میں بند کرنا چاہیں تو ہم با آسانی کہہ سکتے ہیں کہ جدید مغربی تہذیب نے انسان کو دو چیزوں پر زور دینا سکھلایا ہے: (i)۔ عقل، (ii)۔ حقوق انسانی اور یہ عقل اور حقوق انسانی کا عہد ہے۔

حوالہ جات

۱۔ An Anatomy of the World by John Donne. London: A. Mathewes for T. Dewe, n.d.

۲۔ Controlling the State: Constitutionalism from Ancient Athens to Today by Gordon Scott. Harvard: Harvard University Press, 2009.

۳۔ Dictionary of the Social Sciences by C. Calhoun. New York: Oxford University Press, 2002.

۴۔ Encyclopedia Britannica. Chicago: The University of Chicago, 1988.

۵۔ Journal of history of behavioural sciences, 42 (2006). Is There a Problem with Mathematical Psychology? A fresh look at Kant's old argument by Thomes Strum

۶۔ Journal of the History of Ideas 59 (3), 1998. Explaining Away the Greek Gods in Islam by J. T. Walbridge.

۷۔ Renaissance Genius: Galileo Galilei & His Legacy to Modern Science by David Whitehouse. London: Sterling Publishing, 2009.

۵

مسلم دنیا کی علمی بے بسی



شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملّا کے غلام اے ساقی
(بال جبریل: غزلیات)

عہد متوسط اور جدید دور میں جب مغرب میں پرانے علوم نئی شکل اختیار کر رہے تھے اور نئے علوم رونما ہو رہے تھے تو مسلم دنیا خواب غفلت کے مزے لے رہی تھی یا پھر پدرم سلطان بود (مرا باپ بادشاہ تھا) پکار رہی تھی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مسیحی علما کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عقل و خرد سے جنم لینے والے علوم اور اس کے نتیجے میں بننے والے اداروں کی مخالفت کر رہی تھی اور انہیں اسلام کی تعلیمات کے خلاف ثابت کر رہی تھی۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ جب مغرب میں علوم و فنون آگے بڑھ کر انسان و کائنات کی تسخیر کر رہے تھے تو اس وقت ہم کیا کر رہے تھے۔

۱۔ سائنس سے بے نیازی

بارہویں صدی عیسوی سے پہلے مسلمان سائنس کے میدان میں چھائے ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے سائنس کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور اصلاح مذہب (Reformation) اور روشن خیالی (Enlightment) کی تحریکیں اٹھیں مگر مسلم دنیا ان سے بے خبر اور بے تعلق رہی۔ مغربی دنیا اور عیسائی دنیا نے سائنس میں ترقی شروع کی اور وہ سائنس میں استاد بن گئے اور مسلمان ان کے شاگرد بننے لگے اور وہ بھی نکمے حالانکہ اس سے پہلے مسلمان سائنس کے میدان میں استاد تھے اور مغربی و مسیحی دنیا ان کی شاگرد۔

مسلمانوں کے سائنس میں اس زوال کی کئی وجوہات ہیں۔ کچھ فکری اور کچھ عملی۔ فکری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ روایتی مسلمان علما نے معتزلہ کے حامی عباسی خلیفہ مامون الرشید کے ہاتھوں سخت اذیتیں اٹھائیں جو یونانی فلسفہ (ارسطو) کے زیر اثر معتزلہ (عقلی تحریک) کا حامی تھا۔ اس کے اس تشدد کے ردعمل میں مسلمان علما میں عقلیت پسندی کے خلاف ایک ردعمل نے جنم لیا اور مامون سے نصف صدی بعد مسلمان دنیا میں فلسفہ کی کتابیں جلائی جانے لگیں۔ معتزلہ کے رد میں

اشاعرہ کی تحریک چلی جس کے بعد انتہا پسندوں نے غیر عقلی باتیں کیں۔ اس کے بعد امام غزالیؒ کی تعلیمات کو بھی غیر ضروری طور پر عقل کے خلاف سمجھا جانے لگا حالانکہ وہ صرف یونانی فلسفہ کا علمی رد کر رہے تھے جس نے مسلمانوں کے ذہن کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کے بعد عام طور پر مسلمانوں میں ایک غیر ضروری غیر عقلی رویے نے جنم لیا جس نے نئے نظریات، نئی تحقیقات وغیرہ کو ناپسند کرنا شروع کر دیا جو سائنس کی ترقی کے لیے ضروری تھیں۔

مدارس کے نصاب میں قرآن پاک، حدیث شریف اور فقہ کے علوم کو اسلامی علوم کہا جانے لگا جس سے ذہن سازی ہونے لگی کہ باقی سائنسی اور دیگر علوم غیر اسلامی ہیں بلکہ سائنسی اور عقلی علوم کے ماہرین اور طلباء کو ناپسند کیا جانے لگا بلکہ ان کو سزائیں دی جانے لگیں۔ عقلیت پسند مسلمان فلاسفر اور عالم ابن رشد پر روایتی علما نے دین سے انحراف کا الزام لگایا۔ خلیفہ مجبور ہو گیا۔ اس نے ابن رشد کو قرطبہ سے نکال کر قریبی یہودیوں کی بستی میں بھیج دیا اور اس کی کتابوں کو جلانے کا حکم دیا۔ ابن رشد نے مراکش میں جا کر پناہ لی۔ مغرب نے اس کے علم و فضل سے بہت فائدہ حاصل کیا مگر مسلمان کئی صدیاں اس سے محروم رہے۔

عظیم مسلمان سائنسدان ابوبکر زکریا رازی کو اتنا مارا گیا کہ وہ نابینا ہو گئے۔ عظیم ترین مسلمان کیمیا دان جابر بن حیان کی وفات جیل میں ہوئی۔ اسی طرح اور بہت سے واقعات ہوئے مگر دوسری طرف مغرب نے اسلامی ثقافت سے حاصل کردہ علم کو استعمال کیا اور اسے بے پناہ ترقی دی۔ مسلمان جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ مثال کے طور پر ریاضی کی کتاب اقلیدس افغانستان، بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان کے دینی مدارس میں ابھی تک ایک نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے۔ یہ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ نیوٹن اور لائبنیز کے زمانے سے اب تک ریاضی میں بے پناہ تغیرات آ چکے ہیں۔ جدید ریاضی نے انجنیئروں کو حیران کن کمالات دکھانے کی اہلیت عطا کر دی ہے لیکن مدارس کے فارغ التحصیل ایسی ہنرمندی اس لیے نہیں دکھا سکتے کہ ان کی تعلیم زمانے سے پیچھے رہ گئی ہے۔ ہم اپنے مدارس کے طلبا کو اب تک یہی پڑھا رہے ہیں کہ کیمیا میں صرف چار عناصر (elements) ہوتے ہیں: آگ، مٹی، پانی اور ہوا جبکہ مغرب ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) سے زائد عناصر دریافت کر چکا ہے۔ ہم ابھی تک ان کے چار ہونے کے نظریئے سے چمٹے ہوئے ہیں۔

مغرب نے ان ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) عناصر میں سے صرف ایک عنصر یورینیم کو پھاڑا ہے۔ جس سے ایٹم بم بنا لیا ہے۔ اس طرح مغرب اور مسلمانوں کا فرق 118:4 کے تناسب سے ہے۔ اس فرق کو مٹی اور یورینیم کا فرق کہا جا سکتا ہے۔

آیئے ہم ایک مثال لیتے ہیں۔ حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کا شہنشاہ رہا۔ اسے بے پناہ وسائل دستیاب تھے کیونکہ اس وقت کی سلطنتِ مغلیہ، برصغیر دولت مند ترین سلطنت تھی۔ وہ برصغیر پر اس زمانے میں حکمرانی کر رہا تھا جب مغرب میں جدید سائنسز اور فلسفے کو ترقی دی جا رہی تھی۔ اس کی بادشاہت اس تعلیم کے اثرات کو محسوس کر رہی تھی۔ واسکوڈے گاما جس نے مغرب کو ایشیا کا راستہ دکھایا وہ ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر 1499ء میں اتر چکا تھا۔ 1510ء میں پرتگال نے ہندوستان کے ساحلی علاقے گوا پر قبضہ کر لیا تھا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے بعد میں سراج الدولہ[1] اور ٹیپو سلطان کو شکست دیکر ہندوستان پر سیاسی قبضے کی ابتدا کی، سولھویں صدی سے یہاں کام کر رہی تھی۔ لیکن اورنگزیبؒ ان خطرناک سیاسی حقائق سے بالکل بے خبر رہا۔ 1440ء میں پرنٹنگ پریس لگنے شروع ہو گئے تھے۔ ہمارے ہاں بادشاہ سلامت اپنے متبرک ہاتھ سے قرآن مجید لکھنا کمال سمجھتے تھے۔ یورپ میں 1455ء میں انجیل مقدس پریس سے چھپ چکی تھی۔ اورنگ زیبؒ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ قرآن پاک کی اشاعت ہی کے لیے پرنٹنگ پریس لگوا لیتا۔ پیرس یونیورسٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی گیارہویں صدی عیسوی میں بن چکی تھیں جبکہ اورنگزیبؒ نے یہ کام اٹھارہویں صدی عیسوی میں بھی نہ کیا۔

(Encyclopedia of Britanica, Vol 7, p.761)

1632ء میں اس کے والد محترم شاہجہان نے اپنی بیوی ممتاز محل کی یاد میں اس کا مقبرہ بنوانا شروع کیا جو فن تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ تاج محل کو دیکھنے کے لیے ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں جبکہ اس کے چار سال بعد 1636ء میں امریکہ کے ایک پادری جان ہارورڈ (John Harvard) نے ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ امریکہ کے آٹھ صدور اس

---

[1]۔ مرزا محمد سراج الدولہ المعروف نواب سراج الدولہ (1733ء-1757ء) بنگال، بہار اور اڑیسہ کے آخری آزاد حکمران تھے۔ 1757ء میں ان کی شکست سے بنگال میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا۔

یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ میں سے ایک سو اکسٹھ (161) کو نوبل پرائز مل چکا ہے۔ اس وقت (2020ء) ہارورڈ یونیورسٹی کے پاس چالیس (40) ارب امریکی ڈالر (6200 ارب روپے) کا وقف (endowment) ہے جبکہ پاکستان کا وفاقی تعلیمی بجٹ (2020ء) 84 ارب روپے کا ہے۔ اس سے ہمارے رہنماؤں کی ترجیحات پر روشنی پڑتی ہے۔

جدید علوم سے یہ بے خبری تھی کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریز فوج کی تعداد صرف پینتالیس ہزار (45000) تھی جبکہ مسلمان فوج کی تعداد اڑھائی لاکھ (250000) تھی لیکن پھر بھی شکست ہمارا مقدر بنی۔ اس لیے کیونکہ ہم جدید علوم سے بے خبر تھے اور انگریز کے پاس توپ اور ٹیلی گرام (Telegram) تھے۔ یہ بات یاد کر کے زخموں پر نمک پڑ جاتا ہے کہ ہم ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں اپنے پیغام کبوتر کے ذریعے بھیجتے تھے۔ برطانوی فوج ٹیلی گرام استعمال کرتی تھی۔ نتیجہ تو یہی نکلنا تھا جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ (فکر اسلامی از وحید الدین خان، ص: ۱۸۰) اس طرح سب سے بڑی مسلم مغل سلطنت کو سات ہزار (7000) کلومیٹر دور بیٹھی حکومت کی ایک چھوٹی سی فوج نے شکست دے دی۔

قرآن مجید میں سات سو (۷۰۰) سے زائد آیات اسی ہیں جو فطرت کے مظاہر سے متعلق ہیں اور بہت سی آیات مبارکہ ہمیں فطرت کے مظاہر میں غور وفکر کا حکم دیتی ہیں۔ لیکن جب انیسویں (۱۹) صدی میں جدید سائنس مسلمان دنیا میں آئی تو مسلمانوں نے اس کو مکمل طور پر قبول نہ کیا اور مسلمانوں میں کئی طبقات سامنے آ گئے۔

(۱)۔ ایک طبقے نے جدید سائنس کو گمراہ کن غیر ملکی فکر قرار دے دیا جو اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہو۔

(۲)۔ ایک طبقہ نے کہا کہ مسلمان صرف اور صرف اس وقت ترقی کر سکتے ہیں جب کہ وہ سائنس پر مکمل طور پر عبور پا لیں اور اپنی ذہنی سوچ کو سائنسی بنا لیں۔

(۳)۔ زیادہ تر مسلمانوں نے جدید سائنس کو مذہبی بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کچھ نے کہا کہ جدید سائنس کی تمام جدید دریافتوں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ جبکہ کچھ نے کہا کہ اسلامی تعلیمات کو جدید سائنس کی روشنی میں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

(۴)۔ کچھ علما نے کہا کہ جدید سائنس کو اس کی غیر اسلامی تعبیرات سے الگ کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے سائنس کی ترقی کی تو تعریف کی مگر کہا کہ سائنس کی دریافتوں اور تعلیمات کی مادہ پرستانہ تعبیر نہ کی جائے بلکہ سائنس ایک خالص علم ہے۔ اس کی فلسفیانہ تعبیر اسلام کے فلسفہ کی روشنی میں کی جاسکتی ہے اور اس طرح سائنس انسان کو خدا کے قریب لاسکتی ہے۔

قصہ مختصر وجوہات جو بھی ہوں مسلمانوں کی روش عام طور پر سائنس اور سائنسی فکر سے بیزاری ہے۔ جس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ آج تک پوری مسلمان دنیا سے صرف تین لوگوں کو سائنس میں نوبل انعام (Nobel Prize) مل سکا ہے اور یہ تینوں مغربی ممالک میں پڑھے ہیں۔ وہاں ہی انہوں نے تحقیق کی ہے۔ ایک کو مسلمان نہیں مانا جاتا اور دوسرے دو بھی اسلام پر روایتی طریقے سے عمل نہیں کرتے۔

۲۔ ملوکیت ہی ملوکیت

مسلم دنیا مجموعی دنیائے انسانیت کے تقریباً پانچویں حصے کی نمائندگی کرتی ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے مسلمان مراکش (Morocco) سے لے کر منڈاناؤ (Mindanao) تک پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا کے وسط پر قابض ہیں۔ یہ ایک طرف امریکہ، یورپ اور روس اور دوسری طرف سیاہ فام افریقہ، بھارت اور چین کے چوراہوں پر براجمان ہیں۔ عباسی خلافت (750ء–1258ء) کے دوران انہوں نے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ اسلام نے ایک عظیم الشان اور وسیع المنظر تہذیب کی تشکیل کی جو صحیفۂ آسمانی کے پیغام اور تین براعظموں میں اس کی توسیع کے دوران وجود میں آنے والی ثقافتوں کی حکمت و دانش اور سائنس پر استوار تھی۔ اس نے کئی عظیم سلطنتوں کو جنم دیا جن میں بجانب مغرب عثمانیوں، ایران کے صفویوں اور برصغیر ہند کے مغلوں کی بادشاہتیں شامل تھیں۔

پھر مغرب نے اٹھنا شروع کیا۔ اولین جدید اسلامی دنیا اٹھارویں صدی عیسوی کی روشن خیالی اور انیسویں صدی عیسوی کے صنعتی انقلاب کی آمد سے اقتصادی اور سیاسی طور پر مضبوط و مستحکم ہو جانے والے مغرب کے پیچھے دھڑام سے گر گئی۔ تقریباً 1800ء میں چھوٹی چھوٹی یورپی اقوام (انگلینڈ، فرانس اور ہالینڈ) نے اسلامی دنیا کے بڑے بڑے خطوں پر اپنی حکومتیں قائم

کرلیں۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد مسلمانوں کے جغرافیائی و سیاسی نقشے پر یورپی طرز پر از سر نو منظم ہو جانے والی قومی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں مسلم اہل دانش پر دو یکسر مختلف رجحانات مسلط ہونے لگے جو معاشرتی اور مذہبی تجدید نو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جدیدیت کے علمبرداروں کی تجویز یہ تھی کہ اسلام کو مغربی تصورات کے مطابق ڈھال دیا جائے جبکہ احیا (revivalism) کے حامی، اسلام کی اصل حرکیات (dynamism) کے جوش و جذبے کو بحال کرنے کی ضرورت پر زور دے رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی نقطۂ نظر ایک ہمہ گیر اسلامی خلافت کی خیالی دنیا (utopia) کی طرف رہنمائی نہیں کر رہا تھا۔ اب اسلام کو چیلنج دیا جا رہا تھا کہ وہ اپنا اظہار خودمختار قوموں کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے کرے۔ جیسا کہ یہ قومیں نسلیت، علاقائیت اور ثقافت پر توجہ مرکوز کرتی ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلامی دنیا نے صدی کے وسط میں ترکی کے سیکولرازم کی گھن گرج کا مشاہدہ کیا تھا جس سے اسے اواخر صدی میں عرب، ایرانی، پاکستانی اور انڈونیشی سیاسی ثقافت میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ سیکولرازم عسکریت پسندی کے رجحانات سے مغلوب ہوتا جا رہا ہے کیونکہ یہاں عوام کی آزادانہ مرضی پر مبنی کوئی حقیقی نمائندہ حکومت نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اسلامی سیاسی فکر کی بنیادیں خود رکھیں اور باہمی مشاورت پر مبنی نظامِ مساوات قائم کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چار جانشینوں، خلفائے راشدین نے عوامی فلاح و بہبود کی ترغیب دینے کے لیے انتخابی نظام متعارف کرایا۔ بنی امیہ (658ء - 750ء) جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلہ قریش میں سے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہونے کی بنا پر خود کو حق دار خلافت سمجھتے تھے لیکن انہوں نے ملوکیت متعارف کرا دی۔ اہل تشیع جو قیادت کو خاندانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور خوارج جو انتہائی متقی مسلمان کو مثالی خلیفہ کے طور پر منتخب کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے، دونوں نے بنی امیہ کی قیادت کو چیلنج کر دیا۔

750ء میں عباسیوں کو خلافت مل گئی اور خلیفہ مذہب اور ریاست کے محافظ کے طور پر اپنے

فرائض انجام دینے لگا۔ خلیفہ کو ظل الٰہی تصور کیا جاتا تھا لیکن سیاسی ادارے ابن المقفع[۱] کی وجہ سے ایرانی ثقافت کے زیر اثر تھے۔ قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسفؒ نے خلیفہ ہارون الرشید کے حکم پر 'کتاب الخراج' لکھ کر حکمرانی اور مالیاتی امور کے لیے ایک نظیر قائم کر دی۔ انہوں نے خلیفہ کے مقام کی صراحت کرتے ہوئے چرواہے اور اس کے ریوڑ کی مثال دی اور بڑوں اور چھوٹوں کے لیے دین الٰہی کا قیام اس کے لیے فرضِ عین قرار دیا۔ خلیفہ مامون الرشید نے اپنے دور خلافت (813ء- 833ء) میں یونانی تہذیب کے زیرِ اثر مذہبی طبقے پر خلیفہ کی فوقیت کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ تاہم علماء نے حضرت امام شافعیؒ اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی تحریک پر اسلام کے سنی مکتبہ فکر میں اجماع (concensus) کو بنائے اقتدار (authority) بنانے کا موقف پیش کیا جبکہ اہل تشیع کا موقف یہ تھا کہ اصل اقتدار امامِ معصوم کی ذات میں مضمر ہے۔

فارابی اور ابن سینا نے سلطنت کے مرکز کے بارے میں غور کیا اور یونانیوں کے زیر اثر تصورِ 'فلسفی بادشاہ' کو جو اخلاقی طور پر ایک کامل فرد ہو، ایک اچھی معاشرت رکھنے والے ملک کی سربراہی کے لیے موزوں ترین قرار دیا۔ فارابی کا تصورِ شہر (مدینۃ الفاضلہ) ایک کامل معاشرے کا تھا جس میں معقول طرزِ زندگی، حصولِ سعادت کے لیے ایک معروف ذریعہ تھا۔ جیسا کہ ایک جسم پر حکمرانی کے لیے سر ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کو بھی حکمرانی کے لیے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس معاشرے کو ایک مثالی معاشرہ بننے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ابن سینا نے اپنی کتاب 'الشفاء' میں حکمرانی (سیاسہ) پر ایک باب باندھا ہے۔ اس نے اس باب میں انسانوں کے اصول انحصار باہمی پر زور دیا ہے اور تصورِ قانون دہندہ (law giver) کے لیے فلسفی اور پیغمبر دونوں کی صفات ہونے کو لازم قرار دیا اور کہا کہ ایسا پاکباز شخص ہی دنیوی 'ناموس' اور 'شریعہ' کی ضمانت بن سکتا ہے۔

اہل سنت کی سیاسی بصیرت کا مزید اظہار 'ماوردی'[۲] نے اپنی کتاب 'احکام السلطانیہ' اور نظام

---

[۱]۔ ابن مقفع (متوفی 756ء) ایک ایرانی النسل مترجم، مصنف اور سکالر تھا جس نے عربی زبان میں کتب لکھیں۔

[۲]۔ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی (972ء- 1058ء) ایک مشہور اسلامی قانون دان تھا۔ جس نے چیف جسٹس اور سفیر کی خدمات انجام دیں۔

الملک[۱] نے اپنی کتاب 'سیاست نامہ' میں کیا۔ عہد متوسط کے اسلامی سیاسی افکار کا بھرپور اظہار حضرت امام غزالیؒ اور حضرت امام فخر الدین الرازیؒ[۲] نے کیا۔ سپین میں اسلامی سیاسی فکر ابن رشد نے نمایاں طور پر پیش کی جس نے کہا تھا کہ کتاب اللہ، حدیث رسول ﷺ اور قانون کی بہترین تشریح وتفسیر کرنے کے لیے فلسفی ہونا ضروری ہے کیونکہ ان کے پاس علم اپنی اعلیٰ ترین صورت میں ہوتا ہے اور یہ کہ مؤثر قانون سازی کے لیے نظریاتی اور تجرباتی، دونوں قسم کے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

شیخ ابن تیمیہؒ نے قرار دیا کہ مذہب اور ریاست ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ کامل روحانی اور دنیاوی خوشحالی صرف اسی وقت ممکن ہے جب مذہب کو شرعی قانون کے تحت رو بہ عمل لایا جائے۔ اس کو نافذ کرنے والا شخص امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کو بطور ذمہ داری قبول کرتا ہو۔ ابن خلدون نے بھی ذہین مدبر اور بابصیرت لوگوں کی حکومت کے قیام پر زور دیا جو مذہبی اصولوں پر مبنی معاشرت کے قیام کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حضور نبی کریم ﷺ کی ہدایات پر عمل کرے اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز عمل اپنائے۔

عثمانیوں نے فوج، اہل علم اور بیوروکریسی کو ان کی موروثی ریاست میں مدغم کیا اور صوفیانہ نظاموں اور عوامی سطح کے اسلام کے اثرات کے لیے گنجائش نکالی۔ سلطانوں نے انصاف پر بطور عوام کے حقوق و فرائض عمل درآمد ہوتا دیکھ کر ججوں (قاضیوں) کو اختیار دے دیا کہ وہ شریعت اور اپنے اختراعی اور متوازی دیوانی قانون، دونوں کا انتظام و انصرام کریں۔ ابوالسعود[۳] نے بطور شیخ الاسلام تعینات ہونے کے بعد سلطان کی مطلق فرماں روائی کے تصور کو مستحکم کرنے کے لیے کام کیا جس سے سلطان کو حتمی مذہبی اور سول حاکمیت حاصل ہو گئی۔ شیخ

---

[۱]۔ نظام الملک طوسی (1018ء-1092ء) ایک اسلامی سکالر، قانون دان اور سلجوقی حکومت کا وزیر تھا۔ اس نے سلطنت کو قانونی شکل دینے کے لیے ایک نئے نظریے کی بنیاد رکھی۔

[۲]۔ حضرت امام فخر الدین رازیؒ (1149ء- 1209ء) ایک نامور مفسر قرآن، محدث، متکلم، تاریخ دان، فقیہ اور فلسفی تھے۔ آپؒ کی وجہ شہرت قرآن پاک کی مایہ ناز تفسیر مفاتیح الغیب ہے جسے تفسیر کبیر اور تفسیر رازی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

[۳]۔ (Hoca CelebiEbussuud Efendi): ابوسعود آفندیؒ (1490ء- 1574ء) ایک نامور مفسر قرآن، فقیہ اور قانون دان تھے جنہیں خلافت عثمانیہ میں شیخ الاسلام بھی نامزد کیا گیا۔

الاسلام کا استدلال تھا کہ قاضی حضرات اپنا دائرۂ اختیار (competence) سلطان کی طرف سے اپنے تقرر سے اخذ کرتے ہیں، جس کی بنا پر وہ اس امر کے پابند ہیں کہ وہ قانونی امور میں اس کے احکامات کی اطاعت کریں۔ کاتب چلبی[۱] نے جو خلافت عثمانیہ کا فاضل ترین عالم تھا، جرّی و عادل سلطان کی حکمرانی کی تائید کی اور سلطنت کے مالی امور کو جائز قرار دیا۔

صفویوں[۲] کے شاہ اسماعیل نے پورے ایران کو اپنے قبضے میں لے کر خود کو زمین پر شیعیت کے بارہویں امام مہدی کے نمائندے کے طور پر پیش کیا اور اعلیٰ ترین دنیاوی اور روحانی اختیارات کو یکجا کر کے ایک ہمہ مقتدر حکمران کے منصب میں ضم کر دیا۔ صفوی خاندان کا نادر شاہ[۳] کے ظہور کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا۔ نادر شاہ نے سارے ایران پر اپنا اقتدار مجتمع کر لیا نتیجتاً قاچار خاندان[۴] کی بادشاہت قائم ہو گئی جو 1779ء سے شروع ہو کر 1925ء تک رہی۔

محقق کرکی[۵] کی تصانیف سے شیعی سیاسی نظریہ پھر سے زندہ ہو گیا۔ اس نے ایک بڑا اشتعال انگیز دعویٰ کیا کہ وہ امامِ غائب کے نمائندے (النائب العم) کے طور پر بولنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس کے نظریات 'اصولی'[۶] عالموں نے قبول کیے اور پھیلائے۔ ان کا کہنا تھا کہ 'مذہبی اختیار'

۱۔ حاجی خلیفہ کاتب چلبی (1609ء-1657ء) کا اصل نام مصطفیٰ بن عبداللہ تھا جو کاتب چلبی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپؒ ایک مشہور ترکی مؤرخ، سکالر اور خلافت عثمانیہ کی مہم و فتوحات کے عینی شاہد تھے۔ اس کی وجہ شہرت مشہور تصنیف کشف الظنون سے ہے۔

۲۔ شاہ اسماعیل اول ایران میں قائم ہونے والی صفوی حکومت (1501ء-1722ء) کا بانی تھا جو اپنے جد امجد شیخ اسحاق صفی الدین کی نسبت سے صفوی کہلواتا تھا۔ اس طرح اس کی قائم کردہ سلطنت کو بھی صفوی سلطنت یا حکومت کہا جانے لگا۔

۳۔ نادر شاہ (1688ء- 1747ء) جسے نادر شاہ افشار، نادر قلی بیگ اور طہماسپ علی خان بھی کہا جاتا ہے، ایران کا بادشاہ اور خاندان افشار کی حکومت کا بانی تھا۔ اپنی عسکری صلاحیتوں کے باعث مورخین اسے ایشیا کا نپولین اور سکندر ثانی کہتے ہیں۔

۴۔ Qajar dynasty: قاجار خاندان ایک ترک النسل ایرانی شاہی خاندان تھا جس نے 1785ء سے 1925ء تک ایران پر حکومت کی۔

۵۔ علی بن حسین بن عبدالعالی کرکی العاملی (1466ء-1534ء) ایک نامور اہل تشیع فقیہ تھا جسے ایران کے صفی خاندان نے عراق سے ایران بلا لیا تھا تاکہ ایران میں اہل تشیع عقائد و خیالات کی ترویج میں اس سے مدد لی جا سکے۔

۶۔ اصولی، اہل تشیع اثنا عشریہ کا ایک ذیلی فرقہ ہے۔

اصول الفقہ کے عمیق مطالعہ سے ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ان 'اصولیوں' کو محمد امین الاسترآبادی[۱] نے للکارا جسے 'اخباری'[۲] کہا جاتا تھا۔ اسے خواب میں 'الہام' ہوا تھا کہ قانون کا واحد ماخذ کیا ہے۔ 'اصولی مجلسی'[۳] نے ریاست کو 'مجاز فقہاء' کے تابع قرار دیا اور کہا کہ 'شاہ' (بادشاہ) طبقہ علما کا 'ہتھیار' ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے صرف 'مجتہد' پر انحصار کرنا ہوگا۔

سنی مسلک مغلوں نے ظہیر الدین محمد بابر[۴] کی زیر کمان 1526ء میں ہندوستان فتح کر لیا۔ اس کے پوتے بادشاہ اکبر نے اسلام کی روایتی سیاسی فکر سے انحراف کر کے خود کو معصوم عنِ الخطا بادشاہ قرار دے دیا۔ وہ بقول خود ایک انسانِ کامل تھا جس کی بنا پر اسے مذہبی اور دنیاوی معاملات میں بلند ترین حیثیت حاصل تھی۔ اس نے شریعہ کے فرامین واحکام کو نظر انداز کر کے مذہبی رواداری اور سیاسی مساوات پر مبنی ایک دین اختیار کر لیا۔ شیخ احمد سرہندیؒ نے جو سلسلۂ نقشبندیہ کے پیروکار تھے بادشاہ اکبر کے نظریات کو اسلامی قانون اور مذہب کے لیے تباہ کن قرار دیا۔ وہ اسلامی اقدار کو عوام الناس کی دینی اور سیاسی زندگی میں زندہ وفعال بنانے کے متمنی تھے (اسی لیے انہیں مجدد الف ثانی کہا جاتا تھا)۔ حضرت عبدالحق دہلویؒ[۵] شریعت کی سربلندی پر یقین رکھتے تھے اور بادشاہ سے صرف یہ توقع کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو شریعت کا علم

۱۔ محمد امین الاسترآبادی اہل تشیع فقیہ تھا جس نے اہل تشیع اثناعشریہ میں ذیلی فرقہ اخباری کی بنیاد رکھی اور اصولی فرقہ کی سخت مخالفت کی۔

۲۔ اخباری، اثناعشریہ اہل تشیع میں نمودار ہونے والا ایک ذیلی فرقہ ہے جس کی بنیاد محمد امین الاسترآبادی نے رکھی۔ اس فرقہ کے عقائد کے مطابق قرآن، حدیث محمد اور حدیث امامیان عشریہ کی جانب سے آنے والی خبر پر قیام کیا جاتا ہے۔ ان کے مطابق کسی دیگر عالم (علماء) کے اجتہاد کی اہمیت دینی امور میں محض فتاویٰ کی حد تک ہی محدود ہوتی ہے۔ اس فرقہ کے برعکس اصولی فرقہ تھا جس میں علما کو امام کے بارے میں اجتہاد کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔

۳۔ محمد باقر بن محمد تقی بن المقصود علی مجلسی المعروف علامہ مجلسی (1616ء-1700ء) کا شمار عالم اسلام کے مشہور ترین علماء، فقہا اور محدثین میں ہوتا ہے۔ آپ صفوی دور کے بااثر شیعہ حکام میں سے تھے۔ آپ کتابِ حدیث بحار الانوار کے مؤلف ہیں۔

۴۔ ظہیر الدین محمد بابر (1483ء-1530ء) ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی تھا۔

۵۔ حضرت عبدالحق محدث دہلویؒ (1551ء-1642ء) مغلیہ دور میں متحدہ ہندوستان کے مایہ ناز عالم دین اور محدث تھے۔ ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج واشاعت میں آپؒ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔

بردار کہلانے تک محدود رکھے۔ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ نے اکبر کے فلسفے سے اظہار برأت کیا اور فقہ حنفی پر مبنی عقیدہ اور متفقہ قانونی نظام کو ازسرنو متعارف کروایا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ[۱] نے ہندوستان میں شریعہ پر مبنی معاشرت کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ زمین اور ریاست کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ یہاں کے شہری ان لوگوں کی مانند ہیں جو کسی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے لیے یہ امر ممنوعہ ہے کہ وہ کسی اور کے حق انتفاع (right of benefiting) میں مداخلت کریں۔ تمام انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ملک کا مالک اور عوام الناس کا بادشاہ بنے۔ سربراہِ ریاست کی حیثیت ایک اثاثے کے منتظم جیسی ہے۔ ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ اسے بلا امتیازِ ذات وعقیدہ روٹی کپڑا اور مکان حاصل ہو۔ اسے شادی کرنے، اپنے بچوں کو تعلیم دلانے اور پرورش کرنے کا بھی حق ہے۔ علاوہ ازیں اسے انصاف، تحفظ زندگی واملاک اور عزت وناموس کی مساوات، حق ملکیت اور یکساں شہری حقوق بھی حاصل ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے دوران نصف مسلم دنیا یورپی ممالک کے نوآبادیاتی نظام کے زیر تسلط آ گئی۔ باہر سے مسلط شدہ کنٹرول کے خلاف مسلم اہل دانش کا داخلی ردعمل ان کے اندر احساس اصلاح واحیا پیدا ہو جانے کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس کی قیادت ان کے اصحابِ دانش اور سیاسی ومعاشرتی مصلحین کر رہے تھے۔ جمال الدین افغانیؒ[۲] نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کے ذہین طبقے اور ان کی معاشرتی زندگی میں تموج (agitated) پیدا کرنے کے لیے وقف کر دی اور ایک اصلاح شدہ مسلم شناخت ابھارنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انہوں نے عوام الناس کو مسلمہ مذہبی عقائد اور ممتاز طبقے کو قانون فطرت پر مبنی معقولیت کا درس دیتے ہوئے ہمہ گیر اسلامی ریاست (پان اسلامک سٹیٹ) کو وجود میں لا کر عظمت اسلام کے لیے متحرک

---

[۱]۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (1703ء-1762ء) برصغیر پاک وہند کے ایک مشہور مفکر، اسلامی سکالر، محدث فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا آپؒ نے اس کی رفتار کو تیز کیا۔

[۲]۔ سید محمد جمال الدین افغانی (1839ء- 1897ء) وحدت عالم اسلام کے زبردست داعی اور دنیائے اسلام کی نمایاں شخصیت تھے۔

ہونے کی ترغیب دی اور کہا کہ اسلام کا حتمی نصب العین رجوع الی اللہ ہے جو حتیٰ الامکان اعلیٰ ترین سیاسی امت کی تشکیل کے لیے جدوجہد کا درس دیتا ہے۔ جمال الدین افغانیؒ کے شاگرد شیخ محمد عبدہؒ[۱] اور ان کے رفیق کار رشید رضاؒ[۲] نے اسلام کے قرونِ اولیٰ کی طرف رجوع کرنے کے نصب العین کے لیے جدوجہد کی۔ وہ عمر بھر قرآن وسنت کی تعلیمات اور اجتہاد کے کردار کو بحال کرنے کی اہمیت پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے مذہبی فرائض (عبادات) جو نا قابل تغیر خدائی احکامات ہیں اور دیگر انسانوں سے متعلقہ 'معاملات' میں فرق واضح کیا۔ انہوں نے ان کی از سر نو تشریح کے لیے قیاس واستدلال کو بروئے کار لانے کی تلقین کی تا کہ معاشرے کی بہبود (مصلحہ) کے لیے کام کیا جا سکے۔

سلفیوں کی جدید اصلاحی تحریک کو حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور شیخ ابن تیمیہؒ کے افکار سے تقویت ملی۔ جس کا آغاز جمال الدین افغانیؒ، شیخ محمد عبدہؒ اور رشید رضاؒ سے ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری دینی غیرت اور عزتِ نفس صرف اسی وقت بحال ہوگی جب ہم اسلام کو دوبارہ بطور مذہب اور بطور ایک طرزِ زندگی اختیار کر کے مغربی قوتوں کی ثقافتی اطاعت سے نجات پائیں گے اور اپنے داخلی وسائل سے از سر نو قوت حاصل کریں گے۔ سلفیوں نے الجزائر میں عبدالحمید بن بادیسؒ[۳] کی مساعی (کوششوں) سے، مراکش میں محمد علال الفاسیؒ[۴] کی جدوجہد سے اور تیونس میں محمد طاہر بن عاشور[۵] کی قیادت میں گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہابیوں کی تزکیۂ

۱۔ شیخ محمد عبدہ (1849ء-1905ء) مصری اسلامی سکالر، عالم اور فقیہ تھا جس نے اسلامی افکار کی جدیدیت کے لیے کام کیا۔

۲۔ محمد رشید رضا (1865ء- 1935ء) ایک شامی ماہر علم حدیث وتفسیر، ادب اور تاریخ تھے۔ بعد ازاں مصر میں منتقل ہوئے جہاں پر شیخ محمد عبدہ کی شاگردی اختیار کی۔ انہوں نے بیروت سے ایک رسالہ مجلۃ المنار جس میں دینی اصلاح اور عصری تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔

۳۔ عبدالحمید بن بادیس (1889ء- 1940ء) الجزائر میں اسلامی افکار کی اصلاح کی تحریک کی مشہور شخصیت تھے جنہوں نے 1931 میں الجزائر میں مختلف مکتبہ فکر کے علماء کی ایک تنظیم قائم کی۔ بعد ازاں اس تنظیم نے الجزائر کی سیاسی صورت حال اور آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

۴۔ محمد علال فاسیؒ (1910ء-1974ء) مراکش کے ایک معروف سیاستدان، اسلامی سکالر، مصنف، شاعر اور عالم تھے۔

۵۔ محمد طاہر بن عاشورؒ (1879ء- 1973ء) بیسویں صدی کا عظیم اسلامی سکالر، فقیہ اور تعلیمی اصلاح کار تھا۔ اس کی وجہ شہرت قرآن پاک کی تفسیر التحریر والتنویر ہے۔

نفس پر مبنی تحریک نے شیخ محمد بن عبدالوہابؒ [۱] کی زیر قیادت اور سعودی عرب کے شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود [۲] کے تعاون وحمایت سے سیاسی بنیاد پرستی کے قوی ترین جذبے اور حکمت عملی سے اپنا کام شروع کیا۔ اس کے زیر اثر اسلامی دنیا کے کئی حصوں میں اس کی مماثل تحریکیں چل پڑیں۔

سرسید احمد خانؒ [۳] ہندوستان میں احیائے اسلام کی ایک بڑی قوت اور مسلم جدیدیت کے بانی بن گئے۔ انہوں نے اسلام کی تشریح اپنے اس کلیے کے مطابق کی کہ خدا تعالیٰ کے افعال اور کلام باہم مماثل ہوتے ہیں یعنی ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اس نے اسلام اور مسلم ثقافت میں معاشرتی اصلاحات کے بارے میں معقولیت پر مبنی طرز فکر اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ حضرت اقبالؒ نے پوری دنیا کو دعوت دی کہ وہ قرآن وسنت کے صحیح اسلام کی حرکیات (dynamism) کے اندر شامل ہو جائیں۔ ایک ایسی حرکیات، جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ تاریخ کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں ساری انسانیت کی اخلاقی تجدید کے لیے بروئے کار لائے گی۔

1924ء میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک [۴] نے شرعی عدالتوں کو منسوخ کر کے نئے دیوانی فوجداری اور تجارتی قواعد نافذ کر دیئے۔ ان سب چیزوں کو لادینیت پر استوار کر دیا جن کی بنا پر ترکی اس وقت مضبوط ترین مسلم سلطنت کہلاتا تھا۔ ترکی ثقافتی اور سیاسی انقلاب کی ایسی مثال بن گیا جو ایک مستبدِ حکومت نے بزور طاقت مسلط کیا تھا۔ بعدازاں ترکی

۱۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ (1703ء–1792ء) موجودہ سعودی عرب کے علاقہ نجد کا معروف اسلامی سکالر، فقیہ اور قائد تھا جس نے وہابی تحریک کی بنیاد رکھی۔ وہابی تحریک نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا اور کئی اختلافات بھی جنم دیے۔

۲۔ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود (1875ء–1953ء) جدید سعودی عرب کے بانی تھے۔

۳۔ سرسید احمد خانؒ (1817ء–1898ء) برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری علم کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

۴۔ مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک (1881ء–1938ء) جنگ عظیم اول میں عثمانی دور کا فوجی سالار، جدید سیکولر ترکی کا بانی اور اس کا پہلا صدر تھا۔ کمال اتاترک کے کردار کو اہل اسلام کے ہاں ہمیشہ سے مشکوک تصور کیا جاتا ہے۔

نے بدیع الزمان سعید نورسیؒ[۱] کے اثرات کی وجہ سے اسلامی ثقافت اور اسلامی طرز زندگی کے لیے عقبی دروازہ کھول دیا۔

بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں مصر کے حسن البناؒ[۲] اور سید قطب شہیدؒ[۳] اور پاکستان کے مولانا سید ابواعلیٰ مودودی[۴] اور ایران کے آیت اللہ خمینی[۵] کے اثرات کی وجہ سے اسلامی دنیا میں قدامت پسندی غالب آ گئی۔ ان تحریکوں نے اسلام کو ایک سیاسی نظریئے کی شکل دے دی۔ حسن البناؒ نے اخوان المسلمین نامی جماعت قائم کر لی جب کہ سید قطب شہیدؒ نے اپنے ذاتی نظم وضبط اور تعلیماتِ جہاد کے ذریعہ سیاسی انقلاب کا منشور لکھا اور جمال عبدالناصر کے مصر کو 'جاہلیۃ' قرار دیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور وہ بیسویں صدی عیسوی میں صف اول کے ترجمانانِ اسلام میں شمار ہونے لگے۔ وہ نظریۂ جہاد کے تحت روحانی اور اخلاقی تعلیمات پر زور دیتے تھے اور مغرب زدگی کے خلاف اپنے شدید جذبات کا اظہار کر کے اسلامی تہذیب کی سربلندی اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے اپنے نظریات کا اظہار

۱۔ شیخ بدیع الزماں سعد نورسیؒ (1877ء-1960ء) ترکی سے تعلق رکھنے والے، قرآن کریم، حدیث، فقہ، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ و دیگر علوم وفنون کے ماہر اور جذبہ جہاد سے سرشار ایک ممتاز عالم دین اور صوفی بزرگ تھے۔ آپؒ نے کمال اتاترک کے غیر اسلامی اقدامات کی پرزور مخالفت کی جس کی بنا پر آپؒ کو کئی دفعہ قید وسلاسل کی تکالیف بھی برداشت کرنا پڑیں۔

۲۔ حسن احمد عبدالرحمٰن محمد البناؒ (1906ء-1949ء) مصر کے ممتاز مذہبی رہنما اور عظیم اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے بانی اور صوفی بزرگ تھے جنہوں نے تصوف کے شاذلی طریقہ میں شیخ عبدالوہاب حصافی کی خدمت میں تکمیل کی۔

۳۔ سید قطب شہیدؒ (1906ء-1966ء) ایک ممتاز مصری سکالر، مفسر اور ادیب تھے جو اخوان المسلمین سے وابستہ رہے۔ ان کی شہرہ آفاق کتاب معالم فی الطریق لکھنے پر مصری حکومت کے خلاف سازشیں کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور 25 اگست 1966ء کو پھانسی دے دی گئی۔

۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903ء-1979ء) ایک مشہور عالم دین اور مفسر قرآن اور جماعت اسلامی کے بانی تھے۔ ان کا شمار بیسوی صدی کے موثر ترین اسلامی مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کی فکر، سوچ اور ان کی تصانیف نے پوری دنیا کی اسلامی تحاریک کے ارتقا میں گہرا اثر ڈالا۔

۵۔ روح اللہ خمینی (1902-1989) ایرانی کی قوم کا مشہور روحانی وانقلابی شیعہ رہنما تھا۔ جس نے 1979 میں ایران میں کامیاب شیعہ انقلاب برپا کیا۔

کرتے رہتے تھے۔

جناب آیت اللہ خمینی 1950ء کے عشرے میں آیت اللہ بنے اور 1960ء میں 'مرجع' کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ خمینی کے والد کو رضا شاہ پہلوی[1] کے حکم پر قتل کر دیا گیا تھا۔ خود انہیں بھی 1964ء میں عراق میں جلا وطن کیا گیا۔ بعد ازاں جب انہوں نے محمد رضا شاہ پہلوی[2] اور مغرب نوازی کے خلاف بولنا شروع کیا تو انہیں فرانس میں جلا وطن کر دیا گیا۔ انہوں نے جلا وطنی کے دوران ہی سیاسی جدوجہد شروع کر دی۔ جب شاہ کا تختہ الٹ دیا گیا تو وہ یکم فروری 1979ء کو بطور قائد انقلاب ایران واپس آ گئے۔ ایران کے لیے نئے دستور میں شیعہ اسلام کو سرکاری مذہب اور مذہبی لیڈر (ولایت الفقیہ) تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ ایک منتخب صدر ایگزیکٹو برانچ کا سربراہ تھا لیکن اس کے اختیار کے استعمال کی نگرانی ولایت فقیہ کرتا تھا جسے شیعہ فقہا کی مشاورتی کونسل کی حمایت وتائید حاصل تھی۔

مسلمانوں کے جدید سیاسی مفکرین ابھی تک عہد متوسط کے نظریات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ صرف حضرت محمد اقبالؒ اس سے مستثنیٰ تھے لیکن روایتی علماء انہیں زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ حضرت اقبالؒ کا استدلال یہ تھا کہ کسی بھی انسانی معاشرہ کے سیاسی افکار اس معاشرہ کے روحانی اور اخلاقی تصورات کے تابع ہونے چاہئیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے ان کے سیاسی افکار اسلام کے روحانی اور اخلاقی افکار کے تابع ہیں اور اسلام کا نصب العین ہر قیمت پر معاشرتی امن کا تحفظ ہے۔

(Thoughts and Reflections of Iqbal, p. 49)

ایسی امت کے لیے بہترین طرز عمل جمہوریت ہوگا۔ جس کا نظریہ یہ ہے کہ ایک فرد کو اس کی فطرت کی تمام صلاحیتوں کو ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔ اس کے لیے اسے اتنی آزادی استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے جتنی قابلِ عمل ہو اور اس امر سے مشروط ہو کہ اس فرد کی

---

[1] رضا شاہ پہلوی (1878ء-1944ء) ایران کا بادشاہ تھا جس نے حکومت حاصل کرنے کے لیے 1925ء میں خاندان قاجار کے بادشاہ احمد شاہ قاجار کے خلاف کامیاب بغاوت کی۔

[2] محمد رضا شاہ پہلوی (1919ء-1980ء) ایران کے پہلے پہلوی بادشاہ رضا شاہ کا بیٹا، دوسرا اور آخری پہلوی بادشاہ تھا جس کے خلاف آیت اللہ خمینی نے کامیاب شیعہ اسلامی انقلاب برپا کیا تو وہ خود ہی ملک چھوڑ کر چلا گیا۔

آزادی اس گروہ یا امت کے مفادات کے تابع رہے گئی۔

تاہم حضرت اقبالؒ مغربی جمہوریت کو کلی طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ اس کی بجائے انہوں نے جمہوریت کے اپنے فہم کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور مذہب اور ریاست کی علیحدگی کے تصور کو باطل ثابت کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کی جمہوریت اقتصادی موقع پرستی کی توسیع نہیں ہے۔ یہ ایک روحانی اصول ہے جو اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر فرد و بشر ایک قوتِ پنہاں (latent power) کا مرکز ہے جس کے امکانات (یا استطاعت) کو ایک خاص قسم کے کردار کی تادیب کے ساتھ فروغ دیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ آگے بڑھ کر اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ایک معاشرتی زندگی کی تشکیل کریں اور اس روحانی جمہوریت کو فروغ دیں جو کہ اسلام کا اصلی نصب العین ہے۔

(ibid, p. 51.)

حضرت اقبالؒ کہتے ہیں کہ تہذیب کی اعلیٰ منزل پر جا کر مطلق شخصی اقتدار (personal absolute authority) قابل عمل دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا قانونی حاکمیتِ اعلیٰ (legal sovereignty) عوام سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام شخصی اقتدار کا کلیتاً مخالف ہے کیونکہ یہ انسان کی انفرادیت کے بھرپور ارتقاء کے لیے ضرررساں ہے۔ حضرت اقبالؒ کے لیے اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ عوام کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا اختیار حاصل ہے لیکن عوام اور ان کے نمائندگان، دونوں کو خدا تعالیٰ کے نازل کردہ قانون (شریعت) کے ڈھانچے کے اندر رہ کر کام کرنا ہوگا۔ شریعت کے نقطۂ نظر سے مذہب اور ریاست دو مختلف وجود نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی چیز ہیں۔ اسلام میں خلیفہ لازمی طور پر اسقف اعظم نہیں ہے۔ وہ روئے زمین پر نمائندہ خدا نہیں ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کی طرح پُرخطا (fallible) ہے اور ہر مسلمان کی طرح اسی قانون کے غیر شخصی حاکم کی رعیت ہے۔

(ibid, p. 51 - 52.)

شریعت کے عام اصول، اہل ایمان کے نقطۂ نظر سے، خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ جن کی تفصیلات طے کرنے کا کام فقہاء کرامؒ کی تعبیر کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ وہ پیش آمدہ دنیاوی امور کو نازل شدہ وحی کے مطابق طے کرسکیں۔ تاہم اگر کوئی نئے امور سامنے آئیں جن

کے لیے اسلامی قانون میں پہلے سے کوئی مثال موجود نہ ہوتو پوری امتِ مسلمہ کی منشا (اجماع امت) ایک مزید ماخذ قانون (source of law) بن جاتی ہے۔ حضرت اقبالؒ نے تجویز کیا کہ ایک نئی منتخب شدہ اسمبلی میں علماء کو مسلم قانون ساز اسمبلی کا اہم حصہ ہونا چاہیے تا کہ وہ قانون سے متعلقہ سوالات پر آزادانہ بحث ومباحثے کی رہنمائی کر سکیں۔ چنانچہ انہوں نے مجلس قانون ساز اور پارلیمنٹ کے تصور کی پوری حمایت کی جو متذکرہ بالا 'اجماع' کے لیے ایک فورم بنے۔

(ibid, p. 61 - 62, 176)

حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں کہ فی الوقت عالمی خلافت نے مسلم ممالک کی دولتِ مشترکہ (Commonwealth of the Muslim countries) کی جگہ لے لی ہے کیونکہ عالمی امامت عملاً فیل ہو چکی ہے۔ یہ تصور قابل عمل نہیں رہا۔ لہٰذا جدید اسلام کے نظم میں یہ ایک زندہ عامل کے طور پر کام نہیں کر سکتا۔ خلافت کا حقیقی اظہار آزاد وخود مختار اکائیوں کے تنوع کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترکہ روحانی امنگ نے بنا سنوار کر ہم آہنگ کر دیا ہو۔ اسلام نہ تو قومیت (Nationalism) کا حامی ہے اور نہ بادشاہت (Imperialism) کا علمبردار، بلکہ وہ ایک جمعیت اقوام (League of Nations) کا حامی ہے جو مصنوعی حدوں اور نسلی امتیاز کو صرف بحوالہ شناخت تسلیم کرتا ہے جو اس کے ارکان کے معاشرتی افق کو محدود نہ کرتا ہو۔ (ibid, p. 159) انہوں نے مزید کہا کہ دو یا اس سے زیادہ خلافتوں کا بقائے باہمی (co-existence) غیر قانونی نہیں ہے بشرطیکہ وہ مختلف ممالک میں قائم ہوں۔ مزید برآں مسلم تاریخ میں دو رقیب خلافتیں بڑے عرصے تک رہ چکی ہیں۔

(*ibid, p. 165 - 166*)

حضرت اقبالؒ نے خلیفہ کے منصب کی اہمیت کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ بدلتے ہوئے حالات میں خلیفہ کا ذکر کسی اور نام سے بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے نام کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اس کی شرائط منصب (qualifications) کی ہے۔ لہٰذا انہوں نے خلیفہ اور اس کے عمال (وزراء) کی شرائط منصبی (qualifications) کی تفصیلات بتائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ شرائط اضافی اور ذیلی ہیں نہ کہ مطلق۔ ان میں حالات کے مطابق ردوبدل اور ترمیم ہوسکتی ہے۔

اس سلسلے میں حضرت اقبالؒ نے اسلام میں حکمرانی کے ایک اور اہم پہلو، خلیفہ اور اس کی حکومت پر عوامی تنقید اور حکمرانی سے اچھے نتائج برآمد نہ ہونے پر خلیفہ کی برطرفی کا معاملہ پر روشنی ڈالی۔ خلافت کے ابتدائی دور میں جب خلیفہ کی برطرفی یا معزولی یا کسی حاکم کا کردار اسلامی تعلیمات کے مطابق اچھا نہیں پایا جاتا تھا تو اس کے خلاف کارروائی مسجد میں عمل میں لائی جاتی تھی۔ حضرت اقبالؒ کا خیال تھا کہ مسجد مسلمانوں کے لیے ایک مجلس یا کچہری کی حیثیت رکھتی ہے اور روزانہ کی نماز کا یہ ادارہ مسلم معاشروں کی سیاسی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ روحانی اور معاشرتی کرداروں کے علاوہ یہ ادارہ حکومت اور ریاست پر مسلسل تنقید کے لیے بھی ایک تیار جگہ کا کام دیتا تھا۔

(Discourses of Iqbal, p. 249)

حضرت اقبالؒ نے منتخب ہونے والوں اور منتخب کرنے والوں کے تعلق کی نوعیت کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ تعلق ایک قسم کا معاہدہ (عقد) ہے جو دونوں فریقوں کو اس امر کے پابند بناتا ہے کہ وہ معاشرے کے کچھ اعلیٰ و ارفع مقاصد مل جل کر حاصل کریں۔ خلیفہ چند بنیادی فرائض کا ذمہ دار ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے عالمگیر ہیں۔ مثال کے طور پر اس کا فرض ہے کہ وہ مذہب کی تشریح اور اس کا تحفظ کرے۔ اسلام کے قانون کو نافذ کرے۔ اسلام کے مطابق درآمد و برآمد کے محاصل (levy customs) عائد اور وصول کرے۔ سالانہ تنخواہیں ادا کرے۔ ریاستی خزانے کو صحیح طریقے سے چلنے کی ہدایت کرے۔ حتماً معاشرے میں امن قائم کرے اور خوشحالی لائے۔ اگر وہ ان شرائط کو پورا کرتا ہے تو ان کے حوالہ سے عوام کے دو فرائض ہیں: اس کی اطاعت کریں اور کاموں کی انجام دہی میں اس کی مدد کریں۔

حضرت اقبالؒ سمجھتے تھے کہ سیاسی حاکمیت عملاً عوام کے زیر تصرف ہوتی ہے اور یہ کہ حلقۂ انتخاب (الیکٹوریٹ) متفقہ پسند کے آزادانہ اقدام کے ذریعہ اس حاکمیت کی ایک معین شخصیت کے اندر تجسیم کرتا ہے جس کی وساطت سے اجتماعی منشاء کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ اس نشستِ اقتدار کو کوئی قانون رعایت نہیں دی جاتی ماسوائے انفرادی مرضیات (Wills) پر قانونی قدغن عائد کرنے کے، جس کا وہ مظہر ہے۔ (ibid, p. 58) علاوہ ازیں سیاسی

حاکمیتِ اعلیٰ قانون کی نگاہ میں معاشرے کے تمام ارکان کی کلی مساوات کے تحت عوام سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں، کوئی پاپائیت نہیں ہے اور کوئی نظامِ ذات پات نہیں ہے۔ اسلام ایک مساواتی قوت (levelling force) ہے۔ یہ فرد کو اس کی داخلی قوت (inward power) کا احساس دلاتا ہے اور ان کو بلندی عطا کرتا ہے جو معاشرتی طور پر کمتر ہیں۔

مختصراً یہ کہ مغرب نے گروہوں کی تشکیل نو کے لیے شراکت اور صلاح ومشاورت کے اصول اختیار کئے ہیں۔ 'سنہری انقلاب' (Glorious Revolution, 1688) نے یہ طے کر دیا تھا کہ انگریز بادشاہوں کو اپنے عوام پر غیر معمولی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے اور یہ کہ عوام کا بنایا گیا قانون ہی بالاتر ہوگا۔ اس میں ہمیشہ کے لیے یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ بادشاہوں کے خدائی حقوق (Divine Rights) کا کوئی تصور نہیں اور یہ کہ حاکمیتِ اعلیٰ (sovereignty) عوام کے پاس ہوتی ہے۔ اس تصور نے مغربی معاشروں میں حکومتوں اور شہریوں کے موجودہ کردار اور حقوق کی وضاحت کی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی سیاسی تعلیمات ابھی تک عہد متوسط جیسی ہیں اور ان کی نگاہیں 'امیر' کے اختیارات پر مرتکز چلی آ رہی ہیں۔ اس سیاق وسباق میں شوریٰ (پارلیمنٹ) کو امیر کے تابع بنا دیا گیا ہے کیونکہ اس کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اسے 'امیر' خود نامزد کرتا ہے۔ جب ایک امیر ارکان شوریٰ کو نامزد کرتا ہے اور اس کے فیصلوں کا اطلاق امیر پر نہیں ہوتا۔

مسلمان تو عوام کے ساتھ واجب التعمیل مشاورت کے علمبردار ہوتے تھے لیکن اب انہوں نے کبھی ایک بہانے سے اور کبھی دوسرے بہانے سے جمہوریت یا عوام کی حکمرانی کے اس تصور کی مخالفت شروع کر دی۔ مسلمان رہنماؤں نے اپنی ساری قوتیں جمہوریت کی اصلاح کرنے کی بجائے مخالفت کرنے پر ضائع کر دیں۔ اس ماحول کی وجہ سے ٹامس ہابز، جان لاک، روسو اور مونٹیسکیو جیسے مفکرین نہ اُبھر سکے۔ مسلمانوں کی سیاسی ثقافت میں ابھی تک جاگیردارانہ، اشرافیانہ یا مذہبی حکومت کے تصورات پائے جاتے ہیں جو سماوی حقوق، بادشاہت اور خاندانی حکومت پر مبنی ہیں جن میں انسانی حقوق کم ہوتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی اور دستوریت، صحیح معنوں میں نہیں ہوتی۔ اس شعبے میں ابتدائی مراحل میں بہت

ترقیوں کے باوجود مسلمان اب تک پوری طرح آزاد نہیں ہوئے اور اپنی حکومتیں بناتے یا توڑتے نہیں ہیں۔عمومی لحاظ سے مسلم دنیا میں آج کی سیاسی ثقافت زیادہ تر ویسی ہی ہے جیسے انقلاب فرانس(1779ء) سے پہلے مغرب میں ہوتی تھی۔اس طرح ہم ان قوموں سے تقریباً 250 سال پیچھے چل رہے ہیں۔

۳۔ معاشرتی علوم میں کمزوری

(ا)۔ علم البشریات

علم البشر یا'بشریات' انسان کے بارے میں ایک 'نظریۂ کلیت'(totality of human) ہے یعنی ہستی انسان کی کلیّت کا علم۔ یہ شاخِ علم معاشرتی علوم، انسانی خصوصیات (humanities)اور انسانی حیاتیات(human biology) کے مختلف پہلوؤں کے انضمام (integration) کا مطالعہ کرتی ہے۔ بشریاتی معاشرتی علوم (anthropological social sciences) اکثر اشاراتی درجے کی تفصیلات تک جا پہنچتے ہیں جبکہ اس کے برعکس کیمیاء یا طبیعیات سے ماخوذ عام قوانین سے انسان کے بارے میں عمومی معلومات حاصل ہوتی ہیں یا وہ زیادہ عمومی اصولوں کے ذریعے انفرادی کیسوں میں وضاحت پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ علم نفسیات کے کئی شعبوں میں ہوتا ہے۔علم کی یہ شاخ، جدید دنیا میں ایک بڑے شعبۂ مطالعہ کے طور پر ظہور پذیر ہو چکی ہے۔لیکن ہمیں علم کی اس شاخ میں کوئی نمایاں مسلم نام دکھائی نہیں دیتا۔البیرونی نے مشرق وسطیٰ، بحیرۂ روم اور جنوبی ایشیا کے لوگوں، مذاہب اور ثقافتوں کی بشریات کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اس پر گرانقدر کتابیں لکھی ہیں۔

(Journal of the History of Ideas 59 (3), p. 389 - 403)

ابن خلدون نے 'جمعیت شناسی' (Demography)، تاریخیائی جغرافیہ (Historiography)، فلسفۂ تاریخ (Philosophy of History)، عمرانیات (Philosophy of Sociology) اور اقتصادیات(Economics) کے شعبوں پر کافی تحقیقی مواد مرتب کیا۔ ابن خلدون کو اپنی کتاب 'مقدمہ' کی وجہ سے بہت شہرت ملی ہے۔ ابن خلدون کے بعد کسی مسلمان نے اس شعبے میں قابل ذکر کام نہیں کیا۔ مسلمان تہذیب اور

موجودہ مسلمان معاشروں پر سارا کام مغربی دانشور ہی کر رہے ہیں جن کی فکر بنیادی طور پر ہماری سوچ کی ساخت سے مختلف ہے۔ وہ عام طور پر ہم سے ہمدردانہ رویہ نہیں رکھتے۔

عہد حاضر میں علم البشریات پر سب سے زیادہ اثر آثار قدیمہ کے علم (Archeology) کی دریافتوں نے کیا ہے جس میں مسلمانوں کا کوئی بھی حصہ نہیں ہے۔

عہد حاضر کے ڈاکٹر اکبر صلاح الدین احمد (پاکستان) نے علم بشریات کے حوالہ سے مسلم معاشروں پر کچھ کام کیا ہے۔ آپ کا زیادہ تر کام پشتون قبائل، مراکش، یمن، سعودی عرب اور فلپائن کے مسلمانوں پر ہے۔

(۲)۔ علم سیاسیات

علم سیاسیات ایک تعلیمی اور تحقیقی شعبۂ علم ہے جو سیاسیات کے نظریہ اور سیاست کے طریق ہائے کار، سیاسی نظاموں اور سیاسی رویوں کی تفصیلات اور تجزیہ کا مطالعہ کرتا ہے۔

سیاسیات کے شعبے اور ذیلی شعبوں میں سیاسی معیشت، سیاسی نظریہ اور فلسفہ، شہریت (civics) اور تقابلی سیاسیات، سیاسی ارتقا، بین الاقوامی تعلقات اور عوامی پالیسی (public policy) شامل ہیں۔ سیاسیات میں بین الاقوامی تعلقات اور بڑی طاقتوں اور سپر طاقتوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ پچھلے ابواب میں مغرب اور مسلم دنیا میں سیاسی فکر کے ارتقا کی تفصیلات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مسلم دنیا میں ایک مصنف بھی ایسا نہیں جس کا سیاسی تحریروں کے حوالہ سے ٹامس ہابز، لاک یا روسو سے موازنہ کیا جا سکے۔ صرف حضرت شاہ ولی اللہؒ حضرت محمد اقبالؒ اور محمد اسدؒ[1] نے اپنے اپنے عہد میں سیاسی مسائل کا جامع، محتاط اور طریقیاتی تجزیہ (methodological analysis) کیا ہے۔ عہد جدید میں جمال الدین افغانی نے سیاسیات میں اسلام کے کردار کی بحث کو آگے بڑھایا جس کے بعد کچھ کام مصر میں علامہ رشید رضا اور شیخ مصطفیٰ عبدالرزاق نے کیا۔ جس کے بعد سید قطب شہید اور پاکستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کیا۔ ایران میں علی شریعتی، مرتضیٰ مطہری، حسین

[1]۔ Leopold Weis: محمد اسدؒ (1900ء-1992ء) ایک جرمن مسلم سکالر تھے جنہوں نے یہودی مذہب کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی دنیا کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ محمد اسد اسلامی موضوعات پر کئی تحقیقی کتب کے مصنف بھی ہیں۔

منتظری اور روح اللہ خمینی نے کیا۔

ان علما کی تحریروں نے مسلمان دنیا پر غیر معمولی اثر ڈالا لیکن عالمی مطالعہ سیاسیات میں شاید اس کا کوئی کردار نہیں ہے۔ کیونکہ ان سب قابل قدر حضرات کی سیاسی تعبیرات اسلامی تعلیمات کے دائرہ کے اندر تھیں بلکہ ان کی فی الحقیقت تشریح ہی تھی۔

(۳)۔ علم نفسیات

اسلام کے عہد زریں میں مسلمانوں نے نفسیات (Psychology) پر اچھا خاصا کام کیا جس میں ان کی زیادہ تر توجہ روح، ذہنی امراض اور فلسفہ ذہن وغیرہ پر رہی۔ جس میں زیادہ تر کام ابوبکر محمد بن زکریا الرازی اور ابن سینا نے کیا۔ الرازی نے بغداد کے ہسپتال میں نفسی ونفسیاتی امراض کا وارڈ قائم کیا۔ غالباً انسانی تاریخ میں یہ پہلا باقاعدہ وارڈ تھا۔ اس ضمن میں دو کتب المنصوری اور الھواء بہت مشہور ہیں۔ ابن سینا نے اپنی کتاب القانون فی الطب میں بے خوابی، پاگل پن، ذہن کے چکر، فالج، مرگی، ڈپریشن پر خوب بحث کی اور ان کے علاج تجویز کیے۔

عہد حاضر میں نفسیات کے مطالعہ کو علم التصوف سے منسلک سمجھا گیا ہے۔ اسے قلبی بیماریوں اور کیفیات سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جس میں کچھ صوفیائے کرامؒ نے یقیناً کام کیا ہے۔ کچھ نومسلم فلسفی صوفیوں[1] نے بھی اچھا کام کیا ہے مگر ہم اس کا مقابلہ علم نفسیات کی اس ترقی سے نہیں کر سکتے ہیں جو عہد جدید میں مغرب میں ہوئی ہے۔ حالانکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علمائے کرام نے ماضی میں علم النفس کی پیچیدگیوں پر عظیم کام کیا ہے۔ مگر اب ولیم جیمز، فرائڈ، ایڈلر اور یونگ کا زمانہ ہے۔

(۴)۔ علم عمرانیات

علم عمرانیات جدیدیت مثلاً صنعتی ارتقاء، شہری آبادیوں پر پڑنے والے دباؤ، لادینیت اور بڑھتے ہوئے سلسلۂ توجیہات کے چیلنجز کے علمی ردعمل کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ مسلمانوں

[1]۔ رینے گینوں (1951) فرتھ جوف شوان (1998) اور مارٹن لنگز (2005) شامل ہیں جن کی تعلیمات کو سید حسین نصر نے پھیلایا۔

میں سے صرف ابن خلدون نے عمرانیات پر قابل قدر کام کیا۔ ابن خلدون نے اپنی کئی جلدوں پر مشتمل تاریخ کی کتاب کا ایک طویل مقدمہ (Prolegomena) لکھا جس میں انہوں نے انسانی سماج اور اس کے ارتقا کے بارے میں تاریخ میں پہلی بار ایک جامع اور عقلی تجزیہ پیش کیا۔ مقدمہ میں انہوں نے تاریخ میں پہلی بار علم عمرانیات کے بنیادی اصول بیان کیے جو یہ ہیں:

(i)۔ سماجی عمل کے کچھ اپنے اصول وضوابط ہیں جن کے تحت سماج میں ایک خاص ترتیب سے خاص نتائج نکلتے ہیں۔ یہ سماجی اصول اگرچہ سائنس کے اصولوں کی طرح مطلق نہیں ہیں مگر بہت حد تک مستقل ہیں۔

(ii)۔ سماجی قوانین عمومی طور پر عوام الناس پر اثر کرتے ہیں اور افراد ان پر زیادہ اثر نہیں ڈال سکتے۔

(iii)۔ سماجی قوانین جاننے کے لیے ہمیں بہت سے حقائق اکٹھے کرنا ہوتے ہیں۔ حالات اور ان کے نتائج کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ جس کے لیے ہمیں تاریخی ریکارڈ اور حالات حاضرہ دیکھنے پڑتے ہیں۔

(iv)۔ سماج غیر متحرک نہیں ہے۔ سماجی اشکال بدلتی رہتی ہیں۔ مختلف لوگوں اور آبادیوں کے باہمی عمل اور معاشی ناہمواریوں سے سماج میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔

(v)۔ سماجی قوانین صرف حیاتیاتی اور جسمانی عوامل کے نتیجے نہیں ہوتے بلکہ اس میں سماجی قوتوں کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔

ابن خلدون کے سماجی نظریات میں نظریہ عصبیت (Social Solidarity) بہت اہم ہے۔ جس سے سماج میں باہمی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ قبائلی اور شہری عصبیت مختلف ہوتی ہے۔ ابن خلدون نے نظریہ عصبیت کی روشنی میں مسلم سماج کے بارے میں کہا کہ

(ا)۔ بدوی قبائلی سماج اپنی بہتر سماجی عصبیت اور یک جہتی کی وجہ سے غیر متحرک شہری سماج پر فتح حاصل کر لیتے ہیں۔

(ب)۔ قبائلی عصبیت اور یک جہتی کا، سخت گیر اور کتابی شہری مذہب سے امتزاج بہت طاقتور بن جاتا ہے۔

(ج)۔ فتوحات کے بعد ترقی اور عیاشی شروع ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں حکمران طبقہ میں تنزلی شروع ہوجاتی ہے اور پھر وہ ختم ہوجاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ[۱] نے ہندوستانی معاشرے کی روشنی میں مسلم سماج پر کلام کیا۔ انہوں نے علم حیاتیات، نفسیات اور اخلاقیات کا رابطہ سماجیات سے جوڑنے کی کوشش کی۔ ارتفاقات (مفید مقاصد) کا نظریہ پیش کیا جس کی روشنی میں انہوں نے انسانی خصوصیات، سماجی ترقی کی منازل، سماجی سسٹم کے عناصر وغیرہ پر بحث کی۔ لیکن یہ ساری بحث اسلام کے نقطہ نظر کے حوالہ سے ہے۔

حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے بھی مسلم نفسیات کی ساخت اور مسلم سماج کی خصوصیات وغیرہ پر بحث کی مگر زیادہ تر یہ بات غالب رہی کہ مسلم سماج کا احیا کیسے ہوسکتا ہے۔

ایران کے ڈاکٹر علی شریعتی[۲] حضرت علامہ محمد اقبالؒ سے بہت متاثر تھے اور اسلام کی انسان دوست اور ترقی پسندانہ تعبیر کرتے تھے۔ انسانی وحدت کے زبردست حامی تھے۔

۴۔ نئے معاشی افکار سے بے خبری

آٹھویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان مسلم دنیا میں متعدد ترقی یافتہ تصورات اور تیکنیکوں نے فروغ پایا۔ ان کا تعلق پیداوار، سرمایہ کاری، مالیات، معاشی ترقی، محاصل اور املاک کے استعمال کے شعبہ جات سے تھا۔ ان پیش قدمیوں میں 'حوالہ' (قدیم طریقۂ ترسیل زر)، وقف، طریقۂ معاہدہ، جس پر تاجروں کو اعتماد ہوتا تھا، مشترکہ کرنسی کا پھیلاؤ، چیک، پرامزری نوٹس (promissory notes)، قدیم معاہدے، بلوں کا تبادلہ (مفوضہ) ترقی

۱۔ حضرت قطب الدین شاہ ولی اللہؒ (1762) دہلی کے محدث۔ فقیہ اور فلسفی تھے۔ ان کے والد محترم نے مشہور مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا اور وہ اورنگ زیب عالمگیر کے مذہبی مشیر تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کے مصنفین میں شامل تھے۔ آپؒ کی کتب یہ ہیں: حجۃ البالغہ، التفہیمات

۲۔ ڈاکٹر علی شریعتی مشہد ایران میں پیدا ہوئے۔ ایران اور پیرس میں تعلیم پائی۔ رضا شاہ پہلوی نے ان کو کئی بار جیل میں ڈال دیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کو ایران کی خفیہ ایجنسی نے قتل کیا۔ آپ کو ایرانی انقلاب کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

یافتہ زرعی طریقے، اعلیٰ شرح خواندگی اور خادموں کا بہترین استعمال شامل تھا۔

اولین معاشی مفکرین میں ایک حضرت امام ابو یوسفؒ تھے جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے محاصل پر کتاب 'کتاب الخراج' لکھی۔ جس میں محصولات، قومی مالیات اور زرعی پیداوار کے خطوط واضح کئے گئے۔ انہوں نے املاک پر مقررہ ٹیکس کی بجائے، پیداوار پر متناسب محصول کے مسئلے پر بحث کی تا کہ زیادہ سے زیادہ رقبہ زیر کاشت لانے کے لیے اچھی ترغیبات مل سکیں۔ انہوں نے محصولات معاف کرنے کی پالیسیوں پر بھی زور دیا۔ جس سے کاشتکار کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس میں بدعنوانیاں کم کرنے کے لیے مرکزی نظامِ محاصل قائم کرنے پر بھی زور دیا گیا۔ حضرت امام ابو یوسفؒ نے محاصل کی آمدنی سے معاشرتی و اقتصادی ذیلی ڈھانچے کی تعمیر کی بھی تجویز دی۔ اس میں مختلف قسم کے محاصل بشمول سیلز ٹیکس، اموات ٹیکس اور درآمدی محصول کا بھی ذکر تھا۔

حضرت ابوعبید القاسم بن سلامؒ نے 'کتاب الاموال' لکھی جس میں اسلام کی پہلی دو صدیوں کے دوران عائد محصولات کے قانونی نظائر (precedents) کا صحیح ریکارڈ موجود تھا۔ خاص طور پر اس میں مآخذ محاصل اور سرکاری مصارف کے طور طریقے شامل تھے۔ تاہم اس کتاب کی افادیت ان طریقوں میں مضمر ہے جو مصنف نے تجویز کئے اور ان کا تجزیہ پیش کیا۔ حضرت ابوعبیدؒ نے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آراء اور ممتاز فقہاء کرامؒ کے اقوال جمع کر کے ان کا قانونی تجزیہ پیش کیا جو کہ اسلام کے قانونی ادب کا فقید المثال مجموعہ ہے۔

فارابی، ابن سینا، حضرت امام غزالیؒ، محقق طوسی، ابن خلدون اور دیگر اہل علم نے گھر، معاشروں، کارخانوں اور اقوام کے حوالوں سے تقسیم محنت (division of labour) پر شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔ حضرت امام غزالیؒ نے نظریۂ مالیات پر روشنی ڈالی۔ شیخ ابن تیمیہؒ جیسے ابتدائی دور کے اہل علم و دانش طلب و رسد (supply and demand) کی قوت کا کسی حد تک ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے منڈیوں کے قواعد و ضوابط کے حوالے سے فلاح عامہ کو ملحوظ رکھنے کے فوائد اور نہ رکھنے کے نقصانات پر لکھا ہے۔

ابن خلدون نے معاشی نظریئے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ پیداوار کو فروغ اور ترقی دینے سے طلب اور رسد دونوں پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ کہ طلب و رسد کی قوتیں ہی ہیں جو اشیاء کے نرخوں کا تعین کرتی ہیں۔ اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ آبادی میں اضافے، انسانی سرمائے کے فروغ اور فنیاتی پیش قدمی کی معاشی ارتقائے کبیر کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ اس نے ایک تصور متعارف کرایا جسے 'Khaldun Laffer Curve' کہتے ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ شرح محصول اور آمدنی محاصل کے درمیان تعلق شرح محصول بڑھنے کی وجہ سے کچھ عرصے تک بڑھتا رہتا ہے لیکن پھر شرحِ محصول میں اضافہ محاصل کی آمدنی کو گھٹانا شروع کر دیتا ہے کیونکہ مسلط شدہ محصول معیشت کے پیداکاروں کے لیے اشیا پر لاگت بڑھا دیتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے معاشی و معاشرتی مسائل پر مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ وہ کارل مارکس سے بہت پہلے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ دولت کا بنیادی منبع محنت ہے۔ مزدور اور کسان کمانے والے لوگ ہیں۔ مزدور کاشتکاری کرنے والے اور دماغی محنت کرنے والے ملک کی دولت پر سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ (حجۃ البالغہ، ج: ۴، باب: تلاش معاش کے سلسلہ کی اصولی باتیں) مزدور کی رضامندی اس وقت تک شمار نہیں کی جاسکتی جب تک اس کی مزدوری ادا نہ کی جائے۔ محنت کے دورانیے کی ایک حد مقرر ہونی چاہیے تاکہ مزدوروں کو اتنا وقت میسر آسکے جس میں وہ اپنی اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان میں یہ قابلیت پیدا ہو سکے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کریں۔ (ایضاً) تجارت کو صرف تعاون کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ حکومت کے لیے تجارت کی ترقی و خوشحالی میں بھاری ٹیکس لگا کر رکاوٹیں ڈالنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ (ایضاً، باب: ممنوع معاملات کا بیان) جو کاروبار و تجارت عوام کے کسی طبقے کے لیے گردشِ دولت محدود کرے وہ ناپسندیدہ ہے۔ (ایضاً، باب: الرسوم السائرہ)

تاہم اس موضوع پر قدیم مسلم مفکرین کی بلند خیالی کے باوجود اقتصادیات پر اعلیٰ درجے کی کتابوں کا صدیوں سے فقدان چلا آرہا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں اقتصادی نظریئے پر

کچھ لٹریچر لکھا گیا ہے مثلاً سید محمود طالقانی[1] کی 'اسلام و ملکیت' (Islam and Ownership)، سید محمد باقر الصدر[2] کی 'اقتصادُنا' (Iqtisaduna)، سید ابوالحسن بنی صدر[3] کی 'اقتصادِ توحیدی' (Touhid Economics)، حبیب اللہ پیمان[4] کی

Some Interpretations of Property Rigthts,

Capital and Labor from Islamic Perspective

اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی 'اسلامی معاشیات' ہے۔

عہد حاضر کی اسلامی معاشی فکر میں ایک مسئلہ ماسوائے سید قطبؒ کے عمومی طور پر غائب ہے۔ یہ زرعی اصلاحات کا مسئلہ ہے۔ زرعی اصلاحات کی مخالفت نے اسلام پسندوں کی بغاوت میں بھی کردار ادا کیا (ایران، 1963ء اور افغانستان 1978ء)۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے 1972ء اور 1977ء کی زرعی اصلاحات (لینڈ ریفارمز) کو غیر اسلامی قرار دے دیا تھا[5]۔

مسلم دنیا میں اقتصادیات پر لٹریچر کے اس جائزے سے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقتصادیات پر ہونے والا تقریباً سارا کام اقتصادی نظریئے (تھیوری) سے تعلق رکھتا ہے۔ اقتصادیات پر بطور سائنس ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ جب کہ مغربی دنیا میں پچھلی تین صدیوں میں اس موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ مزید برآں اس موضوع پر علمی بحث و مکالمہ کے

۱۔ Mahmoud Taleghani: محمود طالقانی (1911ء-1979ء) ایک ایرانی شیعہ ماہر اقتصادیات، ماہر دینیات، اصلاح کار، جمہوریت کا وکیل اور سینئر صحافی تھا۔

۲۔ Muhammad Baqir al-Sadr: محمد باقر الصدر (1935ء-1980ء) ایک عراقی شیعہ ماہر اقتصادیات، عالم، فلسفی اور حزب دعوت اسلامی کا بانی تھا۔

۳۔ Seyyed Abolhassan Banisadr؛ سید ابوالحسن بنی صدر (1933ء-حیات) ایک ایرانی ماہر اقتصادیات اور ایرانی انقلاب 1979ء کے بعد پہلا صدر تھا۔

۴۔ Habibollah Peyman: حبیب اللہ پیمان (1935ء-حیات) ایک ایرانی ماہر اقتصادیات اور سیاست دان ہے جس نے ایران میں ایک اسلامک پولیٹیکل سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔

۵۔ مظفر علی قزلباش کیس 1989ء، سپریم کورٹ (شریعت اپیلٹ بنچ)

فقدان کے علاوہ مسلمانوں نے زرعی اصلاحات کا رجعت پذیر نقطۂ نظر اپنا لیا ہے باوجود اس امر کے کہ ایک ملک کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لیے یہ بہت لازمی ضرورت ہیں۔

ایک شعبہ جس میں اقتصادیات کو اسلام کے تابع بنانے پر زیادہ بحث مباحثہ ہوا وہ جدید بنکاری ہے۔ تاہم مسلمانوں نے سود کی ممانعت کے لیے تاحال کسی ایک تعریف یا اس کے متبادل پر اتفاق نہیں کیا۔ اسلامی مالیات اور بنکاری کے طریق ہائے کار تکلیف دہ اور گراں محسوس ہوتے ہیں۔ اب تک جو کچھ ہو سکا ہے وہ زیادہ تر محض عذر (mere justifications) ہیں۔ ان میں کسی قسم کی جدت یا اختراع (innovative) سامنے نہیں آ سکی۔

اس طرح جدید معاشیات کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن میں زیادہ تر کاروبار ہوتا ہے۔ جیسا کہ بین الاقوامی تجارت، سٹاک ایکس چینج، بانڈز، کرنسی کا کاروبار، ڈیجیٹل معیشت، چھوٹے قرضے، ٹیکس، بین الاقوامی امداد اور ریاستی مداخلت وغیرہ۔ ان معاملات میں اسلامی معیشت کے حوالے سے کچھ زیادہ کام نہیں ہوا۔ چونکہ زیادہ تر سود کے معاملات ہیں جن کا مناسب حل اسلامی معیشت کے حوالے سے نہیں نکالا جا سکا۔ مثال کے طور پر اسلامی بنکاری کے معاملات میں تاخیر بھی ہوتی ہے اور شرح منافع بھی زیادہ ہے۔ اس لیے مسلمان ممالک بھی اس بنکاری نظام کو مکمل طور پر اپنانے میں ہچکچا رہے ہیں۔ یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر اس موضوع پر کام شروع ہوا جو کہ اب کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت پوری دنیا کے بنکنگ نظام میں اسلامی بنکنگ کا حصہ صرف 1% (ایک فیصد) ہے۔

تاہم اس عہد میں پروفیسر خورشید احمد (پاکستان) ڈاکٹر عمر چھاپرا (پاکستان) مفتی تقی عثمانیؒ (پاکستان) اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی (انڈیا) نے اسلامی معیشت کے تصورات کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

۵۔ نئے اصول قانون سے بے اعتنائی

آیئے دیکھتے ہیں کہ دورِ متأخر میں ارتقائے قانون کے لیے مسلمانوں نے کیا کیا۔ ہم اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے اوائل کی تاریخ میں فقہ اور قانون کے ارتقاء کے لیے بہت کام کیا تھا (دیکھئے باب 4) تاہم جدید دور میں قانون کی ترقی کے لیے مسلمانوں

نے بالکل کوئی کردار ادا نہیں کیا۔حضرت امام شافعیؒ کے بعد صرف دو اہل علم و دانش شخصیات تھیں جنہوں نے اصول قانون (اصول فقہ) کو ترقی سے ہمکنار کیا: حضرت امام شاطبی[1] ؒ جنہوں نے 'الموافقات فی اصول الشریعۃ' (بنیادی اسلامی قانون میں آہنگی) لکھی اور شیخ ابن تیمیہؒ نے 'السیاسۃ الشریعۃ' (اسلامی قانون کی حکمت عملی) لکھی۔تاہم ان کی یہ خدمات ان ذہنی کاوشوں اور ترقیوں کے مقابلے میں پھیکی پڑ جاتی ہیں جو انہی کے زمانے کے بعد مغرب میں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔

آپ نے پچھلے باب میں دیکھا ہے کہ مغرب میں قانون اور خاص طور پر فلسفہ قانون/ اصول قانون (اصول فقہ) میں کتنی ترقی ہو گئی ہے۔جبکہ مسلم دنیا ابھی تک اس ضمن میں سوئی ہوئی ہے۔مثال کے طور پر:

(1)۔ بین الاقوامی قانون اپنی اعلیٰ حدوں کو چھو چکا ہے۔بہت سے بین الاقوامی ادارے بن چکے ہیں جو نہ صرف نظریاتی کام کر رہے ہیں بلکہ بین الاقوامیت تشکیل دے رہے ہیں اور اس پر عمل بھی کروا رہے ہیں۔اسلامی قانون کے حوالے سے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ماضی میں حضرت امام محمد شیبانیؒ اور امام زیدؒ کے کام ملتے ہیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔عہد حاضر میں ڈاکٹر حمید اللہ، محمود احمد غازی اور وہبہ ذوھیلی نے پرانی تصنیفات کی کچھ نئی تشریحیں کی ہیں۔

(2)۔ فلسفہ قانون/ اصول قانون میں ہمارے ہاں امام شاطبیؒ بعد کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا حالانکہ کانٹ، بینتھم، آسٹن وغیرہ نے فلسفہ پر بہت اثر ڈالا لیکن ہماری طرف سے اس ضمن میں کوئی خاص کام نہیں ہوا۔فلسفہ قانون میں اثبات پسندی (Positivism) نے بہت اثر ڈالا ہے۔

(iii)۔ آج کل کا عہد قانون کی تدوین کا زمانہ ہے۔اسلامی قانون مدون شکل میں موجود نہیں ہے۔بلکہ بہت حد تک نصابی کتب یا فتاویٰ کی شکل میں ہے۔دلچسپ بات ہے کہ برصغیر میں مسلم پرسنل لاء میں جو کتاب بطور حوالہ استعمال ہوتی ہے، اس کا مصنف/ مؤلف ایک

---

[1]۔ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد اللخمی الشاطبیؒ (1320ء-1388ء) ایک مشہور محدث، فقیہ، لغوی اور جامع العلوم تھے جنہیں مجدد دین اسلام میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔مالکی المسلک تھے۔آپؒ کی تفسیر شاطبیؒ کا شمار قرآن پاک کی شاہکار تفاسیر میں ہوتا ہے۔

پارسی (F. D. Mulla) ہے۔ کسی مسلمان کو یہ توفیق نہیں ہو سکی کہ ان اسلامی قوانین کو ہی مدون کر دے جو یہاں لاگو ہیں۔ یاد رہے نکاح، طلاق، مہر، وقف وغیرہ کے اسلامی قوانین پاکستان میں لاگو ہیں۔

ہمیں مسلمہ قانون اجتہاد چاہیے۔ حضرت علامہ محمد اقبال نے اس ضمن میں صحیح فرمایا ہے: آج اسلام کو سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے۔ جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کی موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں (اقبالؒ) اور شاہ صاحب (انور شاہ کشمیری) دونوں مل کر کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔

(حیات انور، ص: ۱۶۵، ۱۶۶)

۶۔ حقوقِ انسانی سے بیزاری

اسلام اپنے آغاز سے ہی انسانی حقوق کا علمبر دار رہا ہے۔ احترام انسانیت کے جس تصور کا اعلان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری حج، حجتہ الوداع کے خطاب میں فرمایا۔ اسلام کے قرونِ اولیٰ سے ہی تحریک حقوقِ انسانی کا رہنما اصول رہا ہے اور اس وقت اسی نے اسلام کو باقی دنیا سے ممیز کر دیا تھا۔ تاہم جدید دنیا میں وسیع مسلم آبادی نے انسانی حقوق کے تصور کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد کے زمانے میں صرف چند ایک مصنفین نے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی طرح اس موضوع پر زورِ قلم دکھایا ہے۔ عصر حاضر کے بیشتر مسلمان انسانی حقوق کو مغرب کا سیاسی ایجنڈا سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں مغربی قوتوں نے اپنی خارجہ پالیسی کے آلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مسلم ریاستوں کے معاملات میں انسانی حقوق کا کوئی کلچر نہیں رہا۔ اگر چہ بعض دساتیر میں پاکستان کے دستور کی طرح بنیادی حقوق کے بہت مفصل ابواب موجود ہیں۔

بالآخر اسلامی کانفرنس کی تنظیم نے 1990ء میں اپنے قاہرہ (مصر) کے اجلاس میں اعلانِ قاہرہ برائے انسانی حقوق (Cairo Declaration on Human Rights in

(Islam) جاری کیا۔ یہ اعلان انسانی حقوق سے متعلق اسلامی نقشہ فراہم کرتا اوراس امر کی توثیق کرتا ہے کہ اسلامی شریعت ان حقوق کا واحد منبع ہے۔' Cairo Declaration on Human Rights in Islam' انسانی حقوق کے میدان میں اپنے ارکان (OIC) کی عمومی رہنمائی کے لیے اپنے نصب العین کا اعلان کرتا ہے۔ اس کو 1948ء میں جاری کردہ عالمی حقوق انسانی کے دستور پر ردعمل کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ یہ اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ UDHR کی قسم کے دیگر بہت سے حقوق کو بھی بیک وقت اسلامی روایات کے مطابق آگے بڑھایا جائے گا۔

باوجود اس طرح کی ایک ترقی پسندانہ تحریک کے، مسلم دنیا اب بھی خوفناک حد تک پیچھے ہے جو اس شعبے میں تحقیق اور انسانی حقوق پر عمل درآمد کی کوتاہی کی غمازی کرتی ہے۔ انسانی حقوق کی تحریک دنیا بھر میں پھیل کر ایک عالمگیر نصب العین بن چکی ہے لیکن ہم مسلمان عہد متوسط میں پھنسے ہوئے ذہنی رجحان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہمارے حکمران اپنے عوام کے ساتھ 'شہری' (citizens) کی بجائے اپنی 'رعایا' جیسا سلوک کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں قانون کی حکمرانی کا کوئی تصور نہیں بلکہ قانون کی خلاف ورزی وقار اور اقتدار کی علامت بن چکی ہے۔

جمہوریت اور انسانی حقوق نے بنی نوع انسان کو بہت سی بیڑیوں سے آزاد کر دیا ہے۔ جس سے انسان کی غیر محدود امکانی قوت اور صلاحیت کے بند ٹوٹ گئے ہیں۔ اس کی تخلیقی قوتوں کو استعمال کر کے حالات کو بہتر بنایا جا رہا ہے اور ان سے انسانی فلاح و بہبود کے بہت سے کام لیے جا رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے صنعتی انقلاب برپا کر کے عوام کو غیر معمولی انسانی اور اقتصادی ترقی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ نئے ذرائع مواصلات (communication) نے عالمی تجارت کو بے پناہ فروغ دیا ہے۔ قانون کی حکمرانی اور بینکنگ آپریشنز نے ہر شعبے کو فقید المثال اقتصادی ترقی دی ہے۔ ان حالات میں حقوق انسانی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے تا کہ انسان مکمل طور پر اس معاشی اور سائنسی ترقی سے بھرپور فائدہ اٹھا سکے اور زندگی کو آسان تر اور خوش تر بنا سکے۔ لیکن مسلمان ملکوں میں ایسا نہیں ہے۔ بہت سے مسلمان ممالک نے حقوق انسانی کے بین الاقوامی معاہدے ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی اور امداد کے دباؤ میں کیے ہیں اور اپنی خوشی سے نہیں۔

یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ کیا ان بین الاقوامی حقوق انسانی کی روشنی میں ہمیں اپنی کچھ فقہی آراء تبدیل کرنا ہوں گی؟ مثال کے طور پر عہد حاضر میں چوری کی سزا کے لیے ہاتھ کاٹنا ان معاہدوں کی روشنی میں ممکن نہیں ہے تو کیا ہم اس کو تبدیل کریں گے جس کو ہم نے آج تک اللہ کی حد کہا ہے؟

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے
(بانگ درا: طلوع اسلام)

حوالہ جات

۱۔ بال جبریل، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: تاج کمپنی، ۱۹۳۵ء۔

۲۔ حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ترجمہ مولانا محمد سعد پالن پوری۔ کراچی: زمزم پبلشرز، ۲۰۰۵ء

۳۔ حیات انور، عبدالرحمٰن کوندو۔ ندوہ المصنفین، ۱۹۷۸ء۔

۴۔ Encyclopedia Britannica. Chicago: The University of Chicago, 1988.

۵۔ Journal of the History of Ideas 59 (3), 1998. Explaining Away the Greek Gods in Islam by J. T. Walbridge.

۶۔ Thoughts and Reflections of Iqbal. By Dr. M. Iqbal. Lahore: Sh. Mohammed Ashraf Publishers, 1992.

٦

مسلم ممالک کی حالتِ زار



تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

بلاشبہ مسلمانوں نے یورپ سے پہلے دنیا کو تمام علوم وفنون میں گراں قدر سرمایہ عطا کیا لیکن پھر امت خرافات میں کھوگئی اور امتِ مسلمہ کی اس کاہلی اور غفلت نے بالآخر اسے مکافاتِ عمل سے دوچار کر کے چھوڑا۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
(بانگ درا: خطاب بہ جوانان اسلام)

مسلم تہذیب کو طرح طرح کے خطرات درپیش ہیں۔ یہ کوئی اچانک اور غیر متوقع امر نہیں تھا۔ اسے ہو کر ہی رہنا تھا کیونکہ مادی دنیا فطری قوانین کی تابعِ فرمان ہے۔ فطرت اپنے قوانین کو تبدیل نہیں کرتی۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا. (سورۃ فاطر، آیت:۴۳)
(تم اللہ تعالیٰ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (سورۃ الرعد، آیت:۱۱)
(حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی)

مسلمانوں نے ان قوانین کی اطاعت نہیں کی بلکہ ان قوانین سے سرکشی کی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کا سرغرور ٹوٹ کر پاتال میں جا گرا اور وہ تحت الثریٰ میں جا پہنچے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا:

۱۔ تعلیمی پسماندگی

قرآن مجید میں بیان کردہ واقعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو شیطان (ابلیس) پر علم الاشیاء (مادی چیزوں کا علم) رکھنے کی وجہ سے برتری حاصل تھی۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۳۱)

(اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتلائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ؟)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس کا آغاز اقراء (پڑھو) سے ہوا تھا:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۞ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۞ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۞ الَّذِىۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ ۞ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ. (سورۃ العلق، آیات:۱-۵)

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا)

یہ واضح ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اسلامی روایت علم پر استوار ہے۔ اسلام میں علم پر اتنا زور دیئے جانے کی وجہ سے دنیا میں ایک فقید المثال ذہنی تحریک برپا ہوئی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی بنیاد اسلام کی مرہون منت ہے۔ (دیکھیے باب:۳) حضرت محمد اقبالؒ نے بالکل بجا کہا:

عہد نو با جلوہ ہا آراستہ
از غبار پائے ما برخاستہ
(یہ جدید تہذیب جو حُسن اور شان و شوکت سے آراستہ ہے)
(ہمارے قدموں سے اٹھنے والی خاک سے نکلی ہے)
(اسرار خودی: وقت سیف)

حضرت اقبالؒ کے اس بیان کو اسلامی تعلیمات کے اعلیٰ ترقی یافتہ قدیمی اداروں کی پُرزور

تائید حاصل ہے۔ جامعہ قیروانیہ[1] جس کی بنیاد 859ء میں فاطمہ الفہری[2] اوراس کی ہمشیرہ مریم نے ڈالی تھی، جامعۃ الازہر جو 972ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں قانون، فلکیات، فلسفہ اورادب کے شعبے تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں خواجہ نظام الملک نے متعدد جامعات قائم کیں: نظامیہ البغداد 1065ء میں قائم ہوئی۔ اسی طرح نظامیہ، طوس (ایران)، نیشاپور (ایران)، امول (ایران)، موصل (عراق)، ہرات (افغانستان)، دمشق (شام) اور بصرہ (عراق) میں قائم ہوئیں۔

جب مسلمانوں نے علمی مشاغل کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا، مغرب نے شمعِ علم کو آگے بڑھاتے ہوئے پورے یورپ میں یونیورسٹیوں کا جال بچھا دیا۔ انہوں نے 300 سال سے کچھ زائد عرصے میں یونیورسٹی آف بولوگنا (University of Bologna, 1088)، یونیورسٹی آف پیرس، فرانس (University of Paris, 1150)، یونیورسٹی آف آکسفورڈ (University of Oxford, 1167)، یونیورسٹی آف کیمبرج (University of Cambridge, 1209)، یونیورسٹی آف سلامانکا، سپین (University of Salamanca, 1218)، یونیورسٹی آف مانٹپلائر، فرانس (University of Montpellier, 1220)، یونیورسٹی آف نیپلز (University of Naples, 1222)، یونیورسٹی آف تلوز، فرانس (University of Toulouse, 1229)، یونیورسٹی آف روم لا سیپانزے (University of Rome La Sapienze, 1303)، یونیورسٹی آف پیسا (University of Pisa, 1343)، یونیورسٹی آف ویانا (University of Vienna, 1365)، یونیورسٹی آف لیپزنگ، جرمنی (University of Leipzing, Germany, 1409)، یونیورسٹی آف کاتانیا (University of Catania, 1434)، یونیورسٹی آف گلاسگو (University of Glasgow, 1451)، یونیورسٹی آف کوپن ہیگن

[1] ۔ جامعہ قرویین یا جامعہ قیروانیہ مراکش کے شہر فاس میں واقع ایک جامعہ ہے جسے ایک مسلمان دولت مند تاجر محمد الفہری کی بیٹی فاطمہ الفہری نے 859ء میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ جامعہ مسلم دنیا کے اہم تعلیمی مراکز میں سے ایک ہے اور گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز کے مطابق دنیا کی سب سے قدیم جامعہ ہے جہاں آج تک تعلیم دی جاتی ہے۔

[2] ۔ فاطمہ الفہری (800ء-880ء) اور مریم الفہری ایک دولت مند عرب مسلم تاجر محمد الفہری کی بیٹیاں تھیں جنہوں نے مراکش کے شہر فاس میں 859ء میں جامعہ قیروانیہ تعمیر کروائی۔

(University of Copenhagen, 1479)، یونیورسٹی آف ایبرڈین (University of Aberdeen, 1494) میں قائم کر دیں۔ جبکہ یونیورسٹی آف پنجاب، پاکستان بھی ایک برطانوی مستشرق اور پادری جی ڈبلیولٹنر (G.W. Leitner) نے 1882ء میں قائم کی تھی۔

مسلمانوں میں شرح خواندگی کے حوالے سے درج ذیل حقائق توجہ طلب ہیں:

(i)۔ آج مسلمان دنیا میں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ترین قوم ہیں۔

(ii)۔ مسلم ممالک میں تعلیم کا معیار اور شرح خواندگی دنیا بھر سے کم ہے۔

(iii)۔ دنیا میں اوسط شرحِ خواندگی 80 فیصد ہے جب کہ تنظیم اسلامی تعاون (OIC) کے مطابق ان ممالک میں اوسط شرح تعلیم بالغاں 72 فیصد ہے لیکن ذیلی صحرائی افریقہ اور جنوبی ایشیا میں یہ شرح مایوس کن حد تک کم ہے جو علی الترتیب 57 فیصد اور 55 فیصد ہے۔

(iv)۔ تنظیم اسلامی تعاون (OIC) کے ممالک کی مجموعی ملکی پیداوار (GDP) کا اوسطاً 2.7 فیصد تعلیم عامہ پر خرچ ہوتا ہے جبکہ عالمی سطح پر اس کا اوسط 4 فیصد ہے۔

(v)۔ اکیلے جاپان میں یونیورسٹیوں کی تعداد پوری مسلم دنیا کی یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے۔ وہاں 778 قومی، پبلک اور نجی یونیورسٹیاں ہیں۔ پوری مسلم دنیا میں یونیورسٹیاں 600 سے کم ہیں جبکہ بھارت میں یونیورسٹیوں کی تعداد 8407 اور امریکہ میں 5758 ہیں۔

(vi)۔ ہارورڈ یونیورسٹی کا سالانہ بجٹ بہت سے اسلامی ممالک میں تعلیم پر خرچ ہونے والے مجموعی بجٹ سے زیادہ ہے۔

(vii)۔ آکسفورڈ یونیورسٹی ایک سال میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں 57 مسلم ممالک کی کل یونیورسٹیوں سے زیادہ تعداد میں جاری کرتی ہے۔

(viii)۔ 6.1 بلین مسلمانوں میں سے 300,000 سے بھی کم افراد سائنسدان بنتے ہیں۔ یہ تناسب فی ملین مسلمانوں میں سے 230 بنتا ہے۔ امریکہ (USA) میں 1.1 ملین سائنسدان (4099 فی ملین) جب کہ جاپان میں 700,000 (5095 فی ملین) ہے۔

(ix)۔ مسلمان ممالک اپنے کل GDPs کا بہت کم حصہ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ انڈونیشیا (3.6 فیصد)

پاکستان (2.6 فیصد)، بنگلہ دیش (2.5 فیصد)، نائیجریا (3.4 فیصد) خرچ کرتا ہے۔

(x)۔ تیونس واحد اسلامی ملک ہے جو اپنے کل GDP کا 7.2 فیصد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ یہ GDP فیصد کے حساب سے ان ممالک سے زیادہ ہے۔ اسرائیل (6.3 فیصد)، فرانس (5.7 فیصد) اور برطانیہ (5.5 فیصد) سے زیادہ خرچ کر رہا ہے۔

(xi)۔ تیونس اپنے GDP کا جو 7.2 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے وہ امریکہ کے 5.9 بلین ڈالر کے مساوی ہے۔ جبکہ فرانس اپنے GDP کا 5.7 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔ جو امریکہ کے 121.4 بلین ڈالر کے برابر ہے۔ یہ بات صاف ظاہر کرتی ہے کہ 'فیصد' ہرگز پوری کہانی نہیں سناتا۔ اس کیس میں فرانس تعلیمی شعبے میں تیونس سے 22 گنا زیادہ خرچ کر رہا ہے۔

(xii)۔ 2008 کی اکیڈمک رینکنگ آف ورلڈ یونیورسٹیز (ARWU) کے مطابق فرانس کے پاس دنیا کی 500 ٹاپ یونیورسٹیوں میں سے 23 یونیورسٹیاں ہیں، ریپبلک آف کوریا کے پاس 8 اور اسرائیل کے پاس ایسی 6 یونیورسٹیاں ہیں جب کہ ترکی وہ واحد مسلمان ملک ہے جس کے پاس دنیا کی 500 ٹاپ یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی ہے۔

(xiii)۔ عالمی یونیورسٹیوں کی 'دی ٹائمز ہائر ایجوکیشن رینکنگ' میں آٹھ مسلمان ممالک (ترکی، ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات) شامل ہیں۔ ان کے پاس 500 ورلڈ کلاس یونیورسٹیوں میں سے صرف 18 یونیورسٹیاں ہیں۔

(xiv)۔ یونیسکو کے مطابق تیسرے درجے (ثانوی تعلیم کے بعد) کے علمی اداروں میں داخلے کی سب سے زیادہ شرح (53 فیصد) قازقستان میں ہے۔ جس کے بعد ایران اور ترکی (35 فیصد)، تیونس اور سعودی عرب (31 فیصد)، نائجر، برکینا فاسو اور افغانستان میں 2.5 فیصد سے کم ہے۔ جنوبی کوریا، برطانیہ، اسرائیل اور فرانس میں تیسرے درجے کی سطح میں داخلے کی شرح علی الترتیب 93 فیصد، 59 فیصد، 58 فیصد اور 56 فیصد ہے۔

(xv)۔ بیشتر مسلم ممالک میں استاد شاگرد کا تناسب پرائمری سطح پر سب سے زیادہ ہے۔ مالی میں یہ تناسب 56 شاگرد فی استاد تک جا پہنچتا ہے۔ برکینا فاسو میں 46، گنی میں 45، نائجر میں 40، پاکستان اور سینیگال میں ایک استاد کے لیے 39 شاگرد ہیں۔ اس سے بالکل برعکس صورت حال یہ ہے کہ اسرائیل میں ایک استاد کے لیے 14 شاگرد (1:14)، برطانیہ اور فرانس میں یہ

تناسب 1:18 ہے جب کہ جنوبی کوریا میں پرائمری سکول میں ہر استاد کو صرف 26 طلبا کو پڑھانا ہوتا ہے۔

افراد پر تعلیم کے اثرات اور ان کے کامیابی کے اعلیٰ ترین سطح پر پہنچنے کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو آیئے ہم نوبیل پرائز جیتنے والوں میں مسلمانوں اور مسلم ممالک میں رہنے والوں اور یہودیوں کے تناسب کا ملاحظہ کرتے ہیں:

مسلم دنیا سے نوبیل پرائز جیتنے والے افراد کی فہرست جن کی دنیا میں کل آبادی ایک ارب 60 کروڑ ہے۔ یعنی دنیا کی کل آبادی کا 23 فیصد	یہودی نوبیل پرائز یافتہ افراد کی فہرست جن کی دنیا میں کل آبادی ایک کروڑ 20 لاکھ ہے۔ یعنی دنیا کی کل آبادی کا 0.2 فیصد

ادب (Literature)

1988۔ نجیب محفوظ (Naguaib Mahfouz)

2006۔ ارحان پاموک (Orhan Pamuk)

1910۔ پال ہیسی (Paul Heyse)

1927۔ ہنری برگسان (Henri Bergson)

1958۔ بورس پیٹرناک (Boris Pasternak)

1966۔ سیموئل یوسف اگنن (Shmuel Yosef Agnon)

1966۔ نیلی سیکس (Nelly Sachs)

1976۔ ساؤل بیلو (Saul Bellow)

1978۔ آئزک بشولیس سنگر (Issac Bashevis Singer)

1981۔ الیاس کینیٹی (Elias Canetti)

1987۔ جوزف براڈسکی (Joseph Brodsky)

1991۔ناڈین گاڈیمر(Nadine Gordimer)
2002۔ایمرے کرٹسز(Imre Kertesz)
2005۔ہیرالڈ پنٹر(Harold Pinter)
2014۔پیٹرک موڈیانو(Patrick Modiano)

امن (Peace)

1978۔انورالسادات (Anwar El-Sadat)
1994۔یاسرعرفات (Yasser Arafat)
2003۔شیریں عبادی (Shirin Ebadi)
2005۔محمدالبرادی (Mohamed El-Baradei)
2006۔محمد یونس (Mohammed Yunus)
2011۔توکل کامران (Tawakel Kamran)
2014۔ملالہ یوسف زئی (Malala Yousafzai)
2015۔تیونسی قومی مذاکراتی ٹیم (Tunisian National Dialogue Quarter)

1911۔الفریڈفرائیڈ(Alfred Fried)
1911۔توبیاس اسر(Tobias Asser)
1968۔رینے کیسن(Rene Cassin)
1973۔ہنری کسنگر(Henry Kissinger)
1978۔مناہم بیگن(Menachem Begin)
1986۔ایلی وائزل(Elie Wiesel)
1994۔شمعون پیریز(Shimon Peres)
1994۔یٹشیک رابین(Yitzhak Rabin)
1995۔جوزف روٹبلاک(Joseph Rotblat)

کیمیا (Chemistry)

1999۔احمد زیویل
(Ahmed Zewail)
2015۔عزیز سنکار
(Aziz Sancar)

1905۔اڈولف فان بائر
(Adolph Von Baeyer)
1906۔ہنری موائسن (Henri Moissan)

1910۔اوٹو والاش(Otto Wallach)
1915۔رچرڈ ولسٹیٹر
(Richard Willstaetter)
1918۔فرٹز ہیبر (Fritz Haber)
1943۔جارج چارلس ڈی ہیورسی
(George Charles de Hevesy)
1961۔میلوین کیلوین(Melvin Calvin)
1962۔میکس فرڈیننڈ پروٹز
(Max Ferdinand Perutz)
1972۔ولیم ہاورڈ سٹین
(William Howard Stein)
1972۔سی بی انفنسن (C. B. Anfinsen)
1977۔ایلیا پریگاجن(Ilya Prigogine)
1979۔ہربرٹ چارلس براؤن
(Herbert Charles Brown)
1980۔پال برگ(Paul Berg)
1980۔والٹر گلبرٹ(Walter Gilbert)
1981۔رونالڈ ہافمین(Ronald Hoffmann)
1982۔ہارون کلگ (Aaron Klug)
1985۔ہربرٹ اے ہاپٹمین
(Herbert A. Hauptman)
1985۔جیردم کارلے(Jerome Karle)

1986۔ڈڈلے آر ہرشباخ
(Dudley R. Herschbach)
1988۔رابرٹ ہوبر(Robert Huber)
1989۔سڈنی آلٹمین(Sidney Altman)
1992۔روڈولف مارکس(Rudolph Marcus)
1998۔والٹر کوہن(Walter Kohn)
2000۔الن جے ہیگر(Alan J. Heeger)
2004۔اروین روز(Irwin Rose)
2004۔ہارون ہرشکو(Aaron Hershko)
2004۔ہارون سیچانوور
(Aaron Ciechanover)
2006۔راجر ڈی کورنبرگ
(Roger D. Kornberg)
2008۔مارٹن چلفائی(Martin Chalfie)
2009۔اداپوناتھ(Ada Yonath)
2011۔ڈین شیکٹمین(Dan Shechtman)
2012۔رابرٹ لیفکووٹز
(Robert Lefkowitz)
2013۔ایرائی ورشل(Arieh Warshel)
2013۔مائیکل لیوبٹ(Michael Levitt)
2013۔مارٹن کارپلس(Martin Karplus)

اقتصادیات(Economics)

کوئی نہیں

1970۔پال انتھونی سیموئلسن
(Paul Anthony Samuelson)
1971۔سائمن کوزنیٹس(Simon Kuznets)
1972۔کینتھ جوزف آرو
(Kenneth Joseph Arrow)

1973۔واسیلی لیونٹیف(Wassily Leontief)
1975۔لیونیڈ کینٹوروش
(Leonid Kantorovich)
1976۔ملٹن فرائیڈ مین(Milton Friedman)
1978۔ہربرٹ اے سائمن
(Herbert A. Simon)
1980۔لارنس رابرٹ کلین
(Lawrence Robert Klein)
1985۔فرانکو موڈ گلیانی
(Franco Modigliani)
1987۔رابرٹ ایم سولو(Robert M. Solow)
1990۔ہیری مارکووٹز(Herry Markowitz)
1990۔مرٹن ملر(Merton Miller)
1992۔گیری بیکر(Gary Becker)
1993۔رابرفوجل(Robert Fogel)
1994۔جوہن ہرسینی(Johan Harsanyi)
1994۔رینہارڈ سیلٹن(Reinhard Selten)
1997۔رابرٹ مارٹن(Robert Merton)
1997۔مائرن شولز(Myron Scholes)
2001۔جارج اکرلوف(George Akerlof)
2001۔جوزف سٹگلٹز(Joseph Stiglitz)
2002۔ڈینیل کاہنمین
(Daniel Kahneman)
2004۔رچرڈ ایکسل(Richard Axel)
2005۔رابرٹ جے اومن
(Robert J. Aumann)
2007۔لیونیڈ ہروکز(Leonid Hurwicz)
2007۔ایرک مسکن(Eric Maskin)

2007۔راجر مائرسن(Roger Myerson)
2008۔پال کرگمین(Paul Krugman)
2010۔پیٹر ڈائمنڈ(Peter Diamond)
2012۔ایلوین ای روتھ(Alvin E. Roth)

فزیالوجی/میڈیسن (Physiology/Medicine)

کوئی نہیں

1908۔ایلی میچنیکوف(Eli Metchnikoff)
1908۔پال ایرلک(Paul Erlich)
1914۔رابرٹ بریئی(Robert Barany)
1922۔اوٹو میر ہوف(Otto Meyerhof)
1930۔کارل لینڈ سٹینر(Karl Landsteiner)
1931۔اوٹو وار بروگ(Otto Warbrug)
1936۔اوٹو لووی(Otto Loewi)
1944۔جوزف ارلینگر(Joseph Erlanger)
1944۔ہربرٹ سپنسر گیسر
(Herbert Spencer Gasser)
1945۔ارنسٹ بورس چین
(Ernst Boris Chain)
1946۔ہرمن جوزف مُلر
(Herman Joseph Muller)
1947۔گیرٹی کوری(Garty Cori)
1950۔ٹیڈیس ریشسٹین
(Tadeus Reichstein)
1952۔سلمان ابرہام وکسمین
(Selman Abraham Waksman)
1953۔ہینس کربس(Hans Krebs)

1953۔فرٹزالبرٹ لپمین

(Fritz Albert Lipmann)

1958۔جوشوالیڈربرگ(Joshua Lederberg)

1959۔آرتھرکورنبرگ(Arthur Kornberg)

1964۔کونراڈبلوچ(Konrad Baloch)

1965۔فرینکوائس جیکب(Francois Jacob)

1965۔آندرےلووف(Andre Lwoff)

1967۔جارج ویلڈ(George Wald)

1968۔مارشل ڈبلیونرنبرگ

(Marshall W. Nirenberg)

1969۔سلواڈورلوریا(Salvador Luria)

1970۔جولیئس ایکسلراڈ(Julius Axelrod)

1970۔سربرنارڈکاٹز(Sir Bernard Katz)

1972۔جیرالڈماریس ایڈلمین

(Gerald Maurice Edelman)

1975۔ڈیوڈبالیٹمور(David Balimore)

1975۔ہاورڈمارٹن ٹیمین

(Howard Martin Temin)

1976۔براخ ایس بلمبرگ

(Baruch S. Blumberg)

1977۔روزالین سسمین ییلو

(Rosalyn Sussman Yellow)

1977۔اینڈریووی شیلی

(Andrew V. Schally)

1978۔ڈینیل نتھانس(Daniel Nathans)

1980۔بروج بیناسرآف(Baruj Benacerraf)

1982۔سرجان وینی(Sir John Van)
1984۔سیزر ملسٹین(Cesar Milstein)
1985۔مائیکل سٹوارٹ براؤن
(Michael Stuart Brown)
1985۔جوزف ایل گولڈسٹین
(Joseph L. Goldstein)
1986۔ریٹالیوی مونٹالسینی
(Rita Levi Montalcini)
1986۔سٹینلے کوہن(Stanley Cohen)
1988۔جرٹروڈ ایلین(Gertrude Elion)
1989۔ہیرالڈ ورمس(Harold Varmus)
1991۔ایروین نیہر(Erwin Neher)
1991۔برٹ سکمان(Bert Sakmann)
1992۔ایڈمنڈ فشر(Edmond Fischer)
1993۔رچرڈ جے رابرٹس
(Richard J. Roberts)
1994۔فلپ شارپ(Phillip Sharp)
1994۔الفریڈ گلمین(Alfred Gilman)
1994۔مارٹن روڈ بیل(Martin Rodbell)
1995۔ایڈورڈ بی۔لیوس(Edward B. Lewis)
1997۔سٹینلے بی۔پروزینر
(Stanley B. Prusiner)
1998۔رابرٹ ایف۔فرشگاٹ
(Robert F. Furchgott)
2000۔ایرک آر۔کینڈل(Eric R. Kandel)
2000۔پال گرینگارڈ(Paul Greengard)

2002۔سڈنی برینر(Sydney Brenner)

2002۔رابرٹ ایچ۔ہورونز

(Robert H. Horvitz)

2004۔رچرڈ ایکسل(Richard Axel)

2006۔اینڈریو فائر(Andrew Fire)

2011۔رالف ایم سٹنمین(Ralph M. Steinman)

2011۔بروس بیوٹلر(Bruce Beutler)

2013۔جیمز ای۔روتھمین(James E. Rothman)

2013۔رینڈی شکمین(Randy Schekman)

طبیعیات (Physics)

1979۔ عبدالسلام(قادیانی) (Abdus Salam)

1907۔البرٹ ابراہام مشلسن

(Albert Abraham Michelson)

1908۔گیبرائل لپمین(Gabriel Lippmann)

1921۔البرٹ آئن سٹائن(Albert Einstein)

1922۔نائلس بوہر(Niels Borh)

1925۔جیمز فرینک(James Franck)

1925۔گستاف ہرٹز(Gustav Hertz)

1943۔گستاف سٹرن(Gustav Stern)

1944۔ایسوڈور آئزک ربی

(Isidor Issac Rabi)

1945۔وولف گینگ پالی(Wolf Pauli)

1952۔فلیکس بلوچ(Felix Bloch)

1954۔میکس بارن(Max Born)

1958۔ا یگورٹم(Igor Yevgenyevich)

1958۔الجامیخائیلووچ(Il'ja Mikhailovich)

1958۔ ایگور یوجینی وچ
(Igor Yevgenyevich)
1959۔ ایمیلیو سگرے (Emilio Segre)
1960۔ ڈونلڈ اے گلیزر (Donald A. Glaser)
1961۔ رابرٹ ہافسٹیڈٹر (Robert Hofstadter)
1962۔ لیو ڈیوڈووچ لنڈا
(Lev Davidovich Landau)
1963۔ یوجین پی وگنر (Eugene P. Wigner)
1965۔ رچرڈ فلپس فینمیں
(Richard Phillips Feynman)
1965۔ جولین شونگر (Julian Schwinger)
1967۔ ہنیز البرخت بیتھی
(Hans Albrecht Bethe)
1969۔ مرے جیل مین (Murray Gell Mann)
1971۔ ڈینس گیبر (Dennis Gabor)
1972۔ لیون این کوپر (Leon N. Cooper)
1973۔ برہان ڈیوڈ جوزفسن
(Brain David Josephson)
1975۔ بنجمین موٹلسن
(Benjamin Mottleson)
1976۔ برٹن رکٹر (Burton Richter)
1978۔ ارنو ایلن پینز یاس
(Arno Allan Penzias)
1978۔ پیٹر ایل کپٹزا (Peter L. Kapitza)
1979۔ سٹیفن وینبرگ (Stephen Weinberg)
1979۔ شیلڈن گلاشو (Sheldon Glashow)
1988۔ لیون لیڈرمین (Leon Lederman)
1988۔ میلوین شوارٹز (Melvin Schwartz)

1988۔ جیک سٹینبرگ(Jack Steinberger)

1990۔ جیروم فرائیڈمین(Jerome Friedman)

1992۔ جارجز چرپک(Georges Charpak)

1995۔ مارٹن پرل(Martin Perl)

1995۔فریڈرک رینز(Frederick Reines)

1996۔ڈیوڈ ایم لی(David M. Lee)

1996۔ڈگلس ڈی اوشروف

(Douglas D. Osheroff)

1997۔کلاڈ کوہن ٹنوجی

(Claude Cohen-Tannoudji)

2000۔ زہوریز آئی۔الفروف

(Zhores I. Alferov)

2003۔ ویٹالی جنزبرگ(Vitaly Ginsburg)

2003۔الیکسی ابریکوسوف(Alexei Abrikosov)

2004۔ڈیوڈ گراس(David Gross)

2004۔ایچ ڈیوڈ پولٹزر(H. David Politzer)

2005۔رائے گلابر(Roy Glauber)

2011۔ایڈم رائس(Adam Riess)

2011۔ساول پرلیمٹر(Saul Perlmutter)

2012۔سرج ہیروشے(Serge Haroche)

2013۔فرینکوائس اینگلرٹ

(Francois Englert)

نوبیل پرائز ایک سالانہ بین الاقوامی انعام ہے جو سب سے پہلے 1901ء میں فزکس، کیمسٹری،فزیالوجی،میڈیسن،لٹریچر اورامن کے سلسلے میں بہترین کارناموں پر دیا گیا تھا۔ اکنامکس پر یہ 1969ء سے دیا جارہا ہے۔نوبیل انعامات 850 سے زائد افراد کو دیا گیا ہے۔ان میں سے کم سے کم 20فیصد یہودی ہیں باوجود اس حقیقت کے کہ وہ دنیا کی کل

آبادی کا 0.2 فیصد سے بھی کم ہیں۔ مجموعی طور پر انہوں نے اکنامکس میں 41 فیصد، میڈیسن میں 28 فیصد، فزکس میں 26 فیصد، کیمسٹری میں 19 فیصد، لٹریچر میں 13 فیصد اور شعبۂ امن میں 9 فیصد یہ انعامات حاصل کئے[1]۔ یہودیوں نے چھ کے چھ زمروں میں یہ انعامات پائے۔ دوسری جانب ایک پاکستانی عبدالسلام نے فزکس میں یہ انعام پایا۔ اس کا تعلق قادیانی/احمدی فرقے سے تھا جس کو 1974ء میں پاکستان کی پارلیمان غیر مسلم قرار دے چکی ہے۔ احمد زیول (مصر) اور عزیز سنکر (ترکی)، مسلم دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر انہوں نے تعلیم اور تحقیق کا کام امریکہ میں کیا ہے۔ مزید برآں دیگر نوبیل انعام یافتہ مسلمان عامۃ المسلمین کی نظر میں غیر عملی قسم کے مسلمان ہیں۔

۲۔ غربت

مسلمانوں کے اقتصادی حالات افسوناک حد تک خراب ہیں۔ 'تنظیم برائے اسلامی تعاون' (OIC) کی معیشت 57 ممالک کی معیشتوں کا مجموعہ ہے جن میں سے 49 ممالک زیادہ تر مسلم ریاستیں ہیں دیگر 8 ممالک میں کافی بڑی مسلم اقلیتیں ہیں۔ ان 57 ملکوں کا مجموعی GDP at Purchasing Power Parity: PPP 7.7 کھرب امریکی ڈالر ہے۔ جاپان کا GDP 4.7 کھرب امریکی ڈالر ہے۔ امریکہ (US) کا GDP، 18.7 کھرب ڈالر ہے اور چین کا GDP, 16 کھرب امریکی ڈالر ہے۔

پاکستان اور افغانستان کی فی کس آمدنی تقریباً علی الترتیب 5000 (امریکی) ڈالر اور 1900 (امریکی) ڈالر ہے۔ جب کہ سنگاپور اور سوئٹزر لینڈ کی فی کس آمدنی علی الترتیب 83000 (امریکی) ڈالر اور 53000 (امریکی) ڈالر ہے۔

۳۔ صحت

مسلم دنیا میں 'متوقع انسانی عمر' (life expectancy) 50 برس ہے جبکہ جاپان اور فرانس میں یہ عمر 80 برس ہے۔ ملاوی میں 43 برس اور افغانستان میں 51 برس ہے۔ مغرب نے

---

[1]۔ یہ حقائق 2016ء تک کے ہیں

سائنسی اور طبی ترقی کی بدولت عمر کو طوالت دینے اور موت کے امکانات کو کم کرنے میں کافی کامیابیاں حاصل کر لی ہیں جبکہ بہت سے مسلمان مناسب علاج معالجے سے بے نیاز ہو کر 'راضی بہ رضائے مولیٰ' ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مناسب علاج کرانا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ زندگی خالقِ ارض وسما کی دی ہوئی ایک امانت ہے اس کی کما حقہ، حفاظت کی جانی چاہیے۔ مسلمانوں کو درج ذیل حقائق پر لازماً غور وفکر کرنا چاہیے۔

(i)۔ مسلم ممالک کے صحت پر اخراجات ان کے GDP کے لحاظ سے فیصد تناسب، دنیا کے اوسط کے تقریباً نصف ہیں۔

(ii)۔ مسلم دنیا کے تقریباً 30 لاکھ افراد ہر سال ٹی بی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں سے نصف موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

(iii)۔ پانچ مسلم ممالک افغانستان، پاکستان، نائیجریا، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش دنیا کی ان 22 قوموں میں شامل ہیں جن میں ٹی بی کی بیماری سب سے زیادہ پھیلتی ہے۔

(iv)۔ اگر ہم اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے اشاریئے 'HDI' پر نظر ڈالیں تو ترقی یافتہ ممالک ناروے، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور نیدرلینڈ اپنے شہریوں کو اعلیٰ ترین درجے کا معیار زندگی فراہم کرتے ہیں۔ جہاں اوسط 'HDI' اشاریہ 0.93 ہے۔ امریکہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور سنگا پور کا 'HDI' ان سے ذرا نیچے 0.90 ہے۔ اس فہرست میں اسرائیل 18 ویں نمبر پر قطر 32 ویں نمبر پر، سعودی عرب 39 ویں، متحدہ عرب امارات 41 ویں اور کویت 48 ویں نمبر پر ہے۔

(v)۔ ایک مسلمان ملک بھی ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنے شہریوں کو 'HDI' کے شمار (کاؤنٹ) کے اوسط سے کچھ زائد دیتا ہے۔ اگرچہ چھوٹی ریاستیں قطر اور کویت وافر وسائل رکھتی ہیں۔

(vi)۔ یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں جن ممالک کا 'HDI' کاؤنٹ سب سے کم ہے ان میں سے زیادہ تر مسلمان ممالک ہیں۔ پاکستان اس فہرست میں ایک بدقسمت اندراج والا ملک ہے، جس کی 'HDI' 0.538 فیصد ہے اور یہ افغانستان، سوڈان، نائیجریا، مالی اور سیرالیون کا ہمرکاب ہے۔

(vii)۔ ان زیادہ ترنچلے 'HDI' والے مسلم ممالک میں متوقع زندگی 62 سال کے اردگرد گھومتی ہے جب کہ سرفہرست 10 ممالک میں اوسط عمر 80 سال تک ہوچکی ہے۔

(viii)۔ صنعتی ترقیاتی اشاریئے کے لحاظ سے مسلم ممالک میں قطر 32 ویں نمبر پر ہے جبکہ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور اردن اس سے ذرا قریب ہیں۔ تاہم حسبِ توقع بیشتر مسلمان ممالک 188 ملکوں کی اس فہرست میں بنگلہ دیش کے ہمراہ 142 ویں، پاکستان 147 ویں، افغانستان 171 ویں اور سیرالیون 181 ویں نمبر پر ہیں۔

۴۔ تحقیق وترقی

مسلم ممالک میں تحقیق وترقی کی صورتِ حال بھی حوصلہ افزانہیں رہی ہے۔ جس کی عکاسی درج ذیل حقائق سے ہوتی ہے۔

(i)۔ کسی ملک کے مستقبل میں ترقی سے ہمکنار ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس نے تحقیق و ترقی (Research and Development) پر کتنی رقم خرچ کی ہے۔ 80 فیصد ترقی یافتہ ممالک اس کام پر کم وبیش خرچ کرتے ہیں۔ ان میں سے امریکہ 33.5 فیصد، یورپ 23.5 فیصد اور جاپان 13.4 فیصد خرچ کرتا ہے۔

(ii)۔ عالمی سطح پر 2010ء میں تحقیق وترقی پر مجموعی طور پر ایک کھرب ڈالرز خرچ ہوئے سرفہرست رہنے والے 10 ممالک میں سے امریکہ نے 473 بلین (ارب) جبکہ چین نے 370 ارب ڈالر خرچ کیے۔(*www.royalo. country.org*)

(iii)۔ ترکی 15.3 بلین اور پاکستان 2.4 بلین خرچ کرتا ہے۔ تیل کی بدولت سے مالا مال ملک سعودی عرب تحقیق وترقی پر صرف 1.8 ارب ڈالر حقیر رقم خرچ کرتا ہے۔

(www. sesrtaic.org)

(iv)۔ اوسطاً صرف 649 مسلم محقق فی دس لاکھ (ملین) آبادی ہیں۔

(v)۔ یہ اعداد وشمار اس وقت مزید پریشان کن دکھائی دیتے ہیں جب ان کا موازنہ یورپ سے کیا جائے جہاں فی ملین آبادی میں اوسطاً 6494 محققین ہیں۔

(vi)۔ تنظیم برائے اسلامی تعاون (OIC) کی رپورٹ ہے کہ اس میں محققین کی کل تعداد میں سے خواتین تقریباً 26.8 فیصد ہیں۔ جب کہ عالمی سطح پر یہ اوسط 29.5 فیصد اور یورپ میں 34.4 فیصد بنتی ہے۔

۵۔ عسکری کمزوری

مسلمانوں کو قرآن کریم (سورۃ الانفال، آیت: ۶۰) نے حکم دیا ہے کہ وہ خود کو تیار رکھیں اور اتنی قوت جمع کرتے رہیں کہ اپنے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ جبکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ اس وقت ہم دنیا کی کمزور ترین امت ہیں[1]۔ جیسا کہ ہم افغانستان کو تباہ ہوتے دیکھتے رہے ہیں اگر چہ بعض لوگوں کے قریب یہ ایک صحیح اسلامی ریاست تھی پھر اسے کیا ہوا؟ ذرا 'تورا بورا' کو دیکھ لیجئے۔ پہاڑوں تک کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ افغانستان کے بعد لیبیا، عراق اور شام بھی تباہ ہو گئے۔ یہ سب اکیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوا ہے۔

عراق میں مسلمانوں کے بعض مقدس مقامات ہیں: ان میں روضہ ہائے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ شامل ہیں۔ حالیہ برسوں میں غیر ملکی افواج نے اس ملک کو اپنے قدموں تلے روندا اور ہمارے مقدس مقامات کو برباد کر کے رکھ دیا۔ مسلم ممالک نے امریکیوں کے حملے کی صرف زبانی کلامی مذمت کی۔ تنظیم برائے اسلامی تعاون (OIC) نے اس حملے کی مخالفت میں چند قراردادیں منظور کیں، جو بالکل بے اثر رہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس کانفرنس کے چند رکن ممالک نے عراق پر حملے کے لیے اپنے اڈے تک فراہم کر دیئے۔ ذیل کے اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے صورت حال مزید واضح ہو جائے گی۔

(i)۔ دنیا کے دس سرفہرست ممالک ہر سال مجموعی طور پر 1100 بلین ڈالر دفاع پر خرچ کرتے ہیں۔ ان میں سب سے آگے امریکہ ہے جو 598 بلین ڈالر اور اس کے بعد دوسرے نمبر پر چین ہے جو 215 بلین ڈالر خرچ کرتا ہے۔ اس فہرست میں سعودی عرب واحد مسلم ملک ہے جو اپنی

---

[1]۔ امریکہ کا سالانہ دفاعی بجٹ 640 بلین ڈالر ہے جبکہ تمام مسلم ممالک کا مجموعی دفاعی بجٹ بھی اس کا صرف نصف بنتا ہے۔

افواج پر 87 بلین ڈالر خرچ کرتا ہے۔

(ii)۔ فوجی قوت بہ لحاظ مہارت اور عملیاتی کارکردگی ایک خاص حد تک ان اخراجات کی عکاسی کرتی ہے جبکہ امریکہ، چین اور روس آگے آگے ہیں۔ تاہم مسلم دنیا میں پاکستان بمشکل ہی اس فہرست میں آتا ہے جبکہ سعودی فوج اپنے بے پناہ بجٹ کے باوجود اس کی اہل شمار نہیں ہوتی۔

(iii)۔ ٹینکوں کی لڑائی ہو تو روس کے پاس یہ 22,710 ہیں۔ اس لیے وہ دنیا میں اس شعبے میں اول نمبر پر ہے جبکہ امریکہ اور چین کے پاس 9، 9 ہزار ٹینک ہیں۔ مسلم مما لک میں سے شام کے پاس 4750، مصر کے پاس 4145، پاکستان کے پاس 4000 اور ترکی کے پاس 3760 ٹینکس ہیں۔ مسلمان ملکوں کی جنگی ضروریات اس امر کی متقاضی ہیں کہ ان کے ٹینک تعداد اور معیار کے لحاظ سے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے ہم پلہ ہوں۔ ان مما لک نے یہ معیار ایسے طاقتور آپریشنل یونٹوں کے ذریعے حاصل کیا ہے جو بے حد مستعد، تیز رفتار اور ہیبت ناک ہیں کیونکہ ان کی بنیاد فنیاتی برتری اور اختراع پسندی پر رکھی گئی ہے۔

(iv)۔ مسلمان ملکوں کی فوجیں عشروں پرانے لڑاکا طیاروں کو گھسیٹے جا رہی ہیں جبکہ جدید فوجیں اور ان کی فضائی افواج جست لگا کر بغیر پائلٹ پرواز کرنے والے طیاروں تک جا پہنچی ہیں۔ انہوں نے دکھائی نہ دینے والے پھرتیلے طیاروں کے ذریعے طویل دورانیہ کی صلاحیت اور انتہائی درست نشانہ بازی کے نئے نئے ریکارڈ قائم کر لیے ہیں۔

۶۔ سیاسی جبر وتشدد

آیئے اب مسلم دنیا کے سیاسی نظاموں پر ایک نظر ڈالیں۔ ایک بھی ایسا مسلمان ملک نہیں ہے جس کا سیاسی ڈھانچہ مکمل طور پر 'شوریٰ' (باہمی مشاورت) پر استوار ہو۔

مسلمان مما لک میں جہاں بھی اسلام کے ناک پر حکومت بنی، انہوں نے بعض سخت گیر احکامات دیئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ ظلم سے ظلم جنم لیتا ہے۔ افغانستان میں کمال درجے کی بے اعتنائی کے ساتھ کسی ایک مذہبی اقلیت کے مذہبی آثار تباہ کئے۔ یہ بودھ مت کی وہ باقیات تھیں جو ہزاروں سال سے صوبہ بامیان میں ایستادہ تھیں۔ دنیا بھر نے اس توڑ پھوڑ کی شدید مذمت کی مگر کسی کی نہ سنی۔ انہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ افغانستان کو خلیفہ سوم حضرت عثمان

غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتح کیا گیا تھا۔حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ میں سے تھے جنہوں نے کعبے میں بتوں کو توڑا تھا۔لیکن یہاں انہوں نے بودھ مت کے ان مذہبی آثار کو تباہ نہیں کیا تھا۔حتیٰ کہ سلطان محمود غزنوی[1] جسے بُت شکن کہا جاتا تھا وہ اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔اس نے ہزاروں میل کا سفر کر کے سومناتھ (جنوبی ہندوستان کا ایک شہر) کے بت توڑے لیکن قریب رکھے بودھ کے مجسموں کو ہاتھ نہیں لگایا۔

مسلمانوں کا نظریہ اسلام غیر منطقی ہے۔انہیں نہ تو تاریخ کا شعور ہے اور نہ اقلیتوں کے حقوق کا کوئی پاس۔وہ سیرت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی صحیح طور پر واقف نہیں ہیں۔ان کا تصورِ اسلام قبائلی اور زرعی اور صحرائی سوچ کے مطابق ہے جو عہد حاضر میں انسانیت کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔یہی وجہ ہے کہ وہ وقت کے سیاسی اور سماجی غاروں میں دفن ہو جاتا ہے۔لیکن یہ تصورِ اسلام امتِ مسلمہ پر کاری ضرب لگا جاتا ہے۔مصر، الجزائر، افغانستان، عراق، شام اور پاکستان میں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

باوجود اس حقیقت کے کہ امتِ مسلمہ سیاسی دباؤ، استبداد (tyranny) اور غیر معقولیت میں سے گزر رہی ہے۔ ہمارے ہاں عوامی حاکمیت اعلیٰ (popular sovereignty) یا روشن خیالی (enlightenment) کے قیام کے لیے کوئی موزوں علمی یا سیاسی تحریکیں نہیں ہیں۔حتیٰ کہ جو جماعتیں اور گروہ تبدیلی کے متمنی ہیں وہ انفرادی آزادیوں کے مخالف اور فرقہ پرست ہیں۔ان کے فلسفے غیر معقول (irrational)، بے بہرہ از تاریخ (anachronistic) اور دشمن معقولیت (obscurantist) ہیں۔وہ عوام کو روشنی، امن اور خوشحالی کی طرف لے جانے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔علامہ محمد اقبالؒ اس بارے میں فرماتے ہیں:

قافلۂ حجاز میں ایک حسین رضی اللہ عنہ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
(بال جبریل: ذوق وشوق)

'اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ' (The Economist Intelligence Unit) نے ایک

---

[1] یمین الدولہ محمود المعروف سلطان محمود غزنویؒ (971ء-1030ء) سلطنت غزنویہ کا حکمران تھا جو 997ء سے 1030ء تک برسرِ اقتدار رہا۔اس کی وسیع سلطنت میں موجودہ مکمل افغانستان، ایران، پاکستان کے کئی حصے اور شمال مغربی بھارت شامل تھا۔

'جمہوری اشاریہ' تیار کیا ہے جو 167 ممالک میں کیفیاتِ جمہوریت کو ناپتا ہے۔ یہ اشاریہ '60' نشانات پر مبنی ہے جو پانچ مختلف زمروں میں منقسم ہے۔ یہ دیگر عوامل کے علاوہ تکثیریت (pluralism)، شہری حقوق، سیاسی کلچر کی بنا پر بھی فیصلے کرتا ہے۔ اس فہرست میں پہلے 20 ممالک میں ایک بھی مسلمان ملک شامل نہیں۔ انڈونیشیا انچاسویں، تیونس 57 ویں، سینیگال 75 ویں، البانیہ 81 ویں، بنگلہ دیش 86 ویں، ترکی 97 ویں، مراکش 107 ویں، پاکستان 112 ویں، الجزائر 118 ویں، کویت 121 ویں، قطر 134 ویں، سوڈان 151 ویں اور شام 166 ویں نمبر پر ہے۔ اگر کہیں اسلام کے نام پر سیاسی نظام بنا تو وہ بھی مکمل عدل پر نہ بنا سکا۔ ایران، عراق، مصر اور افغانستان اس کی مثالیں ہیں۔

۷۔ اسلام کی غلط تعبیر

دنیا بھر کے مسلمانوں کی 80 فیصد تعداد ایسے ممالک میں رہتی ہے جہاں وہ اکثریت میں ہے۔ 20 فیصد یا تقریباً 310 ملین (31 کروڑ) اپنے آبائی (غیر مسلم) ممالک میں بطور ایک مذہبی اقلیت آباد ہیں۔ ان میں سے 240 ملین (24 کروڑ) صرف پانچ غیر مسلم ممالک: بھارت میں 161 ملین (16 کروڑ 10 لاکھ)، ایتھوپیا میں 28 ملین (2 کروڑ 80 لاکھ)، چین میں 22 ملین (2 کروڑ 20 لاکھ)، روس میں 16 ملین (ایک کروڑ 60 لاکھ) اور تنزانیہ میں 13 ملین (ایک کروڑ 30 لاکھ) رہتے ہیں۔

10 سے 13 فیصد تک مسلم آبادی شیعہ ہے جو 154 ملین (15 کروڑ 40 لاکھ) تا 200 ملین (20 کروڑ) بنتے ہیں۔ شیعہ اثنا عشری، امامیہ، اسماعیلی، دروزی، نصیری، زیدی اور داؤدی بوہرہ میں منقسم ہیں۔ سنی کل مسلم آبادی کے 87 تا 90 فیصد ہیں۔ یہ وہابی، دیوبندی، بریلوی، صوفیوں، مالکیوں، شافعیوں، حنفیوں، اہل حدیث، حنبلیوں، خارجیوں اور ظاہریوں میں منقسم ہیں[۱]۔

اسی طرح صوفی نقشبندیوں، چشتیوں، سہروردیوں، مولویوں، اویسیوں، شاذلیوں وغیرہ میں منقسم ہیں۔ علم الکلام (Scholasticism) کی رُو سے مسلمان ماتریدی، اشعری، معتزلی،

۱۔ یہ حقائق 2016ء تک کے ہیں

مُرجیہ، قدریہ، جبریہ اور باطنیہ میں منقسم ہیں۔

مسلمان ذاتوں اور فرقوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ہر فرقہ یہ یقین رکھتا ہے کہ صرف وہی صحیح دین کا پیروکار ہے اور باقی سارے فرقے کافر ہیں۔ بعض فرقے یہ سمجھے بیٹھے ہیں دوسرے فرقوں کے پیروکاروں کو اپنے فرقے کے اندر لے آنا یا انہیں قتل کر دینا ایک بڑا جہاد ہے۔ جہاد جو اپنی اور معاشرے کی اصطلاح کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتا تھا نفرت اور تباہی پھیلانے اور قتل و غارت کرنے کا ہتھیار بن گیا ہے۔

مجھے 1998ء کے ماہ رمضان کی وہ صبح اب تک یاد ہے جب میں پاکستان میں ضلع مظفر گڑھ (پنجاب) میں ضلعی انتظامیہ کے سربراہ کے طور پر تعینات تھا۔ میں سحری کھا کر سونے کے لیے جانے ہی والا تھا کہ مجھے پولیس وائرلیس کے ذریعے ایک مسجد (جو ایک خاص فرقے کی تھی) پر اندھا دھند فائرنگ کی اطلاع ملی۔ میں اور ضلعی پولیس کا سربراہ سیدھے اس مسجد میں پہنچے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ مقامی لوگ واقعی اور واضح طور پر مشتعل دکھائی دے رہے تھے۔ ہم کسی طرح بھیڑ کو چیرتے ہوئے اندر پہنچے۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی لوگ فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید میں مصروف تھے کہ چند ظالم و بے رحم افراد جو اپنے تئیں 'جذبۂ جہاد' سے سرشار تھے انہوں نے ان تلاوت کرنے والوں پر فائر کھول دیا۔ 22 افراد کو قتل اور دو درجن کو زخمی کر کے بھاگ گئے۔ مسجد میں انسانی اعضا بکھرے ہوئے تھے۔ فرش اور دیواریں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ گولیاں لگنے سے قرآنی اوراق پرزہ پرزہ ہو چکے تھے۔ متاثرہ افراد معصوم اور نیک دل تھے جو بعد از نماز تلاوت قرآن پاک کرنے کے لیے رکے ہوئے تھے۔ ان کا واحد قصور یہ تھا کہ وہ ایک خاص فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

ایسا کیوں ہوا؟ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ انتہائی جاہل لوگوں نے جنہیں اسلامی تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں، اپنے پیروکاروں کو اشتعال دے کر اس مکروہ حرکت کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے اپنی انتظامی خدمات (administrative service) کے دوران (1987ء تا 2002ء) ایک فقہی مسلک کے علماء کے بارے میں کئی بار سنا کہ وہ دوسرے فرقوں کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کئی بار مسائل پر گفتگو کی اور برادر کشی کے اس خوفناک رجحان کے بین الاقوامی مضمرات بتاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو

ان کا صفایا ہوجائے گا۔لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ان کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ دوسرا فرقہ کافر اور جہنمی ہے۔

تصور جہاد کی اس غلط تعبیر نے نہایت غلط قسم کی فرقہ واریت کو جنم دیا ہے جو اپنے سوا سب کو کافر قرار دیتے ہیں۔ان کی اشتعال انگیزیوں کے باعث صرف پاکستان ہی میں ہزاروں افراد کی جانیں ضائع کر دی گئی ہیں۔گزشتہ بیس یا اس سے کچھ زیادہ برسوں سے اسلام کی یہ تعبیر دھڑلے سے کی جارہی تھی۔یہ ایک انحراف شدہ تعبیر تھی جو بین الاقوامی سطح پر کی جارہی تھی شکر ہے کہ اب اس میں کمی آئی ہے۔

اسی طرح ہمارا معاشی فلسفہ بھی از کار رفتہ (outdated) ہے جو جاگیرداری اور سرمایہ داری کے اثرات تلے دبا ہوا چل رہا ہے۔جنرل ایوب خان[1] اور ذوالفقار علی بھٹو[2] کے ادوار میں پاکستان میں جاگیرداری کے اثرات کو کم کرنے کے لیے چند زرعی اصلاحات متعارف کرائی گئیں۔فیصلہ کیا گیا تھا کہ کوئی شخص قانون کے تحت مقررہ حد سے زیادہ اراضی اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا۔اگر کسی مالک کے پاس اس حد سے زیادہ زمین ہوئی تو وہ بحق سرکار ضبط کر کے کاشتکار مزارعین میں تقسیم کر دی جائے گی۔سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلیٹ بنچ نے ان اصلاحات کو قزلباش وقف کیس (SC 99PLD 1990) میں غیر اسلامی قرار دے دیا۔یہ ایک رجعت پسندانہ اور غلط فیصلہ ہے جس سے غریب کاشتکاروں کا نقصان ہوا اور جاگیرداری مضبوط ہوئی۔

نہ صرف فرقہ پرستی بلکہ اقتصادی پسماندگی،غربت،سیاسی جبر اور فوجی کمزوری بھی ایک حد تک اسلام کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہیں۔ہم نے اسلام کو توہمات اور ترک دنیا کا مذہب بنا کر رکھ دیا ہے جبکہ اسلام درحقیقت ایک ترقی پسند اور سائنٹیفک مذہب ہے جس نے ایک بار ایسی ایک

[1] محمد ایوب خان (1907ء-1974ء) پاکستان کے سابق صدر،فیلڈ مارشل اور سیاسی راہنما تھے۔وہ تاریخ میں پاکستان کے پہلے فوجی آمر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں جنھوں نے 1958ء میں پاکستان میں فوجی حکومت قائم کر کے مارشل لا لگایا۔
[2] ذوالفقار علی بھٹو (1928ء-1979ء) پاکستان کے وزیر خارجہ،صدر،پہلے منتخب وزیر اعظم،پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی،اور آئین پاکستان 1973ء بنانے والے تھے۔

شاندارتہذیب تشکیل دے دی تھی جو دنیا بھر کی قیادت کر رہی تھی۔موجودہ دور میں اسلام کی غلط تعبیر کا قدرتی طور پر ایک غلط نتیجہ وہ ذلت و رسوائی ہے جس کا ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں ہر لمحہ سامنا کر رہے ہیں۔اگر وہ موجودہ پسماندگی،غربت،فوجی کمزوری،سیاسی جبر اور فرقہ واریت کا سلسلہ جاری رہا تو دائمی ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بن جائے گی۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات
(بال جبریل:ابوالعلامعری)

حوالہ جات

۱۔ اسرار خودی، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۵ء۔

۲۔ بال جبریل، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: تاج کمپنی، ۱۹۳۵ء۔

۳۔ بانگ درا، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔

۴۔ www.royalo. country.org

۵۔ www. sesrtaic.org

حصہ دوئم

کسی اور زمانے کا خواب



مسلمان اب اقوام عالم میں انتہائی پسماندہ لوگ ہیں۔ان کے سیاسی نظام قدیم ازمنہ اولیٰ (primitive) سے تعلق رکھنے والے یا نیم شہنشاہانہ ہیں۔عسکری لحاظ سے یہ کمزور اور ڈھیلے ڈھالے (subdued)، اقتصادی لحاظ سے کنگال اور معاشرتی لحاظ سے تقریباً غیر فعال ہیں۔ ہمارے معاشروں میں انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی کو چنداں عزت و احترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ معاشرے زیادہ تر فرقوں، قبیلوں اور ذاتوں پر مبنی ہیں۔ ہماری حالت کی اس فارسی شعر سے زیادہ بہتر عکاسی نہیں ہوسکتی:

ہمہ تن داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم
(سارا جسم داغدار ہو چکا ہے، پھاہا کہاں کہاں رکھوں)

اگر مسلمان موجودہ افسوسناک صورت حال سے نکلنے اور شاندار زندگی بسر کرنے کے متمنی ہیں تو انہیں صحیح معنوں میں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان کے مسائل کیا ہیں؟ وہ کہاں سے پیدا ہوئے ہیں اور انہیں کیسے حل کیا جا سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ وہ اپنی موجودہ زندگی کے اہم پہلوؤں پر توجہ دیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ قارئین حضرات اس مخلص طالب علم اور اسلام کے ایک وفادار پیرو کار کی ان عاجزانہ تجاویز پر غور فرمائیں گے:

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
(بال جبریل: مسجد قرطبہ)

۷

بنیادی فلسفہ حیات



الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

(سورۃ آل عمران، آیت:۱۹۱)

(ان ہوشمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت پر غور وفکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) 'اے ہمارے پروردگار! یہ سب تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا)

اسلام کے پاس ایک بالکل واضح اور غیر مبہم نظریۂ حیات ہے جو زندگی کی ایک خاص طرز پر تشکیل کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق، یہ دنیا بے معنی اور بے مقصد نہیں بلکہ با مقصد اور پُر معنی ہے جس کا قرآن مجید میں متعدد بار ذکر آیا ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا. (سورہ آلِ عمران، آیت:۱۹۱)

(اے ہمارے رب تو نے یہ سب فضول و بے مقصد نہیں بنایا ہے)

اس کا ایک آغاز تھا اور ایک اختتام ہے۔ خالق حقیقی نے جو بالاترین اختیار اور حکمرانی کا مالک ہے۔ اسے پیدا فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ. (سورۃ الحدید، آیت:۴)

(وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا)

کائنات اس کی تابع فرمان ہے:

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا. (سورۃ آل عمران، آیت:۸۳)

(آسمان اور زمین کی ساری چیزیں چار وناچار اللہ تعالیٰ ہی کی تابع ہیں)

انسان ساری تخلیق کا تاجور ہے اور زمین پر اس کا خلیفہ ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ. (سورۃ التین، آیت:۴)

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا)

وَوَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً. (سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۰)

(پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)

کائنات پر فطرت کے قوانین کے ذریعے حکمرانی کی جاتی ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا.
(سورۃ الفتح، آیت: ۲۳)

(یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے)

اسی طرح زندگی کے لیے قانونی ضابطے ہیں اور بنی نوع انسان کے لیے خدا کی طرف سے ہدایت ہے۔ اگر وہ اپنے خالق کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو اسے رہنمائی ملے گی۔ جس سے اسے نہ مستقبل کی فکر ہوگی اور نہ ماضی پر پشیمانی کا سامنا کرنے پڑے گا۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.
(سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۸)

(میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا)

بنی نوع انسان یہ جاننے کی اہلیت رکھتا ہے کہ اس نظریئے کے مطابق اس کے اندر کیا صلاحیتیں اور امکانی قوتیں موجود ہیں۔ درحقیقت ہم پر لازم ہے کہ اس نظریئے کی اتباع کریں۔ اس کے مطابق گزاری جانے والی زندگی ایک نئی شکل اختیار کرے گی۔ انسان اپنے افعال واعمال کے لیے جوابدہ ہوگا۔ اللہ پاک کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کی جائے گی تو اسے اس دنیا اور اگلی دنیا، دونوں میں مسرت وشادمانی اور برکات نصیب ہوں گی۔ اگر اس دنیا کے لیے دی گئی ہدایت پر عمل نہ کیا گیا، اسے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا اور خدا کے خلاف سرکشی وبغاوت کی راہ پر گامزن رہا تو اس کا دہشت ناک انجام ہوگا۔ اس دنیا میں مادی ترقی عموماً کام کرنے اور محنت کو شعار بنانے سے حاصل ہوتی ہے لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ مادی وسائل کی کثرت عزت ووقار کی علامت ہے کیونکہ یہ دنیا تو دارالمحن (محنت کی جگہ) اور ایک مقام آزمائش ہے۔

یہاں انسان کو آزمایا جارہا ہے۔ زندگی اور موت کی تخلیق اس لیے کی گئی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ انسان کیا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا براہ راست حوالہ دیتا ہے:

الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا۔ (سورۃ الملک، آیت:۲)

(جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے)

یہ اسلام دنیا میں لوگوں کے عملی کردار اور عملی رویوں کا نظریۂ حیات ہے۔ جسے مسلمانوں کی اکثریت فراموش کیئے بیٹھی ہے یا آگاہی نہیں رکھتی بلکہ جب ہم اس نظریئے پر غور کرتے ہیں تو دکھائی دیتا ہے کہ بنی نوع انسان متعدد گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ ایسا ہے جو سوچتا ہے یہ زندگی تو کیا پوری کائنات ہی بے مقصد ہے۔ ان کی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں خدا پاک کا کوئی وجود نہیں اور وہ مرنے کے بعد کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں گے اور نہ ہی کوئی روزِ حساب منعقد ہونے والا ہے۔ وہ طلبِ ہدایت کے لیے انسانی عقل کے پیچھے جا کر نہیں سوچتے۔ نازل شدہ ہدایتِ خداوندی پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ یہ ایک متنوع گروہ ہے جو دہریوں سے لے کر مالدار حکمرانوں تک چلا گیا ہے۔ یہ سر سے پاؤں تک دنیاوی مشاغل میں پھنسا ہوا ہے اور دنیاوی اقتدار کے نشے میں مدہوش رہتا ہے۔ یہ سوچتا ہے کہ یہ زندگی بلا اعادہ ہے اس لیے اس سے جتنا فائدہ اٹھانا ہے اٹھالو۔ جتنی خوشیاں سمیٹی جاسکتی ہیں سمیٹ لو۔ لہٰذا وہ ہر موقع اور ہر موڑ پر زیادہ سے زیادہ لذتیں اور مسرتیں ڈھونڈتا ہے۔ ایسے لوگوں کو لذت پسند کہا جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔

نو روز و نو بہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست
(نوروز ہے، بہار کی نوخیزیاں ہیں، شراب ہے اور محبوب ہے)
(بابر، عیش میں سرگرم ہو جا کہ دنیا دوبارہ نہیں ملنے والی)

لوگوں کا ایک اور گروہ ہے جو بہت سے خداؤں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ اقتدار و اختیار دولت اور جائیداد، پیروں، فقیروں اور جاگیرداروں کی پرستش کرتے ہیں۔ ان میں سے 'ہر خدا' کو راضی اور خوش رکھنے کے لیے انہوں نے قسما قسم رسوم و رواج مقرر کر رکھے ہیں۔ ان کا

کوئی واضح راستہ ہے نہ راہ عمل اور نہ ہی کوئی مقررہ طریق کار ہے۔ ان کی زندگیاں ضعیف الاعتقادی، توہمات اور کمینہ خصلتی سے عبارت ہیں۔ یہ جھوٹے عقیدوں کے تنکوں کے سہارے جیتے اور جھوٹی امیدوں سے پھلتے پھولتے ہیں۔ انہیں بہت سے خداؤں کی اطاعت کرنا اور بہت سے خداؤں سے خوفزدہ رہنا پڑتا ہے۔ اکثریت اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا تکلیفوں، دکھوں اور افسردگیوں سے بھری پڑی ہے۔ انسان روح جسم کے اندر مقید ہے۔ اسے رہائی موت کے وقت ہی ملے گی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تمام انسانی خواہشات، مادی آسائشیں اور خوشیاں، حتیٰ کہ خود زندگی ایک گناہ ہے۔ وہ اپنے باطن کی صفائی اور روحانی ترقی کے لیے خود کو جسمانی اذیتیں پہنچاتے ہیں اور شدید ریاضت اور مادی اشیا ترک کر کے گوشہ نشین، جوگی اور ملنگ[1] بن جاتے ہیں۔ خود کو تقدیر کے حوالے کر کے اصلاح، احوال کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ وہ زندگی کو دو الگ الگ شعبوں دنیاوی اور اخروی میں منقسم کر دیتے ہیں۔ اپنے ایمان کو بچانے کے لیے تمام دنیاوی علائق (worldly business) ترک کر دیتے ہیں۔ مختلف روحانی مغالطوں میں پڑ کر خود کو جسمانی اذیتوں سے دوچار کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی صحیح انقلابی تعلیمات کو طاقِ نسیان پر رکھ کر خواب غفلت میں اتر جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے عموماً مذہبی لوگ، عام طور پر اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان مختلف الخیال لوگوں کے عملی کردار اور مختلف النوع رویوں کو دیکھتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصل کامیابی کا راستہ کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ایک صحیح نظریئے کو فروغ دینے کے لیے سب سے پہلے اسلام کے صحیح مفہوم کو ذہن نشین کرنے اور اس کی صحیح سپرٹ (spirit) کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہمیں ہمیشہ پروردگار کے حاضر و ناظر ہونے کو محسوس کرنا چاہیے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح تعلیمات سے آگاہی پانا اور زندگی بعد از موت میں حساب کتاب ہونے پر ایمان لانا چاہیے۔ ہمیں اس نظریئے کا غیر مبہم طور پر ادراک کر کے اس نظریئے کے مطالبات پر جو یہ ہم سے کرتا ہے، از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔ ہمیں اس کائنات میں اپنی حیثیت

---

[1]۔ یہ اردو اصطلاح ان مذہبی لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو دنیاوی آسائشوں والی چیزوں کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے۔

اور مقام کو سمجھنا اور اس کے مطابق رویہ اور طریق عمل اختیار کرنا چاہیے۔

ہمیں اپنے اندر حقیقی اسلامی فکر اور جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ ہمیں اس نظریئے سے سرشار اور عملاً ذمہ دار افراد کے طور پر نہ تو مادہ پرستی (materialism) کو اپنا شعار بنانا چاہیے اور نہ ہی زندگی کی لازمی ضروریات کو ترک کرنا چاہیے۔

ہمیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معاشرے کی بہتری کے لیے کام کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہیے کیونکہ وہ بنی نوع انسان کی خدمت کو پسند کرتا ہے۔ ہمیں عیش و عشرت کے طلب گار بنے رہنے سے گریز کرنا اور بے شمار خود ساختہ جھوٹے خداؤں کے در پر بھٹکنے اور سجدہ ریز ہونے کی بجائے صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سجدہ ریز ہونے والی شخصیت بننا چاہیے۔ غیر ضروری ریاضتوں سے پرہیز کرنا چاہیے خواہ یہ جس نام سے یا جس شکل میں بھی ہوں۔ اسی لیے حضرت محمد اقبالؒ نے ایسی زندگی کے بارے میں یہ کہا تھا:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات
(ضرب کلیم: نماز)

حوالہ جات

۱۔ بال جبریل، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: تاج کمپنی، ۱۹۳۵ء۔

۲۔ ضربِ کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: کتب خانہ طلوعِ اسلام، ۱۹۳۶ء۔

٨

صرف اللہ اور اس کا رسولؐ



يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. (سورۃ النساء، آیت:۵۹)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو۔ اگر واقعی تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو)

اسلام کے صرف دو مستند ماخذ ہیں: قرآن حکیم اور سنت۔ قرآن مجید آخری کتاب ہے جو اللہ پاک نے قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے حضور نبی کریم ﷺ پر بذریعہ حضرت جبریل علیہ السلام نازل فرمائی۔ چنانچہ قرآن مجید افراد اور معاشروں کے لیے اور تمام طبقاتِ انسانی کے لیے راہ ہدایت ہے۔ وہ جہاں بھی رہتے ہیں اور جس زمانے سے بھی تعلق رکھتے ہوں اور ان کی پوری زندگی کے لیے ایک مشعل راہ ہے۔ قرآن مجید خود کہتا ہے:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ.
(سورۃ الانعام، آیت:۱۵۵)

(اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، ایک برکت والی کتاب۔ پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۗ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ.
(سورۃ الانعام، آیت:۹۲)

(اسی کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے بڑی خیر و برکت والی ہے۔ اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی اور اس لیے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم بستیوں کے اس مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو جو آخرت کو مانتے ہیں۔ وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں)

الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۱۸۵)
(قرآن مجید انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں)

قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی سنت کی پیروی کی جائے کیونکہ آپ ﷺ وہی کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا. (سورۃ النساء، آیت:۵۹)
(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو۔ اگر واقعی تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے)

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (سورۃ النور، آیت:۵۱)
(ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ پاک اور رسول ﷺ کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ﷺ ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے اور کامیاب ہیں)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. (سورۃ النساء، آیت:۶۵)
((اے نبی ﷺ) تمہارے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سرِ تسلیم خم کر لیں)

وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (سورۃ الحشر، آیت:۷)

(رسول ﷺ جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روک دے، اس سے رک جاؤ)

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں تم نے انہیں مضبوطی سے پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے: اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری سنت۔

(مشکوٰۃ المصابیح، ج:۱، رقم الحدیث:۱۸۱)

آیئے دیکھیں کہ حضرات ائمہؒ اربعہ نے سنت کی حیثیت کے بارے میں کیا کہا ہے:

حضرت امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا گیا کہ ہمیں اس وقت کیا کرنا چاہیے جب ہم آپؒ کے کسی قول کو کتاب اللہ کے خلاف پائیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرے قول کو چھوڑ دو اور کتاب اللہ کی پیروی کرو۔ پھر پوچھا گیا کہ اگر آپؒ کا قول حدیث سے متصادم ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس صورت میں میری قول کو ترک کر دو۔ پھر سوال کیا گیا کہ اگر آپؒ کا قول کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے قول کے منافی ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ صحابی رضی اللہ عنہ کے قول کے سامنے میرے قول کو چھوڑ دو۔ (القول المفید فی الدلۃ الاجتہاد والتقلید) حضرت امام ابوحنیفہؒ نے یہ اعلان بھی کیا کہ میرا مذہب وہی ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کی حدیث میں ہو۔ (ایقاظ ھمم اولی الابصار، ص:۶۲)

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے قول کے علاوہ کسی بھی شخص کے قول کو قبول یا مسترد کیا جا سکتا ہے۔ (الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر، ص:۹۶)

انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں ایک فانی انسان ہوں۔ بعض اوقات میں غلط ہوتا ہوں اور بعض اوقات صحیح ہوتا ہوں۔ میری آرا کی جانچ پڑتال کر لیا کرو ان میں سے جو بھی کتاب (قرآن) و سنت کے مطابق ہو، اسے قبول کر لو۔ جو ان کے مطابق نہ ہو اسے رد کر دو۔

(ایقاظ ھمم اولی الابصار، ص:۷۲)

ایک دفعہ حضرت امام شافعیؒ نے حضور نبی کریم ﷺ کا ایک قول بیان کیا۔ سامعین میں سے ایک نے کہا کہ کیا آپؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ اس پر آپؒ کو غصہ آ گیا۔ آپؒ کا رنگ فق ہو گیا اور کہا کہ افسوس ہے تم پر! تم مجھے کس زمین پر لے جا رہے ہو؟ مجھے کون سا آسمان پناہ دے گا اگر میں حضور نبی اکرم ﷺ کا ایک قول بیان کروں اور میری رائے اس کے مطابق نہ ہو؟ کیا

تم مجھے زنّار (غیر مسلموں کی پہننے والی ایک پٹی) پہنے دیکھ رہے ہو؟ یا تم نے مجھے کلیسا میں سے نکل کر آتے ہوئے دیکھا ہے؟ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسی بات کیوں بیان کر سکتا ہوں جس سے میں اتفاق نہیں کرتا۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے کہا کہ میری بات نہ مانو، نہ حضرت امام مالکؒ یا حضرت امام شافعیؒ یا حضرت امام اوزاعیؒ[1] یا حضرت سفیان ثوریؒ[2] کی مانو، وہیں سے لو جہاں سے انہوں نے لی ہے (قرآن پاک اور مستند حدیث سے لو)۔

شریعت کی بنیاد قرآن مجید اور سنت پر ہے۔ جب کہ مسلم علماء کی آراء کو فقہ کہا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر کے مسلمان شریعت اور فقہ کو آپس میں گڈمڈ کر جاتے ہیں اور فقہ پر شریعت کے مقابلے میں زیادہ زور دینے لگتے ہیں۔ لفظ شریعت کا مطلب 'قانونی فیصلے' نہیں بلکہ طریقے، راستے اور وہ راہیں ہیں جو اختیار کی جانی چاہئیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا. (سورۃ الجاثیہ، آیت:۱۸)

((اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو)

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا. (سورۃ المائدہ، آیت:۴۸)

(تم انسانوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی ہے)

عربی زبان میں فعل 'شَرَعَ' کے معنی پنگھٹ یا آبگاہ کے ہیں اور اسم 'شریعۃ' کے معنی پانی کا منبع، پانی کا سوراخ، راستہ یا سڑک کے ہیں۔ (لسان العرب از ابن منظور) اس ماخذ سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ شریعت کا مطلب کیا ہے۔ اس میں وہ قانونی ضوابط (قانون سازی) شامل ہے جس کا

---

[1] حضرت امام اوزاعیؒ (707ء-774ء) ائمہ تابعین میں سے تھے۔ آپؒ کا شمار دوسری صدی کے ممتاز مجتہدین میں ہوتا ہے۔ آپؒ نے تقریباً پوری زندگی شام میں بسر کی، اس لیے زیادہ تر شام میں ہی ان کے مسلک کی اشاعت ہوئی۔

[2] حضرت سفیان ثوریؒ (715ء-778ء) ایک مشہور و معروف فقیہ و محدث تھے۔ انہیں محدثین کے ہاں امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ذکر قرآن مجید اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال میں آتا ہے۔ ان معنوں کو پھر غلط طریقے سے اس طرح بنا دیا گیا کہ ان میں وضاحتیں، تعبیریں، فتوے اور وہ فیصلے بھی شامل کر دیئے گئے جو ان احکامات کی وضاحت تھے۔ جن کے حوالے سے احکامات کی صحت کا اندازہ لگایا جاتا ہے یا جہاں سے استخراج کر کے ان کا اطلاق کیا گیا۔ یعنی کہ 'فقہ'۔ شریعت تین چیزوں سے وجود میں آئی ہے:

(i)۔ وہ قوانین جن کا حکم قرآن مجید میں ہے۔

(ii)۔ وہ قوانین جن کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال میں اظہار کیا گیا ہے۔

(iii)۔ وہ قوانین جو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ماخوذ ہیں۔

قرآن مجید اور سنت تبدیل نہیں ہوتے۔ نتیجتاً شریعت تبدیل نہیں ہوتی۔ جس چیز کو بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جائز (permissible) قرار دیا ہے وہ ہمیشہ جائز رہے گی۔ جس چیز یا حرکت سے منع کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ممنوع رہے گی۔ مثال کے طور پر قرآن پاک نے قتل انسان (homicide) سے منع کیا ہے۔ چنانچہ یہ ممنوع تھا اور ہمیشہ ممنوع رہے گا۔

فقہ کے لفظی معنی ہیں 'سچی سمجھ' لیکن اسلامی اصطلاحات میں 'فقہ' میں وضاحتیں تعبیریں اور وہ فتوے اور فیصلے شامل ہیں جو قرآن وسنت کے احکامات کی تشریح کے طور پر جاری ہوئے یا اصولوں سے دیگر احکامات کو جانچا جاتا ہے یا ان سے حالات کے مطابق کچھ اخذ کیا گیا ہے۔ چنانچہ فقہ لازماً قرآن وسنت سے نہیں آئی بلکہ انہی اصل ماخذات سے بالواسطہ طور پر لی گئی ہے۔ اس صورت حال سے یہ بالکل واضح ہے کہ فقہ شریعت پر حاوی نہیں ہوتی۔ فقہ کو ان مسائل اور امور کے لیے قانون سازی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کے بارے میں شریعت نے خصوصی طور پر کوئی حکم صادر نہیں کیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن وسنت میں تمباکو نوشی کی واضح طور پر ممانعت نہیں آئی۔ اس صورت حال میں مسلم اہلِ علم حضرات نے رائے دی کہ تمباکو نوشی اس لیے ناپسندیدہ چیز ہے کہ یہ بدبودار ہے اور صحت کے لیے خطرناک بھی ہے۔ یہ بات قرآن پاک کی اس شہادت پر مبنی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا. (سورۃ النساء، آیت:۲۹)
(اور خود کو قتل نہ کرو! یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر مہربان ہے)

شریعہ اور فقہ ایک دوسری سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دونوں اسلامی قانون کے دو پہلو ہیں۔ تاہم ان میں نمایاں فرق ہے:

(i)۔ شریعت قرآن کریم اور سنت سے آئی ہے اور فقہ شریعت سے آئی ہے۔

(ii)۔ شریعت تبدیل نہیں ہوسکتی لیکن فقہ تبدیل ہوسکتی ہے۔ یہ تبدیلی نئی معلومات سامنے آنے پر ہوتی ہے۔

(iii)۔ شریعت وسیع اور عمومی ہے اور فقہ مخصوص مسائل پر مرتکز ہوتی ہے۔

مسلم اہل دانش اور بالخصوص عام مسلمان، شریعت اور فقہ کے درمیان اس نازک فرق کو نہیں سمجھتے۔ جب مسلمان قانون کو شریعت کے مطابق بنانے پر زور دیتے ہیں تو اس وقت وہ دراصل فقہ کو قانونی شکل دینے پر زور دے رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت شریعت اور فقہ میں فرق سے عدم آگاہی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس امر کا ادراک نہیں کر رہے ہوتے:

(i)۔ فقہ کے اصول تاریخ کے تمام ادوار میں متشکل ہوتے رہے ہیں اور خاص واقعات کے دوران ایک معروف اصول 'اجتہاد' کے ذریعے تشکیل پاتے رہے۔ فقہ مخصوص معاشرتی اور اقتصادی حالات کی پیداوار ہے۔

(ii)۔ یہ حالات، نئے حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ نے اپنی فقہ کو اس وقت تبدیل کر لیا جب انہوں نے عراق سے مصر میں ہجرت کی تھی۔

(iii)۔ فقہ اور نظام انسانی سوچ اور اطلاقات کے مطابق انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ نتیجتاً یہ کسی تقدس کے حامل نہیں ہوتے۔ اس طرح انہیں نئی سوچ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی تخلیق کاری (creativity) اور اختراع کی راہ کو مسدود کرنا چاہیے۔

علماء میں قرآن مجید اور سنت کے معنوں میں اختلاف بہت کم ہے جبکہ ان کی تعبیرات کے مابین اختلاف بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا فقہ کے پانچ مسلمہ مکاتب فکر کا ظہور ہو گیا: حنفی، مالکی، شافعی،

حنبلی اور جعفری۔ کچھ اور مکاتب فکر مثلاً ظاہری اور اوزاعی بھی ہیں مگر وہ قدرے کم مسلمہ ہیں۔

ایک بہت اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ صرف قرآن مجید ہے جس کی حفاظت کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور کسی منبعِ اسلام بشمول سنت کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے نہیں لیا۔ لہٰذا یہ فطری امر ہے کہ قرآن مجید پر فقہ سے کہیں زیادہ زور دیا گیا ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ. (سورۃ الحجر، آیت:۹)
(یقیناً ہم ہی نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

اگرچہ قرآن مجید ہی اسلام کی بنیاد ہے لیکن اسے نظر انداز کر کے زیادہ اہمیت فقہ کو دی جاتی ہے۔ حضرت محمد اقبالؒ نے اس حقیقت پر بہت ہی گریہ وزاری کی ہے۔

خوار از مہجوری قرآن شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوران شدی
(رموز بیخودی: ولم یا کن لہ کفواً)

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر
(بانگ درا: جواب شکوہ)

مسلم دنیا کی موجودہ صورتِ حال قرآن مجید کی ترقی پسندانہ تعلیمات کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ ہم اس کے لیے ہر کسی کو اور ہر چیز کو الزام دیتے رہتے ہیں۔ اگر ہم پیغامِ قرآن پاک کو اپنے اندر سمو لیں تو پھر زندگی ہی نہیں بلکہ ہمارے اردگرد کی ساری دنیا تبدیل ہو جائے گی۔ حضرت محمد اقبالؒ نے مندرجہ بالا مصرعوں میں جو کچھ کہا، ذیل کے مصرعوں میں ذرا آگے کی بات کہہ دی:

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
(ضرب کلیم: اجتہاد)

فقیہہ شہر کی باتوں سے نالاں
خدا و محمدؐ و محراب و منبر

فقہ پر بہت زیادہ زور دینے سے اسلام کا ضابطہ پسندانہ (قانونی) نقطہ نظر سامنے آ رہا ہے۔ یہ ایسا منظر نامہ ہے جس میں اسلام کے حقیقی اخلاقی، معاشرتی اور روحانی پہلو اوجھل ہو گئے ہیں۔ نمازوں کے ضابطہ پسندانہ پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے بہ نسبت اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑے ہونے کا احساس پیدا کرنے پر توجہ دی جاتی (یعنی کیسے کھڑا ہوا جائے، کیسے اور کب ہاتھ باندھے جائیں وغیرہ وغیرہ لیکن بغیر احساسِ حضوری فریضۂ نماز ادا کر دیا جاتا ہے)۔ مدارس میں فقہ پڑھانے پر قرآن مجید پڑھانے کی بہ نسبت سوگنا زیادہ وقت لگا دیا جاتا ہے۔ مذہبی حلقوں میں قرآنی فہم و بصیرت رکھنے والوں سے کہیں زیادہ مفتی دستیاب ہیں۔اس کے مسئلے پر حضرت محمد اقبالؒ اپنے دل حزیں سے یوں رقم طراز ہے:

بہ بند صوفی و ملا اسیری
حیات از حکمتِ قرآن نگیری
(ارمغان حجاز: بہ بند صوفی وملا اسیری)

مسلم دنیا کے بعض حصوں، بالخصوص جنوبی ایشیا میں قرآن کریم کی براہ راست تدریس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔اس کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر تم براہ راست قرآن (ترجمہ) پڑھو گے تو تمہارے گمراہ ہو جانے کا امکان ہوگا۔ میں جب ایک نوجوان طالب علم تھا تو قرآن کی بعض آیات کا مفہوم نہ جاننے کی وجہ سے کسی نہ کسی عالم سے مدد لینے پہنچ جاتا تھا۔ وہ میری نہایت درشت لہجے میں حوصلہ شکنی کرتے اور کہتے کہ خود نہ پڑھا کرو۔کسی عالم سے مدد لیے بغیر پڑھو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔

مسلمان قرآن پاک سے زندگی کی حقیقی اقدار سمجھنے کی بجائے اکثر تعویذوں اور بے جا رسوم کا سہارا لیتے ہیں۔ایک مریض ڈاکٹر کے لکھے ہوئے نسخے کے مطابق دوا نہ لے اور نسخے کو بار بار پڑھتا رہے۔اسے تعویذ بنا کر گلے میں لٹکا لے یا اسے گھول کر پی لے تو اسے کیسے شفا ہو گی؟ ایک نسخہ تو اس وقت کارگر ہو سکتا ہے جب اس پر لکھی ہوئی دوا کو پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے۔قرآن مجید ہماری روح کی بیماریوں کو کس طرح شفا دے سکتا ہے اگر اسے تعویذ

کے طور پر استعمال کیا جائے یا اس کی اعلیٰ تعلیمات پر عمل کرنے کی بجائے بار بار بہ آواز بلند پڑھا جائے؟

با ایں آتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ آں آساں بمیری
(تجھے قرآن کی آیات سے اس کے سوا کوئی سرو کار نہیں)
(کہ اس کی سورۃ یٰسین کی تلاوت سے جان کنی میں آسانی ہو)
(ایضاً)

حوالہ جات

۱۔ ارمغان حجاز، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۲ء۔

۲۔ ایقاظ ھمم اولی الابصار للاقتداء بسید المہاجرین والانصار وتحذیرھم عن الابتداع الشائع فی القری والانصار من تقلید المذاہب مع الحمیۃ وعصبیۃ فقہا الاعصار، امام صالح بن محمد العمری الشہیر بالفلانیؒ۔ شارجہ: دار الفتاح، ۱۱۹۵ء۔

۳۔ بانگ درا، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔

۴۔ رموز بخودی، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۸ء۔

۵۔ ضرب کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: کتب خانہ طلوع اسلام، ۱۹۳۶ء۔

۶۔ القول المفید فی الدلۃ الاجتہاد والتقلید، امام محمد بن علی بن محمد شوکانیؒ۔ ملتان: فاروقی کتب خانہ، ۱۹۹۳ء۔

۷۔ لسان العرب، حضرت انصاری بن منظورؒ۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۹ء۔

۸۔ الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر وباسفلہ الکبریت الاحمر فی بیان علوم الشیخ الاکبر محیی الدین بن العربی وھو منتخب من کتاب لواقح الانوار القدسیۃ المختصر من الفتوحات المکیۃ، امام عبدالوہاب بن احمد الشعرانیؒ۔ بیروت: دار الاحیاء، ۱۹۹۸ء۔

۹

دین کی بنیادی تعلیمات



هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ. (سورۃ آل عمران، آیت:۷)

((اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دوطرح کی آیات ہیں: ایک محکمات ہیں جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات ہیں)

اسلام ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'امن اور اطاعت'۔ اسلام کا نام اللہ تعالیٰ نے خود رکھا ہے۔ اسلام کا مطلب ہے کہ اللہ پاک کی منشا کی کلی اطاعت کے ذریعے اس دنیا میں امن و امان اور بعد میں آنے والی زندگی میں آرام وراحت۔ جو کوئی اطاعت کرتا ہے اور اسلام کے قوانین کی پیروی کرتا ہے، اسے مسلم کہا جاتا ہے۔ اسلام ایک سادہ سا مذہب ہے جس کی تعلیمات بھی سادہ ہیں۔ اسلام کے چھ بنیادی عقائد درج ذیل ہیں۔

(i)۔ ایک خدا پر ایمان: اسلام کی اہم ترین تعلیم یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی پرستش کی جائے۔ جب کہ انتہائی ناقابل معافی گناہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی پرستش کرنا ہے (جسے شرک کہا جاتا ہے)۔

(ii)۔ فرشتوں پر ایمان: اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر مرئی مخلوق پیدا کی ہے جنہیں فرشتے (ملائکہ) کہا جاتا ہے۔ وہ بغیر کسی تھکاوٹ کے ہمہ وقت اس کی بادشاہت کا انتظام وانصرام چلاتے ہیں۔ وہ ہمیں ہر وقت اپنے گھیرے میں رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خصوصی فرض سنبھالے ہوئے ہے۔ ان میں سے کچھ ہمارے لفظوں اور ہمارے کاموں کا ریکارڈ مرتب کرتے رہتے ہیں جو یوم الحساب کو ہمارے سامنے لایا جائے گا۔

(iii)۔ آسمانی کتابوں پر ایمان: مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء ورُسل علیہم السلام کو کتابوں کے ذریعے ہدایت بھیجی۔ جیسے توراۃ (Torah)، زبور (Psalms)، انجیل (Gospel) اور قرآن مجید۔

(iv)۔ خدا کے پیغمبروں علیہم السلام پر ایمان: مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری امتوں کو اپنی ہدایت پیغمبروں علیہم السلام کے ذریعے پہنچائی ہیں جو کہ انسان ہوتے تھے۔ اس کا آغاز

حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا۔ جن میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شامل ہیں اور آخری رسول و نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

(v)۔ یومِ حساب پر ایمان: اس دنیا میں زندگی اور جو کچھ بھی اس دنیا کے اندر ہے ایک پہلے سے مقررہ دن پر ختم ہو جائے گا۔ اس وقت ہر کسی کو اللہ تعالیٰ فرداً فرداً اکٹھا کرے گا اور اسے اس کے ایمان اور اعمال (اچھے یا برے) کے مطابق جزا اور سزا دے گا۔

(vi)۔ مقدر اور منشائے خداوندی: مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آ سکتا ماسوائے اللہ تعالیٰ کی منشا کے اور وہ اس کے پورے علم میں ہوتا ہے[1]۔

ان چھ بنیادی عقائد کے علاوہ اسلام کے پانچ ارکان اہل ایمان کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ان عقائد کو عملی جامہ پہنائیں۔ یہ ارکان عبادت کے اہم اور لازمی فریضے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ پانچ ارکان اسلام درج ذیل ہیں:

(i)۔ اعلان توحید: ایمان کے اظہار کا بیان یہ ہے، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ ایمان کا یہ اعلان محض ایک بیان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسے اعمال کے ذریعہ حقیقت بنایا جانا چاہیے۔

(ii)۔ روزانہ کی نمازیں (صلوٰۃ): ایک دن میں پانچ نمازیں فرض ہوتی ہیں۔ نماز ایک طریقہ عبادت ہے جس کے ذریعے ایک مسلمان اپنے خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑتا ہے اور روحانی قوت اور دل کا سکون پاتا ہے۔

(iii)۔ زکوٰۃ: مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ دولت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے عوض چند مالی ذمہ داریوں کا تقاضا کیا گیا ہے۔ ہر صاحبِ نصاب (دولت مند) شخص پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرے۔

(iv)۔ روزہ (صوم): مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ رمضان کا سارا مہینہ روزہ رکھ کر گزاریں۔ روزے

---

[1]۔ یہ عقیدہ آزاد مرضی کے تصور کی تردید نہیں کرتا کیونکہ ہم مجبور نہیں۔ ہماری پسند و ناپسند سے اللہ تعالیٰ پہلے ہی آگاہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا علم کامل ہے۔ وہ پہلے سے ہی جانتا ہے کہ ہم کیا کرنے والے ہیں۔

کا دورانیہ سحری سے شروع ہو کر مغرب تک ہوتا ہے۔اس دوران نہ کچھ کھایا جا سکتا ہے نہ پیا۔

(v)۔ حج: ہر صاحب استطاعت مسلمان مرد اور عورت پر فرض کیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں مکہ مکرمہ کے مقدس مقامات کا کم از کم ایک بار ضرور حج کر لے۔

مذکورہ بالا عقائد اور ارکان اسلام کے علاوہ بھی چند بنیادی اخلاقی اور قانونی تعلیمات ہیں جن پر عمل کیا جانا چاہیے:

(i)۔ اعمال کا اندازہ ان کے پیچھے کار فرما نیت سے کیا جاتا ہے۔

(ii)۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا جو پاک نہ ہو۔

(iii)۔ ایک شخص کے اسلام پر اچھی طرح عمل پیرا ہونے کا ایک جزو یہ ہے کہ وہ ایسی چیزوں سے اجتناب کرے جو اس سے تعلق نہیں رکھتیں۔

(iv)۔ کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

(v)۔ کسی شخص کو نہ خود کو ایذا دینی چاہیے نہ دوسروں کو۔

(vi)۔ غیر قانونی جنسی تعلقات، چوری، باعصمت خواتین پر بہتان تراشی اور شراب نوشی کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

(vii)۔ اسلامی شریعت کے مقاصد میں درج ذیل امور شامل ہیں۔ مذہب؛ زندگی؛ جذبات؛ عزت و ناموس؛ خاندان؛ اموال اور انصاف کا تحفظ و نگہداشت۔

مسلم علماء و مفکرین نے ہماری سہولت کے لیے اسلامی تعلیمات کی یوں زمرہ بندی کی ہے۔

(i)۔ فرض/ واجب: اس سے مراد ایسے اعمال ہیں جن کے کرنے سے آپ جزا پاتے ہیں اور نہ کرنے سے سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں مثلاً نماز، روزہ اور ان جیسے دیگر امور۔

(ii)۔ مستحب/ سنۃ سے مراد ایسے اعمال ہیں جن کے کرنے سے ثواب ملتا ہے اور ان میں کوتاہی

کرنے سے بندہ ثواب سے محروم ہوجاتا ہے مثلاً مغرب ہوتے ہی روزہ افطار کر لینا، مغرب کے بعد دو رکعت نوافل کی ادائیگی اور مسواک کرنا۔

(iii)۔ مباح: اس کا مطلب ایسا عمل ہے جس کے کرنے سے کوئی ثواب نہیں ملتا اور اسے نہ کرنے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ نیک ارادوں کے ساتھ انہیں بڑھا کر یا گھٹا کر دیگر زمروں میں لایا جاسکتا ہے۔ اس کی مثالوں میں مختلف قسم کے کھانے شامل ہیں۔

(iv)۔ مکروہ (ناگوار) سے مراد ایسا کام ہے جسے کرکے آپ کچھ بھی حاصل نہیں کرتے اور اس سے باز رہنے سے آپ ثواب کما سکتے ہیں۔ اس کی مثالوں میں ایک مثال یہ ہے کہ آپ بعد از نماز عشاء جاگتے رہیں۔

(v)۔ حرام (ممنوع) اس سے مراد وہ فعل ہے جو کرنے سے آپ مستحق سزا ہو جاتے ہیں اور اس سے باز رہنے سے جزا ملتی ہے۔ اس کی مثالوں میں سور کا گوشت کھانا، قتل کرنا اور حرام کاری شامل ہیں۔

ذرا غور و فکر کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام کی بعض تعلیمات لازمی ہیں اور بعض غیر لازمی ہیں۔ مخلص اہل ایمان کی حیثیت سے ہمیں سنت سے زیادہ فرض/ واجب پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ہمیں مکروہ کی بہ نسبت حرام سے بچنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بعض علما غیر ضروری طور پر بال کی کھال اتارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور یہ کہ ان کی گفتگوئیں غیر متعلقہ اور غیر ضروری علمی اور فقہی موضوعات کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر ہم پاکستان میں علما کی ایک سو تقریریں 100 گھنٹوں میں سنتے رہیں تو ان کے موضوعات کچھ ایسے ہوں گے: کیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم الغیب تھے؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاضر ناظر رہتے تھے؟ کیا مردے اپنی قبروں میں ہماری باتیں سن سکتے ہیں؟ کیا خوفِ خدا رکھنے والے لوگ (اولیاء) ہمارے مسائل حل کر سکتے ہیں؟ کیا کسی بزرگ کا عرس ہر ماہ منایا جا سکتا ہے؟ کیا نمازوں میں آمین بالجہر کہی جاسکتی ہے؟ نماز میں قیام کے دوران ہمارے ہاتھوں کی پوزیشن کیا ہونی چاہیے؟ کیا نماز کے دوران ہمارا سر ڈھانپا ہوا ہونا چاہیے؟ کیا پائنچے ٹخنوں سے اوپر ہونے چاہئیں یا نہیں؟ بزرگ ترین ہستی کون سی ہے؟ کون سی فقہ برتر ہے؟ کیا فلاں فرقہ کافر

ہے؟ کیا وہ مشرک ہے؟ ان کی 100 گھنٹے کی باتوں میں سے 90 گھنٹوں کی طویل تقریروں میں صرف ایسی چیزوں پر ہی باتیں ہوں گی جبکہ بمشکل 10 گھنٹے بامعنی اسلامی تعلیمات پر صرف ہوتے سنائی دیں گے۔

اس سے یہ صورت حال سامنے آتی ہے کہ ہم اپنے دین کی اصل بنیاد سے کتنے دور جا چکے ہیں۔ اصل مسائل سے ہمارے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم اپنی قوتوں کو بیکار مدرسانہ اور فقہی موشگافیوں پر ضائع کر رہے ہیں۔ ہماری ساری تقاریر ایک دوسرے کی مخالفت اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے بارے میں ہوتی ہیں۔ ہم یگانگت اور وحدت لانے اور علم کی روشنی پھیلانے کی بجائے انتشار اور جہالت کی تاریکیاں پھیلا رہے ہیں۔ ہم عوام کو توحید باری تعالیٰ کی اصل سپرٹ (spirit) نہیں پہنچاتے نہ انہیں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگاہ کرتے ہیں۔ نہ ہی ان کے اندر عبادات کا صحیح جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ہم اپنے رویوں اور طرز عمل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہیں ڈھالتے اور نہ ہی اپنے اندر اخلاص اور فراخدلی کی اخلاقی قدریں پیدا کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے مذہب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اسلام کے مشعل بردار ہیں اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ یہ دین عنقریب دنیا میں پھیل جائے گا۔ اس سیاق وسباق میں قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا. (سورۃ الکہف، آیات: ۱۰۳-۱۰۴)

(کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ونامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں)

قرآن مجید نے اس آیت مبارکہ میں ایک نفسیاتی روگ کی نشاندہی کی ہے۔ جسے جدید علم نفسیات میں خودفریبی کہا جاتا ہے۔ ہم سب انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر خودفریبی کا شکار ہیں۔ اس کا ازالہ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہمیں اپنے مذہبی مباحث میں اسلام کی بنیادی تعلیمات پر توجہ دیں۔ انسانوں کے خلاف فرقہ واریت اور نفرت پھیلانے سے اجتناب کریں۔ ہماری تقاریر سے شائستگی اور محبت کا اظہار ہونا چاہیے۔

ہمارا رویہ ایسا ہونا چاہیے کہ اگر کوئی شخص ہم سے ایک دفعہ ملے تو وہ ہمیں آئندہ بھی ملتا رہے۔ ہماری محبت وشفقت اس کے دکھ درد کو دور کرے۔ وہ اپنی زندگی میں ایمان کی تازگی کو محسوس کرتا رہے۔ اگر کوئی ہم سے نہیں مل سکا یا ہمیں اب تک رسائی نہیں ہو رہی تو وہ اس وقت تک بے چین رہنے کہ جب تک ہماری اس سے ملاقات نہ ہو جائے۔ ہمیں دوسروں کی فلاح اور انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لانا چاہیے خواہ وہ ہماری طرف متوجہ ہوں یا نہ ہوں۔ ہمیں اپنی جدوجہد اور دعائیں نیکی پھیلانے کے لیے وقف کر دینی چاہئیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ وقت ضرور آئے گا جب ہمیں محبت کا جواب محبت سے ملنے لگے گا۔ تب جا کر کرۂ ارض پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہت قائم ہوگی۔

رواق منظر چشم من آشیانہ توست
کرم نما و فرود آ کہ خانہ توست
(میری آنکھ کی پتلی صرف اور صرف تیرا آشیانہ دیکھتی ہے)
(آپ مہربانی فرمائیں اور نیچے آئیں کہ میرا گھر تیرا گھر ہے)
(دیوان حافظ: غزلیات)

حوالہ جات

۱۔ دیوانِ حافظ، حافظ محمد شیرازیؒ۔ لاہور: پروگریسو بکس، ۲۰۱۰ء

۱۰

غوروفکر کی ضرورت



کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردُوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹُوٹا ہوا تارا
(بانگ درا: خطاب بہ جوانان اسلام)

عقلیت پسندی انسانی وجود کا ایک اظہار ہے۔ کائنات میں ایک خاص نظم ہے جسے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات مبارکہ میں اس قبیلے، گروہ یا قوم کو پسند کیا گیا ہے جو سوچ بچار کرتی ہے اور ایسے قبیلے یا قوم کی سرزنش کی گئی ہے جو اپنی عقل کو استعمال نہیں کرتی۔ (سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۶۴)

مزید برآں وہ بے نظیر انسانی کیفیت جو انسان کو باقی ماندہ مخلوق سے ممیز کرتی ہے وہ عقل ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا. (سورۃ الاسراء، آیت: ۷۰)

(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی)

'روشن خیالی' (Enlightenment) کے فلسفے میں عقل خودمختاری اور خود کفالت کا دعویٰ کرتی ہے اور کسی بھی 'بیرونی اختیار' (outside authority) مثلاً تاریخ، روایت یا مذہب کو مسترد کرتی ہے۔ یہ مذہب کو کلیتاً مسترد نہیں کرتی بلکہ اسے انفرادی انسانی عقل کی جانچ پڑتال کے تابع بناتی ہے۔ کانٹ نے روشن خیالی کی تصریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان خود مول لی ہوئی تولیت سے آزادی چاہتا ہے۔ تولیت انسان کی یہ معذوری یا نااہلی ہے کہ وہ اپنی سمجھ کو کسی دوسرے سے ہدایت لیے بغیر استعمال نہیں کرتا۔ کانٹ نے روشن خیالی کی روح کی یہ تعریف کی ہے کہ یہ اپنے آپ کے بارے میں آزادانہ سوچ بچار کے لیے ایک 'جرأتِ غور وفکر' ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے اندر یہ جرأت پیدا کرو کہ اپنی عقل کو استعمال کر سکو۔

(What is Enlightenment?,p. 3)

جدید لٹریچر میں مقامِ عقل (place of reason) دو انتہاؤں، 'منطقی ایجابیت' (logical

(positivism) اور انقلاب پسندانہ تاریخیت (radical historicism) کے درمیان گردش کرتا رہا ہے۔ اول الذکر انتہا 'عقل' کو ایک مطلق لازوال اصول قرار دیتی ہے جو نہ تاریخ سے متاثر ہوتی ہے، نہ رسم ورواج سے اور نہ ہی ایسی دیگر کمزوریوں مثلاً جذبات اور خواہشات سے کوئی اثر لیتی ہے۔

(Philosophy and the Human Sciences, Volume 2, p. 134.)

دوسری طرف (دوسری انتہا) انقلاب پسندانہ تاریخیت ہے جو عقل کو ساختیاتی عمل میں سے گزار کر اسے معاشرتی اور تاریخی طریق کار کی ایک ضمنی پیداوار قرار دیتی ہے۔ تاہم یہ سمجھنا ایک تاریخی غلطی ہوگی کہ عقل کلیتاً 'روشن خیالی' کی پیداوار ہے کیونکہ مسلمانوں نے عقل و استدلال، منطق، سوچ بچار، استغراق (contemplation)، سائنسی تحقیق اور ذہنی مشاغل کے بارے میں خود بے پناہ لٹریچر تیار کیا ہے۔ تاہم مسلمانوں کا نظریۂ علمیات (epistemology) عقل کو واحد ذریعۂ علم نہ تسلیم کرتا ہے، نہ قبول کرتا اور نہ ہی واحد ہدایت برائے عمل مانتا ہے۔ مسلم روایتِ علم، عقل کو وحی کے میں شامل سمجھتی ہے۔ اس طرح یہ یورپی روشن خیالی کے دورِ مابعد کی جدید عقلیت کے رجحان کے بالکل برعکس ہے۔

(The Virtue of Selfishness, p. 25.)

اسلامی روایت میں عقل کا تصور مختلف ہے اور یہ اثباتیت (positivist absolutism) کے کٹڑ پن اور انقلابی اضافیت (radical relativism) کی انتہا پسندیوں کو مسترد کرتا ہے۔ اسلام موجوداتِ کائنات، حالت انسان اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوچ کا ایک مختلف انداز پیش کرتا ہے۔ یہ عقل کو ایک بڑی حقیقت کے جزو کے طور پر پیش کرتا ہے نہ کہ حسبِ موقع ضابطہ بنا لینے اور اپنی مرضی کے حربے استعمال کر لینے کے اصول اختیار کرنے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دیگر انسانی خصوصیات مثلاً محبت، خیرات، دانش، روحانیت اور تخلیق کاری کی طرح، عقلیت بھی ایک بنیادی انسانی خصوصیت ہے جو ہمیں قابل فہم نظامِ زیست (intelligible structure) کے ڈھانچے کا پردہ اٹھانے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اسلام کے مطابق ایک فرد کو اتنا ضرور عقل مند (عاقل) ہونا چاہیے کہ اپنے افعال کے لیے جوابدہ

ہو سکے۔ کیونکہ عقل نہ رکھنے والے آدمی پر کوئی مذہبی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذہین انسان کی یہ تعریف کی ہے، ذہین شخص (الکیس) وہ ہوتا ہے جو اپنی خود پسندی کو قابو میں رکھتا ہو۔ اپنی آخرت کے لیے تیاری کرتا ہو۔ (جامع ترمذی، ج: ۲، رقم الحدیث: ۲۴۵۷) اس مثال سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام ذہانت، معقولیت، ایمان اور نیکی کے درمیان ایک فطری تعلق قائم کرتا ہے۔

قرآن پاک متعدد ایسی اصطلاحات استعمال کرتا ہے جو عقل، ذہانت اور سوچ سے قریب تر ہیں۔ یہ الفاظ اس موضوع پر کئی طریقوں سے اور کئی بار روشنی ڈالتے ہیں جو اسلام کی اصل بنیادیں ہیں۔ یہ الفاظ یوں ہیں: تدبر (مراقبہ کرنا)، تفکر (سوچ بچار)، قلب (دل)، فواد (اندرونی دل)، عقل (ذہانت)، علم (آگہی)، فہم (سمجھ)، ادراک (گرفت میں لینا)، شعور (ہوشمند)، برہان (مظاہرہ)، حجۃ (شہادت) بینہ (واضح گواہی)، سلطان (غالب/ حاوی شہادت)، ذکر (یاد/ عاجزانہ استمداد)، فرقان (فہمیدگی)، نطق (گفتگو کرنا/ سوچنا)، حکم (فیصلہ) اور حکمت (دانائی)۔

قرآن مجید نے یہ جامع اور متنوع ذخیرۂ الفاظ استعمال کر کے عقل پر مبنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن سے ان ذہنی طریق ہائے کار کی تمامیت (completion) کی نشاندہی ہوتی ہے جو تجربی مشاہدے، شعوری تجزیئے، اخلاقی فیصلے اور روحانی لطافت کو یکجا کرتی ہے۔ یہ جامع انداز قرآن پاک کی ان آیات سے واضح ہوتا ہے:

اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ○ اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا.

(سورۃ الفرقان، آیات: ۴۳-۴۴)

(کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیا؟ کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں)

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُوۡنَ اِلَيۡكَ ؕ اَفَاَنۡتَ تُسۡمِعُ الصُّمَّ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا يَعۡقِلُوۡنَ ○ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡظُرُ اِلَيۡكَ ؕ اَفَاَنۡتَ تَهۡدِى الۡعُمۡىَ وَلَوۡ كَانُوۡا لَا يُبۡصِرُوۡنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ

النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ. (سورۃ یونس، آیات: ۴۲-۴۴)

(اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں، جو سمجھ نہ رکھتے ہوں؟ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں، تو کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھا سکتے ہیں، اگرچہ وہ نہ دیکھتے ہوں؟ یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا اور لیکن لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں)

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ. (سورۃ اعراف، آیت: ۱۷۹)

(اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں)

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ. (سورۃ المومنون، آیات: ۱۱۵-۱۱۶)

(کیا تم نے سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ بلند و بالا اور سچا بادشاہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عرش کریم کا مالک ہے)

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى. (سورۃ القیامۃ، آیت: ۳۶)

(کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی (بغیر حساب کتاب) چھوڑ دیا جائے گا؟)

مندرجہ بالا کیفیات، دیکھنے یا سننے میں ناکامی جسمانی عوارض میں سے برآمد نہیں ہوتیں بلکہ ذہن اور دل کی بندش میں سے جنم لیتی ہیں کہ انسان ان اعضاء سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انہیں دیئے ہیں۔ یہ اعضاء رہنمائی حاصل کرنے کے لیے دیئے گئے ہیں:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ.
(سورۃ الحج، آیت: ۴۶)

(کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں)

معقولیت کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت اور اعضائے انسانی کے استعمال کی افادیت کے بارے میں قرآن کی اعلیٰ وارفع تعلیمات کی کثرت کے باوجود بہت سے مسلمانوں کا عمومی رویہ غیر معقول، غیر متوازن اور سطحی قسم کا ہے۔ قرآن ہمیں ہر لمحہ سوچ و بچار اور فکر کی دعوت دیتا ہے لیکن بہت سے معاملات میں ہمارا طرزِ عمل غیر معقول اور غیر مناسب ہے اور ہم جذبات اور توہمات سے مغلوب رہتے ہیں۔

سابق ادوار کے علما وفضلا نے مذہبی احکامات اور عبادات کی ترجیحات مقرر کرنے پر بہت محنت کی تھی۔ بلا شبہ اس سے معاملات اور عبادات کی اشکال کے بارے میں کچھ سختی پیدا ہو گئی تھی۔ دوسری طرف اس سے ہمارے لیے یہ طے کرنا آسان بھی ہوگیا کہ کون سی چیز زیادہ ضروری ہے اور کون سی کم۔ آیئے عبادات کی اشکال واقسام پر غور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ایک بار اور ہمیشہ کے لیے طے ہو چکا ہے کہ 'فرض' لازمی ہے اور جو 'سنت' اور 'مستحب' ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس ترجیحی اہمیت کے ضمنی نتیجے میں فرض، سنت کی بہ نسبت زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنی ساری قوت اور توجہ ترجیحی اہمیت پر صرف کر دی اور اصل مقصد پر کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ طرزِ عمل غیر معقول اور غیر متناسب ہے اور دین کے اصل تقاضوں کے بالکل منافی ہے۔

نماز کی مثال لے لیجیے۔ نماز کی سپرٹ (spirit) کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب ایک خصوصی انداز اختیار کرنا ہے یا دورانِ نماز میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایک خصوصی آگاہی اور اس کی طرف توجہ مرکوز کرنا ہے؟ نماز میں سر اور ٹخنے ڈھانپنے چاہئیں یا نہیں ڈھانپنے چاہئیں۔ 'آمین' بلند آواز (جہری) میں کہی جانی چاہیے یا آہستہ (سری) سے کہنی چاہیے؟ یہ فقہ کے بہت چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں۔ نماز کا اصل مادہ یا مفہوم یہ ہے کہ کیا ہم نے ادائیگی کے دوران 'احسان' حاصل کیا ہے یا نہیں؟ (صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث:۴۹) ہمیں اپنی نیت کو ٹٹول کر دیکھنا ہے کہ کیا ہم نے نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا ہے یا اس کے دوران اپنی تجارت کے

بارے میں سوچتے رہے یا ہمارا ذہن خدا کی بجائے اپنے خاندان و متعلقین کے بارے میں متفکر رہا؟ کیا اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی نماز کے دوران دیکھ رہا ہے یا ہم اسے دیکھتے ہیں؟ عملی طور پر یہ ہوتا ہے کہ جونہی ہم 'اللہ اکبر' (تکبیر اولیٰ) کہہ کر اپنی نماز شروع کرتے ہیں تمام بھولی بسری باتیں ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ اس بے توجہی کے بارے میں ایک اشارہ اس حدیث میں ملتا ہے 'بہت سے لوگ جو نماز پڑھتے ہیں انہیں سوائے تھکاوٹ اور تناؤ کے کچھ نہیں ملتا۔ (سنن دارمی، رقم الحدیث: ۱۷۸۹) حضرت محمد اقبالؒ نے اس ذہنی کیفیت کو درج ذیل شعر میں بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں
(بانگ درا: غزلیات)

میں نے نماز پر سینکڑوں تقاریر سنی ہیں۔ موضوع عام طور پر نماز کے فقیہانہ مسائل ہوتا ہے۔ شاذونادر یہ موضوع سننے کو ملتا ہے کہ نماز اصل میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا بہانہ ہے۔ یہ معراج ہے۔ یہ تہذیبی عمل ہے۔ انصاف، برابری اور اخوت سکھاتی ہے۔

آپ 100 مساجد میں چسپاں پوسٹروں اور اشتہارات کے بارے میں ایک تحقیق کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ان پوسٹروں پر لکھی عبارات میں سے 99 فیصد مواد فقہی مسائل سے متعلق ہوتا ہے۔ کیا کوئی چھوٹی داڑھی والا شخص نماز کی امامت کرنے کا اہل ہوتا ہے؟ کیا جینز پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے؟ کیا ٹی وی پروگرام دیکھنے والا شخص نماز کی امامت کرا سکتا ہے؟ یہ باتیں تو کی جاتی ہیں لیکن جو باتیں نہیں کی جاتیں ان میں ایک یہ ہے کہ نماز میں خشوع و خضوع کس طرح حاصل کیا جائے؟ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کس طرح کھڑا ہوا جائے؟

میں سطحی باتوں کو غیر ضروری اور ناجائز و غیر معقول حد تک اہمیت دینے کے بارے میں ایک ذاتی تجربہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں ولایت (England) میں زیر تعلیم (1997ء) تھا۔ لندن کے جنوب مشرقی علاقے کینٹ (Kent) میں رہنے والے میرے ایک دوست نے ہماری دعوت کی۔ جس میں اندازاً بیس (20) کے قریب مسلمان طالب علم اور ایک ہندو رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ میزبان اور اس کے اہل خانہ کھانا پکا رہے تھے۔ ولایت کی روایت

کے مطابق ہم سب ان کی مدد میں لگ گئے۔تھوڑی دیر بعد نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ ولایت کے رہنے والے تقریباً اٹھارہ (18) نوجوان (جنہوں نے جینز کی پتلونیں پہنیں تھی۔ ایک کے علاوہ جن کی داڑھیاں بھی نہ تھیں) وضو میں تھے۔ اصرار کرنے لگے میں نماز پڑھاؤں۔ میں نے ولایت میں رہنے والے ایک بائیس (22) سالہ نوجوان کو زبردستی آگے کر دیا۔جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تو تھی مگر جینز کی پتلون تھی۔ بڑے بڑے فوجی بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس نے بوٹوں سمیت نماز پڑھائی۔ میں نے اتنی پر اثر نماز کبھی نہیں دیکھی۔ میں نے بہت سے غزالی زمان اور رازی دوران دیکھے ہیں۔ پیر طریقت دیکھے ہیں مگر ولایت میں رہنے والے اس چھوٹی داڑھی والے بوٹوں سمیت نماز پڑھانے والے کی شان ہی کچھ اور تھی۔ حرمین الشریفین[1] کے علاوہ میں نے نماز میں اور امامت میں اتنی حلاوت کبھی نہیں دیکھی۔

میری منشاء کسی پر تنقید نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اصل شے روحِ بلالی ہے۔جس کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں جاتی۔ ظاہر و باطن کا تناسب ہم نے کھو دیا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ظاہر بھی لازم ہے۔ اس لیے ظاہر کے بغیر باطن بے کار ہے مگر ظاہر کا مقابلہ روح سے ہو گا تو روح کو ترجیح دینی ہوگی۔

ایک اور مثال لیں، غیبت اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔سگریٹ پینا اکثر علما کے نزدیک صرف مکروہ ہے لیکن ہماری دینی سوچ عجیب ہے۔ غیبت کرنے والے کو کچھ نہیں کہتے مگر سگریٹ پینے والا بہت برا سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ غیبت بدتر شے ہے۔

میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اسلامی فکر کا توازن کھو دیا ہے۔مختلف اشیا کے درمیان توازن کھو دیا ہے۔ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم سمجھنے لگے ہیں۔نفل کو فرض سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔مکروہ کو حرام سے زیادہ برا سمجھتے ہیں۔ چالیسواں، جمعہ کی نماز سے زیادہ اہم ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس غیر متوازن فکر نے ہماری پوری زندگی کو ٹیڑھا کر دیا ہے۔ سماجی و معاشی زندگی بے ہنگم ہو گئی ہے۔ہستی کیا ہے؟ ترتیب کا نام ہے۔توازن کا نام ہے۔

---

[1] مسجد الحرام اور مسجد نبوی کو مجموعی طور پر حرمین الشریفین کہا جاتا ہے۔

برج نرائن چکبست نے کیا خوب کہا ہے:

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انھی اجزا کا پریشاں ہونا
(کلیات چکبست)

ان حالات میں ہمارے لیے لازم ہے کہ ٹھنڈے دل سے سوچیں اور اضطرابی طرزِ فکر چھوڑ دیں۔ اضطراب میں چھوٹی شے بڑی نظر آتی ہے اور بڑی شے چھوٹی نظر آتی ہے۔ ہم بھی فکری اضطراب کا شکار ہیں۔ جس کے سبب فکری توازن سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اس کو بدلنا ہو گا وگرنہ تہذیبی کجی (distortion) برقرار رہے گی۔

آیئے ایک اور مثال لیتے ہیں: فرانس کے ایک مزاحیہ رسالے 'Charli Hebdo'[۱] نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں چند بے ہودہ کارٹون چھاپے تو دنیا بھر کے مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ انہوں نے چارلی ہیبڈو مطبوعات کے اس شمارے کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ کیونکہ اس رسالے نے ان کے نظامِ عقائد کے دل پر ضرب لگائی تھی۔ دنیا بھر کے شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حق پہنچتا ہے کہ ایسے معاملات اور اقدامات کے خلاف احتجاج کریں جسے وہ توہین آمیز سمجھتے ہیں یا جس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اس کیس میں ردعمل مروجہ احتجاجوں سے کئی گناہ زیادہ تھا۔ پارلیمنٹ آف پاکستان (قومی اسمبلی) نے ان کارٹونوں کی مذمت کی اور انہیں اشتعال انگیزی، منافرت پھیلانے اور تہذیبوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی دانستہ کوشش قرار دیا۔ (قرارداد، 14 جنوری 2015ء) ان کارٹونوں کی اشاعت پر مسلمانوں نے پیرس میں مبینہ طور پر چارلی ہیبڈو کے دفاتر پر دو دفعہ (2011ء اور 2014ء) حملے کئے۔ دوسرے حملے میں 12 افراد کو جو اس رسالے میں کام کرتے تھے ہلاک کر دیا گیا۔ پوری مسلم دنیا میں مظاہرین اور پولیس کے درمیان جھڑپیں ہوئیں جن میں متعدد افراد زخمی ہو گئے۔ صرف

[۱]۔ بابری مسجد بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے علاقہ ایودھیا میں مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر نے 1527ء میں تعمیر کروائی تھی۔ 6 دسمبر 1992ء کو ہزاروں ہندو کارسیوکوں نے بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے اعلیٰ رہنماؤں اور نیم فوجی دستوں کے سینکڑوں مسلح جوانوں کی موجودگی میں تاریخی مسجد کو منہدم کر دیا تھا۔ جس کے بعد بھارت میں اپنی تاریخ کے بدترین ہندو مسلم فسادات ہوئے۔

نائیجر ہی میں چار افراد جاں بحق اور 45 زخمی ہوئے۔ تین کلیسا تباہ کر دیئے گئے اور فرینچ کلچر سنٹر (French Cultural Centre) کو جلا دیا گیا۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ پر تشدد ردعمل سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب کی اشاعت کے خلاف اور بابری مسجد منہدم[1] کرنے پر ہوا تھا۔ اس قسم کے ردعمل خالصتاً جذباتی، غیر معقول اور ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ ہمیں ایسے احتجاج کرنے چاہیں جس سے ہمارا مقصد حل ہو۔ عہد حاضر میں سیاسی، سفارتی اور خصوصاً معاشی احتجاج زیادہ مفید رہتا ہے۔

اس قسم کی صبر آزما صورتِ حال میں ٹھنڈے دل سے سوچنے اور معقول ردعمل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ دل دکھنے پر احتجاج بھی ہو جائے اور مسلمان بدنام بھی نہ ہوں۔ آج کل تو پر امن احتجاج کے بہت سے مؤثر طریقے رائج ہیں۔ زندگی کے بارے میں جذباتی طرز عمل چھوڑ کر معقولیت پسندی کی راہ اختیار کی جانی چاہیے۔ نا معقولیت کے محدب شیشے کے پیچھے سے جھانکنے سے چھوٹی چیزیں بڑی اور بڑی چیزیں چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔ معقولیت کا طرز عمل نہ اپنایا گیا تو امتِ مسلمہ ہمیشہ ذہنی تعطل کا شکار رہے گی اور غلط جذباتی ردعمل بالآخر اس ذہنی اور جذباتی توازن کو برباد کر کے رکھ دے گا جو قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے۔ ہمیں اس غیر معقول طرز عمل سے نجات پانا ہوگی، ورنہ ثقافتی انحرافات برقرار رہیں گے اور ہماری اسلامی روایت کو آہستہ آہستہ زائل کرتے رہیں گے۔

[1]۔ بابری مسجد بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے علاقہ ایودھیا میں مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر نے 1527ء میں تعمیر کروائی تھی۔ 6 دسمبر 1992ء کو ہزاروں ہندو کارسیوکوں نے بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے اعلیٰ رہنماؤں اور نیم فوجی دستوں کے سینکڑوں مسلح جوانوں کی موجودگی میں تاریخی مسجد کو منہدم کر دیا تھا۔ جس کے بعد بھارت میں اپنی تاریخ کے بدترین ہندو مسلم فسادات ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ بانگ درا، ڈاکٹر محمد اقبال۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔

۲۔ سنن الدارمی، امام ابو محمد عبداللہ دارمیؒ۔ ریاض: دار المغنی، ۲۰۰۰ء۔

۳۔ صحیح بخاری، امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ کلیات چکبست، پنڈت برج نرائن چکبست۔ بمبئی: ساکر پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء۔

۵۔ The Virtue of Selfishness: A New Concept of Egoism.by Ayn Rand. New York: New American Library, 1964.

۶۔ Philosophy and the Human Sciences by Charlas Taylor. Cambridge: Cambridge University Press, 1985.

۷۔ What is Enlightenment? by Kant. New York: Macmillan, 1963.

۱۱

دین وآخرت کی وحدت



وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ. (سورۃ القصص، آیت: ۷۷)

(جو مال اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر)

مسلمانوں کو دنیاوی اور روحانی زندگی کی علیحدگی کا خاتمہ کرنا ہے۔ ہمیں دین و دنیا کی تفریق کو مٹانا پڑے گا۔ یہاں میں اپنی ایک ذاتی مثال کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ بچپن میں جب میں کبھی اعلیٰ تعلیم، اچھی ملازمت، اچھے گھر کی بات کرتا تھا تو میرے ایک انتہائی قریبی اور مذہبی دوست مجھے سگِ دنیا کہتے تھے۔ پہلے تو میں اسے محبت کی ایک رسم سمجھتا رہا بعد میں، میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے مجھے ایک حدیث سنائی کہ دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔ میں نے انہیں عرض کیا کہ اس حدیث کا یہ مفہوم نہیں جو آپ بیان کر رہے ہیں۔ آپ سوچیں کہ ایک دنیاوی ترقی کے خواہش مند طالب علم کو جب آپ اس طرح برا بھلا کہیں گے تو کیا وہ اعلیٰ سائنسدان بننے کی خواہش کرے گا۔ اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ کاروبار، اعلیٰ سواری اسے مردار لگیں گی اور وہ دنیا کا کتا نہیں بننا چاہے گا۔ اس کا رویہ دنیا کے خلاف ہو جائے گا۔

دین و دنیا کی تفریق کا تصور مطلقاً غیر اسلامی ہے۔ یورپی نومسلم عالم دین جناب محمد اسد نے دنیا کے بارے میں مسلمانوں کے معتدل نقطہ نظر کو یوں بیان کیا ہے: اسلام عیسائیت کی طرح دنیا کے متعلق بری رائے نہیں رکھتا۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں۔ عیسائیت دنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے۔ موجودہ یورپ عیسائیت کی اصل روح کے خلاف ابوالہوس کی طرح زندگی پر گرتا ہے۔ زندگی کو نگلتا ہے مگر اس کی عزت نہیں کرتا۔ اسلام عیسائیت اور مغرب کے برعکس اس کو سکون اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسلام زندگی کی پرستش نہیں کرتا لیکن اسے بلند تر زندگی کے سفر کے لیے لازم تصور کرتا ہے مگر اس سے گزر جاتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً. (سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۰۱)

(اے اللہ! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی)

یہ اس دنیا کی نعمتیں ہماری روحانی جدوجہد کے راستہ میں رکاوٹ نہیں۔ مادی ترقی نہ تو ہمارا مقصد ہے اور نہ ہی قابل نفرت۔

(Islam at the Crossroad, p. 26)

اسلام دین وحدت ہے۔توحید ایک مجرد (abstract) تصور نہیں ہے بلکہ عملی نظریہ ہے۔توحید ایک نظریہ حیات ہے۔ یہ ہر چیز میں وحدت کا (oneness) قائل ہے۔ دنیا و دین کی وحدت، دنیا و آخرت کی وحدت، علم و عمل کی وحدت، روح و جسم کی وحدت، قبائل اور علاقوں میں وحدت، مذہب و علم میں وحدت، امارت و غربت میں وحدت۔ اسلام کے نزدیک خدا ایک ہے۔علم ایک ہے۔ دنیا ایک ہے۔ انسان ایک ہے۔ انسانی عمل ایک ہے۔ دنیا اور دین ایک ہیں (اچھی طرح سے دنیا میں رہنے کا نام دین ہے اور دین پر عمل کرنے سے دنیا اچھی ہو گی)۔ جدید و قدیم علم کی بحث کم نظری ہے۔ موت و حیات ایک ہے۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام صرف ہمارے جسم کو چھوتا ہے۔موت سے فنا نہیں آتی بلکہ زندگی شکل بدل لیتی ہے۔حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے
(ضرب کلیم: موت)

قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. (سورۃ الجمعہ، آیت:۱۰)

(جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید تم کامیاب ہو جاؤ)

قرآن پاک نے رزق کی تلاش کو اللہ تعالیٰ کا فضل کہا ہے اور حکم دیا ہے کہ نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل کر اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل دنیاوی کمائی اور عبادت دونوں میں پنہاں ہے اور کسی ایک بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ یہود کا عمل تھا کہ یوم سبت

(ہفتہ کے دن) صرف عبادت کرنا ہے۔ دنیا کے دھندے میں نہیں پڑنا۔ اسلام میں جمعہ کی نماز کی عبادت سے فارغ ہو کر رزق کی تلاش کی عبادت میں شامل ہونے کا حکم ہے۔ مسجد میں بیٹھ کر خاموشی سے ذکر کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ہم نے دین کا تصور دنیا چھوڑ کر خالص رہبانی تصور دین اختیار کر لیا ہے کہ دین الگ ہے اور دنیا الگ ہے۔ درحقیقت ہم نے دنیا میں رہنا ہے اور اس کو مسخر کرنا ہے۔

آیئے میں آپ کو چند مثالیں دوں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ[۱] میں شامل تھے۔ ان کی وفات پر بے پناہ سونا ان کے ترکہ میں شامل تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی دنیاوی دولت ان کی مذہبیت کو جلا بخشتی رہی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے بلکہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ہمارے تاریخ کا کوئی بھی عالم اور سائنسدان ایسا نہیں تھا جو دنیاوی کاروبار میں مشغول نہ تھا۔

دین و دنیا کی تفریق تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت مٹا دی تھی جب اللہ پاک کی طرف سے سکھائی جانے والی یہ دعا ہمیں ارشاد فرمائی:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِي الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً. (سورۃ البقرۃ، آیت:۲۰۱)

(اے ہمارے رب! ہمیں دنیا کی بھلائیاں عطا فرما اور ہمیں آخرت کی بھلائیاں عطا فرما)

دین و دنیا کے باہمی رشتہ کے متعلق دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ اعلیٰ گھر، اعلیٰ سواری، اعلیٰ کاروبار، سونا اور چاندی دنیا داری نہیں بلکہ دنیاداری اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نی قماش و نقدہ و میزان و زن

(دنیا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا دنیا ہے)
(اچھا لباس، سونا، چاندی، اولاد اور خاندان دنیا نہیں ہے)
(مثنوی رومی)

---

[۱] وہ دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جنہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا میں ہی بار بار جنت کی بشارت دی۔

اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آدمی رات کو تہجد پڑھ رہا ہے اور اس کے دل میں دنیا کی اشیا کی ہوس ہے تو وہ خدا سے غافل ہے لیکن اگر کوئی آدمی ایک ارب روپے کے گھر میں ہے۔ ایک کروڑ روپے کی گاڑی میں ہے اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہے تو وہ دین دار ہے۔ میں نے ایسے دنیادار دصاحب ثروت دیکھے ہیں جو مکمل طور پر خدا مست تھے جبکہ ایسے دین دار بھی دیکھے ہیں جو مکمل طور دنیا کے طالب ہیں اور دعویٰ کے باوجود خدا سے مکمل غافل ہیں اور ان کے ساتھ بیٹھا نہیں جا سکتا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ اگر کشتی پانی میں رہے تو ٹھیک ہے بلکہ کشتی کے وجود کے لیے پانی لازم ہے لیکن اگر کشتی کے اندر پانی چلا جائے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ اگر ہم کشتی کی طرح دنیا پر تیرتے رہیں تو بہت اچھا ہے لیکن اگر دنیا ہمارے دین کی کشتی میں داخل ہو جائے تو پھر تباہی ہے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

آب در کشتی ہلاک کشتی است
آب اندر زیر کشتی پشتی است
(پانی کشتی میں داخل ہو جائے تو کشتی ڈھوب جاتی ہے)
(پانی کشتی کے نیچے رہے تو کشتی تیرتی رہتی ہے)
(مثنوی رومی)

ہمیں دین و دنیا کی دوئی کی تعلیم نہیں دینی چاہیے۔ اس تعلیم سے اچھی سوچ والا طبقہ اپنا ایمان بچانے کے لیے دنیا کے کاروبار سے الگ ہو جاتا ہے یا بددلی سے کام کرتا ہے۔ دنیا صحیح معنوں میں سگ زمانہ کے حوالے ہو جاتی ہے۔ جس سے دین داروں کو اور زیادہ نقصان ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں مذہبی طبقہ اپنی مذہبی رسومات کی ضروریات اور تکمیل تک کے لیے اہل دنیا کا محتاج ہو جاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی فکر صحیح کریں۔ جب تک یہ فکر صحیح نہیں ہوگی ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

کبھی کبھی مجھے ہنسی آتی ہے کہ ایک طرف ہم اپنے ماضی میں اپنی دنیاوی شان و شوکت کا بہت فخر سے اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف دنیا چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دنیا چھوڑنا خالصتاً رہبانی فعل ہے۔ جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ہم دنیا کو فتح نہیں کریں گے اور

اسے حاصل نہیں کریں گےتو دنیا کا رعب ہمارے دلوں کی پنہائیوں میں سما جائے گا۔ہم مانیں یا نہ مانیں ہمارا عمل اس کا شاہد ہوگا کہ ہم دنیا کے بندے ہیں اور دین کا صرف دکھاوا ہے۔ یہ بہت بنیادی بات ہے۔اس پرتوجہ نہایت ضروری ہے۔اس کے بغیر ہم عہد حاضر کی دوڑ سے خارج ہو چکے ہیں۔اگر اپنی اصلاح نہ کی تو تاریخ کا قصہ پارینہ بن جائیں گےاور ہمارا ذکر صرف کہانیوں میں رہ جائے گا۔

یک دست جام بادہ و یک دست زلف یار
رقصے چنیں میانہ میدانم آرزو است
(ایک ہاتھ میں شراب کا پیالہ اور ایک ہاتھ میں دوست کی زلف ہو)
(میرا دل کرتا ہے کہ میں اس طرح میدان میں رقص کروں)
(مثنوی رومی)

حوالہ جات

۱۔ ضربِ کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔لاہور: کتب خانہ طلوع اسلام، ۱۹۳۶ء۔

۲۔ مثنوی رومی، مولانا جلال الدین رومیؒ۔ لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۰۶ء

۳۔ Islam at the Crossroads, M. Asad. Kuala Lumpur: The Other Press, 2005.

۱۲

سیاست کے شورائی اصول



وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. (سورۃ آل عمران، آیت:۱۵۹)
(اور اپنے کاموں میں ان سے مشاورت کیا کرو اور جب (کام کا) پکا ارادہ کرلو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو)

ہمارے سیاسی نظام کی اصلاح کے لیے مشاورت کی بے حد ضرورت ہے۔ ہم اپنے سیاسی نظام میں کوئی اصلاح نہیں لا سکتے جب تک کہ ہم اپنی سیاسی فکر میں تبدیلی نہیں لے آتے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں سرزمین عرب میں جو سیاسی نظام رائج تھا وہ نیم قبائلی اور نیم ملوکانہ تھا۔ جبکہ پڑوسی ممالک ایران اور روم میں موروثیت اور مطلق العنان شہنشاہیت پر مبنی نظام تھے۔ جن میں عام آدمی کو ریاستی معاملات میں بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اسلام نے عرب سیاسی نظام کو شراکت اور رضا مندی پر مبنی سیاسی نظام میں تبدیل کر دیا۔ (دیکھیے باب:۲) قرآن مجید (سورۃ آل عمران، آیت:۱۵۹) نے اعلان کیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ.
(اور اپنے کاموں میں ان سے مشاورت کیا کرو اور جب (کام کا) پکا ارادہ کرلو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو)

یہ واضح حکم ہے جو بغیر کسی ابہام کے حضور نبی اکرم ﷺ تک کے لیے مشاورت کو لازم قرار دیتا ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ کو خداوند عالم کی طرف سے غیر معمولی دانش وبصیرت عطا کی گئی تھی۔ آپ ﷺ کا قلب مبارک انسانوں سے محبت اور ان کی فلاح و بہبود اور خیر خواہی سے معمور تھا۔ مزید برآں آپ ﷺ کو بذریعہ وحی بھی تائید وحمایت اور رہنمائی حاصل تھی۔ اس کے باوجود اگر حضور نبی اکرم ﷺ کے لیے مشاورت ضروری تھی تو بعد کے مسلم حکمرانوں کے لیے یہ بدرجہ اتم ضروری ہے۔ قرآن پاک (سورۃ الشوریٰ، آیت:۳۸) اس لازمی مشاورت کے لیے ایک دلیل دیتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ.
(جو لوگ اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)

یہاں شوریٰ کو اہل ایمان کی ایک لازمی خصوصیت اور ان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس خصوصیت کا ان کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی، ادائیگی نماز (فرض نماز) اور ادائیگی زکوٰۃ وغیرہ۔ یہ سب مسلمانوں کے مذہبی فرائض کا حصہ ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید نے 'شوریٰ' کو ایک نظام حکمرانی کے طور پر نہیں بلکہ اصولِ حکمرانی کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ فرق بہت اہم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے یہ بات مسلمانوں کی آئندہ آنے نسلوں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے معاملات کو اصولِ شوریٰ کے تحت طے کریں۔

شوریٰ اس امر کی متقاضی ہے کہ فیصلہ سازی میں سنجیدہ اور موثر شراکت کا اہتمام کیا جائے۔ اسے محض ایک رسمی طریق کار نہ بنایا جائے۔قرآن کریم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جن پر نزول وحی ہوتا تھا، مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جن امور کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی خصوصی وحی نہ آئے، ان کے فیصلے کے لیے 'شوریٰ' پر انحصار کریں۔ لہٰذا تمام اہل ایمان کو اس ہدایت پر عمل کرنے کو کہا گیا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچ سکیں۔ ممتاز مفسرِ قرآن ابن عطیہؒ اس آیت کے بارے میں اپنی تفسیر میں لکھتا ہے کہ 'شوریٰ' شریعت کی بنیادوں میں سے ہے اور ایک امرِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس شخص کو عوامی امور طے کرنے کا اختیار دیا گیا ہے وہ اگر علم اور خدا کا خوف رکھنے والوں سے مشورہ لیے بغیر کام کرے تو اسے اس کے عہدے سے برطرف کر دیا جانا چاہیے۔

(المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز ذیل سورۃ شوریٰ، آیت: ۳۸)

لہٰذا چاروں خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین عوامی 'بیعت' کے ذریعے عوام کے پاس گئے اور ان سے اپنی حیثیت کی منظوری حاصل کی تھی۔ 'بیعت' ایک باہمی معاہدہ ہوتی ہے جس کے تحت حکمران یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اسلامی قوانین پر عمل کرے گا۔ اس سے متعلق عوام کو مطمئن کرے گا اور عوام کی طرف سے اس کے ساتھ یہ عہد کیا جاتا ہے کہ وہ حکمران کی تائید وحمایت کریں گے اور اسے مشورے دیتے رہیں گے۔

لہٰذا آئینی طور پر جب پُر امن طریقے سے ممکن ہو تو بیعت کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ یہ طریق کار

'مواخذے' اور منصب سے معزولی کے مترادف ہوتا ہے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اتفاق رائے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین منتخب ہونے کے بعد واضح طور پر اس حق کی توثیق کرائی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کی بیعت لینے کے بعد اپنے خطاب میں فرمایا: مجھے تم پر اختیار دیا گیا ہے، مگر میں تم سے بہترین نہیں ہوں۔ تم اپنے معاملات کے انتظام وانصرام کے لیے میری اطاعت کرتے رہنا۔ جب میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں رہے گی'۔

اسی انداز میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر میں ٹھیک کام کروں تو تم میری مدد کرنا، اگر غلط کروں تو تم مجھے ٹھیک کر دینا۔

مندرجہ بالا آیاتِ قرآن مجید اور تاریخی نظائر بتاتے ہیں کہ ہر ایک فیصلہ شورائی عمل کا نتیجہ ہونا چاہیے جو کہ اصولِ اکثریت ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء الراشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں پائے جانے والے تاریخی نظائر بتاتے ہیں کہ فیصلے اکثریت کی رائے کے مطابق ہو سکتے ہیں، خواہ سربراہ کی رائے اُس رائے سے مختلف ہو۔ اسلام اس اصول کی بنیاد پر سبق دیتا ہے کہ فرد کو معاشرے یا اجتماع (الجماعت) سے متفق ہونا چاہیے جس کی تعبیر اکثریت کی جا سکتی ہے۔ درج ذیل حدیث اسی اصول اکثریت کا اظہار کرتی ہے۔ 'اللہ تعالیٰ میری امت کو کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہونے دے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت کے ہاتھ کے اوپر ہوتا ہے۔ اس لیے اکثریت (سوادِ اعظم) کا ساتھ دیا جانا چاہیے اور جو کوئی ان سے اختلاف کرتا ہے جہنم کی راہ کا راہی بن جاتا ہے۔ (مستدرک علی الصحیحین، رقم الحدیث: ۱۱۶)

خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وفات کے بعد مسلم حکمرانوں نے رومنوں اور فارسیوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ انہی کی سیاسی روایات، اندازِ حکمرانی، استبدادی طور طریقے اور موروثی خانوادے وجود میں آ گئے۔ مسلم حکمرانوں نے ظل اللہ علی الارض ہونے کا دعویٰ کر دیا جو کہ نظریۂ سماوی حقوقِ شاہی تھا۔ اپنی سیاسی تاریخ کو یاد کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مذہبی سکالرز کی بیشتر کتابوں میں امیر (حکمران) کے مرکزی کردار پر بحثیں ملتی ہیں، نہ کہ عوام کے کردار کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ان میں اطاعتِ امیر کو عوام کا فرضِ اولین قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شوریٰ (پارلیمنٹ) صرف سفارش کر سکتی ہے۔ 'امیر' شوریٰ کے مشوروں

کا پابند نہیں ہے۔

بنو امیّہ کے زمانے سے لے کر آج تک کے اپنے علماء کی کتابوں میں یہی بحثیں ملتی ہیں۔ حکمران اور شوریٰ کے اضافی اختیارات کیا ہیں؟ ان دونوں میں سے کون زیادہ اہم ہے؟ عوام کی نمائندگی شوریٰ کرتی ہے یا امیر کرتا ہے؟ اس کے علاوہ ان کا خیال یہ بھی رہا ہے کہ امیر کو اپنی پسند کے مطابق شوریٰ کا چناؤ کرنے کا اختیار ہے۔

ایک لمحہ بھر اس نقطے پر غور کیجیے۔ کیا یہ خالص شہنشاہی یا آمریت نہیں ہے؟ ایک حریص شخص ایک بار امیر منتخب ہو کر اپنی پسند کی مجلس شوریٰ قائم کر لیتا ہے اور کبھی کبھار اس سے مشورہ کر کے اپنی پسند کے فیصلے مسلط کرنے لگتا ہے اور دعویٰ کر دیتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اور یہ کہ وہ اس وقت تک اقتدار میں رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا کیونکہ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہے ذلیل کر دیتا ہے۔ اس سیاق وسباق میں کیا امیر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات ہیں۔ اللہ پاک ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے اور یہ کہ وہ زمین پر سایہ خدا ہے جو کوئی اس کی اطاعت کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اور جو اس کی توہین کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی توہین کرتا ہے۔

یہ وہ مسخ شدہ تعبیر ہے جو ہمارے حکمران اقتدار پر غاصبانہ قبضے کے لیے پیش کرتے رہے۔ اسی کی آڑ میں اپنی حکمرانی کو طول دیتے رہے ہیں۔ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اسلام میں اس سوچ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ عہد حاضر میں اگرچہ عمومی فکر تو یہی ہے لیکن کچھ علما اور دینی جماعتوں نے اس فکر کو چیلنج کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ 1947ء میں جب اسلام کے نام پر پاکستان وجود میں آیا تو یہ بحث شروع ہو گئی کہ سیاسی نظام کیا ہو گا۔ اس پس منظر کے ساتھ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد منظور کی گئی۔ اس قرارداد کو پاکستان کے تقریباً تمام علماء کی حمایت حاصل تھی اور آج تک تمام مذہبی طبقہ اس کو قبول کرتا ہے۔ اس قرارداد نے اقتدار کا صحیح اسلامی تصور پیش کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات پر اصل حاکمیت (soveriengty) اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس نے اپنا اختیار پاکستان کی ریاست کو تفویض (delegate) کیا ہے۔ جسے پاکستان کے عوام استعمال کریں گے۔ یہ اقتدار ایک مقدس امانت ہے۔ ریاست یہ اختیار عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال

کرے گی۔ اس نظام میں جمہورت، آزادی، برابری، رواداری اور سماجی انصاف ہوگا۔ جہاں اقلیتوں کے حقوق کا مکمل تحفظ ہوگا۔ بنیادی انسانی حقوق کو یقینی بنایا جائیگا۔

آپ ذرا اس قرارداد پر غور کریں۔ اقتدار کسی بادشاہ کے لیے نہیں ہے۔ کسی صدر اور وزیر اعظم یا امیر المومنین کے لیے نہیں ہے بلکہ پاکستان کے عوام کے لیے ہے۔ جسے عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کریں گے۔ علما اور سیاسی لیڈروں کا یہ متفقہ اعلان تھا کہ اصل حکمران عوام ہیں اور وہ حکمرانی انتخاب کے ذریعے حاصل کریں گے۔ کوئی الوہی حقوق (divine rights) نہیں ہوں گے۔ کوئی امیر المومنین عوام کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا۔ کوئی حاکم اپنی مرضی سے اپنی شوریٰ نہیں بنائے گا بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں کا پابند ہوگا۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ دولت، خاندان یا بندوق کی طاقت سے عوام کی گردن پر سوار ہو جائے۔

اچھی بات یہ ہے کہ پاکستان بلکہ بہت سے مسلم مما لک کی آج کل کی مذہبی سیاسی جماعتیں بھی اس فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ عوام کے ووٹ کے ذریعے منتخب ہو کر آنے کے بعد پارلیمنٹ کی بالادستی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ میں مذہبی سیاسی جماعتوں کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ سیاسی جماعتوں کی یہ سوچ اسلامی سوچ ہے۔ اس لیے کہ اسلامی سیاسی فلسفہ حاکم کی بجائے عوام کو اصل مانتا ہے۔ مسلمانوں کے پہلے خلفاء ہر لمحے عوام کے سامنے جوابدہ تھے۔ پارلیمنٹ کی جو بھی ابتدائی شکل تھی۔ وہ اس کے سامنے مکمل طور پر جوابدہ تھے۔

قرارداد مقاصد کے بعد، میں ملائشیا، ترکی اور ایران کی مثال دوں گا۔ ان برادر اسلامی مما لک میں کسی نہ کسی درجے میں عوامی طاقت سے ہی مسلمان حکومتیں بنی ہیں۔

عوام کی حاکمیت کا تصور جو اسلام میں چودہ سو سال سے ہے اور اہل مغرب نے سولہویں صدی میں اختیار کیا ہے۔ ہمارے سیاسی عمل میں آجکل بھی مکمل طور پر عمل پذیر نہیں ہو سکا۔ اکثر اسلامی مما لک میں حکمران عوام کی مرضی کے خلاف عوام کی گردنوں پر سوار ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اقتدار دیا ہے اور کبھی ہماری تہذیبی سیاسی طاقتیں کسی نہ کسی شکل میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔

اہل اسلام کو سوچ سمجھ کر پختہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ انہیں عوامیت کا علمبردار بننا ہے اور یہ کہ

اسٹیبلشمنٹ سے تعلق مناسب نہیں۔ اہل اسلام کو انقلابی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ عوام کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ عوامی زبان بولنی چاہیے۔ ظالم حکمرانوں اور مصنوعی اقتدار سے دوری اختیار کرنی چاہیے۔ عملی طور پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا کردار ادا کرنا چاہیے۔

اہل اسلام کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اسلام کا نام لینے والا ہر طالع آزما (adventurer) اسلام کا نمائندہ نہیں ہے۔ پاکستان کا مرد آہن ضیاء الحق ہو یا سوڈان کا جنرل عمر حسن احمد البشیر اسلام کے نہیں بلکہ اسٹیبلشمنٹ کے لوگ تھے۔ جو عوام کی مرضی کے خلاف ان کی قسمتوں کے مالک بن گئے تھے۔ چونکہ ان کے پاس توپ تھی وہ اسلام کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے استعمال کرتے رہے۔ یہ اہل اسلام کی نفسیاتی بے بسی ہے کہ کوئی بھی مہم جو جب بھی اسلام کا نام لیتا ہے وہ اس کی حمایت کرتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہیں اپنے اس رویے کو تبدیل کرنا چاہیے۔ انہیں اپنی بے بسی برداشت کرنی چاہیے اور اس بے بسی کو عوام کی حمایت سے طاقت میں بدلنا چاہیے۔ اسٹیبلشمنٹ کی براہ راست (directly) یا بالواسطہ (indirectly) حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی طاقت اور استحکام کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ اس کے برعکس ہر لمحے اور ہر فیصلے کے وقت عوام کو ترجیح دینی چاہیے۔ چاہے اس سے وقتی طور پر نقصان ہو۔ اس سے عوام کی نگاہ میں اہل اسلام کا اعتماد بڑھے گا جو بالآخر فائدہ مند ہوگا۔ ایران اور ترکی کی مثالیں ہمارے کے سامنے ہیں۔ جہاں اہل اسلام خالص عوام کے بل بوتے پر پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود اقتدار میں آئے ہیں۔

اس بات کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ اقتدار میں آنے کے بعد حکومت عوام کی ہونی چاہیے کسی خاص گروہ کی اجارہ داری (monopoly) نہیں ہونی چاہیے بلکہ عام مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے۔ افغانستان اس ضمن میں مکمل طور پر ناکام ہوا ہے اور اسلام کی جگ ہنسائی کا سبب بنا ہے۔ اس لیے کہ وہاں سیاسی فکر خالصتاً ملوکیت والی تھی کہ ایک فرد یا ایک ٹولہ عوام کی قسمتوں کا مالک ہے۔ وہ فرد چاہے خلیفہ ہو یا امیر المومنین، مسٹر ہو یا مولوی۔ کچھ حد تک یہی صورت حال ایران میں ہے۔ اگر علماء نے ایران میں اقتدار عوام کے سپرد نہ کیا تو آپ چند سالوں میں ایک اور انقلاب دیکھیں گے جو ولایت فقیہ کے تصور کے خلاف ہوگا۔ پھر شاید وہاں عوامی

بادشاہت قائم ہو جائے اور اچھا ہے کہ ایران اصلاح کی طرف بڑھ رہا ہے۔عرب ممالک کو دیکھیں وہاں اسلام کی ابتدا ہوئی۔ ہمارے مقدس ترین مقامات وہاں ہیں۔ وہاں خالص خاندانی ملوکیت ہے۔عوام کی حاکمیت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہاں کے اکثر علماء اس ملوکیت کے محافظ ہیں۔ملوکیت کے مخالفوں کے سر علماء کے فتوؤں کے بعد تن سے جدا کیے جاتے ہیں۔اس ساری بحث کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اگر ہم کسی مسلمان بادشاہ کی ملوکیت کے خلاف بات کریں تو ہمیں اسلام کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔

میں آپ کو قرآن مجید سے ایک واقع سنانا چاہتا ہوں۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔یمن میں قوم سبا کی حکومت تھی۔اپنے زمانے کے یہ سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور امیر لوگ تھے۔بارش کے پانی کو کنٹرول کرنے کے لیے ڈیم بنا رکھے تھے۔اپنے خاص جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ایشیاء کے مابین تجارت کنٹرول کرتے تھے۔ ملکہ سبا ان کی حکمران تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوجوں نے اس کی سلطنت کا محاصرہ کیا تو ملکہ سبا نے اپنے عمائدین (dignitories) کی مجلس بلائی اور سب سے ایک سوال کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ لڑنا چاہیے یا کہ ہتھیار ڈال دینے چاہیں؟ قرآن پاک (سورۃ النمل، آیت: ۳۳) میں عمائدین کا جواب لکھا ہے:

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ.

(وہ بولے کہ ہم قوت والے لوگ ہیں اور سخت جنگجو ہیں۔البتہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے جو بھی آپ فیصلہ کریں گی ہمیں قبول ہوگا)

ملکہ سبا نے اپنی تقریر (سورۃ النمل، آیت: ۳۴) میں کہا:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ.

(بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد پھیلاتے ہیں۔اس کے عزت والے لوگوں کو بے عزت کر دیتے ہیں اور یہ بھی ایسا ہی کریں گے)

میری رائے میں جدید سیاسی تاریخ میں بادشاہت اور فوجی حکومت کے کردار کے بارے میں یہ سب سے زیادہ واضح بیان ہے۔علامہ محمد اسد نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ داخل ہونے سے مراد قوت سے داخلہ ہے۔ چاہے بیرونی حملے کی شکل میں ہو یا کہ داخلی طور پر طاقت

کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ ہو۔ بادشاہ سے وہ شخص بھی مراد ہے جس نے طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کیا ہو اور اپنے لوگوں کو طاقت کے زور پر غلام بنا رکھا ہو۔

(*The Message of The Quran*)

سید مودودیؒ کے خیال میں ناجائز قابض اس لیے یہ کام کرتے ہیں تا کہ قوم بے بس ہو جائے۔ کوئی ان کے خلاف کھڑا نہ ہو سکے۔ وہ عزت نفس ختم کرتے ہیں۔ غلامی، خوشامد، جاسوسی وغیرہ کے کلچر کو رواج دیتے ہیں۔

فساد اور بے عزتی بہت جامع اصطلاحات ہیں۔ قرآن مجید نے یہ دو الفاظ استعمال کر کے غاصبوں (userpurse) کی ذہنیت اور ان کے ہتھکنڈوں (tactics) پر بہت جامع تبصرہ کیا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کیا پچھلے چار سو سالوں میں آپ کے ساتھ یہی نہیں ہوا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی، تاج برطانیہ ہو یا پاکستان کے غاصب حکمران، سب نے یہاں فساد پھیلایا ہے۔ سب نے یہاں بے عزتی کو رواج دیا ہے۔

بظاہر دلچسپ لیکن اس بحث سے متعلقہ نقطہ یہ ہے کہ جب بھی ہم کسی مسلمان ڈکٹیٹر یا بادشاہ کے خلاف بات کرتے ہیں یا بادشاہوں کے حامی نام نہاد مسلم علماء کی تحریروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو اس کو اسلام سے عناد قرار دیا جاتا ہے۔ ملوکیت اور ملائیت کا یہ تانا بانا ان دونوں کے طبقاتی مفادات کو مستحکم بنا دیتا ہے لیکن اس سے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو شدید نقصان پہنچتا ہے جو صدیوں کے سیاسی جبر و تشدد، مذہبی جور و ستم، غربت و بے چارگی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کراہتے رہے اور اب بھی آہ و فغاں کر رہے ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ کہتے ہیں:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری!
(تمہارے ضمیر کے اس صاف آئینے کا ایک ٹکڑا تک باقی نہ رہا)
(افسوس اس پر جسے بادشاہوں، ملاؤں اور صوفیوں نے کہیں کا نہیں چھوڑا)
(ارمغان حجاز: آواز غیب)

حوالہ جات

۱۔ ارمغان حجاز، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۲ء۔

۲۔ المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، حضرت بن عطیہ اندلسیؒ۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۷ء۔

۳۔ المستدرک الی الصحیحین، امام ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ حاکمؒ ترجمہ شاہ محمد چشتی۔ لاہور: پیغام القرآن، ۲۰۰۹ء۔

۴۔ Islam at the Crossroads, M. Asad. Kuala Lumpur: The Other Press, 2005.

۵۔ The Message of The Quran by M. Asad. London: The Book Foundation, 2003.

۱۳

نیا مذہبی نظام تعلیم



وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِئُوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۳۱)

(اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ!)

ہماری مذہبی تعلیم کا نظام نہ صرف اصلاح کا متقاضی ہے بلکہ یہ مکمل طور پر تبدیل کر دیئے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے نصابات اور تدریس کے طریقے فوری توجہ اور اصلاح کے محتاج ہیں لیکن ہم مسلمان اس مسئلے کے بارے میں بہت ہی حساس واقع ہوئے ہیں۔ میں شروع میں ہی یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں مدارس کا ایک وکیل اور ان کا حامی ہوں۔ ہمیں تمام مذہبی علوم انہی مدارس کے ذریعے منتقل ہوئے ہیں۔ یہ لاکھوں غریب و نادار طلبا کو مفت تعلیم دیتے ہیں جو ریاستی تعلیمی نظام سے باہر رہ گئے ہوئے ہیں۔ علماء، اسلام کے لیے ہمیشہ تقویت کا منبع رہے ہیں اور وہ مسلم دنیا کی شاندار روایات قائم کرنے کے لیے انتہائی نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب حالات و واقعات بہت بدل چکے ہیں۔ ہمیں وقت کا ساتھ دینے کے لیے اپنے اندر تبدیلیاں لانی پڑیں گی۔ اس سیاق و سباق میں غور و فکر کے لیے ذیل میں چند تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔

۱۔ پرانے نصاب کی تبدیلی

مدارس نے ایک مفصل نصابِ تعلیم مقرر کر رکھا ہے مگر اس نصاب کی تقریباً ساری کتابیں صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں۔ مثال کے طور پر مدارس ایک خاص قسم کی منطق کی کتاب پڑھاتے ہیں جو دو ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے۔ وہ اب بھی ارسطو کی کاوشوں پر مبنی منطق پڑھا رہے ہیں۔ بلاشبہ وہ اپنے دور کی انتہائی ترقی یافتہ منطق تھی لیکن اب اس کی افادیت باقی نہیں رہی کیونکہ جدید فلسفے میں ڈیکارٹ کی تصانیف کی وجہ سے بہت کچھ ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ پچھلے پانچ سو برسوں میں انسانی علوم نے بہت ترقی کی ہے لیکن ہم ذہنی تعطل کا شکار ہیں۔ افکار کے

اس تعطل میں سے نکلنے کے لیے نئی علمی کاوشوں اور پیش رفتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدارس میں منطق کی جو کتب پڑھائی جا رہی ہیں وہ کئی صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں جب کہ یہ مضمون بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔

مدارس میں اقلیدس کی ریاضی پڑھائی جا رہی ہے۔ وہ واقعی ایک عظیم ریاضی دان تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے گزرا ہے۔ اس کا جدید بیانیہ یا ایک جدید ریاضی اقلیدس کے اصولوں کی ارتقائی صورت ہے جو آج کل پاکستان میں انٹرمیڈیٹ کی سطح پر پڑھائی جاتی ہے۔ آج کے طلبا انٹرمیڈیٹ کی تعلیم مکمل کر کے انجینئرنگ کالجوں میں داخلے لے رہے ہیں لیکن مدارس کے طلبا جنہوں نے اقلیدس کی ریاضی پڑھی وہ ان داخلوں کے لیے مطلوبہ اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے رہ جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ انٹرمیڈیٹ کی سطح کی ریاضی میں اس شعبے میں ہونے والی جدید پیش رفتوں کو شامل کر لیا گیا ہے لیکن مدارس نے اس نصاب میں نہ کچھ شامل کیا ہے اور نہ کوئی تبدیلی متعارف کروائی ہے اور وہی ریاضی پڑھا رہے ہیں جو تئیس سو (2300) سال پہلے رائج تھی۔

ادب کے معاملہ میں بھی یہی صورت حال ہے۔ مدارس میں جو ادب پڑھایا جاتا ہے، اس میں سے زیادہ تر زمانہ قبل از اسلام اور عباسی دور (750ء - 1258ء) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نصاب میں نشاۃ ثانیہ، عہد وکٹوریہ یا دورِ حاضر کی کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر مدارس کے طلباء امیر خسروؒ[1] اور ولی دکنیؒ[2] کو تو پڑھتے ہیں مگر مرزا غالب حضرت اقبالؒ اور فیض احمد فیض سے واقف نہیں ہیں۔ عالمی ادب کے سیاق و سباق میں یہ طلباء ہومر[3] اور سوفوکلیز[4] کو پڑھتے

---

[1]۔ امیر خسروؒ (1253ء-1325ء) فارسی اور اردو کے صوفی شاعر اور ماہر موسیقی تھے۔

[2]۔ ولی محمد ولی دکنی (1667ء-1707ء) برصغیر پاک و ہند کے کلاسیکل اردو کے شاعر تھے۔

[3]۔ Homer: ہومر (800BC) ایک قدیم یونانی شاعر تھا۔

[4]۔ Sophocles: سوفوکلیز (406BC-497BC) ایک قدیم یونانی مصنف اور شاعر تھا۔

ہیں لیکن چاسر[۱] شیکسپیئر[۲]، ورڈز ورتھ[۳]، جوناتھن سوفٹ[۴]، جان کیٹس، چارلس ڈکنز[۵] ٹی ایس ایلیٹ[۶] کو نہیں پڑھتے۔

اسی طرح مدارس کے نصاب میں یونانی عہد کے بطلیموس کی فلکیات پڑھائی جاتی ہے۔ کاپرنیکس، گیلیلیو اور نیوٹن کے انکشافات نے زمین اور کائنات کے بارے میں بنیادی تصورات ہی تبدیل کر دیئے ہیں۔ ان کے انکشافات سے قبل سائنس دانوں کا نظریہ تھا کہ زمین اس پوری کائنات کا مرکز ہے۔ جب کہ آج ہم جانتے ہیں کہ سورج نظام شمسی کے مرکز میں ہے۔ کائنات کے مرکز میں نہیں۔ مسلمان اب بھی دو ہزار سال پہلے والے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے مسلمانوں میں سے بعض کو یہ یقین نہیں آتا کہ انسان نے چاند تک رسائی حاصل کر لی ہے کیونکہ پرانی نظریات کے مطابق یہ چوتھے آسمان میں ہے اور آسمانوں میں سے کوئی بھی نہیں گزر سکتا۔

دینی مدارس کا موجودہ نصاب، درس نظامی[۷] جو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان اور دنیا کے دیگر حصوں مثلاً جنوبی افریقہ، کینیڈا، امریکہ، کریبین جزائر اور برطانیہ میں پڑھایا جاتا

[۱]۔ Geoffrey Chaucer: جیوفرے چاسر (1340ء-1400ء) ایک عظیم برطانوی شاعر تھا جسے انگریزی شاعری کا باوائے آدم کہا جاتا ہے۔

[۲]۔ William Shakespeare: ولیم شیکسپیئر (1564ء- 1616ء) ایک انگریز مصنف اور شاعر تھا جسے انگریزی زبان میں دنیا کے عظیم ترین مصنفین اور ڈرامہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شیکسپیئر کو انگلستان کا قومی شاعر مانا جاتا ہے۔

[۳]۔ William Wordsworth: ولیم ورڈز ورتھ (1770ء-1850ء) ایک مشہور برطانوی رومانوی شاعر تھا۔ اسے ملک الشعرا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

[۴]۔ Jonathan Swift: جوناتھن سوفٹ (1167ء-1745ء) ایک اینگلو آئرش سیاست دان اور شاعر تھا۔

[۵]۔ Charles Dickens: چارلس ڈکنز (1812ء-1870ء) برطانیہ کا مشہور ناول نویس تھا۔

[۶]۔ T.S. Eliot: ٹی ایس ایلیٹ (1888ء- 1965ء) ایک مشہور انگریزی شاعر، ادیب، ڈرامہ نویس، ایڈیٹر اور پروفیسر تھا جسے 1948ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔

[۷]۔ یہ نصاب ملا نظام الدینؒ (1677ء-1748ء) نے ترتیب دیا تھا جو انہی کی نسبت سے درس نظامی کہلانے لگا۔ ملا نظام الدینؒ فاضل جید، عارف فنون رسمیہ، ماہر علوم نقلیہ وعقلیہ اور فقیہ اصولی تھے۔

ہے۔اس کے مرتب ملا نظام الدینؒ تھے۔ جولکھنؤ (بھارت) کے شہرسہالی کے رہنے والے تھے۔ان کا شجرۂ نسب صحابی حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا۔ ملا نظام الدینؒ 1748ء میں وفات پا گئے۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہم عصر تھے۔ان کا 'مدرسہ سہالی' بعد میں ترقی کر کے مدرسۂ فرنگی محل[۱] کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے ہندوستان کی تعلیمی اور سیاسی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

ملاّ نظام الدینؒ نے اس وقت مروج مذہبی تعلیم کی اعلیٰ کتب کو منتخب کیا اور درس نظامی میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ درسِ نظامی کے نصاب میں عقلی (استدلالی) اور نقلی (مروّج منقول نصابی) علوم کو یکجا کر دیا گیا ہے۔اس کے لیے انہوں نے یہ دلیل دی کہ مختلف عوامل مثلاً نوآبادیاتی نظام کے ظہور اور لادینیت کے عروج کی وجہ سے قرآن وسنت کی طرف رجوع بے حد ضروری ہے۔تاہم موجودہ درس نظامی میں خصوصی طور پر 'نقلی' (روایتی متنی) علوم پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے۔مثلاً 'تفسیر' (شرح، قرآن مجید)، حدیث، علوم القرآن، تجوید[۲]، عقیدہ، فقہ، عربی زبان وادب۔تاہم یہ دعویٰ پوری طرح درست نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت سی منطق، فلسفہ اور مدّرسانہ ذوق (Scholasticism) بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ذیل میں ہم مختلف موضوعات پر کتابوں کے نام جو معمولی سے ردوبدل کے ساتھ اس نظام کا حصہ بنائی گئی ہیں مختصراً بتا رہے ہیں۔اس میں مصنفین کے نام اور ان کی وفات کی تاریخیں بھی شامل کر دی ہیں:

۱۔فرنگی محل لکھنؤ میں وکٹوریہ روڈ اور چوک کے درمیان واقع ہے۔اس عظیم الشان یادگار عمارت کا پہلا مالک ایک فرانسیسی تاجر نیل (Neil) تھا۔جب مغل شہنشاہ نے فرانسیسی تاجروں کو ہندوستان سے نکالا تو اس محل کو ضبط کر لیا۔اسی لیے یہ محل، فرنگی محل کہلانے لگا۔اس دور کے ایک ممتاز عالم دین ملا قطب الدینؒ کو 1692ء میں زمین کے تنازعے میں قتل کر دیا گیا تو مغل بادشاہ اورنگزیب نے اظہار ہمدردی اور دلجوئی کے لیے اس کے چار بیٹوں کو لکھنو کا یہ ضبط شدہ محل اور اس سے ملحق اراضی دے دی۔اس نسبت سے یہ خاندان بھی فرنگی محلی مشہور ہو گیا۔

۲۔قرآن مجید کی تلاوت میں حروف کی صحیح ادائی کے اصول وقواعد کو تجوید کہا جاتا ہے۔

تفسیر قرآن مجید

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	تفسیر جلالین	حضرت جلال الدین محلیؒ	1459ء
		حضرت جلال الدین سیوطیؒ	1505ء
2	الفوز الکبیر	حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ	1762ء
3	مدارک التنزیل	حضرت عبداللہ بن حمد نسفیؒ	1310ء
4	انوار التنزیل	حضرت ناصر الدین بیضاویؒ	1266ء

ہر تفسیر اپنے زمانے کے حساب سے تعبیر ہوتی ہے۔ اب تفسیر جلالین کو چھ سو سال گزر گئے ہیں۔ ہمیں عہد حاضر کی کتب بھی پڑھانی چاہیں۔

حدیث شریف

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	مشکوٰۃ المصابیح	حضرت امام ولی الدین محمد بن عبداللہؒ	1341ء
2	شرح نخبۃ الفکر	حضرت الحافظ ابن حجر عسقلانیؒ	1448ء
3	مقدمہ شیخ عبدالحق	حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ	1462ء
4	صحیح بخاری	حضرت امام اسماعیل بخاریؒ	869ء
5	صحیح مسلم	حضرت امام مسلم قشیریؒ	874ء
6	جامع ترمذی	حضرت امام محمد عیسیٰ ترمذیؒ	892ء
7	سنن ابی داؤد	حضرت امام سلیمان سجستانیؒ	886ء
8	سنن نسائی	حضرت امام احمد نسائیؒ	915ء
9	سنن ابن ماجہ	حضرت امام محمد قزوینیؒ	886ء
10	شرح معانی الآثار	حضرت امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاویؒ	933ء
11	شمائل ترمذی	حضرت مولانا محمد زکریاؒ	1981ء
12	موطا امام مالک	حضرت امام مالکؒ	795ء

13	موطا امام محمد	حضرت امام محمد بن حسن الشیبانیؒ	804ء
14	سنن الصغریٰ	حضرت امام شعیب لسنائیؒ	915ء

عہد حاضر میں حدیث شریف پر بہت علمی کام ہوا ہے۔ مغربی علما نے بہت علمی تنقید کی ہے۔ مسلمان علماء نے بھی کچھ تحقیق کی ہے۔ ہمیں یہ سب کچھ بھی پڑھانا چاہیے۔

فلسفہ/منطق (Logic/Philosophy)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	مِرقاۃ	حضرت مولانا فضل امام خیر آبادیؒ	1829ء
2	شرح تہذیب	حضرت علامہ عبداللہ یزدیؒ	1606ء
3	قطبی	حضرت قطب الدین رازیؒ	1364-5ء
4	کبریٰ	حضرت میر سید شریف جرجانیؒ	1413ء
5	ہدایۃ الحکمت	حضرت اثیر الدینؒ	1261ء
6	ھدیۃ السیدیۃ	حضرت فضل حق خیر آبادیؒ	1861ء
7	حمد اللہ (شرح سلام العلوم:II)	حضرت حمد اللہ سندیلویؒ	19 ویں صدی
8	الشماسیہ	حضرت نجم الدین قزوینیؒ	1099ء
9	القتبیہ	حضرت قطب الدین ریازیؒ	1364ء
10	التہذیب	حضرت تفتازانیؒ	1487ء
11	سلم العلوم لملاّ حسن	حضرت ملا حسن غلام مصطفیٰؒ	1794ء
12	شرح شمس البازعہ	حضرت محمد فاروقیؒ	1409ء
13	تیسیر المنطق	حضرت عبداللہ گنگوہیؒ	1921ء

فلکیات (Astronomy)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	الملخص فی الحیایہ	محمود خوارزمی	تیرہویں صدی عیسوی
2	شرح قاضی	موسیٰ محمود روحی	1436ء
3	تصریح الافلاک	بہاء الدین آمولی	1620ء
4	شرح التصریح	لطف اللہ مہندی	1732ء

فقہ

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ وفات
1	مختصر القدوری	حضرت امام ابوالحسن احمد بن محمدؒ	907ء
2	شرح وقایہ	حضرت عبیداللہ ابن مسود محبوبی حنفیؒ	1346ء
3	اصول الشاشی	حضرت علامہ نظام الدین شاشیؒ	936ء
4	ہدایہ	حضرت برہان الدین مرغینانیؒ	1196ء
5	نورالانوار	حضرت شیخ احمد المعروف ملاجیونؒ	1718ء
6	نورالایضاح	حضرت شیخ حسن بن علیؒ	1688ء
7	شرح بر مسلم الثبوت	حضرت ملاحسن فرنگی محلیؒ	18ویں صدی
8	مسلم الثبوت	حضرت محب اللہ بہاریؒ	1707-8ء
9	البدایہ شرح الہدایہ	حضرت علی مرغینانیؒ	1196ء
10	کنزالدقائق	حضرت احمد نسفیؒ	710ء
11	سراجی	حضرت شیخ سراج الدین محمد	1311ء

آخری کتاب بھی ساڑھے تین سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ اس طرح آپ عہد حاضر کے مسائل سے کیسے عہدہ برآء ہو سکتے ہیں؟ نہ صرف سماجی فکر میں تبدیلی آئی ہے بلکہ بالکل نئے علوم آ گئے ہیں۔ مگر ہم وہیں کے وہیں ہیں۔ نئے عملی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کے بارے

میں ہم اپنے بچوں کو بالکل ہی نہیں پڑھا رہے۔

ادب(Literature)

نمبرشمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	نفحۃ العرب	محمد اعزاز علی	1954ء
2	مقاماتِ حریری	ابو محمد القاسم حریری	1122ء
3	دیوان متنبی	ابوالطیب احمد ابن حسین متنبیؔ کندی	965ء
4	دیوانِ حماسہ	حبیب بن اوس طائی	845ء
5	مقامات البدیع	بدیع الزمان حمدانی	1007ء
6	نفحۃ الیمان	احمد شیروانی	1320ء
7	المعلقات السبع	حماد الروایۃ	771ء
8	مختصر المعانی	مسعود بن عمر تفتازانی	1390ء

نثر و نظم ترقی کرتی رہتی ہے جبکہ ہم نو سو سال پہلے کا ادب پڑھا رہے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان قدیم کتب کے کچھ حصے پڑھالیں اور جدید عربی ادب لازمی طور پر نصاب میں شامل کریں۔ زبان زندہ ہوتی ہے۔ بدلتی رہتی ہے مگر ہم ماضی میں قید ہیں۔

ریاضی(Mathematics)

نمبرشمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	خلاصہ فی الحساب	بہاءالدین آمولی	1620ء
2	تحریر اقلیدسی	نصیر الدین طوسی	1273ء

۲۔ قرآن مجید کی اہمیت

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو علم و دانش کا عظیم ترین خزانہ ہے لیکن مدارس میں یہ مناسب طریقے سے نہیں پڑھایا جاتا۔ تھوڑا سا ترجمہ، مختصر سی تفسیر (جلالین) کے ہمراہ پڑھایا جاتا

ہے۔علاوہ ازیں مدارس میں 'تفسیر بیضاوی' کا ایک حصہ پڑھایا جاتا ہے۔تاہم سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید اس سے زیادہ پڑھائے جانے کا تقاضا نہیں کرتا؟ خاص طور پر اس طویل نصاب کے ہمراہ؟

تفسیر جلالین بلا شبہ ایک مختصر مگر شاندار تفسیر ہے لیکن یہ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی تھی۔ ہر کتاب اپنے زمانے کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی سوچ کے اثرات کی حامل ہوتی ہے۔تاریخی متون کے علاوہ ہمیں طلباء کے لیے چند عصر حاضر کی تفاسیر بھی تجویز کرنی چاہئیں۔

آج کے مدارس میں قرآن مجید کی بہ نسبت حدیث شریف اور فقہ (اسلامی قانون) پر بہت زیادہ وقت اور توجہ صرف کی جاتی ہے۔نصاب میں حدیث کی کم از کم سات کتابیں شامل ہیں اور فقہ بھی چار سال تک پڑھائی جاتی ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید اور حدیث پڑھاتے ہوئے سارا وقت ایک فقہی مسلک کی دوسرے فقہی مسلک سے برتری ثابت کرنے پر صرف کر دیا جاتا ہے۔قرآن مجید اور حدیث شریف کی لازوال تعلیمات کے حسن پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ہمیں پہلے قرآن مجید اور پھر حدیث شریف پڑھانی چاہیے۔فقہ آخر میں پڑھانی چاہیے تاکہ ہم حدیث پاک کو قرآن مجید کی روشنی میں سیکھ سکیں اور فقہ کو قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں کی روشنی میں سیکھ سکیں۔لیکن ہم نے اس ترتیب کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم فقہ پہلے پڑھاتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص مکتب فکر کے نقطۂ نظر کی روشنی میں۔ پھر حدیث کو اس فقہ کی روشنی میں پڑھایا جاتا ہے جس میں اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ اس خاص مکتبۂ فکر کی فقہ کی توثیق کی جاتی ہے۔ حدیث میں ہم صحیح اور مستند احادیث کے ساتھ ساتھ موضوع احادیث بھی پڑھائے چلے جاتے ہیں۔آخر میں جا کر ہم قرآن مجید کو حدیث شریف کی روشنی میں پڑھانے لگتے ہیں۔اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا، لا الہ الا اللہ
(بال جبریل: غزلیں)

۳۔ نیا طریق تدریس

پڑھانے کے تمام طریقے اپنے اندر نمایاں خصوصیات رکھتے ہیں۔ مدارس میں پڑھانے کا طریق کار پرانا ہو چکا ہے۔ دنیا بھر میں اعلیٰ درجے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریس 'لیکچر پر مبنی' ہوتی ہے مگر مدارس میں تدریس متن (Text) پر مبنی ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر استاد نصابی کتاب میں سے ایک سطر یا چند سطریں بلند الفاظ میں پڑھنے کے بعد ان کی وضاحت کرتا ہے۔ اس طرح پوری کتاب کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔ جدید تعلیمی اداروں میں سے کوئی ایک بھی علم سکھانے کے لیے یہ طریقہ استعمال نہیں کرتا۔ یہ 'چمچی سے کھلانے' کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہمارے مدارس میں حافظے پر زور دیا جاتا ہے۔ طالب علم کے ذہن کو مصروف کرنے اور اس کے اندر قوتِ استدلال پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلباء میں تخلیقی کام کے لیے ذہن کو استعمال کرنے کا رجحان پیدا نہیں ہوتا۔ جدید سکولوں میں دورانِ تدریس نفسِ مضمون سے متعلق سوال کرنے کی بہت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے لیکن مدارس میں سوال کرنے کی نہ صرف حوصلہ شکنی کی جاتی ہے بلکہ اسے بدتمیزی اور گستاخی سمجھا جاتا ہے۔ ایسا تدریسی ماحول جدّت واختراعِ تخلیق کا دم گھونٹ کر رکھ دیتا ہے۔

ہم نے کچھ روایات کی غلط تعبیر اور ان کا بے جا اطلاق کر کے سوال پوچھنے کو بُرا اور گستاخانہ رویہ قرار دے دیا ہے جب کہ پورا قرآن مجید اس امر کا گواہ ہے کہ اسرارِ کائنات کے بارے میں جاننے اور اپنی لاعلمیوں کے دائرے سے باہر نکلنے کے لیے سوالات پوچھنے کی تربیت دی گئی ہے۔

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (سورۃ الانبیاء، آیت: ۷)
(اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ.
(سورۃ الغاشیہ، آیات: ۱۷-۲۰)

(تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے ہیں؟ آسمانوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے اٹھایا گیا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے ہیں؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے)

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ.

(سورۃ الجاثیہ، آیات: ۳-۵)

(حقیقت یہ ہے کہ ایمان لانے والوں کے لیے آسمانوں اور زمین میں بیشمار نشانیاں ہیں۔ تمہاری پیدائش میں اور ان حیوانات میں بھی بڑی نشانیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ زمین میں پھیلا رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنے والے ہیں۔ رات اور دن کے اختلاف میں اور اس رزق میں جسے اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل کرتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں)

سوالات پوچھنا ہرگز بے احترامی یا گستاخی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستحسن امر ہے۔ علم کے اعلیٰ مدارج تک رسائی، اختراعات و ایجادات اور انکشافات، یہ سب سوال کرنے کے مزاج اور مروجہ معلومات کو چیلنج کرنے کی عادت کا نتیجہ ہیں۔

۴۔ جدید زبانوں کی تدریس

مدارس میں عربی اور فارسی کے علاوہ کسی زبان کی تدریس نہیں ہوتی۔ عربی واقعتاً بڑی سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے لیکن اس کو پڑھانے کا جو طریق کار اختیار کیا جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ ان مدارس کا ایک فارغ التحصیل عصر حاضر کی عربی کے چند جملے بھی روانی سے نہیں بول سکتا جبکہ انگلش پبلک سکولوں کے تیسرے گریڈ کے طلباء انگلش روانی سے بول لیتے ہیں۔ مدارس کے عربی زبان کے نصاب میں زیادہ زور عربی قواعد (گرامر) حفظ کرنے پر دیا جاتا ہے۔

مزید برآں مدارس میں کوئی بھی جدید زبان نہیں پڑھائی جاتی۔ حتیٰ کہ اب فارسی بھی نہیں پڑھائی جاتی ماسوائے بنیادی سطح کی فارسی کے۔ انگلش، جرمن اور فرینچ پڑھانے کو 'گناہ' سمجھا جاتا ہے۔ میرے بچپن کے اساتذہ بھی انگلش سیکھنے کو کفر کہا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ زبان

اپنے ساتھ مغرب کی انحطاط پذیر ثقافت بھی لاتی ہے۔اس لیے اس سے بچنا ہی چاہیے۔

۵۔ عہد حاضر کا انداز تحریر

ہماری تمام روایتی اسلامی کتب بہت مشکل زبان میں لکھی ہوئی ہیں۔حقیقت یہ ہے مشکل زبان میں لکھنے کو عالمانہ شان کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔نتیجتاً ہماری نوجوان نسل قدیم ادب سے مشکل زبان کی وجہ سے کٹ (لاتعلق ہو) چکی ہے۔ہم آج افلاطون، ارسطو اور شیکسپیئر کو محض اس لیے پڑھ سکتے ہیں کہ ان کے دور کی زبان کو جدید طرز میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ہمارے علماء اب بھی دقیق اور غیر معمولی اسلوب میں لکھتے لکھاتے ہیں اور اسے ادبی کمال اور علم کا اظہار سمجھتے ہیں۔مثال کے طور پر دیکھیے قرآن مجید کی ایک آیت کی ایک نامور ہندوستانی عالم دین نے کس طرح تشریح کی ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ. (سورۃ الرحمٰن، آیت:۲۹)
(وہ ہر آن نئی شان میں ہے)

یعنی ہر وقت اس کارگاہ عالم میں اس کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے اور وہ بے حد وحساب چیزیں نئی سے نئی وضع اور شکل اور اوصاف کے ساتھ پیدا کر رہا ہے۔اس کی دنیا کبھی ایک حال میں نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور خالق ہر بار اسے ایک نئی صورت سے ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

لیکن ایک عالم دین نے اس کا ترجمہ یوں کیا: 'صدورِ افعال لزوم بالذات'۔

(اجرائے احکام اس کی ذات کا ایک جزو لازم ہے)

ہم اس آیت کے معنی سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ ترجمہ/تفسیر سمجھنا ناممکن ہے۔اس لیے یہ لازم ہے کہ اسلام پر لکھی گئی قدیم کتابوں کو آسان زبان میں منتقل کیا جائے۔عربی اور فارسی میں لکھی گئی کتابوں کا بھی مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا جانا چاہیے تا کہ عام قاری کو بھی ان تک رسائی حاصل ہو اور وہ ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

۶۔ تحقیق کی روش

دینی مدارس میں تحقیق کا کوئی تصور یا رواج نہیں۔ ان کے ہاں صدیوں سے بس یہی کام چلا آ رہا ہے کہ کسی قدیم قلمی نسخے یا تحریر کی شرح لکھ دی۔ کسی علمی موضوع پر جدید سائنس کی روشنی میں کوئی تخلیقی کام نہیں کیا گیا۔

ایک دفعہ میں نے اسلامی معاشیات پر خود آگہی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر کئی کتابیں اکٹھی کیں مگر ان میں ایسی کتابیں بہت ہی کم تھیں جنہیں بطور نصابی کتاب تجویز کیا جا سکتا یا انہیں پوسٹ گریجویٹ سطح پر پڑھایا جا سکتا۔

یہی صورت حال اسلامی قانون کے بارے میں ہے۔ گزشتہ پانچ سو برسوں کے دوران صرف چند ایک ہی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں جبکہ مغرب میں ہر سال قانون کے ہر شعبے سے متعلق کئی نئی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

ہم یہ بات کہہ کر خود کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ فلاں فلاں کتاب بہت پرانی ہے مگر اہل مغرب فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ کتاب اس سال چھپی ہے یا یہ اس کا تازہ ترین ایڈیشن ہے۔ یہ معاملہ خصوصاً قانون اور سائنسز کی کتابوں کے سلسلے میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔

مغربی سکالرز قرآن مجید، حدیث شریف اور اسلامی قانون پر مسلسل ناقدانہ تبصرے مع تازہ حوالہ جات شائع کر رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اسلامی لٹریچر پر تازہ ترین رائے مسلمانوں، بالخصوص روایتی مذہبی اہل علم تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔ اگر یہ آراء مسلمانوں تک پہنچ ہی جائیں تو عموماً ایک رُبع صدی (چالیس سال) کے بعد یہ نوبت آتی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ کسی نے ان میں سے کسی کتاب کا ترجمہ کر دیا ہو۔ اس سیاق و سباق میں بھی مسلمان ان آرا پر تعلیمی یا علم و دانش کی بنیاد پر جواب نہیں دیتے۔ صرف یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ اسلام کے منافی ہے۔ بعض اوقات مسلمان اہل مغرب کو لعن طعن کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کتاب کے اثرات جلدی ختم ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کو مغرب کے تیار کردہ اس منفی لٹریچر سے ہماری نوجوان نسل کو پہنچنے والے بے پناہ

نقصان کا ذرہ بھر بھی اندازہ نہیں۔ ہمیں نوجوانوں اور تعلیم یافتہ افراد کی طرف سے روزانہ سنگین سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو وہ اسلام کے مختلف پہلوؤں اور ان تعبیرات کے حوالے سے پوچھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو اسلام کے ساتھ بہت گہری محبت ہے مگر وہ اس نام نہاد مذہبی طبقے اور ان کی غیر معقول اور سطحی تعبیراتِ اسلام سے بیزار ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلم نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ اس معاملے میں حق بجانب ہے۔ مسلمان اہل دانش نہ تو ان کی سوچ سے آگاہ ہیں اور نہ ہی ان کی تعلیم اور ان کی زبان سے واقف ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہمیں ان نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقے سے کوئی ہمدردی بھی نہیں۔ اگر ہمارے علماء کو تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں ذرہ بھر بھی تشویش ہوتی تو وہ انہیں مذہب کی راہ پر لانے کی کوشش ضرور شروع کر چکے ہوتے یا انہیں مکمل طور پر دائرۂ اسلام کے اندر ہی رکھنے کا کوئی سنجیدہ لائحہ عمل مرتب کر لیتے۔ علماء ان کو ان کی وضع قطع اور لباس میں دیکھتے ہی گمراہ اور منحرف از اسلام قرار دینے لگتے ہیں جبکہ ان میں خاصی تعداد ایسی ہے جو قلبی طور پر مذہب سے محبت رکھتی ہے اور نماز بھی پڑھتی ہے۔ علماء کے لیے لازم ہے کہ وہ خود کو اس نسل کی اصلاح کے لیے تیار کریں کیونکہ اب تک ہم یہ کام کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔

ایک روز ایک لڑکی میرے پاس انٹرویو کے لیے آئی اور وہ مختصر لباس پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس لباس کی وجہ سے اسے ایک آوارہ لڑکی سمجھا جس کا مذہب سے کوئی تعلق واسطہ نہیں لگتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج کل کیا پڑھ رہی ہو تو وہ بولی کہ وہ حضرت جلال الدین رومیؒ پڑھ رہی ہوں۔ اس جواب پر میں ٹھٹکا اور مزید سوال پر اس نے بتایا کہ وہ امریکہ میں رہتی تھی اور اس نے مولانا رومیؒ کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا جس سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ کیونکہ مولانا رومیؒ خدا سے محبت کرتا ہے اور وہ بھی خدا سے محبت کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ مجھے زبردست جھٹکا لگا کہ میں نے اسے غیر مذہبی اور بے حیا لڑکی سمجھنے کا گناہ کیا تھا۔ میں نے یہ تاثر اس کے ظاہری لباس سے لیا تھا جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی متلاشی تھی اور اس سے تعلق رکھتی تھی۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ ایک ذہین لڑکی میرے ساتھ کام کرتی تھی۔ وہ مسلمان تھی مگر پلی بڑھی مغربی ملکوں میں تھی۔ اس کا عام رویہ بھی مغربی ثقافت سے متاثر تھا لیکن وہ اکثر مجھ سے اسلام

کے بارے میں سوالات پوچھتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسلام کی صحیح سپرٹ کی تلاش میں تھی۔ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اسے پر ابوبکر سراج الدین المعروف مارٹن لنگ[1] کی لکھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارک پر ایک کتاب دی۔ کتاب پڑھنے کے بعد جب وہ آئی تو اس موضوع پر اس کی اور میری طویل گفتگو ہوئی۔ اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنے ایمان کی تجدید کی۔ میں اسے سیرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انگریزی زبان میں کسی روایتی عالم کی لکھی ہوئی اچھی سی کتاب دینا چاہتا تھا مگر نہ مل سکی۔ چنانچہ مجھے مجبوراً ایک اور مغربی نومسلم کی لکھی ہوئی کتاب دینا پڑی۔

اس نئی نسل میں ایمان کا بیج موجود ہے لیکن اس کے ماحول اور تعلیم نے اسے اسلام سے دور رکھا ہے۔ موجودہ دور کے اسلامی لٹریچر میں ان کے لیے کوئی اپیل موجود نہیں ہے۔ ان کے مسائل، ان کے سوالات، ان کی سوچیں مختلف ہیں۔ یہ روایتی اور قدامت پسند علماء کے طرز عمل سے بالکل بیزار ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس وحشت زدہ اور بوکھلائی ہوئی نسل کی رہنمائی کون کرے گا اور کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟

میں سید ابوالحسن ندویؒ کی اس رائے سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں کہ آج کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کا ذہنی انحطاط ہے۔ مثال کے طور پر شیخ ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے درمیانی عرصے میں کوئی غیر معمولی ذہانت کی حامل شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اسلامی فکر کی ذہنی اور علمی سطح پر آبیاری کر سکتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب میں متعدد بلند مرتبہ سائنسدان، سکالرز، فلاسفرز اور ماہرین معیشت پیدا ہوئے اور اپنی قوم کو ہر شعبے میں ارتقاء کی منزلوں سے ہمکنار کیا۔ ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد ان کی سطح کا کوئی نابغہ پیدا نہیں ہو سکا۔

آج مسلمان ذہنی افلاس کا شکار ہیں۔ ان میں افکار اور واقعات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ ہم حقائق کا تجزیہ کرنے کی بجائے دوسروں کو اپنی غلطیوں اور حماقتوں کا قصوروار

---

[1] Martin Lings: ابوبکر سراج الدین المعروف مارٹن لنگ (1909ء-2005ء) ایک انگلش مسلمان محقق، مصنف اور سکالر تھا۔

ٹھہرا رہے ہیں۔ہم بے حد جذباتی احتجاج کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اپنی ناکامیوں کے لیے دوسروں کو ذمہ دار قرار دینے لگے ہیں۔لیکن ہمارا اصل مسئلہ ہمارا ذہنی بحران اور ذہانت کا فقدان ہے۔ہم کام نہیں کرتے،محنت سے جی چراتے ہیں اور ذہنوں کو ترقی دینے میں کوتاہی کرتے ہیں۔

آیئے ایک مثال لیتے ہیں۔ بھارت میں دارالعلوم دیوبند[۱] دنیائے اسلام کا نہایت مشہور و معروف مدرسہ ہے۔لیکن اس کے پاس ایک بھی تحقیقی پروگرام نہیں ہے۔ ہارورڈ سکول آف ڈیوینیٹی (Harvard School of Divinity) جو ہارورڈ (امریکہ) کے بارہ سکولوں میں سے ایک ہے۔اس میں تحقیق کی مندرجہ ذیل سہولتیں موجود ہیں:

(ا)۔ ہارورڈ کے ریسرچ اینڈ رایٹنگ فیکلٹی ممبران کی تحقیق کے خصوصی شعبوں میں بین الکلیاتی تحقیق، ہمکارانہ تحقیق اور رفقائے کار کے ساتھ مکالمہ شامل ہے۔حالیہ منصوبوں میں درج ذیل امور شامل ہیں:

(i)۔ عقیدۂ بشارت الانجیل (Nigerian evangelicalism) کی تفتیش اور اس عقیدہ کے علمبرداروں نے اسرائیل، یورپ اور امریکہ کے بعض حصوں میں جو علاقائی، عالمی اور سیاسی کردار ادا کیا ہے اس کا مطالعہ؛

(ii)۔ اسلامی دنیا کے مختلف اداروں کے تصورات اور ان کے طبی، مذہبی اور ثقافتی نظریاتِ اصناف اور تذکیرو تانیث کے بارے میں ایک تحقیقی منصوبہ۔

(iii)۔ 'ہمزاد' (divine double) سے متعلق نئی تحریریں جن میں زمانۂ قدیم سے مشہور روایت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ان کے مطابق ہر شخص کا ایک 'ہمزاد ہوتا ہے جو اس کے لیے عصر

[۱]۔دارالعلوم دیوبند ہندوستان کے شمالی صوبہ اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں واقع ہے۔اسے 1866ء میں مولانا قاسم نانوتویؒ نے برطانوی سامراجیت کے دور استبداد میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریک کو جاری رکھنے، مسلمانانِ ہند کے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھنے،مسلک حنفیہ کی مسند تدریس کو منور رکھنے، دشمنان اسلام، مشرکین ہندوستان اور عیسائی مبلغین کے اسلام پر اعتراضات کا جواب دینے کے لیے قائم فرمایا تھا۔اسلامی تعلیمات کی تدریس کے لیے الازہر یونیورسٹی، مصر کے بعد اس درس گاہ کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی۔

حاضر کے فلسفیانہ خیالات میں مشیر ہوتا ہے اور دینیاتی یادداشتوں کو واپس لانے کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔

(iv)۔ رواں مذہبی ادبی منصوبہ، جو مذہب اور تعلیم کے ماخذات کے بارے میں تحقیق میں مدد دیتا ہے۔ بالخصوص ایک عالمگیر دنیا میں مذہب، شہریت اور اخلاقی تعلیم کے مابین تعلق کی تحقیق۔

(v)۔ قبطی انجیل پیپرس، یسوع کی بیوی کی انجیل کے بارے میں تازہ ترین تحقیق۔

(۲)۔ ہارورڈز کے مراکز اور پروگرام حسب ذیل ہیں:

(i)۔ مرکز برائے تحقیق عالمی مذاہب: جس نے مذاہب کے تاریخی اور عصر حاضر کے باہمی تعلقات پر غور و خوض کو فروغ دیا اور مذہبی گروہوں اور آج مذہب کا مطالعہ کرنے والوں کو درپیش دینیاتی فلسفیانہ، تقابلی، سیاسی اور اخلاقی چیلنجوں سے آگاہ کیا۔

(ii)۔ خواتین سے متعلقہ مذہبی مطالعہ وتحقیق کا پروگرام تاکہ پتہ چل سکے کہ مذہبی روایات نے خواتین اور مردوں کے کردار کے تعین میں بنیادی طور پر کیا کردار ادا کیا ہے۔

(iii)۔ منصوبۂ تکثیریت: (pluralism project) یہ امریکہ کے تبدل پذیر مذہبی منظر کی موجدانہ تحقیق ہے تاکہ ہمارے کثیر المذاہب معاشرے کے خدوخال کو ضابطۂ تحریر میں لایا جا سکے۔ بین المذاہب مکالمے کی نئی شکلیں تیار کی جا سکیں۔ شہری زندگی پر مذہبی تنوع کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو عالمی ڈھانچے کے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جا سکے۔

(iv)۔ مذہبی خواندگی کا منصوبہ: یہ ویب سائیٹ تک کھلی رسائی کے ذریعے مذاہب کے عمومی مطالعے کے لیے مواد اکٹھا کرنے، تخلیق کرنے اور خصوصی روایات مرتب کرنے کا منصوبہ ہے جو بنیادی طور پر پبلک سکول ٹیچرز اوران کے شاگردوں کے استفادے کے لیے ہے۔

(v)۔ سائنس، مذہب اور ثقافت پر مذاکرے، سیمینارز اور ورکشاپس کا انعقاد جن کے ذریعے بین الکلیاتی مباحث ہوتے ہیں اور ہارورڈ یونیورسٹی کے اندر اور باہر کے سکالرز اور طلبا میں روابط کو فروغ ملتا ہے۔

(vi)۔ مذاہب اور عمل امن اس کے متقاضی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پیغام میں نظم وضبط کی تلقین کریں۔ اہل علم کے ساتھ رابطے بڑھائیں اور اس امر کی جستجو کریں کہ دنیا بھر کے افراد اور معاشرے مذہبی اور روحانی وسائل کے ذریعے کس طرح باہمی مفاہمت اور خوشگوار تعلقات، باہمی تعاون، بہبود عامہ کے کام کیے اور اپنے پیغام امن کے ذریعے کس طرح مذہبی، فرقہ وارانہ، قوم پرستانہ، نسلی اور ثقافتی اختلافات پر قابو پایا اور کس طرح ایسی مساعی عصر حاضر میں قیام امن کے لیے نظریہ سازی اور عملی اقدامات کو فروغ دے سکتی ہیں۔

(۳)۔ ہارورڈ کے پاس درج ذیل باقاعدہ تحقیقی مطبوعات ہیں:

(i)۔ ہارورڈ یونیورسٹی بلٹین: اس کا مقصد مذہب کے بارے میں غیر فرقہ وارانہ جائزہ پیش کرنا اور عہد حاضر کی حقیقتوں پر توجہ دینا ہے جس کی وجہ سے اکیڈمی کے اندر اور باہر، دونوں حلقوں میں اظہار پسندیدگی ہو رہا ہے۔ یہ پرچہ دنیا بھر کے 20,000 افراد کے پاس پہنچتا ہے۔

(ii)۔ ہارورڈ تھیالوجیکل ریویو (Harvard Theological Review)، یہ امریکہ میں قدیم ترین علمی اور دینیاتی جرائد میں سے ہے۔ یہ تمام روایات اور ادوار کے بارے میں تاریخ اور مذہبی فکر پیش کرتا ہے جن میں عبرانی بائیبل، عہد نامہ جدید، مسیحیت، یہودیت، تھیالوجی، اخلاقیات، آثار قدیمہ اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ شامل ہے۔

(iii)۔ 'جرنل آف فیمینسٹ سٹڈیز ان ریلیجن' (Journal of Feminist Studies in Religion) یہ ایک ششماہی رسالہ ہے۔ یہ مذہبی تعلیمات کے حوالہ سے قدیم ترین غیر مذہبی نسوانی تعلیمی رسالہ ہے۔ *(http: //hds.harvard.edu)*

نیدرلینڈ کے انٹر یونیورسٹی سکول آف اسلامک سٹڈیز میں ہر سال سینکڑوں تحقیقی مقالے شائع ہوتے ہیں۔ آیئے حالیہ برسوں کے شماروں میں شائع ہونے والے چند موضوعات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں:

(i)۔ مسلم اہل دانش اور معاشرہ، سترویں صدی عیسوی کے وسطی سوڈانی افریقہ میں۔

(ii)۔ یورپ میں اسلامی طلاقیں: یورپی اور اسلامی قانونی نظاموں کے درمیان خلیج کیسے کم کی جائے۔

(iii)۔ پاکستانی شادیاں اور جرمنی اور انگلینڈ کے پرائیویٹ انٹرنیشنل قوانین۔

(iv)۔ ایک صحرا میں مچلنے والا شور: ڈچ مسیحی مبلغ کا جاوا کے اسلام سے مناظرہ 1850ء-1910ء۔

(v)۔ اسلامی جلد سازی کی روایت۔

(vi)۔ نیدرلینڈز اور بیلجیئم میں اسلامی طریق تدفین: قانونی، مذہبی اور معاشرتی پہلو۔

(vii)۔ 'ہوسکتا ہے کہ میں اب بھی اس کی بیوی ہوں'۔ ڈچ مراکشی اور ڈچ مصری خاندانوں میں ماورائے قومی سرحدات طلاق۔

(viii)۔ لبنان میں سلفی مسلک: مقامی اور ماورائے سرحدات وسائل۔

(ix)۔ مراکش میں نسوانی مذہبی ایجنٹس: قدیم روایتیں اور نئے مناظر۔

(x)۔ شام میں عائلی قوانین: تعددِ قوانین، طور طریقے اور قانونی روایات۔

(xi)۔ آموزش استناد: سلفی مسلک کے پیروکار جرمن اور ڈچ مسلمانوں کی مذہبی رسوم، مجالس میں اور گپ شپ کے کمروں میں۔

(xii)۔ انڈونیشیا کے جزیرہ میڈورا میں اسلام اور سیاست: علما اور دیگر مقامی رہنما، اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے کوشاں۔

(xiii)۔ قدیم مسلم مصر میں آدابِ مسرت اور اظہارِ غم، پودے سے بنے کاغذ پر لکھے ہوئے خطوط، متن اور مندرجات۔

(xiv)۔ قانونی ادب کا طریق تدوین: سوڈان میں نمیری اور بشیر کے دورِ حکومت میں اسلامی فوجداری قانون سازی اور سپریم کورٹ کیس لاء۔

(xv)۔ بہتر مسلمان کیسے بنا جائے: آسیہہ (انڈونیشیا) میں اطاعت نافذ کرنے کا اختیار اور اصلاحِ اخلاق۔

(xvi)۔ مابین تاریخ افسانہ: حضرت محمد ﷺ کی سوانح حیات از قلم ابن شہاب الزہریؒ۔

(xvii)۔شمالی نائیجریا میں اسلامی فوجداری قانون: سیاست مذہب اور عدالتی طریق کار۔

(xviii)۔ایک تارک الدنیا جہادی سلفی: ابومحمد المقدسی کا نظریۂ حیات اور اس کے اثرات۔

(xix)۔ اسلامی اصلاح پسندی اور عیسائیت: محمد رشید رضا اور ان کے رفقاء کی تحریروں کا ایک تنقیدی جائزہ۔

(xx)۔ اسلام اور جسمانی معذوری: اسلامی تعلیمات اور فقہ کی روشنی میں۔

کیا ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات کا کوئی ایسا ادارہ ہے جو اس درجے کی تحقیق کے لیے کوششیں کر رہا ہو؟ اس کا جواب ہے 'بالکل نہیں'۔

۷۔ اختلافِ رائے کا احترام

اسلام تکثیریت عقیدہ (pluralism of creeds) اور اعمال کو کھلے دل سے قبول کرتا ہے۔ اس امر کا اعلان اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ مذہبی تکثیریت سراسر منشائے الٰہی کا نتیجہ ہے۔ وہ چاہتا تو بنی نوع انسان کو جبراً ایک ہی عقیدہ اختیار کروا سکتا تھا یا ایک طرز عمل پر مجبور کر سکتا تھا۔ جیسا کہ اس نے کائنات کو ایک لگے بندھے طریقے کی پابند کر رکھا ہے۔ تاہم اس نے ہم پر کوئی ایک طریقہ مسلط نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے ہمیں پسند کی آزادی عطا کر رکھی ہے۔ قرآن پاک (سورۃ النحل، آیت: ۹۳) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ.

(اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں: 'اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا طرف دار سمجھ کر بُرے بھلے طریقے سے اپنے مذہب کو (جسے وہ خدائی مذہب سمجھ رہا ہے) فروغ دینے اور دوسرے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے تو اس

کی یہ حرکت سراسر اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہے۔ اگر اللہ پاک کی منشا واقعی یہی ہوتی کہ انسان سے مذہبی اختیار چھین لیا جائے اور چارو ناچار سارے انسانوں کو ایک ہی مذہب کا پیروکار بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو اپنے نام نہاد 'طرف داروں' کی اور ان کے ذلیل ہتھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا۔ وہ سب کو مومن وفرماں بردار پیدا کر دیتا اور کفر ومعصیت کی طاقت چھین لیتا۔ پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان واطاعت کی راہ سے بال برابر بھی جنبش کر سکتا؟

(تفہیم القرآن ذیل آیت بالا)

اسی طرح قرآن پاک (سورۃ المائدہ، آیت: ۴۸) یہ بھی کہتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ.

(اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ تمہیں اس میں آزماتا ہے جو اس نے تمہیں دیا ہے۔ پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تم سب کا لوٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ.
(سورۃ ھود، آیت: ۱۱۸)

(اور اگر آپ کا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے)

وہ اختلاف رائے پیدا کرنے کے لیے اپنے منصوبے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انسانوں کو راہ کے انتخاب کا حق دیتا ہے۔ اس نے بنی نوع انسان کو ایک جبلی فطرت ودیعت کی ہے جس کے اندر غلط اور صحیح کے درمیان امتیاز کر سکنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید (سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۵۶) میں اعلان کیا گیا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ.

(دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ اس لیے جو شخص باطل معبودوں کا انکار کر کے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور

اللہ تعالیٰ خوب سننے اور جاننے والا ہے)

نبی علیہ السلام صرف حق بات واضح کرسکتا ہے لیکن لوگوں پر جبر کر کے ان سے اپنے نظریات منوا نہیں سکتا۔ چنانچہ قرآن پاک (سورۃ الغاشیہ، آیات: ۲۱-۲۲) میں ارشاد ہے:

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ۔

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نصیحت کرتے رہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے ذمہ دار نہیں ہیں)

ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کہتے ہیں: اگر معقول دلیل سے کوئی شخص بات نہیں مانتا تو نہ مانے۔ تمہارے سپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں سے زبردستی منواؤ۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح اور غلط کا فرق بتا دو اور غلط پر چلنے کے انجام سے خبردار کردو۔ سو یہ فرض تم انجام دیتے رہو۔ (تفہیم القرآن ذیل مذکورہ بالا)

یہ آیات کافی حد تک واضح کر رہی ہیں کہ اختلافات کی موجودگی خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ کی ایک سوچی سمجھی سکیم کی وجہ سے ہے جو خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ تمام انسان ایک ہی عقیدے اور سوچ کے حامل ہوں اس لیے اختلاف یا آرا کا الگ الگ ہونا خدائی دانش وحکمت سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ اس دینیاتی تناظر میں سے ایک قدرتی نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا نے خود اپنے بندوں کو مختلف آرا رکھنے کا حق دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کو ایک الوہی حقیقت کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیروکاروں میں اختلافِ رائے کو ہمیشہ گوارا کیا ہے اور اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کسی خاص مسئلے پر مختلف آراء رکھنے سے منع نہیں کیا۔ اس کی ایک مثال غزوہ خندق میں پیش آئی۔ جنگ خندق سے فارغ ہو کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ کو حکم دیا کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں جائیں اور وہاں جا کر عصر کی نماز پڑھیں۔ وہ لوگ روانہ ہوگئے۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آگیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم راستے میں نماز نہیں پڑھیں گے بلکہ منزل پر پہنچ

کر پڑھیں گے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھیں۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے۔ راستے میں نماز پڑھ لی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم دیا تھا اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ جلد از جلد منزل پر پہنچا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں گروہوں کی رائے کو منظور فرمایا۔
(صحیح بخاری، ج:۲، رقم الحدیث:۱۳۴۲)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان قرآن مجید کے احکامات اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کئی فرمودات کی تعبیر کے بارے میں کئی سنجیدہ اختلافات تھے:

(i)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مرتد عورتوں کے مسئلے پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اختلاف تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نظریئے سے اختلاف کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران ان سب عورتوں کو آزاد کر کے انہیں ان کے سر پرستوں کے حوالے کر دیا۔

(ii)۔ شام اور عراق کے مفتوحہ علاقوں کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تعامل سے اختلاف کرتے ہوئے یہ علاقے فاتح سپاہیوں میں تقسیم نہیں کیے بلکہ انہیں اوقاف قرار دے دیا (اجتماعی مفاد کے لیے ریاستی تحویل میں لے لیا)۔

(iii)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مابین کئی قانونی مسئلوں پر اختلافات تھے (اعلام الموقعین عن رب العالمین) لیکن اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے۔

(iv)۔ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا جنگ جمل میں ان کے مقابل مشرکین تھے تو انہوں نے جواب دیا:

وہ مشرک نہیں تھے بلکہ شرک سے تو بھاگ کر مسلمان ہوئے تھے۔

پھر پوچھا گیا کیا وہ منافقین تھے؟

آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ منافقین تو اللہ تعالیٰ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

پھر پوچھا گیا کہ وہ کون تھے؟

آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: وہ ہمارے بھائی تھے جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کردی تھی۔
(سنن کبریٰ للبیہقی، ج:۹، رقم الحدیث: ۲۸۶۹ و دیگر)

(v)۔ امام حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے جانشینوں کے درمیان اختلاف تا قیامت ختم نہیں ہوسکتا، کیونکہ اسے دور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ ایک گروہ کو حق پر قائم اور دوسرے کو ناحق پر قائم قرار دے دیا جائے اور یہ ناممکن ہے۔

(وحدت امت، ص: ۲۵)

ابتدائی دور کے مسلم فقہا میں بھی اختلاف ہوتے رہتے تھے۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ حضرت امام شافعیؒ نمازِ فجر میں دعائے قنوت پڑھنے کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مؤکدہ سمجھتے تھے جب کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اس نظریئے کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام ابوحنیفہؒ کے روضے پر گئے اور انہوں نے فجر کی نماز پڑھتے ہوئے دعائے قنوت نہ پڑھی۔ جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے دربار میں ان سے کیسے اختلاف کرسکتا ہوں۔

(Fiqh Al-Imam, p. 24)

مسلمانوں کو آرا کے ان اختلافات کو ایک قدرتی امر سمجھنا چاہیے اور انہیں ایک حقیقت گردانا چاہیے۔ اہل اسلام کو ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کرکے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ایک سعی لا حاصل ہوگی۔ اس کی بجائے انہیں ان اختلافات کو ایک رحمت سمجھ کر پُرامن بقائے باہمی کا فن سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ حضرت اقبالؒ نے بالکل بجا کہا ہے: فہم فلسفہ کے میدان میں کسی چیز کو درجۂ کمال حاصل نہیں۔ ہمارے علم کی بنیاد میں

وسعت پیدا ہونے اور فکر کے لیے در کھلنے سے بہت سے دیگر خیالات، غالباً ان لیکچرز میں پیش کردہ خیالات سے کہیں زیادہ بہتر، ظہور پذیر ہو جائیں گے۔ تاہم یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم انسانی علم میں ہونے والے اضافے پر نظر رکھیں۔ اس سلسلے میں ہمیں حقِ تنقید کو آزادی سے استعمال کرنا ہوگا۔

(The Reconstruction of Religious Thought In Islam)

ان تعلیمات کے برعکس تقریباً ہر مدرسہ فرقے پر مبنی ہے۔ ان کا نصاب اور امتحانات فرقہ واریت پر استوار ہیں۔ مثال کے طور پر دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، شیعہ اور جماعت اسلامی، سب کے اپنے اپنے تعلیمی بورڈز ہیں۔ ان مدارس کے اساتذہ کی توانائیاں ایک دوسرے کے عقائد اور نظریات کا رد پڑھانے پر صرف ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کے عظیم شیخ الحدیث سید انور شاہ کشمیریؒ[۱] کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ایک بار وہ بہت مغموم بیٹھے تھے۔ ان سے ان کی پریشانی کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی ساری زندگی یہ ثابت کرتے کرتے ضائع کر دی ہے کہ فقہ حنفی باقی فقہ پر فوقیت رکھتی ہے۔

عمومی مدرسوں کا فارغ التحصیل ہر شخص اپنے آپ کو 'عالم' سمجھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ صرف وہی (نہ کہ کوئی دوسرا) اسلام کی نمائندگی کا حق ادا کر رہا ہے۔ یہ سرسید احمد خان، حضرت محمد اقبالؒ، ڈاکٹر فضل الرحمان[۲]، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور علامہ محمد اسد کو عالم دین (سکالر) نہیں سمجھتے۔ بلکہ انہوں نے سرسید احمد خان اور ڈاکٹر فضل الرحمان کو ملحد قرار دے دیا۔ جب کہ مؤخر الذکر کو اپنی جان بچانے کے لیے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ حضرت محمد اقبالؒ نے یورپی اہل ایمان میں مقبولیت حاصل کر لی تھی لیکن ہندوستان اور پاکستان کے علماء انہیں مذہبی سکالر تسلیم نہیں کرتے کیونکہ وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل نہیں تھے۔

---

[۱] ۔ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ (1875ء-1933ء) برصغیر پاک و ہند کے ایک نامور عالم دین، مفسر، محدث اور صوفی بزرگ تھے۔ اپنے کیرئیر کے دوران انہوں نے متعدد مشہور اداروں میں پڑھایا جن میں دارالعلوم دیوبند بھی شامل تھا۔

[۲] ۔ ڈاکٹر فضل الرحمان (1919ء-1988ء) پاکستان کے ایک نامور اسلامی سکالر، فلاسفر اور اسلامی تعلیمی اصلاح کار تھے۔

یہ کوئی راز نہیں کہ سر ولیم میور ا نے حضور نبی کریم ﷺ کی جو سوانح حیات لکھی اس میں اس نے حضور نبی کریم ﷺ کی شخصیت کو داغ دار کرنے کی ناپاک جسارت کی تھی۔ اس کے شائع ہونے کے بعد سر سید احمد خان اپنی ساری جائیداد فروخت کر کے انگلینڈ چلے گئے تاکہ آپ ﷺ کی سیرت پر ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں ولیم میور کے اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیا جائے۔ اس پر انہوں نے کئی سال کی محنت کے بعد 'خطبات احمدیہ' تیار کی۔ یہ اس موضوع پر ایک شاندار کتاب ہے۔ لیکن ہم نے ان پر فطرت پرست اور مرتد ہونے کا الزام لگا دیا۔ علماء نے اسلام اور امت مسلمہ کے لیے ان کی تمام خدمات کو مسترد اور نظر انداز کر دیا محض اس بنا پر کہ ان کے چند نظریات معروف علماء کے خیالات سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ان علماء نے سر سید احمد خان کی تحریک علی گڑھ کو بھی کوئی اہمیت نہ دی جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی بقاء کے لیے حیات آفریں کردار ادا کیا۔

میں نے علامہ محمد اسد کا وہ خط پڑھا ہے جس میں انہوں نے مغموم دل کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہیں کہ پاکستان میں ایک خاص گروہ نے ان کے خلاف تکفیر کی مہم چلا دی ہے۔ جس پر انہوں نے شکستہ دل ہو کر پاکستان چھوڑ دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مراکش میں آباد ہو گئے۔ میری رائے میں ان کی تفسیر قرآن مجید انگریزی میں اب تک لکھی گئی مختصر تفاسیر میں سے بہترین تفسیر ہے۔ ان کی تفسیر صحیح بخاری اور دیگر کتابیں بھی اسلامی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ بعض روایتی علماء نے ان پر ارتکابِ کفر کا الزام لگا دیا کیونکہ وہ واقعہ معراج، جنوں اور دیگر نمایاں عقائد اسلام کے بارے میں بعض مروجہ نظریات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔

ہم صاحبان ایمان لوگ رفتہ رفتہ برداشت اور رواداری ترک کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ ہم معمولی سا اختلاف رائے بھی برداشت کرنے سے معذور ہو گئے ہیں۔ متعدد اہل علم کو اختلاف رائے پر یا اس بنا پر قتل کر دیا گیا کہ کسی مخصوص فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے علماء کو مسلم ممالک کو چھوڑ کر مغربی ممالک میں پناہ لینی پڑی۔ فتح اللہ گولن نے امریکہ میں پناہ لے لی ہے۔ یہ بالکل غیر علمی اور غیر معقول رویہ ہے جس نے ہم میں علم سے مخاصمت پیدا کر دی ہے۔

ا۔ Sir William Muir: سر ولیم میور (1819ء-1905ء) ایک سکاٹش مستشرق تھا۔

۸۔ تخصیص علوم

اب ماہرین خصوصی کا معاملہ لے لیجئے۔ مدارس کا ایک طالب علم آٹھ سے دس سال درسِ نظامی پڑھنے کے بعد ایک سند (ڈگری) لیتا ہے۔ مزید ایک یا دو سال صرف کر کے مفتی بن جاتا ہے۔ اس سے وہ اسلامی قانون سے متعلقہ کسی مسئلے پر رائے دینے کے قابل سمجھ لیا جاتا ہے۔ پھر وہ عائلی امور، مذہبی معاملات، شخصی قوانین، اقتصادی اور بینکنگ کے معاملات، تجارت اور بزنس سے متعلق فتوے جاری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مدرسے کے ایک فارغ التحصیل کے بارے میں یہ رائے قائم کر لی جاتی ہے کہ وہ قرآن مجید، حدیث شریف، منطق، اسلامی قانون، عربی ادب، فلکیات اور دیگر متعلقہ موضوعات کے بارے میں مہارت حاصل کر چکا ہے۔ لہٰذا وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں حتمی فیصلہ صادر کرنے کا اہل ہے جو پوری امت مسلمہ پر قابلِ اطلاق ہوگا۔

جدید طریق تعلیم اس طریق تعلیم سے کلیتاً مختلف ہے۔ قانون کی مثال لے لیجئے۔ ایک طالب علم چودہ سال کی پڑھائی کے بعد مزید تین سال لگا کر قانون میں بیچلرز ڈگری یعنی ایل ایل بی کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ مزید پڑھنا چاہتا ہے تو مزید تین سے پانچ برس میں اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرتا ہے۔ اس کا ڈاکٹر کی سطح کا تفصیلی مقالہ (Doctoral dissertation) قانون کے ایک شعبے کے کسی ایک خصوصی موضوع پر ہوتا ہے جو کہ قانون کا صرف ایک پہلو ہوتا ہے۔ پھر وہ نوجوان کسی یونیورسٹی میں بطور لیکچرز تعینات ہو جاتا ہے۔ اس حیثیت سے پوسٹ گریجویشن کی سطح کی تدریس کے تقریباً 25 / 30 سال بعد پروفیسر بنتا ہے۔ اگر آپ اس سے اس کے مخصوص دائرے سے باہر تعلق رکھنے والا کوئی سوال پوچھیں گے تو وہ صرف یہ کہے گا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کسی متعلقہ شخص سے سوال کریں۔

یہ پروفیسر اس سوال کا جواب نہ دے سکنے اور کسی اور کا نام تجویز کرنے پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرے گا۔ دوسری طرف ایک مدرسے میں دس سال پڑھنے والا نوجوان بغیر کسی جھجک کے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں پورے اعتماد سے اپنا حتمی فیصلہ سنا دے گا اور حرام وحلال پر بھی فوراً رائے دے دے گا۔ یہ رویہ اور طریق عمل آج کے دور میں کام نہیں دیتا۔

ہماری سوچ بڑی عجیب ہے۔ اگر کوئی ہم سے نئی قانونی تحقیق کے بارے میں سوال کرتا ہے تو ہم فوراً جواب دیتے ہیں کہ تمام سوالوں کا جواب اور تمام مسائل کا حل ہمارے گزرے ہوئے فقہاءؒ نے پیش کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت امام مالکؒ، حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام شافعیؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور حضرت امام جعفر صادقؒ[1] بلند پایہ فقیہ تھے۔ جنہوں نے اسلامی فقہ کے اصول وضع کر دیئے تھے اور اسلامی فقہ میں ان کی خوب وضاحت کر دی گئی ہے۔ تاہم ان کے اصولوں کو اطلاق کی ضرورت ہے یا عہد حاضر میں ان کی نئے سرے سے تعبیر کی جانی چاہیے۔

آج کئی نئے مسئلے کھڑے ہو چکے ہیں جو اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں انہی اصولوں کی روشنی میں حل کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر جہاز رانی، ہوا بازی اور بیمہ وغیرہ۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے دنیا کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ ان فاضل فقہاءؒ نے ان مسائل پر کوئی بحث نہیں کی کیونکہ ان کے زمانے میں یہ مسائل موجود ہی نہیں تھے۔ مجھے ان موضوعات پر ایک کتاب بھی دیکھنے کو نہیں ملی جو اسلام اور اسلامی اصولوں کے حوالوں سے ان شعبوں میں بزنس کرنے پر روشنی ڈالتی ہو۔ آج اس پایہ کے اسلامی سکالرز کہاں ہیں جو اتنا علم رکھتے ہوں کہ ان مسائل پر روشنی ڈال سکیں؟

ہمیں اپنے اسلاف ہی کے کارہائے نمایاں پر اظہار فخر ومباہات کرتے نہیں رہ جانا چاہیے۔ دنیا نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی ارتقاء کی کئی کئی منزلیں طے کر چکا ہے اور ہم دنیا کی دیگر قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ پتھر کا زمانہ نہیں بلکہ انٹرنیٹ کا دور ہے۔ یہ گھوڑوں، نیزوں اور تلواروں کا نہیں مزائلوں اور ایٹم بموں کا زمانہ ہے۔ یہ جذباتیت اور شعلہ بیانیوں کا زمانہ نہیں بلکہ عقل اور منطقی دلائل کا زمانہ ہے۔ لیکن ہم اس اذعانی راسخ الاعتقادی (dogmatic intellectual logjam) کے تعطل سے باہر نکلنے اور اپنی فکر وعمل میں تبدیلی

---

[1]۔ امام جعفر صادق بن محمد باقرؒ (702ء-765ء) حضرت زین العابدینؒ بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔ آپؒ نے زین العابدینؒ سے علم وفیض حاصل کیا۔ آپؒ کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔

لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ دنیائے اسلام کے اہم ترین دارالعلوم دیو بند میں بھی اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں کی تخصیص کے لیے موزوں کورسز کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس میں صرف ایک سال کے تفسیر قرآن مجید، فقہ، دینیات اور ادب کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ ان تخصیصی کورسز کے نصاب، مدرسہ کی ویب سائیٹس پر دستیاب ہیں لیکن ان کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانے اور متروک ہیں۔

(http://www.darululoomdesbnd.com/english)

دوسری طرف ہارورڈ یوینٹی سکول (Divinity School of the Harvard University) کے پاس درج ذیل تخصیصی کورسز ہیں:

ہارورڈ الٰہیاتی سکول (Divinity School of the Harvard University) میں درج ذیل چار ڈگری پروگرام ہیں جو دو سے پانچ سالہ عرصے کے ہیں:

(http:/hds.harvards.edu)

(i)۔ ماسٹر آف تھیالوجیکل سٹڈیز (Master of Theological Studies)

(ii)۔ ماسٹر آف ڈیوینٹی (Master of Divinity)

(iii)۔ ماسٹر آف تھیالوجی (Master of Theology)

(iv)۔ ڈاکٹر آف فلاسفی (Doctor of Philosophy)

۹۔ کتابوں کی فراہمی

مسلمانوں نے اپنے آباؤ اجداد کی بھی کتابیں وراثت میں حاصل نہیں کیں۔ حتیٰ کہ ابن سینا، الزہراوی، عمر خیام، الفارابی، ابن نفیس اور ابوالہیثم کی تصانیف مسلم دنیا میں نہ پرائیویٹ لائبریریوں میں پائی جاتی ہیں اور نہ ہی پبلک لائبریریوں میں۔ ان کے ترجمے بلکہ اصل مخطوطات مغرب کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ قدیم کتابوں میں سے صرف حضور نبی

کریم ﷺ (سیرت ابن اسحاق) ملی ہے۔اس کی تدوین الفریڈ گیلیوم[1] نے کی ہے۔اگر کوئی مسلمان آج قدیم مسلم فلسفے یا ادب پر تحقیق کرنا چاہیے تو وہ جامعۃ الازہر، دارالعلوم دیوبند یا دارالعلوم بریلی[2] نہیں جائے گا بلکہ یونیورسٹی آف لائیڈن ہالینڈ یا آکسفورڈ برطانیہ جائے گا جہاں سے اسے اپنی تحقیق کے لیے مطلوبہ موادمل جائے گا۔

لائیڈن یونیورسٹی کی مشرق وسطیٰ سے متعلق جمع کردہ کتب 6000 قلمی نسخوں اور مخطوطات پر مشتمل ہے اوران سے کہیں زیادہ نایاب مطبوعہ کتابیں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کی زبانوں میں ہیں جو 1950ء تک کے مغربی مستشرقین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ پہلے کے سکالرز میں سے ایک جوزف جسٹس سکالیگر[3] نے اپنی عربی فارسی اورترکی زبان کے قلمی نسخے اور مطبوعہ کتابیں بھی لائبریری کو ہدیہ کردیں۔ لیوینس وارنر[4] نے اپنے پرائیویٹ ذخیرے میں سے 1000 قلمی نسخے جو بیشتر عربی، فارسی اور ترکی زبان میں تھے لائیڈن یونیورسٹی کو دے دیئے۔ 1883ء میں یونیورسٹی لائبریری نے مدینہ منورہ کے عالم امین بن حسن المدنی[5] سے 700 قلمی نسخوں کا مجموعہ خریدلیا۔سناوک ہرگرونج[6] نے جونیدرلینڈز کا غالباً سب سے بڑا مستشرق تھا اپنے آخری وقت میں اپنی ساری پرائیویٹ لائبریری اور تاریخی دستاویزات لائیڈن

۱۔Alfred Guillaume: الفریڈ گیلیوم (1888ء-1965ء) ایک برطانوی عربی دانشور، اسلام، بائبل اورعہدنامہ قدیم کاعالم تھا۔

۲۔دارالعلوم دیوبنداوردارالعلوم بریلی برصغیر پاک وہند کے اسلامی تعلیمات کے دوسب سے بڑے ادارے ہیں۔

۳۔Joseph Justus Scaliger: جوزف جسٹس سکالیگر (1540ء-1609ء) ایک فرانسیسی مذہبی رہنما اور عالم تھا جس نے پہلی دفعہ قدیم ادبی تاریخ میں یونانی تاریخ کے ساتھ ساتھ ایرانی، بابلی، مصری اور یہودی تاریخ کو بھی شامل کیا۔

۴۔Levinus Warner: لیوینس وارنر (1618ء-1665ء) ایک جرمن مستشرق، مخطوطات اکٹھے کرنے والا اور سلطنت عثمانیہ میں جمہوریہ ہلند (Dutch Republic) کا سفیر تھا۔

۵۔امین بن حسن مدنی ایک مسلمان مدینہ منورہ کا رہائشی محقق اوراستادتھا جو کتابوں کا کاروبار بھی کرتا تھا جس نے اپنی زندگی میں بہت کلاسیکل ادب اوراسلام کے بارے میں عربی نسخوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی جسے لائیڈن یونیورسٹی نے اپنی لائبریری کے لیے خریدلیا۔

۶۔Christiaan Snouck Hurgronje: کرسچین سناوک ہرگرونج (1857ء-1936ء) نیدرلینڈز کا سب سے بڑا مستشرق، مشرقی تہذیب وتمدن اورزبان کا عالم اورنیدرلینڈز کے حکومت کا مقامی معاملات کا مشیر تھا۔

یونیورسٹی لائبریری کے لیے وقف کر دیں۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد 1960ء کے عشرے میں لائیڈن یونیورسٹی کی لائبریری نے عثمانی ترکی کا عظیم ذخیرہ جو غالباً سلطان مراد پنجم[1] اور اس کے ورثاء کی ملکیت تھا، بھی خرید لیا۔ 2009ء میں یونیورسٹی لائبریری نے پیپلز ری پبلک آف چائنا کے صوبہ سنکیانگ (Xinjiang) سے اسلامی قلمی نسخے حاصل کیے۔

(http://www.library.leiden.edu)

آپ جامعہ اشرفیہ اور جامعہ نعیمیہ لاہور کے کتب خانے دیکھ لیں۔ اس سے زیادہ کتابیں تو میں نے مغرب میں کئی پروفیسروں کے گھروں میں دیکھی ہیں۔ ہماری کوئی اچھی اسلامی لائبریری نہیں ہے۔ اسلامی قانون پر کتابیں ملتی ہی نہیں۔ لنکنز ان (لندن) میں، میں نے 1997ء میں ایک بار احسان (equity) کے قانون پر کتب تلاش کیں۔ جب میں نے کمپیوٹر میں احسان لکھا تو اس نے اپنی سکرین پر 241 کتابوں کی فہرست، ان کے مصنفین کے نام، چھاپے خانے کا نام اور صفحات کی تعداد وغیرہ دس سیکنڈ میں بتا دی۔ ہمارے بہترین مدارس میں نہ تو اتنی کتب ہیں اور نہ ہی ان کو ڈھونڈنے کا نظام (کیٹلاگ) ہے۔ علم کہاں سے آئے گا؟

اب تو تحقیق مزید آسان ہو گئی ہے۔ بازار میں ستر روپے میں کمپیوٹر کی ایک سی ڈی (CD) ملتی ہے۔ جس میں چار قاریوں کی آواز میں پورے قرآن کی تلاوت ہے۔ چار تفاسیر ہیں۔ صحاح ستہ (حدیث کی چھ بڑی کتب) ہیں۔ فقہ کی کئی کتابیں ہیں۔ سیرت پر کئی کتب ہیں۔ تلاش اتنی آسان ہے کہ آپ وضو کا لفظ لکھیں تو قرآن کی تمام متعلقہ آیات، تمام کتب احادیث میں موجود متعلقہ احادیث، فقہ کی کتب سے آرا دس سیکنڈ میں آپ کے سامنے آ جائیں گیں۔ اس کے بعد آپ سب کو پڑھ کر جو چاہیں رائے بنائیں۔ یہ تلاش اگر میں دارالعلوم کراچی کی لائبریری میں کرنا چاہوں تو مجھے ایک ماہ (26 لاکھ سیکنڈ) لگیں گے۔ یہی فرق ہمارا اور مغرب کا ہے۔ انٹرنیٹ نے تو معاملہ مزید آسان کر دیا ہے۔ بیشتر کتب اس پر موجود ہیں اور سیکنڈوں میں اس میں سے حسب منشا کوئی چیز تلاش بھی کی جا سکتی ہے۔

---

[1] سلطان مراد پنجم (1840ء-1904ء) سلطنت عثمانیہ کا تینسواں خلیفہ تھا جو 30 مئی 1876ء سے 31 اگست 1876ء تک برسر اقتدار رہا۔

دوسری مثال لیں۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی، یونیورسٹی آف مینی سوٹا (University of Minnesota) کی انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ پر حقوق انسانی سے متعلق چھ ہزار سے زائد دستاویزات ہیں۔ جو ہمیں مکمل مفت مل جاتی ہیں۔ دیکھیں قانون اور سیاست کے ایک پہلو یعنی حقوق انسانی پر ایک یونیورسٹی نے ہوا میں اتنی کتابیں ہم سب کے لیے مفت رکھی ہیں۔

میں جب علما سے اس مسئلے پر بات کرتا ہوں تو سادہ سا جواب ملتا ہے کہ ہمارے وسائل نہیں ہیں۔ مجھے اس دلیل سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔ مسجد پر اگر ہم ایک چھوٹا سا مینار بنا لیں۔ چار بڑے مینار نہ بنائیں تو اسی مسجد میں ایک چھوٹی سی لائبریری قائم ہوسکتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسجد نبوی کے مینار نہ تھے۔ بیت اللہ شریف کے مینار نہ تھے۔ یہ بعد میں شناخت کے لیے بنے ہیں۔ کیا شناخت کے لیے ایک چھوٹا سا خوبصوت سا مینار کافی نہیں ہے؟ حج ایک فرض ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہر سال حج پر جاتے ہیں۔ فرض حج کے علاوہ ہر سال اربوں روپے ہم حج وعمرہ پر صرف کرتے ہیں کیا اس رقم کا استعمال لائبریری بنانے پر ہوسکتا ہے؟ حالانکہ تحصیل علم بہت اعلیٰ عبادت ہے۔ ہم عالم کی ایک رات عابد کی سوراتوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ (کنز العمال، ج: ۵، رقم الحدیث: ۴۲۷۸) اس کو بھی چھوڑ دیں۔ آپ ایک سال میں غیر ضروری مذہبی جلسے جلوسوں پر اٹھنے والے اخراجات کا جائزہ لیں تو وہ کروڑوں میں ہوں گے جو ایک شاندار لائبریری بنانے کے لیے کافی ہیں۔

ہمارے بڑوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی تحقیق کی ہے۔ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ تیس جلدوں پر محیط کتاب المبسوط امام سرخسیؒ نے جیل کے اندر ایک کنویں میں بیٹھ کر لکھی ہے[1]۔ جہاں انہیں زندگی کی کوئی سہولت حاصل نہ تھی اور نہ کسی اچھی لائبریری تک رسائی حاصل تھی۔

---

[1]۔ فرغانہ کے حاکم نے اپنی ایک کنیز کو آزاد کر کے عدت سے پہلے ہی اس سے نکاح کر لیا۔ امام سرخسیؒ نے اس پر اعتراض کیا تو حاکم وقت نے انہیں ایک کنواں نما گھڑے میں قید کر دیا۔ آپؒ کے شاگردوں کو اس واقعے کا بہت زیادہ دکھ ہوا۔ انہوں نے اپنے استاد سے وابستگی کے لیے درخواست کی کہ ہم روزانہ اس کنویں کے منہ پر آجایا کریں گے۔ آپؒ ہمیں کچھ املا کرا دیا کریں۔ چنانچہ آپؒ نے اس کنویں سے اپنی عظیم کتاب المبسوط فی الفقہ املا کرانی شروع کی اور علم کی تاریخ کا یہ منفرد شاہکار کنویں نما قید خانے سے املا کروائی۔

ان کے پاس علم کی پیاس اور اپنے مقصد کی لگن تھی۔ حضرت اقبالؒ کہتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خُون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خُونِ جگر کے بغیر

(عظیم فن کسی آرام طلب فنکار کے اندر جنم نہیں لیتا۔ یہ آنسوؤں، اذیتوں اور ذہنی کاوشوں کا ثمر ہوتا ہے جو ہر اس سچے فنکار کی جھولی میں آ گرتا ہے جو انسانیت کے جذبے سے سرشار ہو)
(بال جبریل: مسجد قرطبہ)

حوالہ جات

۱۔ تفہیم القرآن، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ لاہور: الاصلاح کمیونیکیشن نیٹ ورک، ۱۹۹۹ء۔

۲۔ سنن البہیقی (شعب الایمان)، حضرت امام ابی بکر احمد بن حسین البہیقیؒ ترجمہ مولانا قاضی ملک محمد اسماعیل۔ کراچی: دارلاشاعت، کراچی، ۲۰۰۷ء۔

۳۔ سیرت النبی ﷺ ابن ہشام، حضرت ابومحمد عبدالملک ابن ہشامؒ؛ حضرت محمد بن اسحاق بن یسارؒ ترجمہ سید یٰسین علی حسنی نظامی دہلوی۔ لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۹۴ء۔

۴۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۵۔ کتاب المبسوط، امام محمد بن احمد سرخسیؒ۔ بیروت: دارالمعرفۃ، ۱۹۷۸ء۔

۶۔ کنزل العمال، امام علاء الدین علی متقی ابن حسام الدینؒ ترجمہ مولانا احسان اللہ شائق۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ، امام ابی بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہؒ ترجمہ مولانا اویس سرور۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ۔ ۲۰۰۰ء۔

۸۔ وحدت امت، مولانا محمد اسحاقؒ۔ فیصل آباد: مکتبہ ملیہ، ۲۰۰۷ء۔

۹۔ Fiqh Al-Imam: Key Proofs in Hanafi Fiqh by Abdur Rehman Ibn Yusuf. London: White Thread Press, 2004.

۱۰۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam by Dr. Muhammad Iqbal. London: Oxford University Press, 1934.

۱۱۔ http: //hds.harvard.edu

۱۲۔ http//:www.darululoomdesbnd.com/english

۱۳۔ http//:www.library.leiden.edu/ Spical- collection/oriental collections/intro-middle-east.html

۱۴

سائنسی علوم کا ذوق



اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ.
(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۹۰)

(بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں)

مسلمانوں کو اس صورت حال کو بغور دیکھنا چاہیے کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ مسلم اکثریت کے حامل 57 ممالک کے پاس اوسطاً 10 یونیورسٹیاں فی ملک ہیں۔ ایک ارب ساٹھ (60) کروڑ افراد کے لیے 600 سے کچھ کم یونیورسٹیاں ہیں۔ دیگر ملکوں میں یہ تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے۔ بھارت کے پاس 8407 اور امریکہ کے پاس 5780 یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک ارب ساٹھ (60) کروڑ مسلمانوں میں 300,000 سے کچھ کم افراد سائنسدان کہلا سکتے ہیں۔ یہ تناسب 530 سائنسدان فی ملین مسلمان آبادی بنتا ہے۔ امریکہ کے پاس گیارہ لاکھ سائنسدان (4099 فی ملین) ہیں۔ جبکہ جاپان کے پاس 700,000 سائنسدان (5095 فی ملین) ہیں۔

مسلمانوں کی کل آبادی ایک ارب 60 کروڑ ہے۔ جو دنیا بھر کی آبادی کا 22 فیصد بنتا ہے۔ جب کہ یہودی صرف 14 ملین (ایک کروڑ 40 لاکھ) ہیں جو دنیا کی آبادی کا صرف 0.22 فیصد بنتا ہے۔ اب تک صرف 2 مسلمانوں کو سائنس میں نوبیل پرائز ملا ہے جبکہ یہودی سائنسدانوں کو 194 نوبیل پرائز ملے ہیں۔ جن دو مسلمانوں کو یہ قابل فخر ایوارڈ ملا ہے ان میں ایک احمد زویل تھا جسے 1999ء میں کیمسٹری میں نوبیل پرائز ملا۔ دوسرا ایک ترکش امریکن عزیز سنکار تھا۔ اسے 2015ء میں نوبیل پرائز ملا۔ دونوں امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں[1]۔

مسلم دنیا میں سائنسی اور بائیومیڈیکل جرائد کافی کم تعداد میں ہیں۔ ان میں سے بھی بہت سوں میں میجر ببلیوگرافک، ڈیٹابیسز کا اشاریہ شامل نہیں کیا گیا۔ اس لیے ان تک 'آن لائن' نہیں پہنچا جا سکتا۔ عرب دنیا سائنسی تحقیق میں صرف 0.5 فیصد شراکت دار ہے جو 200 اہم میڈیکل

[1] ۔ یہ حقائق 2016 تک کے ہیں

جرائد میں شامل ہو جاتی ہے۔

ہمارے تعلیمی ادارے، ہماری لائبریریاں اور ہماری لیبارٹریاں، مغرب کے اداروں، لائبریریوں اور لیبارٹریوں سے کہیں پیچھے ہیں۔ اگر ہم ریسرچ جاری رکھنا چاہیں تو ہمیں مغرب کی ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ کسی بھی خصوصی سائنسی موضوع کے بارے میں تازہ ترین معلومات اور مواد کے لیے ہمیں مغرب کے تحقیقی جرائد سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

مسلم ممالک کو پہلے سائنس کے بارے میں اپنی سوچ اور رویہ تبدیل کرنا چاہیے۔ انہیں یہ امر ذہن نشین کر لینا ہوگا کہ سائنس ان کی وراثت ہے۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے سائنس کو ترقی ونشوونما دی اور اس سے دنیا کو متعارف کرایا۔ آج ہم اسے مغربی علم کے طور پر لیتے ہیں۔ مذہبی ذہن رکھنے والے مسلمان جدید سکولوں اور یونیورسٹیوں کو چھوڑ کر ایک ایسے مدرسے میں داخل ہونے کو بھی ترجیح دے دیتے ہیں جس کا نصاب بہت پرانا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو سائنسی علم کے حصول کو اتنا ہی اہم سمجھنا چاہیے جتنا ہم فقہِ اسلام کی تعلیم کو اہم سمجھتے ہیں۔

ہمیں سائنسی مضامین کو دینی مدرسوں کے نصابات میں شامل کرنا چاہیے۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے شایانِ شان تعلیمی اور تحقیقی ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ جن میں یہ موضوعات شامل ہوں: کائنات کو کیسے مسخر کیا جائے، چاند اور عطارد پر کیسے پہنچا جائے، ایٹم کو کیسے پھاڑا جائے اور روح اور مادے کو کیسے ضم کیا جائے اور ان جیسے موضوعات پر آزادانہ اور بکثرت بحثیں کی جانی چاہیں۔ مسلمانوں کو نئی دریافتوں کو بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے استعمال کرنے، نا قابل علاج اور مہلک بیماریوں کا علاج دریافت کرنے اور عمومی صحت اور خوراکوں کو بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ یہ ایک فریضہ بھی ہے اور مسلمانوں پر انسانیت کا ایک قرضہ بھی ہے۔ یہ بہبودِ انسانیت ہے اور اسلامی کی تعلیم بھی۔

میری قابل احترام علماء سے استدعا اور ایک دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ مسلم معاشرے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ اور اس کے کلچر کے لیے ذوق پیدا کریں۔ اگر مسلمان افغانستان اور عراق کی جنگوں سے سبق نہیں سیکھتے تو انہیں مٹا کر رکھ دیا جائے گا۔ علماء اُمت کو ترغیب دیں کہ وہ مذہب کے نام پر غیر ضروری رسموں اور جلسوں جلوسوں پر بے جا خرچ کرنے

کی بجائے اپنی دولت کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ پر خرچ کرے۔

ہم ہر سال ایسے مذہبی جلسوں اور جلوسوں پر اربوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں جن کا اسلام کی حقیقی روح سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا علماء کے لیے ایسا فتویٰ جاری کرنا ممکن نہیں ہے کہ دولت کو غیر ضروری رسوم پر خرچ کرنے کی بجائے سائنس کے طالب علموں کی فیس ادا کرنے کے کام میں لایا جائے۔ اسی طرح دوسری بار حج اور عمرہ کرنے کی بجائے اس رقم کو اپنے قریب واقع انجینئرنگ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو ایک مکمل سال کی فیس کے لیے بروئے کار لایا جائے۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں اور ایمان رکھتا ہوں کہ ایسا کرنے سے وہ اللہ پاک کو خوش کر سکتے ہیں اور ان کا زائد حج اور عمرہ ویسے ہی قبول ہو جائے گا جیسے انہوں نے واقعی کر لیا ہو۔ ساتھ ہی ایک قابل طالب علم سائنس کا علم حاصل کر لے گا۔

آیئے ہم درج ذیل امور پر غور کریں:

(i)۔ مسلم محقق سائنسدانوں اور انجینئروں کی تعداد دولت مند ملکوں اور لاطینی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے سائنسدانوں اور انجینئروں کی تعداد سے بہت کم ہے۔

(ii)۔ دنیا بھر کے سائنسی لٹریچر کا 80 فیصد حصہ انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، ترکش اور دیگر زبانوں میں اتنا کم ہے کہ طلباء اور محققین کو پڑھانے کے لیے انتہائی ناکافی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے لکھنے اور اس کی تفہیم کے لیے اہلیت حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں مسلمان بہت پیچھے ہیں۔

(iii)۔ سرکاری سکولوں میں پرائمری اور سیکنڈری سطح پر مؤثر سائنسی تعلیم دستیاب نہیں ہے لیکن صرف چند پرائیویٹ شہری سکولوں میں دستیاب ہے۔

(iv)۔ مسلم دنیا میں یونیورسٹیاں اور ٹیکنیکل سکول تحقیق کی بجائے نظریاتی (theoretical) تدریس پر زور دیتے ہیں کیونکہ ان میں لیبارٹریاں اور مطلوبہ اہلیت رکھنے والی فیکلٹیز کم ہیں۔ صرف چند ایک اعلیٰ پایہ کے ڈاکٹورل یا تحقیقی مرکز پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹیاں طلبا کی تعداد بہت زیادہ اور فنڈز بہت کم ہونے کے باعث تحقیق کے لیے مناسب جگہ اور وسائل مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔

(v)۔ مسلم معاشرے میں تحقیق کو بطور پیشہ اختیار کرنے والوں (career researchers) کی شدید کمی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بہت سے ممالک غیر معمولی خصوصی مہارت محققین اور پروجیکٹس رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن نوجوان محققین کی صحیح تربیت کر سکنے والے پختہ کار اور قابل بھروسہ اساتذہ کی ان کے ہاں کافی کمی ہے۔ بہت سے گریجویٹ تحقیق کی تربیت حاصل کر لیتے ہیں لیکن انہیں بیوروکریٹک/ انتظامی پوسٹوں پر بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ مسلم دنیا کو یونیورسٹیوں، ریسرچ انسٹی ٹیوٹس، سرکاری وزارتوں، غیر منافع بخش فاؤنڈیشنوں، ملٹی نیشنل کارپوریشنوں (اور/ یا) کارپوریشنوں میں تحقیق کی صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(vi)۔ مسلم دنیا کو اپنی تطابقی (adaptive) تحقیق کی صلاحیتوں کو ترقی دینی چاہیے نہ کہ غیر ملکی تیار شدہ آلات کی کلید برداری کر کے انہی منصوبوں کو جاری رکھنے پر انحصار کیا جائے۔

(vii)۔ مسلم دنیا میں سرگرم عمل کثیر المملکتی فرمیں اسی امر کو ترجیح دیں گی کہ تحقیق کا کام یورپین یا امریکن سائیٹس پر کرایا جائے۔ وہ مسلم ممالک میں کسی تطابقی تحقیق پر کام شروع کرا کر تحقیق کے صرف ایسے مشترکہ منصوبوں کے لیے ترغیبات دیں گی جو سرکاری کمپنیوں اور کثیر المملکتی کمپنیوں کے اشتراک عمل سے تکمیل پائیں۔

(viii)۔ سائنسدانوں (ماہرین فزکس، انجینئرز، ڈینٹسٹس، فزیشنز اور دیگر سائنسی پیشوں سے متعلق) کی پروفیشنل سوسائٹیاں عام طور پر جرائد اور اجلاسوں کے لیے پیشگی مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔ لیکن مسلم ممالک میں پروفیشنل سوسائٹیاں مسلم دنیا کو ترقی دینے میں سستی کا مظاہرہ کرتی ہیں یا سرے سے دلچسپی ہی نہیں لیتیں۔

(ix)۔ جاپان، امریکہ، جرمنی اور دیگر مغربی ممالک ہر سال اپنے جی ڈی پی کا دو فیصد یا اس سے زائد حصہ تحقیق پر خرچ کرتے ہیں جبکہ کوئی مسلمان ملک اپنے جی ڈی پی کے 0.50 فیصد سے زیادہ ریسرچ پر خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

(x)۔ مسلم دنیا میں مطلق العنان حکومتوں کا راج ہے جو آزادئ اظہار و تجسس اور اختلافِ رائے کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں۔ پروفیشنل سوسائٹیوں کو مفلوج اور یونیورسٹیوں کو خوفزدہ اور ان کے بیرونی

دنیا کے ساتھ رابطوں کو محدود رکھتی ہیں۔ مسلم ریاستیں ٹیکنالوجی کی منتقلی کے مروجہ طریق کار پر انحصار کرتی ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو محض ایک قابل خرید جنس سمجھتی ہیں۔ یہ نقطۂ نظر اندرون ملک تحقیق کی صلاحیتوں کے ارتقا پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔

(xi)۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا علاقائی تعاون سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے لیکن مسلم دنیا میں ایسا تعاون نہ ہونے کے برابر ہے۔

(xii)۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو مناسب انداز میں اداراتی شکل نہیں دی گئی: مثلاً ان کے لیے فنڈز کی فراہمی کا تسلسل نہیں ہے۔ انسانی وسائل کو مناسب ترقی نہیں دی گئی۔ طویل المیعاد مقاصد متعین نہیں اور انتظامی خودمختاری کا فقدان ہے۔

(xiii)۔ عقیدے اور استدلال میں ہم آہنگی پیدا کرنا بھی اہم اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ علم وترقی کے مخالفین سائنس کو مسترد کرنے کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ شرح خواندگی کم ہونے کی وجہ سے سائنس سے لاتعلقی ولاپرواہی برتی جارہی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مناسب ترقی نہ ہوتو کوئی معاشرہ یا تہذیب آگے نہیں بڑھ سکتی۔ مغربی تہذیب کے حالیہ عروج کا راز سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی اور صنعتی انقلابات میں مضمر ہے۔ آج مسلمان اگر اقوام عالم میں عزت و وقار چاہتے ہیں تو انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔

۱۵

اخلاقی اقدار کا احیا



صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَأَعْطِ مَنْ حَرَمَكَ. (مسند احمد، ج:۷، رقم الحدیث:۲۰۲)
(اس سے جڑو جو تم سے قطع تعلق کرے، اسے دو جو تمہیں محروم کرے)

مسلمان عمومی طور پر اخلاقی انحطاط سے دو چار ہیں۔ یہ اخلاقی تنزل اس وقت زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ (سورۃ القلم، آیت:۴) فرماتا ہے۔

وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ.
(اور بے شک آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اخلاق کے بلند مرتبے پر ہو)

بَلَغَ الْعُلٰى بِكَمَالِهٖ
كَشَفَ الدُّجٰى بِجَمَالِهٖ
حَسُنَتْ جَمِيْعُ خِصَالِهٖ
صَلُّوْا عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کمالات کی وجہ سے معراج کے لیے گئے)
(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حُسن کی وجہ سے اندھیرے چھٹ گئے)
(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جامع محاسن اخلاق ہیں)
(پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد پر دورد بھیجو)

اسلام دیگر سب مذاہب کی طرح اخلاقی اقدار کا درس دیتا ہے۔ قرآن مجید اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں عجز و انکسار، عفو، اخلاق اور شیریں مزاجی کی تعلیم دی ہے مگر ہم ان بنیادی اقدار سے بہت دور ہیں۔ اگر ہم ان اقدار کو صحیح انداز میں اختیار کر لیں تو ہماری زندگی بے حد خوشگوار ہو جائے گی۔

۱۔ عاجزی اختیار کرنا

اسلام ہمیں اپنے رویے اور طرزِ عمل میں عجز و انکسار سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن مجید (سورۃ الفرقان، آیت:۶۳) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں

انہیں زمین پر عاجزی اور فروتنی کے ساتھ چلنا چاہیے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا.

(اور اللہ تعالیٰ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں)

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ.
(سورۃ آل عمران، آیت:۱۵۹)

(آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کے لیے نرم مزاج ثابت ہوئے اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ترش رو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے منتشر ہو جاتے)

جب ایک مومن کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگانی اور قوت کا حقیقی منبع ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور انسانوں کو روزِ قیامت اپنا حساب کتاب پیش کرنا ہے تو وہ قدرتی طور پر عاجز، منکسر المزاج اور شفیق و مہربان بن جاتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ اللہ پاک سے رحم کا طلب گار ہے تو اسے اس کی مخلوقات کے ساتھ رحم دلانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے شفقت اور نرم دلی کا سلوک نہیں کرے گا تو وہ اللہ پاک کی طرف سے رحم و شفقت سے محروم ہو جائے گا۔ اگر وہ لوگوں کی مدد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔ اگر وہ لوگوں کے دکھ درد دور کرتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے دکھ درد دور کرتا رہے گا اور روزِ قیامت بھی اس کی پریشانیاں دور کر دے گا۔ یہ تعلیمات اس کے اندر ہمدردی اور غمگساری جاگزین کر کے تنگ مزاجی کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کے تمام پہلوؤں میں عجز و انکسار اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے:

(i)۔ جو کوئی کسی مومن کی اس دنیا کی تکالیف دور کرنے میں اس کی مدد کرے گا، اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی تکالیف دور کر دے گا۔ جو کوئی کسی شخص کے قرضہ واپس نہ دے سکنے کی مشکلات کم کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی اس دنیا کی مشکلات بھی کم کر دے گا اور اس کی آخرت کی مشکل بھی آسان کر دے گا۔ جو کوئی دوسروں کی خطاؤں پر پردہ ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اس جہان میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور آخرت میں بھی اسے رسوائی سے بچائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد

کرتا رہے گا، جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے گا۔
(صحیح مسلم، ج:۳، رقم الحدیث:۲۳۵۲)

(ii)۔ صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا اور بندے کے معاف کر دینے سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت بڑھا دیتا ہے اور جو آدمی بھی اللہ پاک کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند فرما دیتا ہے۔(صحیح مسلم، ج:۳، رقم الحدیث:۲۰۹۱)

(iii)۔ پہلی امتوں میں سے ایک آدمی اپنے لباس میں تکبر کرتے ہوئے نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو زمین نے اسے پکڑ لیا۔ پس وہ اب زمین میں قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔
(جامع ترمذی، ج:۲، رقم الحدیث:۳۸۹)

(iv)۔ حضرت برا ابن عاذب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوم الاحزاب پر ہمارے ساتھ مل کر مٹی ہٹا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ مٹی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بطن مبارک کی سفیدی کو ڈھانپ رہی تھی۔(صحیح بخاری، ج:۳، رقم الحدیث:۲۱۴۲)

(v)۔ حضرت الاسود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں کیا کرتے رہتے تھے؟ جواب ملا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خاندان کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ جب نماز کا وقت آ پہنچتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلے جاتے اور نماز پڑھتے تھے۔(صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث:۶۴۸)

(vi)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر تم میں سے کسی کا خادم اس کے لیے کھانا لے کر آئے اور تم اسے بٹھانا اور اپنے ساتھ کھلانا نہیں چاہتے تو پھر اسے ایک یا دو لقمے کھلا دو کیونکہ اس نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے اور پیش کیا ہے۔
(صحیح بخاری، ج:۳، رقم الحدیث:۴۳۸)

۲۔ غصہ نہیں کرنا

غصہ اخلاقی زندگی کا دشمن ہے۔ غصے کی حالت میں انسان اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیتا ہے۔ ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے یہ بات ذیل کے اشعار میں نہایت

خوبصورتی سے کہی ہے:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا
ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غصے کو صرف اللہ تعالیٰ کا خوف روک سکتا ہے۔ اہل ایمان کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت جو قرآن مجید (سورۃ آل عمران، آیات: ۱۳۳ - ۱۳۴) میں بتائی گئی ہے، یہ ہے کہ جب انہیں غصہ آ جائے تو وہ صبر اور عفو سے کام لیتے ہیں۔

وَسَارِعُوٓا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۝ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡكٰظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ وَالۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِ‌ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ.

(اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ جو پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ جو لوگ آسانی اور سختی میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے)

فَمَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ۚ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ وَّاَبۡقٰى لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ‌ ۝ وَالَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ يَغۡفِرُوۡنَ. (سورۃ الشوریٰ، آیات: ۳۶-۳۷)

(جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر اور ہمیشہ رہنے والا ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں۔ اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کرتے ہیں)

وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ. (سورۃ الشوریٰ، آیت: ۴۳)

(البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل ایمان کو غصہ نہ کرنے اور مسکراہٹ آمیز رویہ اختیار کرنے کے کئی طریقے بتائے اور متعدد نصیحتیں فرمائی ہیں:

(i)۔ حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا اور دو آدمی باہم گالم گلوچ کر رہے تھے ان میں سے ایک کا منہ (مارے غصہ کے) لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں ایک ایسی بات جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص اس بات کو کہہ دے تو اس کا غصہ جاتا رہے اگر یہ **أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ** کہہ دے تو اس کا غصہ ختم ہو جائے۔ (صحیح بخاری، ج: ۲، رقم الحدیث: ۵۳۹)

(ii)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے تعالیٰ ہے کہ ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے کئی بار عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ غصہ نہ کیا کرو۔ (صحیح بخاری، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۰۶۹)

(iii)۔ ایک اور روایت کے مطابق اس شخص نے کہا کہ میں نے اس چیز کے بارے میں سوچا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ غصہ ہر قسم کی برائیوں کا مجموعہ ہے۔

(iv)۔ روایت میں ہے کہ جنت کا ایک دروازہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو غصہ کو ضبط اور دوسروں کی خطاؤں کو معاف کرنے والے ہوں گے ایسے لوگ اسی دروازے سے جنت میں داخل ہوں گے۔ (مشکوٰۃ المصابیح، ج: ۲، رقم الحدیث: ۳۹۰)

(v)۔ جو کوئی اپنے غصے کو اس وقت کنٹرول کرتا ہے جب وہ اپنے غصے پر عمل کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو روز قیامت رضا سے بھر دے گا۔

(کنز العمال، ج: ۲، رقم الحدیث: ۲۰۳۶)

(vi)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پچھاڑ دینے والا زور آور نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر زور آور کون ہے؟ ارشاد فرمایا: وہ جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پا لے۔

(مسند احمد، ج: ۴، رقم الحدیث: ۴۹۸)

(vii)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ جا رہا تھا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چوڑے حاشیہ کی ایک نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک بدو آیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر کو زور سے کھینچا۔ میں نے دیکھا کہ اس بدو کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن پر چادر کے کنارے کا نشان پڑ گیا ہے۔ اس نے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے جو دولت دی ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے اور مسکرائے۔ پھر حکم دیا کہ اسے کچھ دے دیا جائے۔

(صحیح بخاری، ج:۲، رقم الحدیث:۴۱۲)

(viii)۔ حضرت معاذ بن انس الجہنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو انتقام کی قدرت کے باوجود غصہ پی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو بروز محشر مخلوقات کے سامنے بلائے گا اور اسے اختیار دے گا کہ جنت کی حوروں میں سے جسے چاہے اپنا لے۔

(جامع ترمذی، ج:۱، رقم الحدیث:۲۱۱۰)

(ix)۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فحش گوئی کرنے والے اور لعنت کرنے اور گالی گلوچ کرنے والے نہ تھے۔ جب کبھی ناراض ہوتے تو صرف اس قدر فرماتے کہ اس کو کیا ہو گیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو۔

(صحیح بخاری، ج:۳، رقم الحدیث:۱۰۰۴)

۳۔ مسکرانا ہے

(i)۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھائی پر مسکرانے کو صدقے جیسا کام قرار دیتے تھے۔ (جامع ترمذی، ج:۱، رقم الحدیث:۲۰۴۱)

(ii)۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ملاقات کا موقع دینے سے کبھی انکار نہیں کیا اور جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے دیکھتے تو مسکراتے تھے۔ (صحیح مسلم، ج:۳، رقم الحدیث:۱۸۶۲)

(iii)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کردار کے لحاظ سے بہترین

لوگوں میں سے تھے۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے کسی کام کے لیے بھیجا اور میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم میں نہیں جاؤں گا۔ تاہم دل میں میں نے محسوس کیا کہ مجھے وہ کرنا چاہیے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا۔ چنانچہ میں روانہ ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں گلی میں چند لڑکے کھیل رہے ہیں۔ اچانک پیچھے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آ گئے اور مجھے گردن کے پچھلے حصے سے پکڑ لیا۔ جب میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرا رہے تھے۔

(سنن ابوداؤد، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۳۷۰)

(iv)۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے سواری کے لیے کوئی جانور دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اچھا! میں تمہیں اونٹنی کا ایک بچہ دے دیتا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا کوئی اونٹ ایسا بھی ہے جو اونٹنی سے پیدا نہ ہوا ہو۔ (سنن ابوداؤد، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۵۹۰)

(vi)۔ حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (جامع ترمذی، ج: ۲، رقم الحدیث: ۱۶۰۷)

۴۔ نرمی کرنا ہے

اسلام ہمیں نرمی کرنے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

(i)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک سرکش اونٹ پر سوار ہوئیں اور اسے چکر دینے لگیں تو حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نرمی اختیار کرو۔ (صحیح مسلم، ج: ۳، رقم الحدیث: ۲۱۰۲)

(ii)۔ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نرمی فرمانے والا ہے اور نرمی کرنے والے کو پسند فرماتا ہے اور اسے وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو سختی کرنے والے کو نہیں دیتا۔ (سنن ابوداؤد، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۴۰۳)

(iii)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے وہ اسے خوبصورت بنا دیتی ہے۔ جس چیز میں سے نرمی نکال دی جاتی ہے تو وہ چیز بدصورت ہو جاتی ہے۔ (صحیح مسلم، ج: ۳، رقم الحدیث: ۲۱۰۱)

(iv)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جہنم کی آگ پر ہر اس شخص کو حرام قرار دے دیا گیا ہے جو باوقار ہو، نرم خو ہو، سہولت پسند طبیعت کا ہو (جھگڑالو نہ ہو) اور لوگوں کے قریب ہو۔ (مسند احمد، ج:۲، رقم الحدیث: ۲۰۰۲)

(v)۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! سب سے افضل عمل کون سا عمل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ پر ایمان و تصدیق، اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد اور حج مبرور۔ اس آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی چیزیں بیان فرما دی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پھر کلام میں نرمی، کھانا کھلانا، سہل ہونا اور اچھے اخلاق سب سے افضل عمل ہیں۔ اس نے کہا کہ میں تو صرف ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو پھر جاؤ اور اپنی ذات پر تہمت نہ لگنے دو۔ (مسند احمد، ج:۷، رقم الحدیث: ۹۳۹)

(vi)۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اسلام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کھانا کھلانا اور نرم گفتگو کرنا۔ میں نے عرض کی: ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صبر کرنا اور سخاوت کرنا۔

(مشکوٰۃ المصابیح، ج:۱، رقم الحدیث: ۴۲)

(vii)۔ ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کا ایک خادم گرم گرم چائے لایا۔ جو اس خادم کی کوتاہی کی وجہ سے بزرگ کے پاؤں پر گر گئی۔ اس بزرگ کا پاؤں جل گیا۔ کرب و غصے کے عالم میں انہوں نے خادم کی طرف دیکھا۔ وہ سخت پریشان و پشیمان تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت سے قرآن مجید (سورۃ آل عمران، آیت: ۱۳۴) کا سہارا لیا اور کہا:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ.

(وہ غصہ پی جاتے ہیں)

بزرگ خاموش ہو گئے۔ چہرے سے کرب و غصے کی علامات ختم ہو گئیں۔

خادم نے اگلا جز پڑھا:

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط.

(وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں)
بزرگ نے فرمایا جا! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

خادم نے آیت کا اگلا حصہ پڑھا:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.
(اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)
بزرگ نے فرمایا کہ جا! میں نے تمہیں آزاد کیا۔

یہ ہے اسلامی اخلاق کہ پاؤں جلانے کے بدلے میں آزادی بخش دی جائے۔ جبکہ ہماری حالت خاصی توجہ طلب ہے۔ ہمیں غصہ بہت آتا ہے۔ مزاج میں برہمی و درشتی ہر وقت رہتی ہے۔ جتنا بڑا عالم اور جتنا بڑا صوفی ہوتا ہے۔ اس کا جلال اتنا زیادہ ہوتا ہے۔ جتنا بڑا آفیسر، اتنا زیادہ تکبر و غصہ۔

میں لڑکپن میں قرآن پاک کی تفسیر پڑھ رہا تھا۔ جب کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی تھی تو میں کسی مدرسہ میں کسی عالم دین کے پاس جا کر سوال کرتا۔ جواب سن کر اگر پھر کوئی سوال کر دیا تو بس حضرت صاحب کو جلال آ جاتا تھا۔ یہی حال اعلیٰ سرکاری ملازمین کا ہے۔ جتنا بڑا آفیسر اتنا زیادہ بدتہذیب۔ ایک آفیسر نے مجھے ایک دن بہت فخر سے بتایا حالانکہ وہ ریٹائرڈ تھے اور ماشاءاللہ مذہبی ہو گئے تھے کہ جب وہ ڈی سی آفس میں سپریٹینڈنٹ (superintendent) تھے تو فلاں (ایک وزیر کا صاحب کا نام لے کر) کو میں نے کبھی اپنے دفتر میں کرسی پیش نہیں کی تھی۔ میں نے سخت بے ادبی کی اور کہہ دیا کہ غالباً یہ آپ کی بداخلاقی تھی۔ اسی کے ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے کام کے لیے سرکار نے تمہیں ملازمت دی تھی۔

۵۔ معافی ہی معافی

اسلام ہمیں عفو و درگزر کا درس دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے صفاتی نام بتائے گئے ہیں جنہیں 'اسماءُ الحسنیٰ' کہا جاتا ہے۔ یعنی خوبصورت ترین نام۔ ان میں سے کچھ نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی و درگزر سے تعلق رکھتے ہیں۔

(i)۔ 'الغفور': بے حد وحساب معافی دینے والا: قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ صفاتی نام ستر سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔ اسی جڑ سے اللہ پاک کے کئی اور نام بھی ہیں: جیسے 'غافر' اور 'غفار' عربی کے لفظ 'غَفَرَ' کے معنی 'ڈھانپنا' کے ہیں اور اس سے 'معاف کرنے'، 'درگزر کرنے'، 'قرضہ یا سزا معاف کرنے' اور 'بخش دینے' کے مفہوم نکلتے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ 'شرک' (بغیر توبہ کئے) معاف نہیں کرتا مگر وہ اس کے علاوہ کوئی اور گناہ جسے چاہے معاف کرسکتا ہے۔

(سورۃ النساء، آیت:۱۳۶)

(ii)۔ 'العفو': قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ نام پانچ بار آیا ہے۔ لفظ 'عفو' کے معنی ہیں 'رہا کرنا'، 'صحت دینا'، 'بحال کرنا'، 'معاف کرنا'۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ 'ہمیں گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے ملنے والی سزا کے بوجھ سے چھڑوانے والا'۔ ہماری وہ عزت بحال کردے بعد اس کے کہ ہم اسے اپنے گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے کھو بیٹھے تھے۔

(iii)۔ التواب: توبہ قبول کرنے والا: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اس صفاتی نام کا تقریباً گیارہ مرتبہ ذکر آیا ہے۔ لفظ 'تواب' سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا ہے۔

(iv)۔ الحلیم: رحم دل: قرآن مجید میں یہ نام پندرہ مرتبہ آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فوراً فیصلہ صادر نہیں کرتا بلکہ وقت دیتا ہے کہ اس کا بندہ اس کی طرف واپس لوٹ آئے۔ یعنی توبہ کرلے۔

(v)۔ الرحمان الرحیم: نہایت درجے کا رحم دل اور مہربان: قرآن میں 'الرحمان' کا ذکر ستاون (۵۷) بار اور 'الرحیم' کا ذکر ایک سو پندرہ (۱۱۵) بار آیا ہے۔ اول الذکر سے رحم کے وفور اور کثرت کا اشارہ ملتا ہے اور مؤخر الذکر سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسا ہے۔

(vi)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں دیہ دعا سکھائی ہے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْعَفُو تُحِبُّ الْعَفْو ،فَاعْفُ عَنی یاغفور.

(جامع ترمذی، ج:۲، رقم الحدیث:۱۴۶۸)

(اے میرے پروردگار! تو بے حد وحساب معاف کرنے والا ہے۔ تو معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔ پس مجھے معاف فرمادے)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سب سے زیادہ معاف کرنے والی شخصیت تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی امت کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنانے کے لیے طائف گئے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بہت بدسلوکی۔ دشنام طرازی کی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر پتھر برسائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بہت بے توقیری اور زخمی ہونے کی حالت میں وہ شہر چھوڑا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دم لینے کے لیے ایک درخت تلے بیٹھے تو ایک فرشتے نے آ کر خبر دی کہ 'اللہ تعالیٰ اہل طائف سے بہت ناراض ہے اور اس نے مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ میں اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بدسلوکی کرنے والوں کو تباہ کر دوں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ایسا نہ کرے بلکہ انہیں زندہ رہنے دے کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اپنی جہالت کی وجہ سے کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعا فرمائی: اے میرے پروردگار! ان لوگوں کو صحیح راستہ دکھا دے کیونکہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ (مشکوٰۃ المصابیح، ج:۵، رقم الحدیث:۴۲۹)

جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فتح مکہ کے بعد مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے چند ایک بدترین دشمن تھے۔ جو کئی سالوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف لڑ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے رفقا کو اذیتیں دیتے رہے اور بہت سوں کو شہید بھی کیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ان پر پورا اختیار حاصل ہو چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کے ساتھ جو چاہتے سلوک کر سکتے تھے۔ ان کے ہر جرم کی سزا دینے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے انہیں سے پوچھا کہ بتاؤ کیا جانتے ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ وہ سوائے قصاص لیے جانے کے کسی چیز کی توقع نہیں کر رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے رحم کی استدعا کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعلان فرمایا:

آج میں تم سے وہی کچھ کہوں گا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا:

قَالَ لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ الۡيَوۡمَ‌ؕ. (سورۃ یوسف، آیت:۹۲)

(آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو)

اسلام نے ہمیں معاف کرنا سکھائی ہے۔ ابوجہل اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ اس کا بیٹا عکرمہ بھی باپ کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ فتح مکہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کا خون بھی

معاف کردیا تھا۔ وہ مکہ سے بھاگ گیا اور یمن میں پناہ گزیں ہوگیا۔ اس کی اہلیہ ام حکیم بنت حارث پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اپنے خاوند کے لیے معافی کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ درخواست قبول فرمالی۔ وہ یمن جا کر اپنے خاوند کو واپس لائیں۔ عکرمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا۔ جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں آنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے ارشاد فرمایا: عکرمہ بن ابی جہل تمہارے پاس آ رہا ہے۔ اس کا باپ اسلام کا سخت ترین دشمن تھا۔ تم اس کے سامنے اس کے باپ کو برا بھلا مت کہنا۔ مردہ کو برا کہنے سے زندہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ (کنزالعمال، ج: ۷، رقم الحدیث: ۱۳۳۵) سبحان اللہ! کیا احترام آدمیت ہے۔ اپنے مظلوم اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے بدترین ظالم دشمن کا بیٹا آ رہا ہے۔ اس کے باپ کے خلاف بات کر کے اس کو تکلیف نہ دینا۔ یہ وہ کشادہ دلی اور عظمت کردار تھی جس کی وجہ سے مشرق و مغرب نے اسلام قبول کرلیا۔ عکرمہ نے اپنی باقی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہی تھیں۔ ھبار بن اسود نے آپ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کو نیزہ مارا۔ جس سے اونٹ زخمی ہوگیا اور بلک پڑا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اونٹ سے گر پڑیں۔ اس وقت وہ حمل سے تھیں۔ ان کا حمل ضائع ہوگیا۔ اس کے بعد وہ بقیہ زندگی بیمار رہیں۔ اس ظالم ھبار نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر معافی طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بغیر کسی شرط کے معاف فرما دیا۔

(سیرت حلبیہ، ج: ۳، ص: ۲۷۹)

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محسن اور محبوب چچا تھے۔ وحشی بن حرب اور ہند زوجہ ابوسفیان نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ وحشی نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ اس نے فتح مکہ کے بعد مدینے میں حاضر ہو کر معافی مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاف فرما دیا۔ ہندہ نے غزوہ احد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چیرا اور جگر نکال کر چبایا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بھی معاف کر دیا۔ (کشف الباری، ج: ۸، ص: ۴۹۹-۵۰۰)

مجھے ذاتی طور پر اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ بہت ہی عجیب لگتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ایک جھوٹی اور بے بنیاد تہمت لگائی گئی۔ اس غیر اخلاقی و غیر انسانی حرکت میں ایک صحابی حضرت مسطح رضی اللہ عنہ بھی شریک تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غریب رشتہ دار تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی غربت کے سبب اس کا ماہانہ خرچ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جب حضرت مسطح رضی اللہ عنہ نے یہ حرکت کی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بجا طور پر اس کا وظیفہ بند کر دیا۔

آپ سوچیں کہ اول تو وظیفہ دینا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قانونی ذمہ داری نہ تھی بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے از سر خود اخلاقی بنیادوں پر اس پر یہ کرم کر رکھا تھا۔ دوسرے بے گناہ اور لاڈلی بیٹی پر تہمت کے بعد ان کے پاس ایک اخلاقی جواز بھی تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب غم وغصہ کی وجہ سے اس کا وظیفہ بند کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (سورۃ النور، آیت: ۲۲)

(اور تم میں سے جو لوگ اچھی مالی حالت رکھتے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور اللہ کی راہ میں وطن چھوڑنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ ان کو معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تم کو معاف کر دے اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے)

اس آیت کے نزول کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا وظیفہ بحال کر دیا۔ کیا اعلیٰ انسانی تعلیمات ہیں؟ کیا اخلاقی معیار ہے کہ گالیاں کھا کر بھی اپنے دشمن پر کرم جاری رکھنا ہے۔

۶۔ برتر اخلاق

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر لوگ تم سے شریفانہ طور پر پیش آتے ہیں تو تم بھی ان سے شریفانہ طرز عمل اختیار کرو۔ اگر وہ تم سے بدسلوکی کرتے ہیں تو بھی تم ان سے حسن اخلاق سے پیش آؤ۔ (مشکوٰۃ المصابیح، ج: ۴، رقم الحدیث: ۱۸۳)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: عقبہ! رشتہ توڑنے والے سے رشتہ جوڑو، محروم رکھنے والے کو عطا کرو اور ظالم سے درگذر اور اعراض کرو۔

(مسند احمد، ج:۷، رقم الحدیث:۶۰۲)

یہ احادیث بڑی وضاحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ ہمارا رویہ اور طرز عمل دوطرفہ (bilateral) نہیں بلکہ یک طرفہ ہے۔ ہمیں یہ نہیں کہا گیا کہ کسی شخص کے ساتھ اس لیے احسان کرو کہ وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے بلکہ ہمیں نقصان پہنچانے والے شخص سے بھی مثبت سلوک اور اچھا رویہ اختیار کرنا ہے۔ ہم نے برائی کے بدلے برائی نہیں بلکہ برداشت اور عفو کا رویہ اختیار کرنا ہے۔ ہم یہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور اپنے فائدے کے لیے کرتے ہیں۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں تو دوسرے لوگوں کی برائیاں ہمیں ان سے اچھا سلوک کرنے سے نہیں روکتیں۔ حسنِ اخلاق کی ایک تکمیل ہے جس کے لیے اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے۔

(مسند احمد، ج:۴، رقم الحدیث:۱۷۷۴)

اسلام کی تعلیمات کتنی لائق تحسین ہیں۔ قرآن مجید اور تعامل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں کو کتنی اعلیٰ و ارفع اقدار سکھائی گئی ہیں کہ وہ دشمنوں سے بھی نیکی کریں۔ ان کی بھی مدد کریں جنہوں نے انہیں دکھ دیا ہو۔ لیکن افسوس کہ اس کے باجود آج کے مسلمان اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حوالے سے نہیں پہچانے جاتے۔

میں جب برطانیہ (1995ء-1998ء) میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہمارے قانونِ فوجداری کے پروفیسرز اعلیٰ عدلیہ کے نظائر (precedents) پڑھایا کرتے تھے۔ عجیب اتفاق تھا کہ بداخلاقی کے زیادہ تر مقدمات کے نظائر (precedents) ان مسلمانوں کے حوالے سے تھے جو وہاں آباد تھے۔ میں اس مسئلے پر اکثر سوچا کرتا تھا اور اپنے دل میں شرمندگی محسوس کرتا تھا۔ ان کے خلاف دھوکہ، فریب، اعتماد کو ٹھیس پہنچانے اور دیگر اخلاقی جرائم کے مقدمات اپنی مسلم کمیونٹی کی طرف سے ہی دائر ہوئے تھے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اسلام اچھے کردار کی تعلیم دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں بہترین وہ ہے جو

بہترین کردار کا حامل ہے۔ (جامع ترمذی، ج:۱، رقم الحدیث:۱۱۶۹) انسان کی بڑائی اس کی تعلیم، دولت یا منصب سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس کے اعلیٰ اخلاق، عجز وانکساری، سادگی اور خلوص کے حوالے سے ناپی جاتی ہے۔

ایک دفعہ میں مولانا مودودی کا ریڈیو پاکستان سے انٹرویو سن رہا تھا۔ یہ انٹرویو انہوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے دیا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا کہ ان کی تمام عمر اسلام کے احیا کے لیے گزری ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کے لیے گزری ہے۔ آپ تجربے کی روشنی میں کیا سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے؟ مولاناؒ نے فوراً جواب دیا کہ مسلمانوں کو اخلاق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ مودودی صاحبؒ کی زندگی کا یہ حاصل تھا۔ یقیناً انہوں نے سو فیصد صحیح فرمایا ہے۔ اخلاق کے بغیر ہم بانجھ ہیں۔ اس پر گہرے سوچ و بچار کی ضرورت ہے۔ ہمارا مذہب اعلیٰ اخلاقیات کے ذریعے پھیلا لیکن ہم ان اخلاقی بلندیوں سے عاری ہیں جن کا علمبردار اسلام ہے۔ ہمارے پھول اپنی خوشبوؤں سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہمیں گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی اخلاقی اقدار پر غور کرنا ہوگا۔ ہمیں عجز وانکسار، عفو و درگزر، اعلیٰ اخلاق اور خوش مزاج ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے ہمیں اپنی اصلاح اور اخلاق و آداب کی درستی کے لیے ایک مہم شروع کر دینی چاہیے۔

چہ باید مرد را، طبع بلندے، مشرب نابے
دل گرمے، نگاہ پاک بینے، جان بیتابے
(انسان کو کیا چاہیے! بلند طبیعت، اعلیٰ کردار،
(نرم دل، پاک نگاہ اور بے تاب جان)
(بانگ درا: طلوع اسلام)

حوالہ جات

۱۔ بانگ درا، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔

۲۔ جامع ترمذی، حضرت امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ ترجمہ مولانا افضل احمد۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۶ء۔

۳۔ سنن ابو داؤد، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعت سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

۴۔ سیرت حلبیہ، علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ ترجمہ مولانا محمد اسلم قاسمیؒ۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۵۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۶۔ صحیح مسلم، امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج نیشاپوری ترجمہ علامہ وحید الزمان۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۷۔ کشف الباری عما فی صحیح البخاری: اردو شرح صحیح بخاری، مولانا سلیم اللہ خانؒ۔ کراچی: مکتبہ فاروقیہ، ۲۰۰۶ء۔

۸۔ کنزل العمال، امام علاء الدین علی متقی ابن حسام الدینؒ ترجمہ مولانا احسان اللہ شائق۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۹۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ ترجمہ مولانا محمد ظفر اقبال۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۰۴ء۔

۱۰۔ مشکوٰۃ المصابیح، حضرت شیخ ولی الدین الخطیب التبریزیؒ ترجمہ مولانا محمد صادق خلیلؒ۔ لاہور: مکتبہ محمدیہ، ۲۰۰۵ء۔

۱۶

حقوق انسانی کی مرکزیت



وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا. (سورۃ الاسراء، آیت:۷۰)

(اور بلاشبہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔ انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا۔ انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ ہم نے جو مخلوق پیدا کی ان میں بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا کی)

انسانی حقوق کی تحریک جنگ عظیم دوم (WW-II) کے بعد جلد ہی طاقت پکڑنے لگی۔ اقوام متحدہ (U N O) نے 1 9 4 8ء میں عالمگیر اعلان انسانی حقوق (Universal Declaration of Human Rights) کی دستاویز تیار کر لی۔ 1966ء میں اقوام متحدہ (U N O) نے بین الاقوامی معاہدہ برائے شہری و سیاسی حقوق (International Covenant on Civil and Political Rights) اور بین الاقوامی معاہدہ برائے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق (International Covenant on Economic, Social and Cultural Rights) تیار کر لیے۔ خواتین سے امتیازی سلوک برتنے کی ممانعت کا کنونشن (The Convention on Elimination of all forms of Discrimination Against Women) 1981ء میں نافذ ہوا اور کنونشن برائے حقوق بچگان (Convention on the Rights of the Child) 1990ء میں نافذ ہوا۔ اس کے علاوہ عالمی برادری نے انسانی حقوق کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں سینکڑوں اعلانات، معاہدات اور دستاویزات تیار کیں اور متفقہ قراردادیں منظور کر لیں۔ حقوق انسانی کی اس ساری تحریک کو ہم اہل اسلام مغرب کی سازش اور ہتھکنڈہ سمجھتے ہیں۔ اس کے سبب ہم نے ان تحاریک کے خلاف ایک منفی اپروچ اختیار کر لی ہے جو سخت نقصان دہ ہے۔

مذہب انسانی احترام سکھاتا ہے۔ اسلام نے روز اول سے انسان کو اپنی تعلیمات کا مرکز بنایا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام و ابلیس کی کہانی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انسان صاحب شرف ہے۔ مسجود ملائکہ ہے۔ توریت، زبور، انجیل اور قرآن پاک کا مقصد انسانیت کی فلاح و ترقی ہے۔ دنیا میں انصاف قائم کرنا ہے۔ قانون کی حکمرانی لانا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کے شرف کی تکمیل کی۔ عہد نامہ قدیم وجدید (زبور، توراۃ، انجیل) کا نصب العین بھی

بنی نوع انسان کی عظمت کی پہچان اور اس کی ترقی و بہبود ہے۔ زبور شریف (Psalm-8) میں ارشاد ہے:

(i)۔ انسان ہے کیا کہ تو اس کے بارے میں متفکر رہے۔ وہ اولاد انسان ہے جسے تو ملتا رہتا ہے۔

(ii)۔ کیونکہ تو نے اس کو فرشتوں سے کچھ ہی کم بنایا ہے اور اس کے سر پر عزت و عظمت کا تاج رکھا ہے۔

(iii)۔ تو نے اپنے ہاتھوں سے بنائی دنیا پر اس کو غلبہ عطا کیا ہے اور سب چیزوں کو اس کے پاؤں تلے دے دیا ہے۔

(iv)۔ تمام بھیڑیں اور بیل اور کھلے میدانوں میں گھومنے والے جانور۔

(v)۔ ہوا میں اڑتے پرندے، سمندروں میں تیرتی مچھلیاں اور جو کچھ بھی خشکی کے راستوں اور سمندروں کے درمیان ہے۔

(vi)۔ اے خداوند عالم! تیرا کتنا شاندار نام ہے جو ساری روئے زمین پر گردش کر رہا ہے۔

قرآن مجید (سورۃ الاسراء، آیت: ۷۰) میں اللہ تعالیٰ نے انسانی حقوق پر بہت زور دیا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا.

(اور بلاشبہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔ انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا۔ انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ ہم نے جو مخلوق پیدا کی ان میں بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا کی)

قرآن مجید نے تصور احترام آدمیت کا مختلف طریقوں اور مختلف سیاق و سباق میں اظہار کیا ہے۔ ایک تو وقار انسانی کی براہ راست اور غیر مشروط توثیق ہے جو جملہ عالم انسانیت کے احترام و وقار کی قدر شناسی کے سلسلے میں اظہر من الشمس اور جامع ترین ہے۔ جس میں کسی قسم کے رنگ و نسل عقیدہ یا صنف کی کوئی حد بندیاں یا شرائط نہیں ہیں۔

(ا)۔ اہم ترین انسانی حق اس کا زندہ رہنے کا حق اور انسانی زندگی کا احترام ہے جیسا کہ قرآن مجید

میں آیا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا. (سورۃ المائدہ، آیت:۳۲)

(جو کوئی کسی نفس کو قتل کرے جبکہ یہ قتل نہ کسی اور جان کا بدلہ لینے کے لیے ہو اور نہ کسی کے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے، تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ جو شخص کسی کی جان بچالے تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ. (سورۃ الانعام، آیت:۱۵۱)

(ناحق کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے)

یہ آیات ہر انسان پر لازم قرار دیتی ہیں کہ وہ کسی بھی حال میں انسانی جان نہ لے۔ اگر کسی نے ایک انسان کو قتل کیا تو ایسا سمجھا جائے گا کہ اس نے ساری انسانی نسل کو قتل کر دیا ہے۔ یہاں ایک انسان کو قتل (homicide) کو انصاف کے تقاضے کے تحت 'انہدامِ زندگی' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی صحیح قانونی عدالت کے فیصلے کی شرط لگائی ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کیا اس شخص نے دیگر انسانوں کے حقِ زیست اور امن سے لاپرواہ ہو کر ایسا اقدام کیا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے حقِ زیست کو ضبط کرا بیٹھا ہے۔ اس طرح جان لینا، اُس جان لینے کے برعکس ہے۔

قرآن مجید بیان کرتا ہے:

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا. (سورۃ المائدہ، آیت:۳۲)

(جو شخص کسی کی جان بچالے تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی)

کسی شخص کو موت سے بچانے کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہے، یا زخمی ہے یا بھوکوں مر رہا ہے اس کا علاج کر دیا گیا یا کھانا وغیرہ کھلا کر زندہ رہنے کے قابل بنا دیا گیا۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسے عارضوں میں مبتلا افراد کی بلا امتیاز رنگ و نسل اور قومیت و مذہب زندگیاں بچائیں۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ

وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا. (سورۃ النساء، آیت: ۹۳)

(اور جو کوئی مومن کو ارادتاً قتل کر دے، اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس (قاتل) پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔ اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے)

(۲)۔ اسلام معاشی حقوق کو تسلیم کرتا ہے جس کے لیے قرآن مجید (سورۃ الذاریات، آیت: ۱۹) اپنے پیروکاروں کو یوں حکم دیتا ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ.

(اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق تھا)

بالفاظ دیگر ایک طرف وہ اپنے رب کا حق پہچانتے ہیں۔ دوسری طرف بندوں کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے کہ وہ اپنے مال میں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، صرف اپنے بال بچوں ہی کا حق نہیں سمجھتے۔ ان کو احساس ہے کہ ہمارے اس مال میں ہر اس بندۂ خدا کا حق ہے جو مدد کا محتاج ہو اور کسی وجہ سے سوال نہ کر سکتا ہو۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا (صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث: ۲۱۳۷) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں روزِ قیامت تین افراد کا مخالف ہوں گا:

(i)۔ وہ شخص جو میرے نام کی قسم کھاتا ہے مگر دغابازی کرتا ہے؛

(ii)۔ وہ شخص جو کسی آزاد فرد کو غلام ظاہر کر کے فروخت کر دیتا ہے اور اس قیمت کو کھا جاتا ہے؛

(iii)۔ جو شخص کسی سے مزدوری کراتا ہے اور اس سے پورا کام لیتا ہے مگر اس کی اجرت ادا نہیں کرتا۔

(۳)۔ اسلام انصاف پر بہت زور دیتا ہے۔ اس بات کو قرآن مجید میں یوں واضح کیا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. (سورۃ الحدید، آیت: ۲۵)

(ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں)

وہ مقصد وحید جس کے لیے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک، سارے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے وہ تین چیزوں (واضح نشانیوں، کتابوں اور میزان) کے ساتھ آئے تاکہ دنیا میں بنی نوع انسان کا طرزِ عمل اور نظامِ زندگی، انفرادی اور اجتماعی، دونوں انصاف کے ساتھ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کے حقوق، اپنے حقوق اور جن لوگوں کے ساتھ اسے رہنا ہے، ان کے حقوق سے واضح طور پر آگاہ رہے اور اسے سب حقوق پوری ایمانداری سے ادا کرنے ہیں۔ اس طرح اجتماعی زندگی کے نظام (معاشرہ) میں سے ہر طرح کی ناانصافی دور کر دی جائے۔ معاشرتی زندگی کو انتہا پسندی سے تحفظ دیا جائے۔ اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں صحیح توازن اور عدل و احسان قائم کیا جائے تاکہ معاشرے کے جملہ اجزا (عناصر) انصاف کے ساتھ اپنے اپنے حقوق پائیں اور اپنے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ایمانداری کے ساتھ ادا کریں۔

بہ الفاظ دیگر تمام انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے کا مقصد انفرادی اور اجتماعی انصاف کا قیام تھا۔ وہ پروردگار کی طرف سے ہدایت کے مطابق ہر فرد کی ذاتی زندگی میں، اس کے ذہن میں، اس کے کردار میں، اس کے طرزِ عمل اور کاروبار میں ایک توازن، ضبط و اعتدال پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی وہ پورے انسانی معاشرے کو بھی انصاف کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے تھے تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ روحانی، اخلاقی اور مادی طور پر معاون بنیں، نہ کہ ایک دوسرے کے لیے راستے کی رکاوٹ بن جائیں۔ (تفہیم القرآن، ذیل آیت مذکورہ)

اس طرح قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا.
(سورۃ المائدہ، آیت: ۲)

(اور دیکھو ایک گروہ نے جو تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو)

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.
(سورۃ المائدہ، آیت: ۸)

(کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا.
(سورۃ النساء، آیت:۱۳۵)

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عدل و انصاف پر مضبوطی کے ساتھ گواہی دینے والے ہو جاؤ۔ چاہے وہ تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ داروں، عزیزوں کے۔ وہ امیر ہو یا غریب اللہ تعالیٰ ان دونوں کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ تم خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑو اور اگر تم نے غلط بیانی یا پہلوتہی کی تو جان لو جو کچھ تم کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے)

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ. (سورۃ النساء، آیت:۵۸)

(اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو)

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ. (سورۃ الانعام، آیت:۱۶۴)

(کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے)

(۴)۔ اسلام لوگوں کے درمیان بلا امتیاز رنگ و نسل اور قومیت و مذہب قطعی مساوات پر یقین رکھتا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى. (سورۃ الحجرات، آیت:۱۳)

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا)

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ.
(سورۃ الحجرات، آیت:۱۳)

(اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ

مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ. (سورۃ الحجرات، آیت:۱۱)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد نافرمانی کرنا بری بات ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا. (سورۃ الحجرات، آیت:۱۲)

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بدگمانی کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ بہت سی بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔ جاسوسی نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ. (سورۃ النور، آیت:۲۷)

(اے یمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، جب تک کہ گھر والوں سے اجازت اور انہیں سلام کہہ لو)

(۵)۔ اسلام مذہب اور ضمیر کی آزادی کا تحفظ کرتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۲۵۶)

(دین کے بارے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے)

(۶)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانی عزت وتکریم کی تکمیل فرما دی۔ میثاقِ مدینہ اور خطبۂ حجۃ الوداع متذکرہ بالا جملہ تعلیماتِ قرآن مجید کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ خطبہ حجۃ الوداع انسانی حقوق کا پہلا باقاعدہ منشور تھا۔ اس کے نمایاں نقوش میں درج ذیل امور شامل تھے:

(i)۔ اے لوگو! جس طرح تم اس مہینے، اس دن اور اس شہر کو مقدس سمجھتے ہو اسی طرح تم ہر مسلمان کی زندگی اور اس کی املاک کو ایک مقدس امانت سمجھو۔

(ii)۔ کسی کو گزند نہ پہنچاؤ تا کہ تمہیں بھی کوئی گزند نہ پہنچائے۔

(iii)۔ تم ناانصافی نہ مسلط کرو گے اور نہ برداشت کرو گے۔

(iv)۔ اے لوگو! عورتوں کے تم پر حقوق ہیں اور اسی طرح تمہارے عورتوں پر حقوق ہیں اس لیے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا اور ان پر شفقت کرنا کیونکہ وہ تمہاری شریک کار اور پرخلوص مددگار رہیں۔

(v)۔ تمام بنی نوع انسان حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام سے ہی پیدا ہوئے۔ ایک عربی کو ایک عجمی پر کوئی فوقیت نہیں اور نہ ایک عجمی کو ایک عرب پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ نیز ایک سفید فام کو کسی سیاہ فام پر اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سفید پر کوئی فوقیت حاصل ہے ماسوائے تقویٰ اور اعمالِ صالحہ کے۔

(vi)۔ جان لو کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان اکٹھے ہو کر ایک اخوت بن چکے ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے وہ چیز حلال نہیں ہے جو اس کے ساتھی مسلمان کی ہے تاوقتیکہ وہ اپنی آزاد مرضی اور ارادے سے اس کو وہ چیز دے دے۔

(vii)۔ اپنے آپ سے ناانصافی نہ کرنا۔

(۷)۔ قرآن مجید انسانی حقوق کے محترم ہونے کی یہ وجہ بتاتا ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ.
(سورۃ الاعراف، آیت: ۵۲)

(اور بلاشبہ ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے علم کے ساتھ خوب کھول کر بیان کیا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے)

انسانوں کے لیے رحم وہ صفت (value) ہے جس کے اندر نرم مزاجی، توجہ، رواداری، محبت اور عفو جیسے جذبات پائے جاتے ہیں۔ جب ان خصوصیات کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ بندوں کے لیے ان کے خالق کی رحمت کا ایک عکس ہوتی ہیں۔ قرآن مجید واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری مخلوقات کے لیے رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

صرف اپنے خاندان، دوستوں یا عرب قوم یا ساتویں صدی عیسوی کے یا ہمیشہ آنے والے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سارے جہانوں کے لیے رحمت بنایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ (سورۃ الانبیاء، آیت:۱۰۷) ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ.

(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمتِ مجسم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اردگرد کے تمام لوگوں، خاندانوں، یتیموں، دوست احباب، اجنبیوں حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی شفقت فرماتے تھے۔ آیئے ایک مثال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح حیات سے لیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں اپنے خادموں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ایک بدو آیا اور اس نے مسجد نبوی کے صحن میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اٹھ کر بھاگے تا کہ اس کو روکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سختی سے فرمایا کہ اسے تنگ نہ کرو۔ پیشاب کرنے دو۔ اس کی مجبوری ہوگی[1]۔ قربان جاؤں یہ تھے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام کہلانے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دوسرے مسلمان کو اپنی مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دیتے۔ کیا نسبت ہے؟ کیا قربت ہے؟ کیا بعد المشرقین ہے؟ تو کجا و من کجا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ماحول اور جانوروں کا بھی خیال رکھتے اور ان کے ساتھ رحم کا سلوک کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ واضح کر دیتے ہیں کہ بے چارے جانوروں کو اذیت دینا نہ صرف ناقابل قبول ہے بلکہ ہم ایسی حرکتوں کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ بھی ہیں۔

(i)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کھیل تماشے کے لیے ایک چڑیا کو مار دیتا ہے تو وہ چڑیا روزِ قیامت فریاد کرے گی: اے اللہ تعالیٰ! اس شخص نے مجھے خواہ مخواہ قتل کر دیا

---

[1]۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا، تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی ڈال دو۔ اس لیے کہ تم لوگ نرمی کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، سختی کرنے کے لیے نہیں۔ (صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث:۲۲۱)

تھا۔اس نے یہ کام کسی مفید مقصد کے لیے نہیں کیا تھا۔(سنن نسائی، ج:۳،رقم الحدیث:۷۵۵)

(ii)۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر کسی جانور پر زیادہ بوجھ لدا ہوا دیکھتے یا لاغر حالت میں پاتے تو اس کے مالک سے ارشاد فرماتے کہ جانوروں سے سلوک کرتے ہوئے خدا سے ڈرا کرو۔

(مسند احمد، ج:۱،رقم الحدیث:۱۶۶۲)

(iii)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی کسی حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ہم نے ایک چھوٹی چڑیا دیکھی اس کے دو بچے تھے۔ہم نے اس کے دونوں بچے پکڑ لیے، تو وہ چڑیا آئی اور (انہیں حاصل کرنے کے لیے) تڑپنے لگی۔ اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: کس نے اس کے بچے لے کر اسے تکلیف پہنچائی ہے؟ اس کے بچے اسے واپس لوٹا دو۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی جسے ہم نے جلا ڈالا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کس نے جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آگ کے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کے لیے آگ کی سزا دینا مناسب نہیں ہے۔(سنن ابوداؤد، ج:۳،رقم الحدیث:۱۸۵۶)

(iv)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک راستے پر سے گزر رہے تھے۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ساتھ تھے۔راستے میں ایک کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں راستہ چھوڑ دینا چاہیے ورنہ کتیا پریشان ہوگی۔بچے دودھ نہیں مکمل کر سکیں گے۔

یہ تعلیمات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کی عکاسی کرتی ہیں جن کے اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔آج مشرق اور مغرب کے مسلمانوں میں اس اخلاقی کردار کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی۔ہم وہ لوگ ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے پیروکار ہونے کا دعویٰ تو رکھتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پرعظمت کردار کا ہم میں کوئی شائبہ تک پایا جاتا ہے؟

جدید دنیا نے انسانی حقوق پر بہت زور دیا ہوا ہے۔ہم مسلم معاشرے کے لوگ، بدقسمتی سے اسلام کی واضح تعلیمات کے برعکس انسانی حقوق کی جدید تحریک کو اسلام کے خلاف چال اور

سازش قرار دیتے ہیں۔نتیجتاً ہم نے اس مسئلے کے بارے میں منفی ذہن بنا لیا ہے جو کہ بہت نقصان دہ ہے۔ہم پر تو اپنی تاریخ کے لحاظ سے بھی ایک ذمہ داری تھی کہ انسانی حقوق کی تحریک کا آغاز ہم خود کرتے اور اس کی رہنمائی کرتے۔ہم انسانی حقوق کے محافظ ہیں۔جیسا کہ قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری خطبے اور دیگر احادیث میں مذکور ہے۔لیکن الٹا ہم نے رجعت پسندانہ اور منفی طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔جس کی وجہ سے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں یہ رویہ اسلام کے نصب العین سے مطابقت نہیں رکھتا۔

ہم اپنے ورثے سے ہمکنار ہو سکتے ہیں اور آج کی دنیا سے ہم آہنگ اور ہمقدم ہو کر چلنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ہم جدید دنیا پر اسلامی اقدار کے اطلاق کے لیے کھلے ذہن سے کوئی بھی قابلِ عمل طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ہم جدید انسانیت کے ان طور طریقوں سے اختلاف کر سکتے ہیں جو ہمارے نظامِ عقائد سے متصادم ہو۔ہم اپنے عقائد سے مطابقت رکھنے والے طریقوں کو مثبت انداز میں قبول کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۲۔ تفہیم القرآن، سید ابواعلیٰ مودودیؒ۔ لاہور: الاصلاح کمیونیکیشن نیٹ ورک، ۱۹۹۹ء۔

۳۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ ترجمہ مولانا محمد ظفر اقبال۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ سنن ابو داؤد، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعت سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

۱۷

عورت کے انسانی حقوق



وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۲۲۸)
(عورتوں کے بھی معروف طریقے پر وہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں)

عورتیں کل انسانیت کا نصف حصہ ہیں۔ عالمی آبادی کا پچاس فیصد (50%) عورتوں پر مشتمل ہے لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں کا عورتوں کے بارے میں عمومی رویہ اسلامی نہیں ہے۔ یہ عہد متوسط کے روایت پسندانہ طرز عمل جیسا ہے۔ عورتوں کے بارے میں یہ رویہ اخلاقی طور پر غلط ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ دور حاضر کے تقاضوں سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس نصف انسانیت کے بارے میں بیرونی تصورات سے بہت متاثر ہیں۔ ان تصورات میں سے ایک تصور یہ ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام معصیت کے پہلے اقدام (حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے) کا سبب بنی تھی۔ اس سے اس تصور نے جنم لیا کہ عورتیں تمام معصیتوں کی جڑ ہیں۔ چنانچہ مردوں نے عورتوں کو منبعِ فساد قرار دے کر اپنی فکر و عمل کا ایک مخصوص انداز اختیار کر لیا۔

مسیحیوں نے شروع شروع میں اس عقیدے کو محورِ خیال بنائے رکھا لیکن اب وہ عورتوں کے بہت سے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں جو کہ تحریک حقوقِ انسانی کا نتیجہ ہے تاہم مسلمان ابھی تک 'اسرائیلیات' (روایاتِ عہد نامہ قدیم و جدید) کی کہانیوں اور افسانوں کو اپنی تقریروں اور تحریروں اور عمل کے ذریعے دوہراتے رہتے ہیں۔ جب کہ قرآن کریم اس بارے میں بالکل مختلف اور بہت واضح انداز میں احکامات دیتا ہے۔

(۱)۔ اسلام نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں اعلان کرتا ہے کہ ایک عورت بطور ایک بنی نوع انسان مرد کے مساوی ہے۔ قرآن مجید مردوں اور عورتوں کو ایک ہی طریقے سے مخاطب کرتا ہے۔ یعنی 'الناس' (اے لوگو) الانسان (اے بنی نوعِ انسان)، البشر (اے انسانوں) اور المؤمن (اے ایمان والو)۔ یہ سب اصطلاحیں عوام کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال ہوئی ہیں، جو عورتوں اور مردوں، دونوں کے لیے ہیں۔ اس میں کوئی امتیاز نہیں، خواہ صنف کے لحاظ سے وہ جو کچھ بھی ہیں۔ قرآن مجید (سورۃ النساء، آیت: ۴) نے دونوں کی برابری بیان کی ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ.
(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا)

قرآن مجید اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کو مساوی مخرج سے پیدا کیا۔ بطور بنی نوع انسان ان میں سے کسی کو دوسرے پر کسی بھی لحاظ سے برتری یا کمتری کی حالت میں نہیں بنایا تاہم ان میں سے کسی کو اخلاقی برتری، راستبازی، انصاف پسندی اور نیک اعمال کی بنا پر ہوسکتی ہے۔ اس برتری کو مرد یا عورت مساوی طور پر حاصل کر سکتے ہیں:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ. (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳)
(اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہارے خاندان اور قبیلے بنا دیئے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)

(۲)۔ زمانہ قبل از اسلام ایک عام معاشرتی اور کسی قدر مذہبی عقیدہ تھا کہ عورتوں پر اس لیے لعنت بھیجی گئی کہ حضرت حوا علیہا السلام باغِ بہشت سے حضرت آدم علیہ السلام کے اخراج کا سبب بنی تھی۔ قرآن مجید نے یہ کہانی بیان کرتے ہوئے بار بار حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام دونوں کا ذکر کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ خطا حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام دونوں سے سرزد ہوئی تھی۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَاۤ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَاۤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. (سورۃ الاعراف، آیت: ۲۲)
(پس اس نے دونوں کو دھوکے سے پھسلا دیا جب دونوں نے اس درخت کو چکھا تو ان کے لیے ان کی شرمگاہیں ظاہر ہوگئیں اور دونوں جنت کے پتے اپنے آپ پر چپکانے لگے اور ان دونوں کو ان کے رب نے آواز دی کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور تم دونوں سے نہ فرمایا تھا کہ بیشک شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے)

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ. (سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۶)

(لیکن شیطان نے ان دونوں کو پھسلا کر وہاں سے نکلوا دیا)

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ.
(سورۃ الاعراف، آیت: ۲۳)

(دونوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے)

(۳)۔ اسلام مرد اور عورت، دونوں کو یکساں حیثیت دیتا ہے اور اس نے صنف کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا۔ اسلام عورتوں اور مردوں کو برابر اہمیت دیتا ہے اور اس نقطے پر زور دیتا ہے کہ ان دونوں اصناف میں سے کسی ایک کو بھی قتل کرنے والے کو مساوی سزا ملے گی۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا. (سورۃ النساء، آیت: ۹۳)

(اور جو کوئی مومن کو ارادتاً قتل کر دے، اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے)

ہم صنفی مساوات کی وضاحت سے متعلق قرآنی تعلیمات کو نظر انداز کرتے ہوئے عموماً اور غلط طور پر مسلم معاشرے یہ یقین کئے جا رہے ہیں کہ مرد عورتوں سے ایک بالاتر مخلوق ہے۔ یہ موقف رکھنے والے بہانے کے طور پر اس آیت کا سہارا لیتے ہیں۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ.
(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۲۸)

(عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے)

یہ آیت مسلمانوں کو محض یہ ہدایت فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے خاندانی معاملات کو کیسے چلائیں۔ اسلام خاندان کو ایک بنیادی معاشرتی اکائی قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد دونوں کے حقوق اور فرائض کا اس مقدس اکائی کے اندر تعین کیا ہے۔ جہاں تک ان الفاظ 'مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے' کا تعلق ہے ان کا اطلاق خالصتاً ان دونوں کے ازدواجی تعلق اور خصوصاً مردوں کی اپنے خاندان کے لیے کما کر لانے کی ذمہ داری پر ہوتا ہے۔ یہ مرد کو عورتوں کو

کنٹرول میں لینے اوران سے بدسلوکی کرنے کالائسنس نہیں دے دیتا، کیونکہ اسلام انہیں برابر کے انسان قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق عزت کے مستحق بنی نوع انسان، مرداورعورتیں، دونوں ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی بہترین تخلیق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بنی آدم (انسان) کو بے پناہ شفقت سے نوازا ہے۔

لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ. (سورۃ التین، آیت:۴)
(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے)

وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِیۡلًا. (سورۃ الاسراء، آیت:۷۰)
(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی، انہیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اوران کو پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا اوراپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت بخشی)

اسلام نے زمانہ قبل از اسلام میں مروج دخترکشی کی شدید مذمت کی ہے۔قرآن مجید نے اس کے مرتکبین کوسخت تنبیہ کرتے ہوئے بتایا کہ قیامت کے روز ان سے اس برے فعل کے بارے میں پوچھا جائے گا۔قرآن مجید نہایت زوردار طریقے سے کہتا ہے:

وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ ۞ وَاِذَا الۡمَوۡءٗدَةُ سُئِلَتۡ. (سورۃ التکویر، آیات:۸-۹)
(اور جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس غلطی کے بدلے قتل گئی)

قرآن مجید بیٹیوں کی پیدائش کوایک رحمت کہتا ہے اوراپنے پیروکاروں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ بیٹی کی پیدائش کوخاندان کے لیے غمناک موقع نہ سمجھا کریں۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰی ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّهُوَ کَظِیۡمٌ ۞ یَتَوَارٰی مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَیُمۡسِکُهٗ عَلٰی هُوۡنٍ اَمۡ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ.
(سورۃ النحل، آیات:۵۸-۵۹)
(جب ان میں کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تواس کے چہرے پرکلونس چھا جاتی ہے اوروہ خون کاسا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بُری خبر کے بعد کسی کو کیا

منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ دیکھو کتنی بری بات ہے)

(۴)۔ اسلام حصول علم کو مرد اور عورت دونوں کے لیے لازم قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید علم کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (سورۃ الانبیاء، آیت: ۷)
(تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب (علماء) سے پوچھ لو)

اسی طرح متعدد احادیث میں عورتوں کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

(i)۔ حصول علم تمام مسلمانوں کے لیے لازم ہے۔ (سنن ابن ماجہ، ج:۱، رقم الحدیث: ۲۲۴)

(ii)۔ جو آدمی بھی اپنی لونڈی کی تربیت کرتا ہے اور اچھی تربیت کرتا ہے۔ اس کو تعلیم دلاتا ہے اور اچھی تعلیم دلاتا ہے۔ پھر اس کو آزاد کرتا ہے اور اس سے شادی کرتا ہے تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔ (سنن کبریٰ للبیہقی، ج:۸، رقم الحدیث: ۱۵۶۹)

(iii)۔ کچھ خواتین نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استدعا کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرح مردوں کو وقت دیتے ہیں اسی طرح ہمارے لیے بھی ایک دن مقرر فرما دیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے ایک دن کا وعدہ کر لیا۔ اس دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں دینی اسباق دیتے اور احکاماتِ الٰہی سے آگاہ کرتے تھے۔ (صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث: ۱۰۴)

(۵)۔ اسلام مسلمان عورتوں کو زندگی کے تمام معاملات پر اظہار خیال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ گھر کے امور سے لے کر سیاسی تنظیم تک وہ ہر معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہیں۔ قرآن مجید (سورۃ الشوریٰ، آیت: ۳۸) مسلمانوں کی ایک خصوصیت کو درج ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ.
(وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مختلف معاملات میں اپنی ازواجِ مطہرات سے مشورہ کرتے اور ان کی

آرا معلوم کرتے تھے۔ ایک مثال کا ذکر سیرۃ اور احادیث کی کئی کتابوں میں آتا ہے۔ جب حدیبیہ میں ایک عارضی معاہدہ ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سال حج کئے بغیر مدینہ واپس چلے جائیں گے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس شرط پر خوش نہیں تھے جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طرفین کے مابین خونریزی سے بچنے کے لیے قبول کر لیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ مدینہ منورہ واپس جانے سے پہلے اپنے جانور ذبح کر لیں اور سر منڈوانے کی رسم حج ادا کر لیں۔ لیکن کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مشورہ پر عمل نہ کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبار اپنے الفاظ دوہرائے، پھر بھی کسی نے عمل نہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر حیرت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف گئے اور اپنی ناراضی سے انہیں آگاہ کیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عمل نہیں کر رہے ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی چاہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز پر عمل کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے یہ عمل خود کر کے دکھائیں، یہ جگہ چھوڑ دیں اور اس وقت تک کسی سے بات نہ کریں جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود قربانی کر کے سر نہ منڈوالیں۔

(صحیح بخاری، ج:۳، رقم الحدیث:۸۹۱)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا تھا۔ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ اعمال دیکھے تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ کام کرنے لگے جن کے لیے انہیں پہلے کہا گیا تھا۔ یہ حدیبیہ کے مذاکراتِ امن میں خواتین کی شمولیت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان سے مشاورت کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ کام ایسے وقت ہوئے جو تاریخِ اسلام کے بڑے حساس لمحات تھے۔ اسی طرح ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے موقع پر خواتین سے مشورہ کیا گیا تھا۔

ایک اور دلچسپ نظیر بھی ہے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اپنے خطبے میں مشورہ دیا کہ حق مہر بہت زیادہ مقرر نہ کیا کرو کیونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیویوں کو بارہ

اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں دیا۔ یہ سن کر ایک عورت اٹھ کھڑی ہوئی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولی کہ جب اللہ تعالیٰ ہمیں زیادہ دلوانا چاہتا ہے آپ رضی اللہ عنہ ہمیں کیوں محروم کررہے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ نہیں کہا:

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا. (سورۃ النساء، آیت: ۲۰)

(خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا)

یہ دلیل سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے مہر کی مقدار مقرر کرنے کا اپنا حکم واپس لے لیا۔ اسلام نے عورتوں کو جھوٹے الزام سے محفوظ رکھنے اور ان کی آبرو کے تحفظ کے لیے مثالی سزا (حدّ قذف) مقرر کی ہے۔ قرآن مجید نے اعلان کیا ہے کہ تمام عورتیں باعصمت ہیں اور اپنے پیروکاروں کو کہا ہے کہ وہ ان پر بے بنیاد الزامات ہرگز نہ لگائیں۔ اگر کسی عورت پر حرام کاری کا الزام ہے تو الزام لگانے والے پر لازم ہے کہ وہ ثبوت کے لیے چار گواہ پیش کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو اسے اسی (۸۰) کوڑے مارے جائیں گے۔ مزید برآں وہ آئندہ کبھی گواہی دینے کا اہل نہیں رہے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. (سورۃ النور، آیت: ۴)

(اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ پیش نہ کریں ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے کیونکہ وہ فاسق ہیں)

(۶)۔ اسلام عورتوں کو اقتصادی حقوق دیتا ہے، جن میں گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کا حق بھی شامل ہے۔ قرآن مجید دو عورتوں کے کام کرنے کا ذکر کرتا ہے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۠ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۫ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ. (سورۃ القصص، آیت: ۲۳)

(اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روکے ہوئے ہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے ان عورتوں

سے پوچھا تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ انہوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاسکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ لے جائیں اور ہمارے والد بہت بوڑھے آدمی ہیں)

اسلام نے عورتوں کو بطور ماں، بہن، بیٹی اور بیوی، کی حیثیتوں سے حقوقِ وراثت دیئے ہیں۔ وہ اپنے آباؤاجداد کی املاک میں سے اپنا جائز حصہ پاسکتی ہیں۔قرآن مجید (سورۃ النساء، آیت: ۷) میں ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا.

(ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں مردوں کا حصہ ہے اور عورتوں کا بھی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں حصہ ہے۔ مال کم ہو یا زیادہ حصہ مقرر کر دیا گیا ہے)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجہ تھیں اور قریش کی ایک مشہور تاجر تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جوانی میں ان کا مالِ تجارت لے کر بیرونی ممالک میں جاتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بارے میں روایت کرتی ہیں کہ وہ چمڑے کو سکھا کر اس سے مختلف چیزیں بناتیں اور مارکیٹ میں فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم غرباء میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ (سنن نسائی، ج: ۲، رقم الحدیث: ۱۳۰۷)

مسلمانوں کی تاریخ انکشاف کرتی ہے کہ مسلمان عورتیں جہاد میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم عورتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتی تھیں قوم کو پانی پلاتی تھیں اور ان کی خدمت کرتی تھیں اور زخمیوں کو مدینہ پاک لاتی تھیں۔ (صحیح بخاری، ج: ۳، رقم الحدیث: ۶۵۷)

(۷)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک کنواری لڑکی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح ایسی جگہ کر دیا ہے جو اسے پسند نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لڑکی کو اختیار دے دیا (اگر وہ چاہے تو نکاح فسخ کر دے۔ (مسند احمد، ج: ۲، رقم الحدیث: ۶۰۰) اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ابو ودیعہ جن کا نام کذام تھا نے اپنی بیٹی کا نکاح ایک

شخص سے کر دیا۔ ان کی بیٹی حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور شکایت کی کہ اس کا نکاح فلاں شخص سے زبردستی کیا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے اس کے شوہر سے الگ کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ عورت کو مجبور نہ کیا کرو۔ (مسند احمد، ج: ۲، رقم الحدیث: ۱۵۲۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کنواری لڑکی سے نکاح کی اجازت لی جائے اور شوہر دیدہ عورت سے مشورہ کیا جائے۔ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کنواری لڑکی شرماتی ہے (تو اس سے اجازت کیسے حاصل کی جائے؟)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی خاموشی ہی اس کی رضامندی کی علامت ہے۔ (مسند احمد، ج: ۴، رقم الحدیث: ۱۳) ایک دوسری روایت (مسند احمد، ج: ۴، رقم الحدیث: ۱۸۰۷) میں ہے کہ اگر وہ (لڑکی) انکار کر دے تو اس پر زبردستی کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے اپنی بیٹی حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کرانے سے پہلے بیٹی کی رضا پوچھی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے حضور نبی کریم ﷺ کو شادی کی پیشکش ایک اور واضح مثال ہے کہ خواتین کو اپنے شوہر کے انتخاب کا مکمل حق حاصل ہے۔

(۸)۔ قرآن مجید واضح کر دیتا ہے کہ تمام مسلمان عورتیں کسی عدالت میں بطور گواہ پیش ہونے کی اہلیت رکھتی ہیں تاہم بعض فقہاء کرامؒ کی رائے ہے کہ 'حدود' کے کیس میں ایک عورت کا بطور گواہ پیش ہونا ناقابل قبول ہے جب تک کہ ان میں سے دو اکٹھی ہو کر ایک مرد گواہ کے ہمراہ گواہی نہ دیں۔ یہ فقہاء کرامؒ اپنی دلیل کی تائید میں ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں:

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى. (سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۸۲)

(اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے)

روایتی علماء اور فقہاء اس آیت کی سخت تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ آیت صرف قرضے اور کاروباری معاملات کے بارے میں ہے جن سے عورتیں زمانۂ وحی میں عموماً غیر متعلق رہتی تھیں۔ بعض اہل دانش اس سخت گیرانہ تعبیر سے درج ذیل وجوہ کی بنا پر اختلاف رکھتے ہیں:

(i)۔ یہ آیت ایک اصول کی تشریح کرتی ہے جو تجارتی معاملات کا حوالہ دیتا ہے۔

(ii)۔ یہ شہادت کا کوئی قانونی اصول نہیں بتاتی۔

(iii)۔ اس کا اطلاق زندگی کے دیگر شعبوں پر نہیں کیا جا سکتا خاص طور پر اس وقت جب قرائنی شہادت کی ضرورت ہو۔

(iv)۔ اس آیت میں کسی صورت بھی یہ نہیں بتایا کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔

(v)۔ یہ آیت سبب (تناسب) بتاتی ہے کہ اگر ایک عورت غلطی کر جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے گی۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس زمانے میں عورتیں زیادہ تر ایسے معاملات سے سروکار نہیں رکھتی تھیں۔ اس لیے ان کے فہم میں غلطی کا امکان ہو سکتا تھا۔

(vi)۔ ایسے معاملات میں جج کو فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کون سی گواہی قبول کرنی ہے اور کس پر انحصار کرنا ہے۔

(vii)۔ یہ آیت صرف مستقبل کے مالیاتی امور تک محدود ہے، اس کا دیگر معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(viii)۔ جب خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کی اہلیہ حضرت سیدہ نائلہ رضی اللہ عنہا کی گواہی کو قبول کیا کیونکہ وہ آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی واحد گواہ تھیں۔

اگر روایت حدیث میں ایک عورت کی گواہی مساوی طور پر قبول کر لی جاتی ہے اور حدیث ماخذِ قانون مانی جاتی ہے تو معمول کے معاملات (قانونی یا فوجداری) میں عورت کی گواہی کیوں قبول نہیں کی جا سکتی۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دو ہزار پانچ سو (2,500) سے زائد احادیث مروی ہیں اور اسلامی قانون کے متعدد اہم اصول ان روایات پر استوار ہیں۔

(۹)۔ اسی طرح ایک عورت کو بطور ماں، بہن، بیٹی اور بیوی خصوصی حقوق حاصل ہیں جن میں اعتماد و بھروسہ، عزت واحترام، حُسن سلوک، مناسب برتاؤ، فراہمی خوراک، لباس، رہائش، بڑھاپے میں خصوصی دیکھ بھال اور دیگر روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل شامل ہیں۔ قرآن مجید میں والدہ کے حقوق کے متعلق بے شمار آیات موجود ہیں:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ.
(سورۃ لقمان، آیت: ۱۴)

(ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں نصیحت کی ہے۔ اس کی ماں نے اسے اپنے بطن میں بہت کمزوری میں اٹھائے رکھا اور دو سال اسے دودھ پلاتی رہی)

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا. (سورۃ الاحقاف، آیت: ۱۵)

(ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے)

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا.
(سورۃ الاسراء، آیت: ۲۴)

(اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو: اے ہمارے پروردگار! ان پر رحم فرما! جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا)

(۱۰)۔ اسلام بیٹے اور بیٹی کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتا بلکہ اہل ایمان کو تحریک دیتا ہے کہ وہ بیٹیوں کے ساتھ زیادہ شفقت و رحم کا سلوک کریں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جس کسی کے ہاں بیٹی جنم لے اور وہ اسے زندہ نہیں دفنا دیتا، اس کی تذلیل نہیں کرتا اور بیٹے کو اس پر ترجیح نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کر دے گا۔

(سنن ابوداؤد، ج: ۳، رقم الحدیث: ۵۱۴۶)

ایک دوسری روایت ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص دو لڑکیوں کی ان کی بلوغت تک صحیح پرورش کرتا ہے، وہ شخص جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (صحیح مسلم، ج: ۳، رقم الحدیث: ۲۱۹۴)

ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں، یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہیں اور وہ اچھی طرح ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، تو اس کے لیے جنت ہے۔ (جامع ترمذی، ج: ۱، رقم الحدیث: ۱۹۹۶)

(۱۱)۔ اسلام مردوں کو سکھاتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا سلوک کریں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ. (سورۃ الروم، آیت:۲۱)

(اوراس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور شفقت پیدا فرمادی۔ یقیناً اس میں اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں)

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۱۸۷)

(بیویاں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو)

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا. (سورۃ النساء، آیت:۱۹)

(ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت بھلائی رکھ دی ہو)

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۲۲۸)

(اوران کے خاوند اگر پھر موافقت چاہیں تو اس (مدت) میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ایسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے۔ البتہ مردوں کو ایک درجہ عورتوں پر فضیلت حاصل ہے)

اسی طرح بہت سی احادیث مردوں کو اپنی بیویوں سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آنے کی ہدایت کرتی ہیں:

(i)۔ تم میں سے بہترین وہ ہیں جو اپنی بیویوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں اور تم سے میں اپنی ازواج کے ساتھ اچھا ہوں۔ (جامع ترمذی، ج:۲، رقم الحدیث:۱۸۶۶)

(ii)۔ مسلمانوں میں سے کامل وہ ہے جو اچھے آداب رکھتا ہے اور اپنے خاندان پر شفقت کرتا ہے۔ (جامع ترمذی، ج:۱، رقم الحدیث:۱۱۶۹)

(iii)۔ آدمی کے اسلام لانے کے بعد اسے جو چیز سب سے بہتر فائدہ پہنچاتی ہے وہ اس کی خوبصورت بیوی ہے۔ جب بھی وہ اس کی طرف نظر کرتا ہے وہ اسے خوش کرتی ہے۔ جب وہ اسے حکم دیتا ہے وہ اس کی اطاعت کرتی ہے۔ اس کے گھر پر نہ ہونے کی صورت میں اس کے مال اور اپنی جان کی حفاظت کرتی ہے۔ (کنز العمال، ج:۸، رقم الحدیث:۴۶۷۲)

(iv)۔ اپنی بیویوں کے حقوق پورے کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قابلِ احترام مخلوق ہیں۔ خبردار رہو کہ انہیں غذا، لباس اور دیگر ضروریات پوری کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ (جامع ترمذی، ج:۲، رقم الحدیث:۱۰۲۹)

اسلام شادی کے ادارہ کو بے حد اہمیت دیتا ہے اور اپنے پیرکاروں کی اپنی پسند کی شادی کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ مسلمان مرد اور عورت بلوغت کو پہنچنے کے بعد نکاح کا معاہدہ کر سکتے ہیں۔ تاہم مسلمانوں کے لیے شادی اس صورت میں لازمی نہیں ہے اگر وہ شادی کی ذمہ داریاں پوری کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ. (سورۃ النور، آیت:۳۲)
(تم میں سے جو لوگ غیر شادی شدہ ہوں اور تمہارے لونڈی اور غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو)

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ دنیا میں بہترین چیز ایک اچھی عورت ہے۔ (مشکوۃ المصابیح، ج:۳، رقم الحدیث:۳۰۸) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آگاہ رہو! تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ پس وہ امیر جو لوگوں پر نگہبان بنایا گیا ہے (روز قیامت) اس سے لوگوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے مکان اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص

اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے۔(سنن ابوداؤد،ج:۲،رقم الحدیث:۱۱۶۱)

ذرا تصور میں لائیے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کیسا سلوک فرماتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے گھر میں، دروازے پر دستک دیئے بغیر کبھی داخل نہیں ہوئے اور جب بھی وہ تشریف لاتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی میں ان کی سہیلیوں کو عید پر تحفے بھیجتے رہے۔(جامع ترمذی،ج:۱،رقم الحدیث:۲۱۰۶)اس سے زیادہ اپنی بیوی کی محبت اور احترام کیا ہو سکتا ہے۔

(۱۲)۔ ہم اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی ہیں لیکن ہم نے خواتین سے متعلق بہت پست رائے قائم کر رکھی ہے اور ان سے توہین آمیز اور رسوا کن رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ہر لمحے کہتے ہیں کہ عورت جوتی برابر ہے۔عورت فتنہ ہے۔اس ضمن میں ہم نے بہت ایسی روایات کا سہارا لیا ہے جو جرح و تعدیل[1] کے اصولوں پر پورا نہیں اترتیں۔بعض احکام خاص حالات کے لیے تھے۔ہم نے انہیں عمومی بنا لیا ہے۔جو قانون اور اصول تعبیر کے تمام مروجہ اصولوں کے خلاف ہے لیکن ہم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

ایک سے زائد شادیوں سے متعلق قرآن مجید(سورۃ النساء، آیات:۲-۳)بہت واضح ہے:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ○ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا.

(یتیموں کو ان کا مال دے دو۔ان کے اچھے مال سے اپنا برا مال تبدیل نہ کرو۔ان کے مال میں اپنا مال ملا کر مت کھاؤ۔یہ بہت بڑا گناہ ہے۔اگر تمہیں ڈر ہے کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو (ان سے نکاح نہ کرو) ان سے نکاح کرو جو تمہیں پسند آئیں (ان کے علاوہ دوسری)

۱۔ جرح سے مراد حدیث کے راویوں کے وہ عیوب بیان کرنا جن کی وجہ سے ان کی عدالت ساقط ہو جاتی ہے اور ان کی روایت کردہ حدیث رد کر دی جاتی ہے اور تعدیل سے مراد حدیث کے راوی کے عادل ہونے کے بارے میں بتلانا اور حکم لگانا کہ وہ عادل یا ضابط ہے۔

عورتوں سے دودو، تین تین اور چار چار اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی.......اس سے تم ایک کی طرف جھکنے سے بچو گے)

حضرت سعید بن جبیرؒ[۱]، قتادہؒ[۲] اور دیگر تابعینؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم یتیموں کے حقوق کے بارے میں خوف زدہ ہو۔ اس طرح عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی فکر مند ہونا چاہیے۔

(i)۔ اس سے ثابت ہوا کہ اصل مسئلہ یتیم بچیوں کے حقوق کا بیان ہو رہا تھا۔ ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے ان سے شادی کے نام پر ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(ii)۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر تم انصاف کر سکو۔ یہ آیت تعدد ازواج کے جواز کو عدل کی شرط سے مشروط کرتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دغا بازی کرتا ہے۔ حکومت اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو ان کی دادرسی کریں۔ (تفہیم القرآن، ذیل سورۃ النساء: آیات: ۲-۳)

(iii)۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ واضح کیا جا رہا ہے کہ ایک ہی بہتر ہے تاکہ تم ایک کی طرف جھک کر برائی کے مرتکب ہو گے اور یہ انصاف کے خلاف ہوگا۔

ہم نے اس آیت کو اس کے تناظر سے باہر نکال لیا اور انصاف کی شرط کو بھی بھول گئے۔ شادی کو عیاشی کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ حکم نہیں تھا جو اہل اسلام پر فرض تھا بلکہ ایک خاص تناظر میں ایک مشروط رخصت تھی۔ یہ عمومی حکم نہیں تھا بلکہ خاص حالات میں ایک گنجائش تھی۔

آیئے حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت کو ملاحظہ کریں (آپ ﷺ کی اپنی شادیوں کو ہم یہاں موضوع نہیں بنا سکتے۔ اس لیے کہ قرآن پاک میں واضح ہے کہ یہ رعایت صرف

۱۔ حضرت سعید بن جبیرؒ (665ء-714ء) معروف تابعی، مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔ ان کی فقہی آرا کو اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے ہاں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

۲۔ حضرت قتادہ بن دعامہؒ پیدائشی نابینا معروف تابعی مفسر، محدث عصر اور فقیہ تھے۔

آپ ﷺ کے لیے تھی) بخاری شریف نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے منبر پر حضور نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے سنا۔ آپ ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ ہشام بن مغیرہ کی اولاد میں سے ایک نے مجھ سے یہ اجازت مانگی کہ وہ اپنی لڑکی کا نکاح علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سے کر دیں۔ تو میں تو اجازت نہیں دیتا۔ ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ کبھی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ابوطالب کا بیٹا میری بچی کو طلاق دے دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لے۔ بات یہ ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرا ایک ٹکڑا ہے جو اس کو برا لگے مجھے بھی لگتا ہے۔ جس چیز سے اس کو تکلیف ہو، مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے۔
(صحیح بخاری، ج:۳، رقم الحدیث:۲۱۸)

سوال یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو صرف اپنی بیٹی کے جذبات کی فکر تھی یا آپ ﷺ انسانی فطرت کے بارے میں ارشاد فرما رہے تھے؟ میرا ایمان ہے کہ نبی علیہ السلام صرف اپنی بیٹی کے لیے کوئی حکم جاری نہیں کرسکتا وگرنہ آپ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا اگر وہ چوری کرتیں۔ آپ ﷺ کی اس حدیث سے یہ بات واضح ہے کہ دوسری شادی عمومی معاملہ نہیں ہے۔ یہ دولت کے اظہار یا ہوس رانی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اصولی اور انسانی مسئلہ ہے۔

(۱۳)۔ اسلامی تہذیب کے سنہری عہد میں عورتیں مسلم معاشرے کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں وسیع اور موثر طور پر حصہ لیتی تھیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کی زوجہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنی نوعمری کے دور میں ہی ایک متبحر عالمہ تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فقہ، تاریخ اور ادب سے متعلقہ سوالات پر آپ رضی اللہ عنہا سے مشورہ لینے حاضر ہوتے تھے۔ حضرت اُمِ درداء رضی اللہ عنہا یروشلم کی مسجد میں عمومی تقریر کرنے آتی تھیں۔ جہاں اموی امیر سلیمان بن عبدالملک[1] بھی شریک مجلس ہوتے تھے۔

فقہ کے چار بڑے مکاتب میں سے ایک مکتبۂ فکر کے بانی حضرت امام شافعیؒ قاہرہ میں

[1]۔ سلیمان بن عبدالملک بن مروان بن حکم (674ء-717ء) ایک اموی خلیفہ تھا جو 715ء سے 717ء تک برسر اقتدار رہا۔

حضرت نفیسہؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت امام ابن حجر عسقلانیؒ[1] نے اپنے پچاس (۵۰) ساتھی شاگردوں کے ہمراہ مکتب عائشہ الحنبلیہ میں تربیت پائی۔ آپؒ نے اپنی سوانح حیات میں پندرہ سو (۱۵۰۰) سے زائد خواتین کا ذکر کرتے ہیں جو عالمہ اور فقہاء تھیں۔ امام سخاوی[2] نے نویں صدی عیسوی کی ذہین و دانشور خواتین کے لیے ایک پوری جلد وقف کی ہے جن میں سے متعدد 'فیض[3]' سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت امام جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی 'نزہہ' میں سنتیس (۳۷) مسلم شاعرات کی سوانح قلم بند کی ہے۔ امام ابن عساکرؒ[4] اکیاسی (۸۱) خواتین اساتذہ کے شاگرد تھے۔ اسلام کے چند بڑے علماء ابن خلکانؒ[5]، خطیب بغدادیؒ[6] اور حضرت امام زمخشری[7] نے اپنے علم کا بیشتر حصہ اپنی ہم عصر خواتین سے پایا۔ حضرت ابن مزرعہ رضی اللہ عنہ کی پوتی حضرت رقیہؒ اپنے دور میں حدیث کی نامور راویہ حدیث تھیں۔ انہیں مصر شام اور مدینہ منورہ میں بڑی تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی طرح بہت سی دیگر خواتین کو دینی علوم اور ادب میں بڑا مقام حاصل تھا۔ جن میں دمشق کی عائشہ قواعد عربی زبردست مہارت رکھتی تھیں اور خطیبہ بھی تھیں اور یروشلم کی عائشہ راویہ حدیث اور استاد تھیں۔

---

[1] حافظ احمد بن حجر عسقلانیؒ (1372ء-1449ء) ایک نامور شافعی فقیہ اور محدث تھے۔

[2] حضرت شمس الدین محمد بن عبدالرحمان سخاویؒ (1428ء-1497ء) ایک شافعی عالم، محدث اور مؤرخ تھے۔

[3] طربوش یا فیض (Fez) مراکش کا ایک شہر ہے جو 1927ء سے پہلے تک سلطنت مراکش کا دارالحکومت بھی تھا۔

[4] حافظ ابوالقاسم علی بن ابی محمد الحسن المعروف ابن عساکرؒ (1106ء-1175ء) دمشق (شام) کے ایک بلند پایہ محدث اور مورخ تھے۔ آپؒ نے دمشق کی تاریخ پر ایک ضخیم اور مفصل کتاب لکھی التاریخ الکبیر الدمشق کے نام سے لکھی۔

[5] شمس الدین ابن خلکان بن یحییٰ بن خالد برمکی المعروف ابن خلکانؒ (1211ء-1282ء) ایک نامور مورخ، فقیہ اور عالم تھے۔ آپؒ کی وجہ شہرت تصنیف وفیات الاعیان ہے جو تاریخ ابن خلکان کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

[6] احمد بن علی خطیب بغدادیؒ (1002ء- 1071ء) تاریخ عالم کے ایک نامور مفکر اور مورخ تھے۔ عام طور پر انہیں خطیب بغدادیؒ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد 60 ہے۔

[7] علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد زمخشریؒ (1075ء- 1144ء) ایک ممتاز عالم اور مفسر تھے جو تفسیر کشاف کے مولف ہیں۔

(۱۴)۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین اسلامی فوج میں بھی شامل رہیں۔ نہ صرف نرسوں کے طور پر بلکہ بطور محارب (جنگجو) بھی دادِ شجاعت دیتی رہیں۔ مؤرخ ابن اثیر[۱] نے ایک خاتون ہیر و صفیہ کی مثال دی ہے۔ جنگ یرموک میں حضرت اسما بنت یزید رضی اللہ عنہا نے تنِ تنہا دشمن کے نو (۹) سپاہیوں کو قتل کر دیا تھا۔ غزالہ نامی خاتون کی بہادری ایک ضرب المثل بن گئی جس کے فوجی دستے نے الحجاج کی اموی فوج کے چھکے چھڑا دیئے اور اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ فلسطین میں ہونے والی صلیبی جنگوں میں متعدد خواتین نے اپنے شوہروں کے شانہ بشانہ کئی معرکوں میں حصہ لیا۔

شجرۃُ الدُّر ایوبی سلطان صالح ایوب کی بیوہ تھی جس نے مصر کے خلاف ساتویں صلیبی جنگ (1249ء۔ 1250ء) میں شوہر کی وفات کے بعد فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اس نے 2 مئی 1250ء کو سلطانۂ مصر بن کر ایوبی دور کا خاتمہ اور مملوکوں کا آغاز کر دیا۔ ہندوستان میں رضیہ سلطانہ 1236ء سے لے کر 1240ء تک سلطانۂ دہلی رہی۔ اس دور کی دیگر شہزادیوں کی طرح اسے بھی فوج کی قیادت کرنے اور ضرورت پڑنے پر بادشاہت چلانے کی تربیت دی گئی تھی۔ چودہویں صدی عیسوی میں ترکان خیاتون خراسان میں تخت نشین رہی۔ اسی وقت مشہور و معروف تنزونے فارس اور عراق پر حکمرانی کی۔ اسی صدی میں ملکہ دلشاد عراقی صوبوں میں وسیع اختیارات کی حامل رہی۔

بارہویں صدی ہجری کے ایک اندلسی مؤرخ ابن جبیر[۲] نے لکھا ہے کہ علمی بحثوں میں عورتیں بھی حصہ لیا کرتی تھیں۔ احمد بن محمد المقری[۳] نے اپنی کتاب نفح الطب میں عورتوں کی شاعری پر طویل باب لکھا ہے۔ اس نے پچیس شاعرات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے فن بلاغت میں اعلیٰ مقام حاصل کیا تھا۔

۱۔ عزالدین ابوالحسن علی بن محمد بن عبدالکریم الجزری المعروف بہ ابن اثیر (1160ء۔ 1233ء) تاریخ اسلام کے مشہور تاریخ دان ہیں۔ مورخین میں ابن جریر طبری کے بعد ابن اثیر کا نام سب سے نمایاں ہے۔

۲۔ ابن جبیر (1145ء۔1217ء) اندلس کے ایک نامور سیاح، جغرافیہ دان اور شاعر تھے۔

۳۔ ابوالعباس احمد ابن محمد المقری (1578ء۔1632ء) ایک نامور مسلمان مورخ تھا۔

غرناطہ[1] عورتوں کے ادبی کارناموں کے حوالے سے بھی بہت مشہور شہر تھا۔ ادب اور فن میں عورتوں کی ذہانت کی لہلہاتی فصلیں عورتوں کو حاصل معاشرتی آزادی کی مرہون منت تھیں۔ ان میں بعض اپنے دور کی مشہور خطاط تھیں۔ مثلاً لبنیٰ اور فاطمہ (جو الحکم ثانی کی سیکرٹری تھیں) المراکشی کی روایت ہے کہ صرف قرطبہ کے ضلع میں ایک سو ستر (۱۷۰) خوش نویس عورتیں تھیں۔ اس دور میں مشینی طباعت نہیں تھی اس لیے فن خطاطی بہت اہم کردار ادا کرتا تھا۔

(۱۵)۔ اس کے برعکس عہد حاضر کے مسلمانوں نے خواتین کو ہمارے معاشرے سے خارج کر رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو باہر کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ بہت بڑی بے انصافی ہے کہ مسلمانوں نے عورتوں کو با جماعت ادائیگی نماز اور صلوٰۃ الجمعہ میں شرکت سے محروم کر رکھا ہے۔ انہیں نماز عید میں بھی شرکت کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ہم نے ایران، ترکی اور مغرب میں بھی 'حجاب' پہنے خواتین کو کام کرتے دیکھا ہے۔ وہ شرم و حیا اور وقار کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ کسی کو بُری نیت سے ان کو دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ تاہم بعض مسلمان ممالک میں عورتوں اور مردوں کو کلی طور پر الگ الگ رہنا پڑتا ہے۔ یہ بڑی ناانصافی ہے۔ ہم انہیں محفوظ مقامات پر بھی کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حالانکہ ایسے مسائل کا بہت آسان حل ہے۔ مثال کے طور پر پرائمری سطح پر بچوں کو پڑھانے کے لیے خواتین بھرتی کی جائیں تو وہ اپنے پُرشفقت انداز میں بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کر سکتی ہیں۔ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ موجودہ دور میں جب کہ انسان پوری طرح بیدار ہے اور معاملات کا شعور بڑھ رہا ہے۔ تعلیم عام ہو چکی ہے اور حقوق نسواں کی تحریک ہر روز نئی قوت حاصل کر رہی ہے۔ ہمیں اپنا طرز عمل بدل لینا چاہیے۔ اس لیے کہ عورتوں کے بارے میں ہماری موجودہ سوچ اور رویہ غیر معقول ہے۔

[1]۔ غرناطہ (Granada)، ہسپانیہ (Spain) کے جنوب میں ایک تاریخی شہر کا نام ہے۔ اسکی وجہ شہرت یہاں مسلمانوں کے دور کا ایک محل الحمرا ہے۔ 1492 تک غرناطہ سپین میں آخری اسلامی ریاست کا مرکز تھا۔

حوالہ جات

۱۔ تفہیم القرآن، سید ابواعلیٰ مودودیؒ۔ لاہور: الاصلاح کمیونیکیشن نیٹ ورک، ۱۹۹۹ء۔

۲۔ جامع ترمذی، امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ ترجمہ مولانا افضل احمد۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۶ء۔

۳۔ سنن ابن ماجہ، امام حافظ ابی عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہؒ ترجمہ مولانا محمد قاسم امین۔ لاہور: مکتبہ العلم، ۲۰۱۰ء۔

۴۔ سنن ابو داؤد، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

۵۔ سنن البیہقی (شعب الایمان)، امام ابی بکر احمد بن حسنل البیہقیؒ ترجمہ مولانا قاضی ملک محمد اسماعیل۔ کراچی: دارلاشاعت، کراچی، ۲۰۰۷ء۔

۶۔ سنن نسائی، امام احمد بن شعیب نسائیؒ ترجمہ مولانا افضل احمد۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۱ء۔

۷۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۸۔ صحیح مسلم، امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج نیشاپوریؒ ترجمہ علامہ وحید الزمان۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۹۔ کنزل العمال، امام علاء الدین علی متقی ابن حسام الدینؒ ترجمہ مولانا احسان اللہ شائق۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۱۰۔ مسند امام احمد بن حنبل، امام احمد بن حنبلؒ ترجمہ مولانا محمد ظفر اقبال۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۰۴ء۔

۱۱۔ مشکوٰۃ المصابیح، حضرت شیخ ولی الدین الخطیب التبریزیؒ ترجمہ مولانا محمد صادق خلیلؒ۔ لاہور: مکتبہ محمدیہ، ۲۰۰۵ء۔

۱۸

غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق



وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ‌ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا. (سورۃ الاسراء، آیت: ۳۴)
(اپنے عہد کی پابندی کرو! بے شک عہد کے بارے میں تمہیں جوابدہی کرنا ہوگی)

قدیم اسلامی ادب میں ایک مسلم ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمی کہا جاتا تھا۔ لفظ ذمہ کے معنی ایک میثاق یا ایک معاہدہ کے ہیں۔ جس کے تحت اہل ایمان ایک ذمی کا احترام کرنے کا عہد کرتا ہے جس کی خلاف ورزی پر ذم (الزام) عائد ہوجاتا ہے۔

(*War And Peace in the Law of Islam, p. 198.*)

اس لفظ کے دوسرے معنی تحفظ کی ضمانت کے ہیں۔ (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص: ۷) قانونی طور پر یہ اصطلاح چند حقوق کا حوالہ دیتی ہے جن کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کے حقوق کا ذمہ لیا جاتا ہے انہیں 'ذمی' یا زیر تحفظ رعایا کہا جاتا ہے۔

(*Islamic Law, Its Scope and Equity, p. 67.*)

(۱)۔ مسلمانوں کو غیر مسلم اقلیتوں کے محافظ بننا ہے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے کیونکہ انہیں قرآن مجید میں ایک عمومی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے انصاف کو عالمگیر بنائیں۔ اس دائرے میں غیر مسلم بھی آجاتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ‌ ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا‌ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ‌ۚ وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا.
(سورۃ النساء، آیت: ۱۳۵)

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عدل و انصاف پر مضبوطی کے ساتھ گواہی دینے والے ہوجاؤ۔ چاہے وہ تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ داروں، عزیزوں کے وہ امیر ہو یا غریب۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ تم خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ و اور اگر تم نے غلط بیانی یا پہلوتہی کی تو جان لو جو کچھ تم کروگے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ.
(سورۃ المائدہ، آیت:۸)

(اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی خاطر پوری طرح قائم رہنے والے، انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ۔ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو! بیشک اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو)

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. (سورۃ الممتحنہ، آیت:۸)

(اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ.
(سورۃ النساء، آیت:۱۳۵)

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عدل و انصاف پر مضبوطی کے ساتھ گواہی دینے والے ہوجاؤ۔ چاہے وہ تمہارے اپنے خلاف ہو)

قرآن مجید کی یہ آیت ایک واقعہ سے متعلق ہے جس میں مدینہ منورہ میں رہنے والا ایک یہودی ملوث تھا۔ ایک مسلمان شخص نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی ڈھال چرائی اور مدینہ طیبہ ہی کے ایک یہودی کے گھر میں رکھوا دی اور اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگا دیا۔ جب معاملہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودی کو صاف بری کر دیا۔ یہ واقعہ ایسے وقت پر ہوا تھا جب مسلمان مدینہ منورہ کے یہودیوں سے وسیع پیمانے پر برسرِ پیکار تھے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے مسلم معاشرے کو ایک سبق پڑھا دیا کہ انصاف کرتے وقت یہ نہ دیکھو کہ فریقین کس عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ باوجود اس حقیقت کے، کہ اس وقت یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان عداوت چل رہی تھی اور مسلمانوں کو انصاف کا دامن نہ چھوڑنے کی تلقین کی گئی تھی۔

(۲)۔ غیر مسلم ایک میثاق کے تحت مسلمانوں کی زیر حفاظت ہوتے ہیں جنہیں اصطلاحاً ذمی کہا جاتا ہے۔اس کے لیے قرآن مجید میں یہ آیت آئی ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ. (سورۃ النحل، آیت:۹۱)

(اور جب تم نے کوئی عہد کیا ہو تو اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو جبکہ تم اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا چکے ہو۔تم جو کچھ کرتے ہو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے)

کہا جاتا ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کے پیشِ نظر کہا: میں اپنے جانشینوں کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ ان غیر مسلموں کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زیر تحفظ ہیں اور اس طرح کہ وہ ان سے رابطے میں رہیں۔ ان کی طرف سے لڑیں اور ان پر ایسا بوجھ نہ ڈالیں جو ان کی استطاعت سے زیادہ ہو۔
(صحیح بخاری، ج:۲، رقم الحدیث:۳۱۷)

قرآن پاک واضح طور پر اور تاکیداً مذہبی رواداری پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ مذہب کے بارے میں کسی زور زبردستی سے کام نہ لیا جائے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں مقیم غیر مسلموں اور مسلم ریاست میں سے گزرنے والوں کے تحفظ اور اس کے ضمیر کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔

(*Muslim Conduct of State, para. 412*)

اس مسئلے پر قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ. (سورۃ البقرۃ، آیت:۲۵۶)
(مذہب کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے)

اس نقطے کی قرآن مجید نے مزید وضاحت یوں کی ہے:

وَلَا تُجَادِلُوۡۤا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ. (سورۃ العنکبوت، آیت:۴۶)
(اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے)

(۳)۔ اسلامی تہذیب کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ذمیوں کو عدالتی، معاشرتی اور ثقافتی خودمختاری دیتی ہے۔ اسلامی قانون کے تحت رہتے ہوئے عدالتی خودمختاری کے جزو کے طور پر ہر کسی پر اسلامی قانون مسلط نہیں کیا جائے گا۔ اسلام ہر گروہ (یہودی، مسیحی، مجوسی وغیرہ) کو اجازت دیتا ہے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ اپنے ٹربیونلز قائم کریں جن کی صدارت ان کے اپنے گروپوں کے جج کریں۔ انسانی معاملات کے تمام شعبوں پر اپنے گروپ کے قوانین نافذ کریں۔

(*Introduction To Islam, p. 45*.)

اس طرح اس عدالتی خودمختاری کا مطمحِ نظر نہ صرف انفرادی اور پرائیویٹ معاملات (جن میں ذاتی حیثیت کا استقرار ہو) ہوں بلکہ زندگی کے تمام معاملات، سول، تعزیراتی، مذہبی اور دیگر امور شامل ہوں۔ اس خودمختاری کو 'میثاق مدینہ' (Charter of Medina) میں پوری طرح تحفظ دیا گیا ہے۔ میثاق مدینہ کی درج ذیل شقوں کا اعادہ کرنا مفید مطلب رہے گا:

(i)۔ ایسے یہودی جو مومنوں کی پیروی کریں گے ان کی مدد کی جائے گی اور ان سے مساویانہ (معاشرتی قانونی اور معاشی) سلوک ہوگا جیسا کہ ریاست کے دیگر وفادار شہریوں سے وعدہ ہے۔

(ii)۔ کسی یہودی سے محض اس کے یہودی ہونے کی بنا پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

(iii)۔ ہمارے پیروکار یہودیوں کے دشمنوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔

(iv)۔ بنی عوف کے یہودیوں کے ساتھ اہل ایمان کے اتحادیوں کا سا سلوک کیا جائے گا۔ یہودی اپنا مذہب رکھتے ہیں۔ اس کا اطلاق ان کے آزاد کردہ مردوں پر ہوگا۔ استثنائی سلوک صرف ان سے ہوگا جو انصاف کے خلاف اقدام کریں گے اور ارتکابِ گناہ کریں گے۔ ایسا کرنے والے خود اپنا اور اپنے خاندانوں کا نقصان کریں گے۔

(v)۔ یہودیوں کے اتحادیوں سے وہی سلوک کیا جائے گا جو یہودیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

(vi)۔ یہودیوں کو اپنے (دورانِ جنگ کے) اخراجات خود برداشت کرنا ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات برداشت کریں گے۔

(vii)۔ اگر کوئی اس معاہدے کے کسی فریق پر حملہ کرتا ہے تو دوسرے اس کی مدد کو آئیں گے۔

(viii)۔ فریقین معاہدہ کو لازماً باہمی مشاورت سے کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔

(ix)۔ مدینہ منورہ صرف ان لوگوں کے لیے پناہ گاہ ہوگا جو اس معاہدے کے تحت ہوں گے۔

(*http://www.constitution.org*)

(۴)۔ اسلام غیر مسلموں کے اس حق کو واضح طور پر تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی اور مذہبی حقوق کا تحفظ کریں۔ ایک مسلمان شوہر کی عیسائی یا یہودی بیوی کو اس امر کی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کا تحفظ کرے اور اس پر عمل کرے یعنی وہ اپنے کلیسا (Church) یا کنیسہ (Synagogue) جا سکتی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں اور مفتوحہ غیر مسلم اقلیتوں کے مابین معاہدوں میں ایک شرط یہ بھی رہی ہے کہ اسلامی حکومت اقلیتوں کی ضروریاتِ زندگی اور تحفظِ جان و مال کی ذمہ دار ہوگی۔ اہلیانِ حیرہ[1] کے ساتھ معاہدۂ امن کی ایک شق یہ تھی: جو غیر مسلم ضعیف ہو جائے اور کام کاج کے قابل نہ رہے یا کسی قدرتی آفت کی وجہ سے معذور ہو جائے یا جو پہلے بہت ثروت مند تھا کسی ناخوشگوار واقعہ کے باعث کنگال ہو جائے۔ حکومت ایسے افراد سے ٹیکس وصول نہیں کرے گی۔ بلکہ ایسے مردوں اور ان کے خاندانوں کو سرکاری خزانے سے امداد دی جائے گی۔ (بدائیۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ص:۳۱۰)

قرآن مجید اعلان کرتا ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ. (سورۃ الممتحنہ، آیت:۸)

(اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ

---

[1]۔ حیرہ قدیم عراق کا ایک شہر تھا جو موجودہ کوفہ سے تین کلومیٹر جنوب میں دریائے فرات کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ زمانہ حال میں اس شہر کے صرف کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔

تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

اس آیت مبارکہ میں نہ صرف تحفظ شامل ہے بلکہ یہ ان سے شفقت اور خلوص کا برتاؤ کرنے کا بھی مشورہ دیتی ہے کیونکہ اسلام مجموعی طور پر بنی نوع انسان کی وحدت کو تقدس عطا کرتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا.
(سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳)

(اے بنی نوع انسان! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو)

اسی طرح قرآن مجید عالمگیر مذہبی اتحاد کو تقدس کا درجہ دیتا ہے اور اس طرح تعصب کا خاتمہ کرنے کے لیے لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ تمام آسمانی مذاہب کو برحق سمجھیں:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. (سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۳۶)

(مسلمانو! کہو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اُس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم (علیہ السلام)، اسماعیل (علیہ السلام)، اسحاق (علیہ السلام)، یعقوب (علیہ السلام) اور اولادِ یعقوب (علیہ السلام) کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ (علیہ السلام) وعیسیٰ (علیہ السلام) اور دوسرے تمام پیغمبروں (علیہم السلام) کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ تعالیٰ کے مسلم ہیں)

پھر قرآن مجید ایک قدم اور آگے جا کر خصوصی نوعیت کی مذہبی وحدت کو بلا کسی کی تحقیر یا عناد کے تقدس عطا کرتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ.
(سورۃ الحجرات، آیت: ۱۰)

(مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو! امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا)

(۵)۔ میثاق مدینہ کے افتتاحی پیراگراف میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک ہی امت سمجھا گیا ہے۔

یہ دستاویز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ہے جو اہل ایمان قریش کے مسلموں اور مدینہ منورہ کے مسلموں اوران کے تعلقات کو منظم کر رہی ہے جنہوں نے ان کی پیروی کی اوران کے ساتھ مل کر مساعی کیں۔ یہ ایک قوم کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ایک امت ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیر حفاظت لوگوں کے بارے میں ازخود بے حد محتاط وروادار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایک بھی زیر حفاظت شخص (ذمی) کو قتل کرتا ہے وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکے گا۔(صحیح بخاری، ج:۲،رقم الحدیث:۴۲۶)

(۶)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے واقعات میں سے چند مثالیں درج ذیل ہیں: نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد فتح مکہ سے ذرا پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے لیے مدینہ پہنچا۔ انہیں مسجد نبوی کے احاطے میں خیمے نصب کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اگرچہ انہیں خیمے مسجد کے صحن سے باہر نصب کرنے کے لیے کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہ عیسائی تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں خیمے احاطے کے اندر گاڑنے کی اجازت دے دی۔(تفسیر قرطبی، ذیل سورۃ انعام، آیت:۶۱) ان کو گھوڑے بھی قریب ہی باندھنے اور چارہ کھلانے کی اجازت مل گئی۔ نجران سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے لیے آنے والے عیسائیوں کا وفد ساٹھ (۶۰) گھڑسواروں پر مشتمل تھا۔ ان میں چودہ ان کے سردار تھے جنہیں فیصلہ کرنا تھا۔ یہ مدینہ منورہ میں آ کر مسجد نبوی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے رنگارنگ لباس اور چغے زیب تن کر رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت نماز عصر پڑھ کر فارغ ہو چکے تھے۔ وفد کے ہمراہ اونٹوں کا کارواں تھا۔ ان کی قیادت بنی الحارث بن کعب کر رہا تھا۔ جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس وفد کو دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ایسا وفد اس کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔ جب ان کی عبادت کا وقت ہو گیا تو انہوں نے وہیں مسجد نبوی میں عبادت کرنا شروع کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ارشاد فرمایا کہ انہیں عبادت کرنے دو اور وہ مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کر رہے تھے۔(سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج:۲،ص:۴۰۱)

ہم بطور مسلمان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں جنہوں نے عیسائیوں کو اپنی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جو کہ مسجد الحرام (بیت اللہ) کے

بعد دوسری مقدس ترین مسجد ہے۔ کیا آج ہم عیسائیوں یا یہودیوں کو اپنی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں؟ بعض لوگ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اجازت اس لیے دی کہ وہ آغاز اسلام تھا اور اس وقت مسلمان کمزور تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت کمزور تھے؟ اگر کمزور تھے تو کیا یہ بات قابل فہم ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنی فراخ دلی سے کیوں کام لیا؟ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہے۔ اس وقت تک مسلمان جزیرہ نمائے عرب کا نصف حصہ فتح کر چکے تھے۔ نجران کے لوگ مسلمانوں سے کمزور تھے۔ ان کے ساتھ جو بھی سلوک کیا گیا وہ خالصتاً خوش اخلاقی، حسن معاشرت اور پُر خلوص رواداری کا مظہر تھا۔ یہ معاملہ اقدار کا تھا مصلحت اندیشی کا نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب انسانوں کے ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی سلوک فرماتے تھے۔

(۷)۔ جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے نومبر 636ء میں چھ ماہ تک یروشلم کا محاصرہ کئے رکھا تو پیٹریاک سوفرونیئس[1] اس شرط پر ہتھیار ڈالنے پر رضا مند ہوا کہ وہ صرف خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے گیٹ کھولے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ اپریل 637ء میں بذاتِ خود یروشلم پہنچے تا کہ شہر کی اطاعت کو قبول کریں۔ چنانچہ انہوں نے 638ء میں ان کے لیے 'منشورِ حقوق' جاری کیا۔ اس منشور میں آزادی، سلامتی اور آزادئ عقیدہ کے بنیادی اصولوں کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا جو کہ اسلام میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں:

'بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ یہ پیغامِ سلامتی بندۂ خدا امیر المومنین عمر (رضی اللہ عنہ) کی جانب سے 'ایلیاء' (یروشلم) کے باشندوں کو دیا جا رہا ہے۔ وہ یہاں کے سب لوگوں کو خواہ وہ علیل ہیں یا صحت مند، ان کی جان و مال، ان کے کلیساؤں، صلیبوں اور لوازماتِ مذہب کی سلامتی کی ضمانت دیتا ہے۔ ان کے کلیساؤں کو نہ تو تبدیل کیا جائے گا اور نہ انہیں رہائش گاہیں بنایا جائے گا۔ نہ منہدم کیا جائے گا۔ نہ یہاں کے باشندوں اور نہ ان کی مملوکہ اشیاء و لوازم زندگی کو کوئی ضرر پہنچایا جائے گا اور نہ ہی ان کی کسی قسم کی اشیاء میں کوئی کمی کی جائے گی۔ ان کے مذہب وعقیدے

---

[1]۔ سوفرونیئس (560ء-638ء) ایک عیسائی راہب تھا جو سوفرونیئس آف یروشلم کے نام سے معروف ہے۔ 637ء میں مسلم افواج کی یروشلم کی فتح کے وقت اس نے شرط رکھی کہ شہر کو صرف مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا جائے گا۔ چنانچہ خلیفہ وقت نے یروشلم کا سفر کیا۔

سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو گزند پہنچائی جائے گی'۔

کیا مسلمان ممالک آج اپنے ہاں اقلیتوں سے ایسا سلوک کرتے ہیں؟ 'نہیں بالکل نہیں' غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا سلوک نفرت انگیز ہے حتیٰ کہ ہم اپنے ساتھی مسلمانوں سے بھی عجیب سلوک کرتے ہیں۔ بعض اوقات دوسرے مسلمانوں پر غیر مسلم کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں۔ ان پر محض دباؤ ڈالنے کے لیے یا سنی سنائی گواہی اور اٹکل پچوؤں کی بنا پر ان کی زندگی کو اجیرن کر دیتے ہیں۔ میں اس سیاق وسباق میں دو مثالیں دوں گا۔

(۸)۔ میں 1990ء میں عمرکوٹ (سندھ) میں تعینات تھا۔ ایک مذہبی گروہ نے جلسہ کرنا چاہا۔ مذاکرات ہوئے۔ شرائط طے پا گئیں۔ جلسہ ہوا تو تمام شرائط کو پامال کر دیا گیا۔ میں نے اس پر قانون کے مطابق کاروائی کی۔ کچھ علماء گرفتار ہوئے۔ میں خود جیل میں جا کر ان سے ملا۔ ان کے اچھے کھانے کا انتظام کیا۔ جائے نماز پیش کی۔ بے گناہ یا کم گناہگار فوراً رہا کر دیئے۔ چند روز کے بعد میرے خلاف پورے سندھ میں پوسٹر لگ گئے کہ میں قادیانی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا یہ ہوا کہ عمرکوٹ کے علماء نے اپنے خطبات میں اس کی تردید کی۔ اس لیے کہ وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ مقامی جامع مسجد کے خطیب اسلامی یونیورسٹی میں میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا یہی اسلام ہے؟

دوسری مثال ایک اعلیٰ عہدے پر فائز سرکاری ملازم کی ہے جو بہت متقی و پرہیزگار اور صاحب علم شخص تھا۔ وہ دن کی پانچوں نمازیں باجماعت ادا کرتا تھا۔ اس کے سب بیٹے اور بیٹیاں اعلیٰ مذہبی تعلیم سے آراستہ تھیں۔ ساری اولاد اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ عملی مسلمان بھی تھی۔ اس خدا ترس ملازم کے سرکاری فرائض میں ایک سیاستدان کی کارستانیوں سے متعلق رپورٹ لکھنا بھی شامل تھا۔ اس پر سیاستدان ناراض ہو گیا۔ چنانچہ اس سیاستدان نے 1970ء کے عشرے میں جیل میں ایک کتاب لکھی جس میں ذاتی بغض کی وجہ سے یہ بھی لکھ دیا کہ یہ سرکاری ملازم قادیانی فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد چند مذہبی جماعتیں اس کے پیچھے پڑ گئیں اور اسے قادیانی کہنا شروع کر دیا۔ یہ محض ایک الزام تھا جس کی کوئی ٹھوس شہادت نہیں تھی اور حقائق کے بھی منافی تھا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے اس شخص پر کیا بیتی ہوگی اور معاشرے میں اس کی کیا عزت رہ گئی ہوگی۔ کیا اسلام ہمیں یہی سکھاتا ہے؟ کیا کسی زندگی کو کسی

تحقیق یا گواہی کے بغیر اجیرن کر دینا درست ہوتا ہے؟

1990ء کے اوائل میں میں اس مذہبی جماعت کے چند بڑوں سے ملا۔ جنہوں نے اس افسر کے خلاف یہ الزام لگایا تھا۔ میں نے اس بے بنیاد الزام کے حوالے سے دکھی دل سے ان سے شکایت کی۔ اب ذرا ان کا جواب سنیے: انہوں نے مجھے کہا کہ میں اس افسر سے کہوں کہ وہ اس الزام کی تردید کر دے۔ میں نے کہا: 'لا حول ولا قوۃ الا باللہ'۔ وہ یہ سن کر پریشان اور ہکا بکا رہ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے آپ کا یہ جواب سُن کر دلی صدمہ پہنچا ہے۔ میں نے ان سے مزید کہا کہ یہ آپ کا اخلاقی اور مذہبی فرض تھا کہ آپ اس پر اتنا سنگین الزام لگانے سے پہلے تحقیق کر لیتے۔ اس محض افواہ یا سنی سنائی بات پر یقین نہ کرتے۔ بہرصورت گواہی اور ثبوت کا باران کے کندھے پر ہے اور اس حقیقت کی بنا پر کہ یہ اپنے آپ کو عالمِ دین بھی کہتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ ملزم ٹھہرائے جانے والے شخص کو الزام کی تردید کے لیے ثبوت لانا چاہیے۔ میں نے انہیں قائل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر ڈالی کہ ہر شخص عزت اور وقار کا مستحق ہے۔ ہمیں لیبل لگا کر دوسرے کی زندگی خراب نہیں کرنی چاہیے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے انہیں فیض احمد فیض کا یہ شعر سنایا:

آتش فشاں ز قہر و ملامت زبانِ شیخ
از اشک تر ز دردِ غریباں ردائے تو

(شیخ کی زبان سے غصہ و ملامت کی آگ نکل رہی ہے)
(حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر غریبوں کے درد میں روتے روتے تر ہو جاتی تھی)
(غبارِ ایام: نعت)

حوالہ جات

۱۔ غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، شیخ یوسف عبداللہ القرضاوی۔ قاہرہ: مکتبہ وہبہ، ۱۹۸۴ء۔

۲۔ بدائیۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ابوالولید محمد بن احمد بن رشد۔ لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۹ء۔

۳۔ تفسیر قرطبی، امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبیؒ ترجمہ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ۔ لاہور: ضیاء القرآن، ۲۰۱۲ء۔

۴۔ جامع البیان عن تاویل آیٔ القرآن، امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۷ء۔

۵۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، علامہ شبلی نعمانیؒ؛ علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ لاہور: ادارہ اسلامیات، ۲۰۰۶ء۔

۶۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۷۔ غبار ایام، فیض احمد فیض۔ لاہور: فرید بک، ۲۰۱۰ء۔

۸۔ http://www.constitution.org/cons/medina/charter.htm

۹۔ Introduction to Islam by Dr. Muhammad Hamidullah. Lahore: Sh. Mohammed Ashraf, 1974.

۱۰۔ Islamaic Law: Its Scope and Equity by Said Ramadan. London: P.R. Macmillan, 1961.

۱۱۔ The Muslim Conduct of State by Dr. Muhammad Hamidullah. Lahore: Islamic Book Trust, 2012.

۱۲۔ War and Peace in the Law of Islam by Majid Khadduri. New Jersey: The Law Book Exchange, 2006.

۱۹

فکری غلامی سے نجات



بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
(بانگ درا: خضر راہ)

بیشتر مسلمان کسی نہ کسی طرز کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہم طویل عرصہ سے اسی حالت میں رہ رہے ہیں۔ مسلم معاشرے کا روایتی مذہبی طبقہ ماضی بعید کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ایک انچ بھی مستقبل کی طرف متحرک نہیں ہونا چاہتا۔ یہ طبقہ ایک زوال پذیر اور ذہنی لحاظ سے 'زمانہ سہوِ تاریخ' (anachronistic intellectual paradigm) میں رہ رہا ہے۔ مذہبی طبقے نے ذہنی غلامی کی وجہ سے اجتہاد، علمی تحقیق اور خودمختارانہ فکر کو ترک کر دیا ہے۔ دوسری جانب مسلم معاشرے کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تہذیب کا ایک اندھا غلام ہے۔ اشرافیہ مغرب کی طرف منہ اٹھائے اسے واحد ماخذ علم و تہذیب کے طور پر دیکھتی ہے اور اس کی اندھی تقلید کرتے ہوئے اپنے مسلم ورثے کے حسین و نفیس پہلوؤں کو نظر انداز کر رہی ہے۔

بلاشبہ مغرب، افکار اور تحقیق کے میدان میں دنیا بھر کی قیادت کر رہا ہے۔ خاص طور پر سائنسی انقلاب (Scientific Revolution) کے ظہور سے اس کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو چکی ہے۔ مغربی فلسفہ صحیح اور غلط کی تمیز کرنے کا ایک پیمانہ بن گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جب مسلمان خوابِ گراں میں محوِ استراحت (fallen into deep slumber) تھا تو مغرب زیستِ انسانی کے ہر شعبے میں منازلِ ارتقا طے کر رہا تھا۔ اب وہ اپنے علم و ٹیکنالوجی کی ترقی بشمول اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر پوری دنیا پر غالب آیا ہوا ہے۔ نتیجتاً جدید مسلم دنیا کے شکست خوردہ اور آرام طلب ذہنوں نے مغرب کو مادی تعمیر و ترقی کے حتمی پیمانے کے طور پر قبول کر لیا ہے اور اس قبولیت کے ہمراہ اخلاقیات کے لیے بھی مغربی پیمانہ اختیار کر لیا گیا ہے۔ یہ طبقہ ایک انتہا پر ہے۔

جبکہ روایتی مذہبی طبقہ دوسری انتہا پر ہے۔ وہ افراد جو اس گروہ کی تشکیل کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ مغرب سے جو چیز بھی آتی ہے 'کفر' اور گمراہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مغربی فلسفے اور سائنس کا ماخذ مادیت ہے جو دہریت (Atheism)، عدمیت (Nihilism) اور سیکولرازم

(Secularism) کو پروان چڑھاتی ہے۔ عصر حاضر کا روایتی مذہبی طبقہ مسیحی کلیسا کی تاریخ دوہرا رہا ہے جو کہ شروع کے زمانے میں نئے خیالات وافکار پیش کرنے والوں کو اذیت ناک سزائیں دیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں گیلیلیو کا کیس بہت سبق آموز ہے۔

کاپرنیکس نے جو کہ پولش ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔ اپنی وفات سے ذرا پہلے 'On the Revolutions of the Heavenly Bodies' نام سے کتاب شائع کی۔ اس میں اس نے بتایا تھا کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے جبکہ وہ اپنے محورِ معین کے گرد بھی روزانہ گردش کرتی ہے۔ عیسائی فرقہ 'ڈومینکن آرڈر' (Dominican Order) کے ایک رکن 'گیووینی ٹلسانی' (Giovanni Tolsani) نے 1546ء میں لکھا کہ کاپرنیکس کے تقریباً تمام نظریات جھوٹ پر مبنی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انجیل مقدس سے بالکل ناآشنا ہے کیونکہ یہ نظریات انجیل کے بعض اصولوں کے منافی ہیں'۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں 'Revolutions' کو ممنوعہ کتابوں کے اشاریے میں شامل کر دیا گیا۔

(*Journal of the History of Ideas, 36(3), p. 537.*)

گیلیلیو نے 'Revolutions' پڑھی اور اس موضوع پر خود بھی لکھا۔ 1616ء میں اسے ایک حکمنامہ موصول ہوا جس میں اسے متنبع کیا گیا کہ وہ 'Heliocentrism' (سورج کو مرکز قرار دینے کا نظریہ) کا علمبردار نہ بنے، نہ اس کا دفاع کرے اور نہ ہی کسی کو یہ پڑھائے۔

(*Galileo's Mistake, p. 201.*)

جب اس نے 1630ء میں اپنی کتاب 'Dialogues' کو شائع کروانے کی کوشش کی تو ماسٹر آف دی سیکرڈ پیلس [۱] نے گیلیلیو کو حکم دیا کہ وہ کسی سے اس کے مسودے کو پڑھوالے تاکہ اس امر کی ضمانت مل سکے کہ یہ قابل اشاعت ہے۔ فادر ماسٹر جیانسیٹو سٹیفنی (Father Master Giancito Stefani) کو مسودے کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کیا گیا۔ پبلشر نے فادر ماسٹر کی

۱۔ رومن کیتھولک چرچ میں تھیالوجین آف پونٹیفیکل ہاؤس ہولڈ ایک 'رومن کیورل' عہدہ ہے جسے ہمیشہ سے فرائر پریچر آف ڈومینکن آرڈر کے طور پر ذمہ دار بنا کر اسے پوپ کا تھیالوجین مقرر کیا گیا ہے۔ اس عہدے کو پہلے 'ماسٹر آف سیکرڈ اپوسٹولک پیلس' کہا جاتا تھا۔

تمام ہدایات پر عمل کیا اور اس نے 'Dialogues' کو دو بڑے نظاموں 'بطلیموسی' اور 'کوپرنیکسی' پر ڈائیلاگ کے طور پر شائع کر دیا۔ 1632ء میں پوپ اربن ہشتم (Pope Urban-VIII) نے پبلشر کے نام تقریباً فوری طور پر حکم جاری کر دیا کہ 'بس مزید کا پیاں نہ چھاپنا'۔

چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ 'انکویزیشن' (مذہبی عدالت) گیلیلیو پر مقدمہ چلائے گی۔ گیلیلیو نے روم جانے اور مقدمے کا سامنا کرنے سے لیت ولعل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سربراہ عدالت کو خط لکھا کہ وہ بذریعہ ڈاک سوالوں کا جواب دینے کو تیار ہے۔ اس نے صحت کی کمزوری کی بنا پر دوسو (۲۰۰) میل لمبا سفر کرنے سے معذوری ظاہر کی اور تین طبیبوں سے بھی لکھوالیا کہ یہ شخص زندگی کو خطرے میں ڈالے بغیر سفر نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کی استدعا مسترد کر دی گئی۔ پوپ کا اصرار تھا کہ اگر وہ بوڑھا، کمزور اور بیمار آدمی ہے تو وہ سردیوں میں روم تک دوسو میل لمبا سفر ضرور کر سکے گا۔ اس لیے اسے صحت بہتر ہونے تک جیل میں بند رکھا جائے۔ چنانچہ گیلیلیو نے 13 فروری 1623ء کو تئیس (۲۳) دن میں روم تک سفر مکمل کر کے فلورنس (Florence) کے سفارت خانے میں قیام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ گیلیلیو کی ٹانگوں میں شدید درد تھا اور وہ مسلسل دو راتیں روتا اور آہیں بھرتا رہا۔

مقدمے کی کارروائی آٹھ ماہ چلتی رہی۔ اس سے رسمی قسم کے سوالات پوچھے گئے اور 'کوپرنیکس سسٹم' کے بارے میں اس کے صحیح احساسات جاننے کی کوشش کی گئی۔ جان بچانے کے لیے اس نے اپنا بیان یوں ریکارڈ کرایا۔ 'میرا یقین تھا اور اب بھی ہے کہ یہ انتہا درجے کا سچ اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بطلیموس نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ زمین ساکن ہے اور سورج متحرک۔ گیلیلیو کی طرف سے 'کوپرنیکس ازم' سے دستبرداری کا اعلان ان الفاظ پر ختم ہوا، 'میں اقرار کرتا ہوں جیسا کہ میرا ضمیر کہتا ہے کہ اب میں مسترد شدہ رائے کو درست نہیں سمجھتا اور میں حکام کے فیصلے کے بعد سے اس پر قائم نہیں ہوں۔ میں آپ کے ہاتھوں میں ہوں، آپ جو چاہیں مجھ سے سلوک کریں'۔

22 جون 1633ء کو گیلیلیو اعترافِ گناہ کی سفید قمیض پہنے مذہبی عدالت کی عمارت کے بڑے ہال میں داخل ہوا، گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے لیے یہ سزا سنی:

’ہر گاہ کہ تم گیلیلیو والد آنجہانی ونسنزو گیلیلی ساکن فلورنس عمر ستر (۷۰) برس، نے سال 1615ء میں اس مقدس دفتر میں ایک جھوٹے نظریئے کو سچ قرار دینے کی کوشش کی لیکن اب تم مستقبل میں مزید محتاط رہو گے اور دوسروں کے سامنے ایک مثال بننے کے لیے اس قسم کی لغزشوں سے باز رہو گے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ ’Dialogue of Galileo Galilei‘ نامی کتاب کو سرکاری طور پر ممنوع قرار دیا جائے۔ ہم اس مقدس دفتر میں اپنی خوشی سے رسمی سزائے قید سنا رہے ہیں۔ ہم حسب دلخواہ کفارے کے طور پر تم پر یہ سزا عائد کرتے ہیں کہ تم اگلے تین برسوں کے دوران کفارے کی سات دعائیں پڑھتے رہو گے۔ ہم یہ حق اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں کہ ہم ان سزاوں کو معتدل، ہلکی کر دیں یا پوری طرح معاف کر دیں‘۔

سزا کے اعلان کے بعد گیلیلیو نے اپنی دستبرداری کا بیان پڑھنے کے لیے گھٹنے کو جھکایا: آپ جیسی عظیم المرتبت ہستیوں اور تمام اہل ایمان مسیحیوں کے ذہنوں میں سے میں اس سخت شبہے کو دور کر دینا چاہتا ہوں جو میرے خلاف بجا طور پر پیدا ہوا ہے۔ میں خلوص دل اور بلا تصنع ایمانداری کے ساتھ دستبردار ہوتا ہوں، لعنت بھیجتا ہوں اور اظہار نفرت کرتا ہوں پہلے بیان کردہ غلط آرا اور کلماتِ کفریہ سے اور عموماً ہر دیگر غلط بیانی اور تفرقے سے جو مذکورہ مقدس کلیسا کے خلاف ہو اور میں قسم اٹھاتا ہوں کہ میں دوبارہ کبھی ایسا نہ کہوں گا نہ زبانی طور پر اور نہ تحریری طور پر، جس سے میرے متعلق اس قسم کے شبہات پیدا ہوں۔

پھر اس نے کہا ’میں گیلیلیو گیلیلی، دستبردار ہو گیا ہوں، قسم اٹھا چکا ہوں، وعدہ کر رہا ہوں اور مندرجہ بالا وعدے کا پاسدار رہوں گا اور اس کی صداقت کا گواہ ہوں۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی دستبرداری کی موجودہ دستاویز کے حرف حرف کی تصدیق کرتا ہوں جس کی روم میں کانوینٹ آف منروا میں خواندگی کی گئی۔ یہ تحریر جون 1633ء کی بائیسویں تاریخ کو قلم بند ہوئی۔

گیلیلیو کی نگرانی ’سینا‘ میں آرچ بشپ پکولومینی کے سپرد کی گئی۔ 1633ء کے اواخر میں گیلیلیو کو اس کے اپنے چھوٹے سے فارم ہاؤس میں جو ’ارسٹری‘ (فلورنس) میں واقع تھا منتقل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ جہاں کچھ عرصہ بعد اس کی بینائی ختم ہو گئی اور 1642ء میں وہ فوت ہو گیا۔ پوپ نے گیلیلیو کو کسی چرچ میں دفنانے کی اجازت نہ دی۔ اس کی بجائے اسے فلورنس

میں سانتا کرزس چرچ (Santa Croce Church) میں بے نشان قبر میں دفن کرنا پڑا۔ 1734ء میں اس کی وفات کے بانوے (۹۲) سال بعد ایک درخواست کی گئی جس کی منظوری ہوئی، اس کے نتیجے میں گیلیلیو کو تدفین کے لیے بہتر جگہ میسر آسکی۔ چرچ کے اندر مزار بنا جہاں اس کی حقیقی تدفین ہوئی۔ اس کی تصنیف 'ڈائیلاگز' (Dialogues) ممنوعہ کتابوں کے اشاریے پر رہی اور اسے بالآخر دوسودو (۲۰۲) سال بعد 1835ء میں اس اشاریے سے حتمی طور پر خارج کر دیا گیا۔ گیلیلیو کی وفات کے تین سو پچاس (۳۵۰) سال بعد 1992ء میں پوپ جان پال دوم (Pope John Paul II) نے اعتراف کیا کہ گیلیلیو نے چرچ کے ہاتھوں غیر منصفانہ سزا پائی تھی۔

گیلیلیو کے مقدمے کے سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے کہ گیلیلیو سادہ سے کمرے میں کلیسائی عدالت میں سرکاری تفتیش کنندوں کے سامنے پڑی میز کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھا سوالوں کے جوابات دیتے دیتے اپنے ہاتھ پشت کے پیچھے لے گیا اور ایک آہ بھری اور اپنی انگلیوں کو صلیب کی شکل دی اور کچھ ایسے الفاظ کہے جن کا مطلب تھا 'ٹھیک ہے، زمین سورج کے گرد نہیں گھومتی، پھر زیر لب بولا' اور پھر بھی گھومتی ہے۔

مختصراً یہ کہ جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا کیتھولک چرچ نئے تصورات کو قدیم زمانے سے چلے آنے والے مذہبی عقائد کے منافی قرار دے کر شور مچاتا رہا۔ سائنسدانوں اور دانش کی نئی تحریک کے علمبرداروں کو سخت وعبرتناک سزائیں دینے کے لیے کلیسائی عدالتیں چلتی رہیں لیکن نوزائیدہ ذہنی تحریکوں کو نہ دبا سکیں کیونکہ یہ عقل واستدلال پر مبنی تھیں اور وقت کے تقاضوں پر پوری اتر رہی تھیں۔ تخیلات کا ایک معرکہ برپا ہونے جا رہا تھا جو دراصل نئی اور پرانی سوچوں کے مابین ایک کشمکش تھی۔ کلیسا نے اپنی جنگ مذہب کے نام پر لڑی جو آگے چل کر آزاد تصورات اور مذہب کے درمیان جنگ میں بدل گئی۔ یہ ساکت ومعطل رہنے یا ترقی کی طرف بڑھنے کی لڑائی تھی۔ نئی فکری تحریک نے لڑائی جیت لی اور کلیسا کو پسپا ہونا پڑا۔ اسے یہ پسپائی فضول اور غیر معقول عقائد اور رویئے اختیار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔

آج کی مسلم دنیا میں صورت حال کسی حد تک ویسی ہی ہے۔ ہمارا روایتی مذہبی طبقہ سولھویں صدی کے مسیحی کلیسا کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ چنانچہ ایک ترقی پسند مذہب اسلام کو ایک

رجعت پسند مذہب کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ مسلم دنیا کے متعدد اہل دانش کو اپنی جانیں بچانے کے لیے دوسرے مسلم ممالک یا مغربی ممالک میں چلے جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمانؒ اور علامہ محمد اسدؒ کو پاکستان چھوڑنا پڑ گیا، کیونکہ انہیں 'مغرب زدہ' قرار دے دیا گیا تھا اور دونوں نے بیرونی ممالک میں وفات پائی۔

ڈاکٹر فضل الرحمانؒ اسلام کے ایک معروف سکالر تھے انہوں نے عربی کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی میں حاصل کی، بعد میں آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ابن سینا پر ایک مقالہ لکھا۔ بعدازاں انہوں نے تدریسی کیریئر اختیار کیا۔ پہلے ڈرہم یونیورسٹی (Durham University) اور پھر میک گل یونیورسٹی (McGill University) میں چلے گئے جہاں وہ 1961ء تک اسلامی علوم پڑھاتے رہے۔ پھر وہ پاکستان آ گئے تاکہ اسلامی ریسرچ کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ کی سربراہی کر سکیں۔ یہ ادارہ حکومت پاکستان نے اس خیال سے قائم کیا تھا کہ اسلام کو قوم کی روزمرہ کی زندگی میں نافذ کیا جائے۔ عائلی قوانین کے بارے میں ان کے ترقی پسندانہ خیالات کی وجہ سے ایک زبردست تنازعہ کھڑا ہو گیا جس سے ان کے خلاف نفرت کا طوفان برپا ہو گیا۔ اس پر وہ ستمبر 1968ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر یونیورسٹی آف شکاگو (University of Chicago) امریکہ میں چلے گئے۔ جہاں انہوں نے مشرقِ قریب پر تحقیقی پروگرام شروع کر دیا جو اب بھی دنیا کے بہترین پروگراموں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف میں

(i). Islam
(ii). Prophecy in Islam: Philosophy and Orthodoxy
(iii). Islam and Modernity: Transformation of an Intellectual Tradition
(iv). Major Themes of the Quran
(v). Revival and Reforms in Islam
(vi). Islamic Methodology in History
(vii). Health and Medicine in the Islamic Tradition

شامل ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمانؒ اسلامی حکومت و معاشرے کی اصلاح کے علمبردار بھی بنے۔

ان کا یہی موقف تھا جس نے انہیں پاکستان واپس آنے سے روکا تھا۔ انہوں نے 26 جولائی 1988ء میں امریکہ میں وفات پائی۔ وفات کے بعد سے ان کی تحریریں دنیا بھر اور بالخصوص مشرق قریب کے علما و اہل دانش میں مزید مقبول ہو رہی ہیں۔ یونیورسٹی آف شکاگو میں ان کی خدمات کا ابھی تک اعتراف کیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی میں مرکز برائے مطالعہ مشرق وسطیٰ کو ان سے منسوب کیا گیا ہے۔

علامہ محمد اسدؒ ایک یہودی نژاد آسٹروہنگیرین صحافی اور بیسویں صدی عیسوی کے نہایت با اثر یورپی مسلمانوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے عبرانی، آرامی، انگلش، فرانسیسی، فارسی اور عربی زبانوں میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ انہوں نے 1892ء میں عرب دنیا میں بطور صحافی کام کرنا شروع کیا۔ 1926ء میں وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ہندوستان آئے تو فلسفی شاعر حضرت اقبالؒ سے متعارف ہوئے جنہوں نے انہیں ترغیب دی کہ وہ مستقبل کی اسلامی ریاست کے ذہنی قضیوں کو واضح کرنے میں مدد دیتے رہیں۔ علامہ محمد اسدؒ نے جنگ عظیم دوم (WW-II) کے دنوں میں پانچ سال حکومت برطانیہ کی نظر بندی میں بھی گزارے۔ 14 اگست 1947ء میں علامہ محمد اسدؒ نے پاکستانی شہریت پائی اور بعد ازاں عہدوں پر فائز رہے جن میں اقوام متحدہ میں پاکستان کی سفارتی نمائندگی بھی شامل تھی۔ ان کی تصانیف میں

(i). The Message of the Quran
(ii). The Road to Makkah
(iii). The Law of Ours
(iv). Islam at Crossroads
(v). The Principles of State and Government in Islam

اور انگریزی ترجمہ بخاری شریف شامل ہے۔ ان کے اعزاز میں اپریل 2008ء میں بائیسویں ڈسٹرکٹ آف دی آنا (District of Vienna) میں 'یو این او سٹی' (UNO City) کے سامنے والی جگہ کا نام علامہ محمد اسد سے منسوب کر کے 'Mohammad Asad Platz' رکھ دیا گیا۔

میں نے ان کے کئی خطوط دیکھے ہیں جن میں انہوں نے فریاد کی ہے کہ وہ مذہبی لوگوں کے اظہار

نفرت کی وجہ سے پاکستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اسلام میں ان کے اجتہاد اور عقلیت پسندی کی اہمیت پر زور دینے کی بنا پر مخالف ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس صاحب علم نومسلم کو جو حضرت اقبالؒ کی ہدایات کے مطابق اسلام اور پاکستان کے لیے محنت شاقہ کرتا رہا پاکستان چھوڑنا پڑا۔ وہ مراکش چلے گئے اور باقی زندگی اپنی اہلیہ 'پولا' کے ساتھ گزاری۔ آخری عمر میں سپین چلے گئے۔ انہیں اندلسیہ (سپین) کے قبرستانِ غرناطہ میں دفن کیا گیا۔

یہ دو مثالیں اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ ہم بہت مشکل صورت حال سے دوچار ہیں اور ہمارے سامنے ایک کٹھن منزل ہے۔ اسے طے کرنے کے لیے اولاً تو ہمیں اس طرز فکر کو ترک کرنا ہوگا کہ مغرب سے جو کچھ بھی آتا ہے وہ کفر و الحاد ہے۔ ہمیں ہر چیز کو فقہ اسلامی کے اس سنہری اصول کی روشنی میں چھاننا چاہیے۔ جو کچھ درست ہے، اسے اپنا لینا اور جو کچھ بُرا ہے، اسے ترک کر دینا چاہیے۔ ہمیں صحیح اور غلط کے درمیان خود امتیاز کرنا چاہیے۔ اچھے اوصاف مثلاً محنت، دیانتداری، علم، تحقیق (ریسرچ) کا جذبہ، انسانی حقوق کا احترام، فلاحی ریاست کے تصور اور جمہوری اقدار کا تحفظ کرنا چاہیے کیونکہ علم ہماری متاعِ گم گشتہ ہے۔ (کنز العمال، ج: ۸، رقم الحدیث: ۴۲۸۵) ہمیں اسے قبول کرنا چاہیے خواہ کہیں سے بھی دستیاب ہو۔ باب العلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مفہوم ہے کہ نیک امر پر عمل کرنا ہی تمہارا کام ہے۔ یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔ ان دو حضرات کی سوچ عمومی روایتی فکر سے مختلف تھی مگر ایسی بھی نہ تھی کہ ہم ان کی زندگی اجیرن کر دیتے۔

ثانیاً ہمیں ذہنی غلامی کا خاتمہ کرنا چاہیے۔ مغربی فکر اور تہذیب کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے۔ مغرب ایک رہنما کے طور پر کام دے سکتا ہے لیکن یہ ہماری منزل نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں یہ ادراک ہونا چاہیے کہ مغرب کا طرز عمل، جو مذہب سے عناد رکھتا ہے بعض اوقات حیوانی بھی ہو جاتا ہے۔ ان معاملات میں ہمیں اپنی اقدار پر اعتماد اور انحصار کرنا سیکھنا ہوگا۔ ہماری آنکھیں مغربی ثقافت کی ظاہری چمک دمک سے خیرہ نہیں ہو جانی چاہئیں۔ ہمیں حقیقت تک رسائی کے لیے گہرا غوطہ لگانے کی کوشش کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ بنی نوع انسان واقعی خوش اور مطمئن ہے یا کیا جدید تہذیب نے اسے زیادہ رنجیدہ اور مایوس تو نہیں کر دیا؟

ثالثاً ہمیں ذہنی قیادت کا (اگر پوری نہ ہو تو نہ سہی) آبرومندانہ حصہ بننا چاہیے اور افکار اور

ثقافت کے مستقبل کی سمت کا تعین کرنا چاہیے۔ اس کام کے لیے زبردست محنت اور قوت و ہمت درکار ہے۔ ہم ذہنی طور پر بہت کمزور ہیں اور اب تک ذہنی غلامی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم وقت کے ساتھ ہم قدم نہ رہنے کی وجہ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ تاہم تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کمزور قومیں جب اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو زمام کار سنبھال لیتی ہیں۔ اسلامی تہذیب کے آغاز کے زمانے میں رومن، یونانی اور ایرانی تہذیبیں سربرآوردہ تھیں۔ ہم نے کمزور ہونے کے باوجود قیادت ان سے چھین لی۔ اب پھر ہمیں اپنی قوت کو مجتمع کر کے غلامی کے دائرے سے باہر نکلنا چاہیے تاکہ اسلامی عالمی قیادت کے دور کا دروازہ کھول سکیں۔ جیسا کہ قرآن مجید اقتدار کی اترائی اور چڑھائی کے بارے میں فرماتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ. (سورۃ آل عمران، آیت: ۱۴۰)
(یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں)

جو فاتح تھے وہ مفتوح ہو گئے ہیں اور جو مفتوح ہیں وہ فاتح ہو جائیں گے۔ کچلے ہوئے لوگ زمین کے وارث بن جائیں گے۔ اس کے حصول کے لیے ہمیں خود کو وقف کر دینا چاہیے۔ ہم میں سے بعضوں کو علم و تحقیق اور فلاحی و اصلاحی کاموں کے لیے اپنی زندگیاں قربان کرنا ہوں گی۔ علماء اور دانشوروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ذہنی غلامی کی مذمت کریں اور عوام اور بالخصوص نوجوانوں کو تلقین کریں کہ وہ اپنا وقت اور قوت کو ضائع نہ کریں بلکہ اپنی زندگیاں حقیقی انسانی ترقی کے لیے صرف کریں۔ ہم میں سے کسی کو بھی اپنی خودی نہیں بیچنی چاہیے بلکہ اپنے اندر ڈوب کر اخلاقی اور روحانی قوت حاصل کرنی چاہیے یہ اخلاقی قوت ہے جو بالآخر جیت جاتی ہے اور دنیا کو فتح کر لیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ بانگ درا، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔

۲۔ Journal of the History of Ideas: Was Copernicus Revolutions Approved by the Pope, 36(3), p. 537, 1975.

۳. Galileo's Mistake: A New Look at the Epic Confrontation Between Galileo and the Church by Wade Roland. New York: Arcade Publishing, 2003.

٢٠

تزکیہ واحسان



فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ. (سورۃ المائدہ، آیت: ۵۴)
(عنقریب اللہ تعالیٰ بہت سے ایسے لوگ پیدا کردے گا جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو محبوب ہوگا)

اسلام کی روحانی وسعتیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ انہیں مناسب انداز میں سامنے لایا جائے کیونکہ بنی نوع انسان روحانیت کی تلاش میں مضطرب ہونے کے باوجود اس تک رسائی پانے سے قاصر ہے۔ نوجوان اور تعلیم یافتہ مسلم ذہن اسلام کی بیرونی وسعتوں میں ہی کھو جاتا ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں پر ان کے ایمان کے اندرونی حسن کو بھی آشکارا کیا جائے۔ اسلام کی داخلی پنہائیوں کو عموماً تزکیۂ نفس (پاکیزگیٔ روح) یا تصوف (Mysticism) یا احسان کہا جاتا ہے۔

اسلام کا اصل نصب العین انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک رابطہ پیدا کرنا ہے۔ اس عمل کا ایک جزو وہ ہے جو دکھائی دیتا ہے۔ اسے 'ظاہر' یا 'شریعت' کہا جاتا ہے اور دوسرا جزو جو روحانی اور اخلاقی پہلو سے تعلق رکھتا ہے 'باطن' کہلاتا ہے۔ اسے احسان یا تصوّف کہتے ہیں۔ شریعت ایک بنیادی ساخت مہیا کرتی ہے تاکہ بنی نوع انسان گمراہ ہونے سے بچ جائے لیکن بنی نوع انسان کا اخلاقی ارتقا اس کی اپنی داخلی خواہش پر منحصر ہے۔ یہ خواہش جتنی زیادہ اور بڑی ہوگی اتنی ہی زیادہ روحانی ترقی ہوگی۔ تصوف انسان کی روحانی تمنا اور ارتقا کو آگے بڑھاتا ہے۔ صوفیاء اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرنے کی بجائے اس سے محبت کا درس دیتے ہیں۔ ان کا قاعدہ سورۃ المائدہ کی یہ آیت ہے:

فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ. (سورۃ المائدہ، آیت: ۵۴)
(عنقریب اللہ تعالیٰ بہت سے ایسے لوگ پیدا کردے گا جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو محبوب ہوگا)

(۱)۔ صوفیاء کرامؒ نے اللہ پاک کے لیے پُرجوش محبت کرنے کی تاکید کی اور اس محبت کے ساتھ اس

کی مخلوقات سے بھی محبت کرنے پر زور دیا۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ[۱] کا مشہور قصہ علامتی طور پر مفید ہے۔ ان کے ایک مرید کہیں سفر سے آئے تو وہاں کی سوغات کے طور پر قینچی لائے۔ آپؒ نے فرمایا کہ تم میرے لیے کاٹنے کی چیز لائے ہو۔ اگر تحفہ لانا ہی تھا تو سوئی دھاگہ لاتے کہ وہ جوڑنے کے کام آتا۔ صوفیاء کرامؒ کی یہی خصوصیت تھی جو دین کی اشاعت کا سبب بنی۔ اس محبت کے درس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں رقابت کم ہوگئی۔ اس میل جول سے لوگ اسلام سے متاثر ہوئے اور اسلام میں داخل ہوئے۔ (فکر اسلامی از وحید الدین خاں، ص: ۱۳۱) یہ مسلم صوفیاء کرامؒ کا کردار تھا جس نے اسلام پھیلانے میں مدد دی۔ اس ہمدردانہ معاشرتی رویہ نے اس دشمنی وعناد کو کم کردیا جو صدیوں سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان چلا آرہا تھا۔ ان کے قریب آنے اور میل ملاپ نے ایک دوسرے کے رویئے کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے دائرے میں شامل ہوگئے۔

مشہور انگریزی شاعر Leigh Hunt نے 1834ء میں حضرت ابو بن ادھمؒ[۲] کے حوالے سے اس مسئلہ پر خوبصورت نظم لکھی ہے۔ جس میں اس بات کو بہت خوبصورت سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے محبت کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے:

Abou Ben Adhem

Abou Ben Adhem - may his tribe increase-
Awoke one night from a deep dream of peace,
And saw, within the moonlight in his room,
Making it rich, and like a lily in bloom,
An angel writing in a book of gold
Exceeding peace had made Ben Adhem bold,
And to the presence in the room he said:

۱۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ (1188ء–1280ء) برّصغیر میں چشتیہ سلسلے کے عظیم صوفی بزرگ تھے۔ آپؒ کا مزار پاک پتن، پاکستان میں ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ (718ء–782ء) ایک مشہور صوفی بزرگ تھے۔

What writest thou? The vision raised its head
And with a look made allo of sweet accord,
Answered, The names of those who love the Lord.
And is mine one? Said Abou. Nay, not so,
Replied the angel. Abou spoke more low,
But cheerly still, and said, I pray thee, then,
write me as one who loves his fellow men.
The angel wrote and vanished. The next night
It came again, with a great wakening light,
And showed the names whom love of God had blest
And lo! Ben Adhem's name led all the rest.

ابوبن ادھمؒ

اللہ تعالیٰ اس کی جماعت کی تعداد بڑھائے
اک روز گہری نیند سے بیدار ہوا
اور چاند کی روشنی سے اپنے حجرہ کو منور دیکھا
اس نے حجرہ کو چمبیلی کی کلیوں کی طرح بھرا ہوا تھا
اک فرشتہ سنہری کتاب میں لکھ رہا تھا
پر سکون ماحول نے ابو بن ادھمؒ کی ہمت بندھائی
اور حجرہ میں موجود فرشتے سے پوچھا
تم کیا لکھ رہے ہو؟ فرشتے نے سر اٹھایا
اور آپؒ پر محبت بھری نگاہ ڈالی
اور جواب دیا، اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کے نام
ابو بن ادہمؒ نے پوچھا: کیا ان میں میرا نام بھی ہے؟
فرشتے نے جواب دیا کہ نہیں
ابو بن ادہمؒ نے دھیمی لیکن خوشی کی آواز میں کہا
میں تم سے گزارش کرتا ہوں

میرا نام ان میں لکھ لو جو اس کے بندوں سے محبت کرتے ہیں
فرشتہ نے لکھا اور غائب ہوگیا
فرشتہ اگلی رات پھر آیا
اب وہ نیند سے بیدار کر دینے والی روشنی کے ساتھ آیا
اور ان کو وہ نام دکھائے جن کو اللہ تعالیٰ کی محبت کی سند ملی تھی
اور اس فہرست میں ابو بن ادہمؒ کا نام سب سے اوپر تھا

(۲)۔ آج کا تصوف کائنات اور بنی نوع انسان سے ربط وضبط کی بجائے ترک دنیا اور خلوت نشینی کی وکالت کرتا ہے جبکہ حقیقی صوفی رویے اور طرز عمل میں تعیش اور انتہا پسندی ترک کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ تصوف کے اس غلط تصور نے امت مسلمہ کو کمزور کر کے رکھ دیا ہے۔ حضرت اقبالؒ کے مطابق مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سقوط بغداد کے بعد دوسرے نمبر پر تصوف کا غلط تصور ہے:

دور متأخر کے تصوف میں کلیتاً آخرت کا جذبہ پیدا ہوجانے سے لوگوں کی نظروں سے اسلام کا ایک بہت اہم پہلو اوجھل ہوگیا جو کہ معاشرتی نظم وضبط سے متعلق تھا۔ ان کی بے لگام سوچ بچار کی تخمینہ کاری میں مصروف ہوجانے کے باعث تصوف نے اسلام کے بہترین ذہنوں کو بالآخر اپنے اندر جذب کرلیا۔ اس طرح مسلم ریاست عموماً دوسرے درجے کا ذہن رکھنے والوں اور اسلام سے لا پرواہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہ گئی اور عوام کی رہنمائی کے لیے کوئی عالی دماغ شخصیت باقی نہ رہی اور ان کا تحفظ کورانہ تقلید کرنے والے مدرسین کے پاس رہ گیا ہے۔

(*The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, p. 150 - 151*)

(۳)۔ جب مسلمان ذہنی طور پر مخبوط الحواسی کی کیفیت میں تھے تو مغرب میں فطری علوم ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ہم عمومی طور پر دنیا کی رائج الوقت ذہنی سرگرمیوں سے منقطع رہے۔ ہمارا تصوف خوابوں اور متصوفانہ مشاہدات پر زور دیتا رہا حالانکہ اسے ہماری توجہ کائنات پر مرکوز کرانی چاہیے تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صوفیوں نے لوگوں کو سائنسی علوم پڑھنے سے براہِ راست روک دیا تھا لیکن غلط تصورات کی وجہ سے، وہ مزاج اور طرز عمل جو ہم نے وضع کیا اگر سائنس دشمن نہیں تو غیر سائنسی ضرور تھا۔ سائنس ہماری توجہ خارجی مادی دنیا کی طرف

مبذول کرتی ہے جبکہ ہم نے اپنی توجہ اور قوتوں کو صرف اور صرف 'باطن' (داخلی وسعتوں) پر مرکوز کر دیا تھا۔ ہمارا روحانی سفر جب تک رواں رہا، اسے ہماری تمام وقت توجہ کی ضرورت نہیں تھی۔ جوں جوں ہم روحانی طور پر بڑھتے رہے ہم نے دنیا کو زیادہ سے زیادہ سنبھالے رکھا ہے۔ اس سفر میں بھی ہم سیکھتے اور ترقی کرتے رہے ہیں۔

جس زمانے میں ہمارے ہاں بڑے صوفی پیدا ہوئے۔ یورپ میں اعلیٰ پائے کے سائنسدان پیدا ہوئے۔ جیسا کہ

حضرت جلال الدین رومیؒ (متوفی 1273ء)	راجر بیکن (متوفی 1294ء)
حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ (متوفی 1389ء)	گٹن برگ (متوفی 1498ء)
حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (متوفی 1624ء)	کیپلر (متوفی 1630ء)
حضرت خواجہ باقی باللہؒ (متوفی 1605ء)	ڈیکارٹ (متوفی 1650ء)
حضرت مظہر جان جاناںؒ (متوفی 1781ء)	نیوٹن (متوفی 1727ء)
حضرت سید احمد شہیدؒ (متوفی 1831ء)	جیمز واٹ (متوفی 1819ء)
حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ (متوفی 1899ء)	ڈارون (متوفی 1882ء)
حضرت اشرف علی تھانویؒ (متوفی 1943ء)	آئن سٹائن (متوفی 1955ء)

ہمارے یہ صوفیا کرامؒ عظیم لوگ تھے۔ انہوں نے انسان کی اخلاقی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ لیکن اچھا ہوتا کہ ان کے ساتھ ساتھ عظیم پائے کہ سائنسدان بھی پیدا ہوتے جو انسانی علم کو آگے بڑھاتے۔ انسان کی روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی فلاح کا بھی مداوا کرتے۔

تصوف نے پلوٹینس[۱] کی تعلیمات اور ہندوؤں کی رسم 'تیاگ'[۲] کے زیر اثر فکر و عمل کا ایک پیچیدہ

[۱]۔ Plotinus: پلوٹینس (204ء-270ء) دنیائے قدیم کا ایک بڑا یونانی فلسفی تھا۔ اس کا فلسفہ تین اصولوں پر مشتمل تھا: ذاتِ واحد، ذہانت اور روح۔ انیسویں صدی کے مورخوں نے 'افلاطونیتِ نو' کی اصطلاح ایجاد کی جو اس پر اور اس کے فلسفے پر لاگو ہوتی تھی وہ زمانۂ قدیم کے آخری حصے میں بہت مقبول تھا۔

[۲]۔ 'تیاگنا' کسی چیز کو باطل اور غیر اہم قرار دے کر چھوڑ دینے کو کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح خاص طور پر ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو پہلے عیش و عشرت کی زندگی گذار رہے ہوں لیکن پھر سب کچھ چھوڑ کر راہبانہ طرز عمل اختیار کرلیں۔

نظریہ وضع کرلیا جو روحانیت کے بارے میں سادہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ بڑی حد تک مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ یہ نظریہ اس خوبصورت توازن سے متصادم تھا جو اسلام نے روح اور مادے کے درمیان اور دنیاوی و اُخروی معاملات کے درمیان قائم کیا تھا۔ یہی اسلام کا اصل نصب العین تھا۔ (دیکھیے مصنف کی دوسری کتاب: کتاب الزہد)

(۴)۔ مسلمانوں نے دو بڑے نقصان اٹھائے جو تصوف کی ان گمراہ کن تعلیمات، رہبانیت اور تیاگ (renunciation) اور نامعقولیت کی صورت میں ظاہر ہوئے:

(i)۔ اسلام متحرک و عملی دین کی بجائے چلہ کشی و مردم بیزاری کی طرف چلا گیا۔ دین کی سماجی، سیاسی و معاشی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ خدا کی ذات کی بجائے شیخ کی طرف بلایا جانے لگا۔ دین کی عطا کردہ اجتماعیت کی بجائے ذاتی عرفان (gnosis)، کشف (revelation) اور مراقبہ (meditation) جیسے انفرادی اعمال کیے جانے لگے۔ دین نے تو عبادت و دعا کو بھی اجتماعی عمل بنایا تھا۔ ہم نے اس کو حجرہ تک بلکہ جنگلوں تک محدود کر دیا۔ اس سے سماج ٹوٹنے لگا۔ اجتماعیت کمزور پڑ گئی۔ روحانیت ذاتی فعل بن گیا۔ اس کی اجتماعیت ختم ہوگئی۔ اجتماعیت کی قوت نہ ہونے کی وجہ سے روحانی و نفسی مسائل بڑھنے لگے۔ عبادت کا مقصد اس وقت صحیح طور پر پورا ہوتا ہے جب اس کو اجتماعی طور پر کیا جائے۔ اس لیے اسلام نے نماز باجماعت، جمعہ کی نماز، عیدین اور سالانہ حج پر زور دیا ہے۔

حضرت اقبالؒ نے بجا کہا ہے کہ عبادت اسی وقت بہتر نتائج دے سکتی ہے جب وہ اجتماعی طور پر کی جائے۔ اسلام میں حقیقی عبادت ایک اجتماعی اقدام ہے، انفرادی نہیں۔ اس کا مقصد انسانی میل جول کے دائرے کو وسیع کرنا پھر اس کو اس طرح بڑھانا ہے کہ یہ رفتہ رفتہ عالمگیر بن جائے۔ ان کے الفاظ میں:

'تاہم نماز کا حقیقی مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب اقدامِ نماز، اجتماعی اقدام بن جائے۔ صحیح نماز کی سپرٹ (spirit) معاشرتی ہے۔ اسلام میں نماز با جماعت کی ادائیگی معاشرتی راہ و رسم بڑھانے اور روحانی رخشندگی پھیلانے کا خصوصی ذریعہ ہے۔ اس میں بہت سے فائدے مضمر ہیں۔ جب مسلمان روزانہ کی اجتماعی نماز سے بڑھ کر آگے چلتے ہوئے سالانہ تقریب کے لیے مکہ کی مرکزی مسجد میں پہنچیں تو آپ بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اسلامی

عبادت کا دستور العمل بتدریج بڑھتے بڑھتے انسانی دائرہ رفاقت کو وسیع تر کر دیتا ہے۔

(*Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.84*)

(ii)۔ مسخ شدہ تصوف کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر عجیب قسم کے نفسیاتی مسائل نے جنم لے لیا۔ ہر ایرے غیرے نے زاہد ہونے کے دعوے کرنا شروع کر دیئے۔ لوگ مکار صوفیوں کو غیر معمولی قوتوں کے مالک سمجھنے لگے۔

(۵)۔ صوفیوں نے 'حالت سکر' (intoxication) میں عجیب وغریب دعوے کر دیئے۔ یہ حقائق زندگی سے کٹ کر اور غلط روحانی کیفیات میں ڈوب گئے۔ ہندوستان کے عظیم صوفی حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ سے منسوب قول قابل توجہ ہے کہ

محمد عربی برفلک الافلاک رفت و باز آمد
واللہ گرمن رفتمے، ہرگز باز نیامدے
(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج میں آسمانوں پر گئے اور واپس آ گئے)
(خدا کی قسم اگر میں وہاں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا)

حضرت اقبالؒ کے بقول یہی فرق ہے صوفی کے شعور میں اور نبی علیہ السلام کے شعور میں۔ صوفی روحانی تجربے کے بعد پھر عام حالت میں واپس نہیں آنا چاہتا مگر نبی علیہ السلام واپس آتا ہے اور انسانیت کے لیے فلاح لاتا ہے۔ وہ اس تجربے سے واپس آ کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں کرتے ہیں اور فکر ونظر کی ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں۔ صوفی کے لیے روحانی تجربہ اس کی معراج ہے۔ انتہا ہے جبکہ نبی علیہ السلام کے لیے روحانی تجربہ صرف سیکھنے کا ایک عمل ہے۔ بیداری کا عمل ہے:

حضرت اقبالؒ اپنے سات خطبات میں سے پانچویں میں جس میں نبوت اور ولایت کا فرق بتایا گیا ہے، کہتے ہیں: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلند ترین آسمان پر تشریف لے گئے اور واپس پلٹ آئے۔ خدا کی قسم اگر میں وہاں جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ یہ الفاظ عظیم صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ہیں۔ غالباً پورے صوفیانہ ادب میں پیغمبرانہ ادراک اور صوفیانہ شعور میں موجود واضح نفسیاتی فرق کو ایک جملے میں ادا کرنے کی کوئی اور نظیر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے

گی۔صوفی نہیں چاہتا کہ وہ اس واردات اتحاد کی لذت اور سکون سے واپس لوٹے اور جب وہ کبھی لوٹتا ہے اور اسے واپس لوٹنا پڑتا ہے۔اس کی واپسی نوع انسانی کے لیے کوئی بڑا مفہوم نہیں رکھتی۔ نبی علیہ السلام کی واپسی تخلیقی ہوتی ہے۔وہ اس سے لوٹتا ہے تا کہ زماں کی قلمرو میں داخل ہو اور تاریخ کی قوتوں کو قابو میں رکھتے ہوئے مقاصد کی تازہ دنیا تخلیق کرے۔صوفی کے لیے اتحاد لذت اس کی آخری منزل ہے مگر نبی علیہ السلام کے لیے یہ تجربہ اپنے آپ میں دنیا کو ہلا دینے والی نفسیاتی قوتوں کو بیدار کرنے کا عمل ہے۔جس سے عالم انسانیت کو مکمل طور پر تبدیل کیا جا سکے۔ یہ خواہش کہ اس کا مذہبی تجربہ ایک زندہ عالمگیر قوت میں تبدیل ہو جائے، نبی علیہ السلام میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔

(*The Reconstruction of Religios Thoughts in Islam*)

(۶)۔ ہمارے صوفیاء کرامؒ بالعموم اپنے صوفیانہ تجربات میں گُم ہو گئے تھے تاہم ان میں کچھ پیغمبر علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سنجیدہ اور متین حالت میں واپس آ گئے اور انھوں نے دنیا کے لیے مثبت خدمات انجام دیں۔ جو کچھ انھوں نے اپنے عارفانہ تجربے سے حاصل کیا اس سے انھوں نے دنیا میں تبدیلی کی۔مگر اکثریت کی دعاؤں نے بنی نوع انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ چنانچہ وہ انسانی صلاحیتوں کے لیے تاریک غار بن گئے۔معتزلہ[1] کی غیر ضروری عقلیت کے جواب میں ہم نے صوفیت کے وجدان (intuition) کو لا کھڑا کیا جس سے ایک غیر عقلی اور توہماتی (superstition) رویے نے جنم لیا۔

(۷)۔ عقل علم کا واحد ذریعہ نہ تھا لیکن وحی کے ساتھ ساتھ عقل لازم ہے۔وحی بھی عقل کو خطاب کرتی ہے۔ہم نے عقلیت کے خلاف روحانی تجربے کو لا کھڑا کیا۔کشف، الہام اور وجدان کو علم کا اصل ذریعہ سمجھ لیا۔عقل اور علم کے خلاف باتیں کرنے لگے۔صوفیا نے جو بات ایک خاص انداز میں ایک خاص وجہ سے کہی وہ ہم نے عمومی اصول بنا لیا۔حضرت جلال الدین رومیؒ نے

۱۔معتزلہ ایک عقلیت پسند مسلک ہے جس کا بانی ایک ایرانی نژاد واصل بن عطا تھا جو خواجہ حسن بصریؒ کا شاگرد تھا۔معتزلہ دین کے سارے معاملات کو عقل کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس ضمن میں عقل کو نقل پر غیر معمولی فوقیت دیتے ہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی میں کہا:

صد ورق و صد کتاب را در نار کن
روئے دل را جانب دلدار کن
(سینکڑوں صفحے اور سینکڑوں کتابیں آگ میں ڈال دیں)
(اور اپنے دل کا رخ اپنے محبوب کی طرف کر لیں)

اس طرح کی عارفانہ گفتگو سے ہم نے غلط نتیجہ نکالا۔ ہم نے ایک غیر عقلی رویہ اپنا لیا۔ علم سے دور رہنے لگے جس کے نتیجے میں تصوف نے ایک غیر علمی اور غیر عقلی شکل اختیار کر لی جس کے سبب کم علم صوفیا غیر اسلامی نظریات کا شکار ہو گئے۔ وہ جاہلیت کے حملوں کو نہ سمجھ سکے۔ رام اور رحیم کو، کرما اور کریم[1] کو ایک سمجھنے لگے۔

(۸)۔ اس صوفیانہ سوچ سے ایک بہت بڑا نقصان ذات کی نفی کی صورت میں سامنے آیا جس سے شخصی آزادی اور ارتقا رک گیا۔ صوفی نے اپنی ذات کو شیخ میں فنا (فنا فی الشیخ) کرنا تھا۔ پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں فنا (فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور پھر خدا کی ذات میں فنا (فنا فی اللہ) کرنا تھا۔ اس نفسیاتی سوچ نے وحدت الوجود (Pantheism) کو جنم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کا حصہ بن جائیں گے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فنا کی اس سوچ کے مضمرات کو سمجھا۔ اس فنا کے بعد بقا کو اپنایا۔ خدا تعالیٰ کی ذات میں اپنی ذات کو گم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ خدا تعالیٰ کے رحم و کرم پر ہوتے ہوئے اپنی ذات کا تشخص (identity) قائم رکھا۔ ذات کا یہ قیام (affirmation) انسانی ترقی کا بنیادی لازمہ ہیں۔ جب تک انسان اپنی ذات کو آگے نہیں لائے گا، وہ کوئی بھی تخلیقی عمل نہیں کر سکتا۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ بڑے بڑے ذہن تصوف کی اس غلط تعبیر کی نذر ہو گئے۔ حیوانی صفات (animal instincts) کو ضبط کرنے کی بجائے ان کو فنا کرنے پر تل گئے۔ غیر ضروری عاجزی نے اعتماد ذات ہی ختم کر دیا۔ خودی میں ڈوب کر باہر نہ نکل سکے۔ حضرت اقبالؒ نے صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ

۱۔ اس ضمن میں ہندوستان میں بارہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں بھگتی تحریک شروع کی گئی جس کا مقصد ہندوستان میں موجود تمام مذہبی خیالات کو ملا کر ایک نیا مذہبی تصور قائم کرنا تھا۔

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تیری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں
(ضرب کلیم: تصوف)

(۹)۔ ہم اپنی ذات میں اعتماد کی بجائے فنافی مرشد میں (فنافی الشیخ) کے چکر میں پڑ گئے۔ قرآن مجید نے آسمان و زمین کی طرف بلایا تھا ہم نے کہا کہ شیخ کی اطاعت کرو۔ بقول حافظ شیرازیؒ:

بامئے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا
(اگر پیر صاحب کہیں تو پیالہ شراب سے بھرلو، اس لیے کہ
شیخ صاحب کو منزل کے راستوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے)
(دیوان حافظ، غزل اول)

اس نظام فکر سے غیر صحتمندانہ شخصی تقدس اور شخصیت پرستی (personality cultism) نے جنم لیا جو بذات خود تحقیق و تعلیم کی دشمنی ہے۔ یہ سوچ جب آگے بڑھی تو اس نے نعرہ لگایا کہ ولایت نبوت سے بہتر ہے۔ ولی (پیر) نبی سے زیادہ اہمیت اختیار کر دیا جو سراسر غیر اسلامی سوچ تھی۔

(۱۰)۔ تقویٰ کے نام پر ہم نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جائز نعمتیں بھی اپنے اوپر حرام کر لیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار ایک معمولی وجہ سے ارادہ فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئندہ شہد نہیں کھائیں گے۔ اس ارادہ پر اللہ پاک نے ناراضگی کا اظہار فرمایا:

يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ. (سورۃ التحریم، آیت:۱)
(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلال کر دیا ہے اسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں حرام کرتے ہیں؟)

جبکہ ہم نے اب بہت سی نعمتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کے نام پر اپنے لیے ترک کر لی ہیں۔

میرے ایک پیارے دوست نے ایک بار مجھے پورے اعتماد میں لے کر بتایا کہ ان کے پیر صاحب بہت عبادت گزار تھے۔ انہوں نے ایک ٹہنی پکڑ کر کئی سال ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر عبادت کی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے عرض کیا کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت

نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام بھی فرماتے تھے۔ کام بھی کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری رات عبادت سے منع فرمایا ہے۔ سارا سال روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ہمیں اعتدال کا سبق دیا ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دین بہت آسان ہے۔ پس تم لوگ میانہ روی اختیار کرو اور (اعتدال سے) قریب رہو اور خوش ہو جاؤ (کہ تمہیں ایسا دین ملا) اور صبح اور دوپہر کے بعد اور کچھ رات میں عبادت کرنے سے دینی قوت حاصل کرو۔

(صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث:۳۸)

ایسا طرز عمل غلط ہے اور اسلام میں سختی سے ممنوع ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اعتدال کا سبق دیا اور درمیانے راستے پر چلنے کی تلقین کی ہے۔ اس قسم کی انتہا پسندانہ عبادت سے مجھے یاد آیا کہ سینٹ میکیرلیس چھ ماہ تک ایک دلدل میں رہتا رہا اور عام طور پر ایک من لوہے کا وزن اپنے گلے میں رکھتا تھا۔ ہمارے بھی ملنگ یہی کرتے ہیں۔ زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ سینٹ یوسیس تین سال تک ایک خشک کنویں میں مقیم رہا۔ مشہور راہب یوحنا مسلسل تین سال تک کھڑے ہو کر عبادت کرتا رہا۔ سونے کے لیے بس ایک چٹان پر لیٹ جاتا تھا۔ سینٹ انتھونی نے کبھی پیر دھونے کا گناہ نہیں کیا تھا۔ سینٹ ابراہم نے پچاس سال میں کبھی اپنا منہ نہیں دھویا۔ سبحان اللہ! کیا تقویٰ تھا؟ یہ روایت اسلام میں ممکن نہیں ہے۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص:۲۱۲)

(۱۱)۔ ہمیں اس تصوف کو غیر اسلامی اور غیر انسانی نظریات سے پاک کرنا ہوگا۔ روحانیت اللہ پاک کی ذات عالی کی حضوری اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کا نام ہے۔ ہمیں نبوی مزاج اپنانا ہوگا۔ انسانوں میں رہتے ہوئے اعلیٰ اخلاق اور روحانی واردات رکھتے ہوئے عمومی فلاح کے لیے کام کرنا ہوگا۔ روحانی تجربے اور نفسیاتی بیماریوں میں فرق کرنا ہوگا۔ انسانیت سے محبت کرنا ہوگی۔ عاجزی پیدا کرنا ہوگی۔ دین کی اشاعت کے لیے اپنے آپ کو گھولنا ہوگا۔ اجتماعیت میں انفرادیت ڈھونڈنا ہوگی۔ نیلے پیلے رنگوں اور نفسیاتی خوابوں سے نجات پانا ہوگی۔ طریقت کو شریعت کے تابع کرنا ہوگا۔

یہ حکمتِ مَلکوتی، یہ علم لاہُوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(ضرب کلیم: تصوف)

(۱۲)۔ اگر تصوف حقیقی ہو تو وہ ہمیں اس جدید دنیا میں بہت کام دے سکتا ہے جس میں لوگ مال و دولت اور عیش و آرام کے لیے ہلکان ہوئے جا رہے ہیں اور مادی آسائشوں کو زندگی کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

(i)۔ حقیقی تصوف ہمیں اپنے خالق سے محبت اور اس کی اطاعت سکھاتا ہے۔

(ii)۔ ہم خدا کی اس طرح عبادت کریں جیسے ہم اسے دیکھ رہے ہیں یا کم از کم ہم یہ سمجھیں کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

(iii)۔ تصوف یہ سکھاتا ہے کہ ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں اور ان کی اقدار کو اہمیت دیں۔

(iv)۔ تصوف یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہم اس اندھیرے کے پردوں کے پار دیکھیں، جو ہمارے نظامِ اخلاق کی شکل بگاڑتا ہے اور روحانی تربیت ہمیں چیزوں کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھنے کے قابل بنا سکتی ہے۔

(v)۔ ہم اس دنیا کے 'لیے' ہو سکتے ہیں لیکن اس دنیا کے نہیں۔

(vi)۔ تصوف نظر کی پاکیزگی کا سبق دیتا ہے تاکہ ہم پاکیزگی روح کی ضمانت حاصل کر سکیں۔

(vii)۔ تصوف دل میں محبت شفقت اور عدل جاگزیں کرتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ چالاکیوں، استحصال بددیانتی اور بے راہ روی سے کیسے محفوظ رہا جائے۔

(viii)۔ تصوف ادب واحترام، خدمت اور سب سے یکساں سلوک سکھاتا ہے۔

(ix)۔ تصوف انسانوں اور ماحول (جانوروں، پھولوں، پھلوں اور درختوں) سے محبت کا درس دیتا ہے۔

(x)۔ یہ ہمیں اپنے تکبر، حرص، بے صبری، غصے اور خودنمائی کو کنٹرول کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

(xi)۔ ہم اپنے ذہنوں کو غرور، حرص اور نمود و نمائش اور ماضی و مستقبل کے تفکرات سے آزاد کر سکتے ہیں۔

(xii)۔ ہم دکھ درد میں صابر بننا سیکھ سکتے ہیں جیسا کہ اللہ ہمیں درد اور مسرت، خوشیوں اور غموں کے ذریعے صبر و ضبط کا درس دیتا ہے۔

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ خدا تمہیں ایک احساس سے دوسرے احساس تک پلٹاتا ہے اور تمہیں متقابلات کے ذریعے ہدایت دیتا ہے تاکہ تمہارے پاس اڑان کے لیے دو 'پر' ہوں نہ کہ 'ایک'

اور خدا سے محبت کے بغیر کوئی زندگی نہ ہے:

I wonder, by my troth, what thou

And I did, till we loved?

(John Donne)

(مجھے زمین کی قسم، میں حیران ہوں کہ آپ اور میں نے آپس میں محبت کرنے سے پہلے کیا کیا)

حوالہ جات

۱۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ لکھنو: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۷۹ء۔

۲۔ دیوان حافظ، حافظ محمد شیرازیؒ۔ لاہور: پروگریسو بکس، ۲۰۱۰ء

۳۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ ضرب کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: کتب خانہ طلوع اسلام، ۱۹۳۶ء۔

۵۔ کتاب الزہد، ظفر اللہ خان۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۷ء۔

۶۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam by Dr. Muhammad Iqbal. London: Oxford University Press, 1934.

۷. An Anatomy of the World by John Donne. London: A. Mathewes for T. Dewe, n. d.

۲۱

غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتیں



وَمَنۡ یُّهَاجِرۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ یَجِدۡ فِی الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا کَثِیۡرًا وَّسَعَةً.
(سورۃ النساء، آیت:۱۰۰)
(جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے وسیع جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا)

آج مسلمان دنیا میں دوسرا بڑا مذہبی گروپ ہیں۔ 2015ء کی ایک شماریاتی تحقیق کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ایک ارب ستر کروڑ ہے جو کل عالمی آبادی کا 22/23 فیصد ہیں۔

(*http://www.gordonconwell.edu/resources/*)

اسلام مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ، قرنِ افریقہ، ساحل اور ایشیا کے بعض حصوں میں ایک اکثریتی مذہب ہے۔ لگ بھگ باسٹھ فیصد (62%) مسلمان جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں رہتے ہیں۔ یہ تعداد ایک ارب ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مغربی چین، بلقان (مشرقی یورپ کا ایک حصہ جو بحیرہ اسود، ایجین اور ایڈریاٹک سمندروں سے گھرا ہوا ہے) بھارت اور روس میں رہتی ہے۔ مغربی یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں بھی مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) ستاون (۵۷) مسلم ریاستوں (بشمول فلسطین) کی نمائندہ ہے۔

(۱)۔ غیر مسلم ریاستوں میں رہنے والے مسلمانوں کے حقیقی مسائل از سر نو غور وفکر کے متقاضی ہیں کیونکہ مسلم اکثریت کے حامل مما لک سے مغربی ملکوں کی طرف بڑے پیمانے پر ہجرت ہو رہی ہے۔ زمانۂ جنگ میں جدید تصورِ شہریت محض قانونی رہائش یا اظہار وفاداری سے کہیں زیادہ چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ایسی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے جو محض قوانین کی پابندی کا عہد کرنے سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جدید شہریت وہاں پہلے سے موجود تمام شہریوں کے ساتھ یکجہتی کا مطالبہ کرتی ہے جو بالعموم مذہبی اور نسلی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ مسلمان شہریوں اور مغربی مما لک کے مستقل باشندوں کو سیاسی آزاد خیالی کی اس قسم (برانڈ) کو لازماً قبول کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ جدید مسلم دانشور فقہ الاقلیات (Jurisprudence of Muslim

(Minorities) کے نام پر ان سیاسی و معاشرتی حقیقتوں سے ہم آہنگی اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مسلم اہل دانش اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مغربی ممالک میں مسلمان اپنے لیے خود مختار حکومت کا مطالبہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ آزاد خیال معاشرے مسلم اقلیتوں کو متوازی قانونی دائرہ اختیار عطا نہیں کر سکتے اور یہ کہ مغربی ریاستوں میں جدید شہریت تمام مذاہب کے ماننے والوں سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ اخلاقی اور معاشرتی یکجہتی کا اظہار کریں گے۔

(۲)۔ کیا مسلمان قرآنی احکامات کی روشنی میں ایک غیر مسلم ریاست میں رہ سکتے ہیں؟ کیا مغربی ممالک زمانۂ جنگ میں مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ کر سکتے ہیں جب کہ یہ ان کے ساتھی مسلمانوں سے متعلقہ فرائض سے متصادم ہو؟ کیا مسلمان مغرب میں ایسی اخلاقیات (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کو فروغ دے سکتے ہیں جیسے کہ یہ رویہ جسے مسلمان قابل نفرت سمجھتے ہیں مثلاً ہم جنسیت اور کلمات کفریہ؟

مسلم فقہاء کرامؒ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلم ماحول کے اندر رہ سکتے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں اس کی گنجائش موجود ہے۔

دَرَجٰتٍ مِّنۡهُ وَمَغۡفِرَةً وَّرَحۡمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا. (سورۃ النساء، آیت:۹۶)

(ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے درجات ہیں، مغفرت اور محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا. (سورۃ النساء، آیت:۹۹)

(اور ان کے لیے بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے)

وَمَنۡ يُّهَاجِرۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يَجِدۡ فِى الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا كَثِيۡرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنۡ يَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَيۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ يُدۡرِكۡهُ الۡمَوۡتُ فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا. (سورۃ النساء، آیت:۱۰۰)

(جو کوئی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سی جگہ اور گزران کی کشادگی پائے گا اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف نکل کھڑا ہوا پھر اسے موت نے آلیا

تو یقیناً اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان ہے)

ایک قدیم فقیہ کا یہ موقف کہ مسلموں اور غیر مسلموں کے تعلقات کی بنیادی حیثیت جنگ ہے اور جنگ کی بنیاد دینی ہے۔ یہ موقف موجودہ زمانے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کمزور نظریے کا ایک ممکنہ نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ غیر مسلم بے دھڑک مسلمانوں کو قتل کرتے جائیں جو ان کی اس سوچ کا ایک فطری نتیجہ ہوگا کہ مسلمان اور غیر مسلم مستقل طور پر حالت جنگ میں ہیں۔

(۳)۔ تاہم قرآن مجید کی چند آیات ہیں جو بظاہر اس کے برعکس اشارہ دیتی ہیں:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ. (سورۃ آل عمران، آیت: ۲۸)

(مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ. (سورۃ آل عمران، آیت: ۱۱۸)

(اے ایمان والو! ایمان والوں کے سوا کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم دکھ میں پڑے رہو۔ ان کی عداوت ان کی زبان سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہم نے تمہارے لیے آیات بیان کر دیں تاکہ تم سمجھ جاؤ)

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا. (سورۃ النساء، آیت: ۱۳۹)

(یہ لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو دوست بناتے ہیں کیا ان کفار کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں۔ ہر قسم کی عزت تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. (سورۃ المائدہ، آیت: ۵۱)

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا تو یقیناً وہ انہی میں سے ہوگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا)

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ. (سورۃ آل عمران، آیت:۲۸)

(مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ مگر یہ کہ ان کے شر سے بچنے کے لیے ایسا کرے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے اور اللہ پاک ہی کی طرف لوٹ جانا ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا. (سورہ النساء، آیت: ۱۴۴)

(اے صاحب ایمان لوگو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی صاف حجت قائم کرلو؟)

بعض دانشور یہ دلیل دیتے ہیں کہ غیر مسلموں سے دوستی کی ممانعت کے متعلقہ آیات کے وہ معانی نہیں ہیں جو عموماً لیے جاتے ہیں۔ تاہم یہ آیات بظاہر غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات اور وفاداریاں نبھانے سے روکتی ہیں۔ اگر ان آیات کی لفظی تعبیر کریں تو پھر مسلمان غیر مسلم ریاست کا تحفظ یا سرپرستی قبول نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان آیات کو مناسب انداز میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ آیات مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معمول کے معاشرتی اور سیاسی تعلقات کی ممانعت نہیں کرتیں بلکہ ان سے ایسی مذہبی اور سیاسی وفاداری سے باز رہنے کے لیے کہتی ہیں جو مسلم کمیونٹی یا بحیثیت مجموعی سب مسلمانوں کے مفادات کے لیے نقصان دہ ہو۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے اتنے گہرے تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں جن کی وجہ سے ان کے اندر اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہوں اور نہ ہی انہیں مذہبی معاملات، سیاسی اتحاد یا وفاداریوں کے

سلسلے میں مسلمانوں پر غیر مسلموں کو ترجیح دینی چاہیے۔ مزید برآں یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں تھیں جب قرون اولیٰ کے مسلمان مخاصمانہ ماحول کے اندر محض اپنی بقا کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ جہاں اسلام اور کفر کے درمیان مسلسل کشمکش برپا تھی۔ یہ آیات مسلمانوں کی اقلیتی حالت سے متعلق نہیں ہیں۔

مزید برآں یہ آیات دو خصوصی صورت احوال کی طرف اشارہ دیتی ہیں۔ ان لوگوں سے محبت رکھنا جو مسلمانوں سے ان کے مذہب کی بنا پر لڑ رہے ہوں اور ان سے ان کے کفر کی وجہ سے محبت رکھنا۔ (تفسیر المنار ذیل سورۃ آل عمران، آیات: ۱۲۷-۱۲۸)

(۴)۔ تاہم 'حُبِ فطری' (Innate love) اور 'حُب عقیدی' (creedal love) میں ایک فرق ہے۔ مسلمان اچھے تعامل یا مشترکہ مفاد کی خاطر غیر مسلموں سے حبِ فطری رکھ سکتے ہیں مگر حبِ عقیدی نہیں رکھ سکتے۔ اسلامی اخوت کے علاوہ انسانی اخوت اور قومی اخوت ہوسکتی ہے۔

قرآن مجید کی درج ذیل آیات اس نقطے کی اچھی وضاحت کرتی ہیں:

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ.
(سورۃ الاعراف، آیت: ۶۵)

(اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ اس نے کہا: 'اے برادرانِ قوم! اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟)

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ.
(سورۃ ہود، آیت: ۸۴)

(اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا: 'اے میری قوم کے لوگو! اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے)

ان آیات میں سابق ابراہیمی انبیاء علیہم السلام کا حوالہ ان کے کافر، گناہ گار اور ظالم برادران ورشتہ داران کے طور پر دیا گیا ہے۔ (الخصائص العامہ لی الاسلام، ص: ۹۸) اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید پیغمبروں علیہم السلام کے غیر مسلموں کے ساتھ معمول کے دوستانہ و برادرانہ تعلقات کی اجازت دیتا ہے۔

(۵)۔ اسی طرح مسلم فقہاء کرامؒ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ معاہدوں کی اسی طرح پاسداری کی جانی چاہیے جیسے مسلمانوں کے باہمی معاہدوں کی پابندی لازمی قرار دی گئی ہے۔ ان معاہدوں کو 'امان' (معاہدۂ تحفظِ باہمی) کہا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ معاہدے مسلمانوں کو پابند بناتے ہیں کہ وہ ان کے تحت عائد ہونے والی اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں پوری کریں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو کوئی معاہدے کی خلاف ورزی کرے گا قیامت کے روز اس کے لیے ایک جھنڈا اٹھایا جائے گا تاکہ اس کے دھوکے کا پتہ چل جائے۔ (کتاب المبسوط، ج:۱۰، ص:۱۰۵)

یہ عام طور پر مسلمہ رسمِ امان ایک غیر مسلم ریاست کے مفادات کے احترام کا جواز مہیا کرتی ہے جب تک ایک مسلمان وہاں رہتا ہے۔ عہد حاضر میں 'ویزا' یا 'توطن' (naturalization) کا نظام، امان کے مساوی قانونی اور اخلاقی اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ غیر مسلم ریاستوں کے حق میں قانونی اور سیاسی ذمہ داریاں پیدا کرتا ہے۔ (فقہ الاقلیات، ص:۱۶۰) اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہ اسلامی ایک مسلمان کو اس امر کا پابند بناتی ہے کہ وہ جس ملک میں رہائش رکھتا ہو وہاں کے قانون کی پابندی کرنا اس کے لیے ایک اخلاقی اقرار نامہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا اپنے ایمان اور ضمیر کے ساتھ وفاداری اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ملک کے ساتھ دیانتدارانہ وفاداری کرے اور شریعت مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی جائے رہائش کے ملک کے دستور کے دائرے کے اندر رہ کر وہاں کا ایک دیانتدار اور وفادار شہری بنے۔

(*To be a European Muslim, p. 171.*)

(۶)۔ درج ذیل آیاتِ قرآنی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اقلیت ایسے ممالک میں رہ سکتی ہے جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہوں:

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (سورۃ النساء، آیت:۹۶)

(ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا

يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا. (سورۃ النساء، آیت: ۹۸)
(ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے)

فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا. (سورۃ النساء، آیت: ۹۹)
(بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کردے۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے)

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (سورۃ النساء، آیت: ۱۰۰)
(اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے، اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمے واجب ہو گیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے)

(۷)۔ یورپی کونسل برائے فتویٰ وتحقیق کے رہنما جناب فیصل مولویؒ[۱] اور علامہ یوسف القرضاویؒ[۲] اس اصول کی بنیاد پر مزید آگے بڑھتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر کسی کی رہائش غیر مسلم ریاست ایک مسلم ریاست پر حملہ کردے تو اس زمانے میں وہاں موجود مسلمانوں کی 'خودلگامی' (ضبط نفس) کے فریضے میں مزید توسیع ہو جاتی ہے۔

(*http://www.fatwa-online.com*)

بعض سکالرز 'نظریہ سیاسہ شرعیہ' (اسلامی قانون کی پالیسی) کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں غیر مسلم ریاست کے دفاع میں لڑائی میں شریک ہو جانا بھی جائز ہے۔ اس جواز کی بنیادیں درج ذیل ہیں:

۱۔ فیصل مولویؒ (1941ء-2011ء) ایک معروف لبنانی جج، فقیہ، اسلامی مبلغ اور مبصر تھے۔
۲۔ علامہ یوسف القرضاویؒ (1926ء-حیات) عالم اسلام کے ممتاز ترین عالم دین، اخوانی فکر کے حامل، صدر عالمی اتحاد برائے مسلم علماء ہیں۔

(i)۔ شریعت اس کی ممانعت نہیں کرتی، لہٰذا یہ جائز ہے۔

(ii)۔ شریعت کفریہ کلمات کو آگے بڑھانے کی ممانعت کرتی ہے۔ یہ وہ چیز نہیں جس کا جدید دور کی غیر مسلم فوج یا سیاسی نظام میں خدمت انجام دینے پر اطلاق ہوتا ہو۔

(*Al-Ahkam al-Siyasiyya, p. 117.*)

(iii)۔ اگرچہ ایسی خدمت (سروس) ناخوشگوار ہے تاہم اس سے مسلمانوں کو چند ایک فوائد پہنچ سکتے ہیں۔ مثلاً مال و جان کی حفاظت اور غیر مسلم سیاسی ڈھانچے میں ان کی حیثیت کی بہتری۔

(iv)۔ اس طریق کار کا 'مقاصدِ شریعت' میں بھی جواز موجود ہے۔

(صناعۃ الفتویٰ وفقہ العقلیات، ص: ۳۰۴)

علامہ یوسف قرضاویؒ کا استدلال یہ ہے کہ بنیادی اصول یہ ہے کہ غیر مسلم حکومت کا حصہ بننا ممنوع ہے لیکن اس سے استثنا کے لیے چند ایک مسلمہ وجوہات ہیں مثلاً:

(ا)۔ شر اور ناانصافی کم کرنے کے لیے جس حد تک جانا ممکن ہو۔

(ب)۔ دو برائیوں میں سے کمتر کو اختیار کر لینا۔

(ج)۔ اعلیٰ مثال سے نسبتاً کم تر حقیقت تک اُتر آنا۔

یہ درج بالا مستثنیات ان قانونی کلیات سے مربوط ہیں بشمول:

(ا)۔ ضرورت ممنوعہ چیزوں کو جائز کر دیتی ہے۔

(ب)۔ مشکل گوارہ کر لی جائے تو وہ باعث آرام بن جاتی ہے۔

(ج)۔ نہ زخم پہنچانا نہ ہی ادلے کا بدلہ پانا۔

(د)۔ مشکلات میں کمی لانا۔ (من فقہ الدولۃ فی الاسلام، ص: ۱۸۰)

(۸)۔ چند اہل علم حضرات ہیں جو غیر مسلم ریاستوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مصالحتی رویئے کو 'دعوۃ' کے مقاصد (اسلامی مشینری سرگرمیوں یا تجدید اسلام کی مساعی) کو فروغ دینے کے لیے

جائز قرار دیتے ہیں۔ 'دعوۃ' غیر مسلم ریاستوں میں قیام کے لیے ایک مضبوط، پُر معنی اور ولولہ انگیز مقصد ہوتی ہے۔ یہ مصلحت (مفاد عامہ) ایک ایسی بے انتہا نیکی ہے کہ یہ ہر اس تحفظ کو زائل کر دیتی ہے جو کسی بھی باضمیر مسلمان کو اقلیتی شرط کے بارے میں ہو (ایک غیر مسلم اکثریت میں ایک مسلمان کا مقیم ہونا) ان کی مجبوریوں میں ایک غیر مسلم فوج کی ملازمت بھی شامل ہوسکتی ہے۔

اسی طرح علامہ یوسف قرضاویؒ یہ دلیل دیتے ہیں کہ کسی مسلمان کے ایک غیر مسلم ملک میں قیام کے جواز کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا جا سکتا کیونکہ اگر ہم اس کی ممانعت کر دیں جیسا کہ بعض سکالرز کہتے ہیں تو پھر ہم غیر مسلموں کو اسلام کی طرف بلانے کے دروازے بند کر دیں گے۔ اگر ماضی میں ایسا کیا گیا ہوتا تو اسلام جزیرہ نمائے عرب میں ہی محدود ہو کر رہ جاتا۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں اسلام کی اشاعت بعض مسلمانوں کے انفرادی اثر و رسوخ کی وجہ سے ممکن ہوئی تھی جو ان ملکوں میں تاجروں اور صوفیوں کی شکل میں گئے۔ وہ اپنا وطن ترک کر کے دور دراز مما لک میں پہنچے جہاں وہ مقامی لوگوں سے گھل مل کر رہے، کاروبار کیے، رشتے ناطے کیے۔ ان کے اخلاق و حسنِ عمل سے لوگ ان کے مذہب سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مقامی لوگوں نے انفرادی و اجتماعی طور اسلام کو دل و جان سے قبول کیا۔

علامہ یوسف قرضاویؒ کہتے ہیں کہ مسلمان ایسے حالات میں بھی غیر مسلم مما لک کی افواج میں شامل ہو سکتے ہیں جب وہ فوجیں مسلمان مما لک کے خلاف جنگ لڑ رہی ہوں تا کہ غداری کے الزام سے بچ سکیں۔ اگر یہ الزام لگ جائے تو اس سے وہاں مقیم مسلمانوں کے لیے سنگین خطرات پیدا ہو جائیں گے اور ان کے دعوۃ کے کام کو بھی شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ اگر افراد نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تو اس سے اُس ملک کی مسلم آبادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ دلیل ان فقہی اصولوں پر مبنی ہے کہ بڑے ضرر سے بچنے کے لیے کم درجے کے ضرر کو قبول کر لیا جانا چاہیے۔ یہ کہ نجی ضرر کو اس لیے قبول کر لیا جائے تا کہ عمومی ضرر سے محفوظ رہا جا سکے اور یہ کہ گروہ کے مفاد کو فرد کے مفاد پر ترجیح حاصل ہے۔

(*http/www.fatwa-online.com*)

(i)۔ یہ نقطہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کہ آج بیشتر مسلمان فقہاء کرام کا عمومی موقف یہ ہے کہ دعوۃ نے جہاد کی جگہ لے لی ہے۔ ان کا یہ موقف غیر مسلم ممالک کے صرف مسلم شہریوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ساری امتِ مسلمہ کے لیے ہے۔ یہ نقطۂ نظر بیشتر قدیم فقہاء کرامؒ کے نظریئے سے متصادم ہے:

(ا)۔ جہاد ایک دفاعی تصور تھا۔ جہاد کے بارے میں بیشتر آیات میں اسے ایک دفاعی جنگ کہا گیا ہے۔

(ب)۔ جہاد سے متعلق جارحانہ نوعیت کی آیات کو اس انتہا درجے کے عناد کے سیاق وسباق میں سمجھا جانا چاہیے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے عرب مشرکین رکھتے تھے۔ اسے غیر مسلموں کے بارے میں ایک عمومی جنگجویانہ رویہ نہیں سمجھا جانا چاہیے۔

(ج)۔ حکم جہاد کے تحت عائد ہونے والا بنیادی فریضہ غیر مسلموں کا لڑ کر خاتمہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ ایک فریضۂ دعوت ادا کرنا ہوتا ہے یعنی لوگوں تک اسلام کا عالمگیر پُرامن اور ترقی پسند پیغام پہنچانا ہے۔

(۹)۔ اس صورت احوال کے ساتھ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دعوت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی بنیادی کیفیت (الاصل) ہے۔ لوگوں کو پُرامن اور پوری اخلاقیات کے ساتھ اسلام کی طرف راغب کرنے کی خواہش ایک سیاسی آزادی کی طرح کا ایک عمل ہے اور یہ شہریت کے جدید تصور سے متصادم نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ.

(سورۃ النحل، آیت:۱۲۵)

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے بہت اچھے طریقے کے ساتھ بحث کرو۔ یقیناً آپ کا رب زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے گمراہ ہوا اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی جاننے والا ہے)

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ.

(سورۃ البقرۃ، آیت:۲۵۶)

(دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ اس لیے جو شخص باطل معبودوں کا انکار کر کے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور

اللہ تعالیٰ خوب سننے، جاننے والا ہے)

(۱۰)۔ ان آیات سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن پاک دعوت کے لیے خاص طریقے استعمال کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

(i)۔ **موعظۃ الحسنہ** : یہ اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ غیر مسلموں سے خیر سگالی کے جذبے، دوستی، صبر اور خلوص سے پیش آیا جائے اور کھلے معاشرتی ماحول میں گفتگو کی جائے تاکہ مخاطب ایسا محسوس کرے کہ مسلمان دوست ہوتے ہیں اور اچھی نصیحت کرتے ہیں جس سے سب کو فائدہ اور خوشی حاصل ہوگی۔ (ارباب الدعوۃ فی القرآن، ص:۶۲)

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ. (سورۃ فصلت، آیت: ۳۴)

(اور اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیکی اور بدی برابر نہیں ہے۔ تم برائی کا دفاع بہترین نیکی کے ساتھ کرو۔ دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑ چکی ہے وہ دلی دوست بن جائے گا)

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُبِينًا. (سورۃ الاسراء، آیت: ۵۳)

(اور میرے بندوں سے فرما دیں وہ اچھی بات کیا کریں بیشک شیطان ان کے درمیان جھگڑا ڈالتا ہے۔ بلاشبہ شیطان ہمیشہ سے انسان کا کھلا دشمن ہے)

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا. (سورۃ النساء، آیت: ۸۵)

(جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے)

(ii)۔ **بہترین استدلال** : قرآن مجید مسلمانوں کو بہترین دلائل کے ساتھ گفتگو کرنے کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ پیچھے مذکور آیت 'ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ' (سورۃ النحل، آیت: ۱۲۵) میں کہا گیا ہے (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ

نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے)

یہ آیت اہل ایمان کو حکم دیتی ہے کہ وہ پہلے والے تصورات اور تعصّبات کو حذف کر کے گواہی اور شہادت پیش کرو اور عقل کے مسلمہ قواعد کے مطابق اور اچھا استدلال پیش کرو۔ اس کے لیے داعی اور مدعو کے درمیان شفافیت اور دیانت پر قائم رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب معاندانہ، مجادلانہ اور حاصل صفر قسم کا ٹکراہر گز نہیں ہے۔

(iii)۔ **زور زبردستی سے اجتناب:** اسلام میں مذہب کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ مثلاً

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ.
(سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۵۶)

(دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ اس لیے جو شخص باطل معبودوں کا انکار کر کے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے، جاننے والا ہے)

قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ دعوت کو ہر قسم کے دباؤ یا جبر سے مبرا رکھا جائے کیونکہ ہر شخص اپنے کئے کا خود ذمہ دار ہے۔ جبر ایمان کو جنم نہیں دے سکتا۔ دعوۃ اسلامی معاشرے میں نظم ونسق کے دفاع کے کام سے مختلف چیز ہے جو کہ آزادئ اظہار پر چند قدغنیں عائد کرتا ہے۔ ایک غیر مسلم معاشرے میں دعوۃ کو کسی قوت، دھوکے یا جبر سے بالکل الگ تھلگ ہو کر آگے بڑھنا ہے۔

(iv)۔ **حکمت ودانائی:** اسلام تبلیغ کے کام میں حکمت کے اطلاق کا تقاضا کرتا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ. (سورۃ النحل، آیت: ۱۲۵)
(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو)

'حکمت' خصوصی وقت اور جگہ کے مطابق طریق ہائے کار اور ذرائع رسائی کا مطالبہ کرتی ہے۔

یہ زمینی حقائق کا فہم حاصل کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔اس کے موثر ہونے کے لیے اپنے اندر لچک کی اہلیت پیدا کی جانی چاہیے۔

حکمت کا یہ طریق کار دل جیتنے کے کسی خاص انداز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہے۔حکمت تقاضا کرتی ہے کہ دوسرے کو پہچانا جائے اور معاشرے کے ساتھ ربط وضبط، یکجہتی رکھی جائے اور باہمی علم، بقائے باہم کا جذبہ اور تعاون کی فضا پیدا کی جائے۔

(۱۱)۔ دعوۃ کا مطلب کسی کو تبدیلی عقیدہ کی تاکید کرنے کا نام نہیں۔ یہ طریق عمل ہر کسی سے اسلام قبول کرنے کی توقع نہیں کرتا بلکہ یہ اسلام پیش کرنے کا ایک کام ہوتا ہے۔خواہ وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔مسلمانوں کو اس سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ دعوۃ اس اصول پر مبنی ہے کہ یہ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ علم پر مبنی ایک راہ کا انتخاب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ سب کے سامنے اسلام کی صحیح تعلیمات پیش کریں خواہ ان کے مخاطبین مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔

(*To be a European Muslim, p. 134.*)

(۱۲)۔ دعوۃ کی بنیاد اسلامی عالمگیریت ہے جو تمام بنی نوع انسان کی ابتدا، فطرت اور مقصد کے اشتراک کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ ادراک قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے۔

(i)۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُمۡ وَٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ.
(سورۃ البقرۃ، آیت:۲۱)

(اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ)

(ii)۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدۡ جَآءَكُم بُرۡهَٰنٞ مِّن رَّبِّكُمۡ وَأَنزَلۡنَآ إِلَيۡكُمۡ نُورٗا مُّبِينٗا.
(سورۃ النساء، آیت: ۱۷۴)

(اے لوگو! بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک واضح روشنی نازل کی ہے)

(iii)۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُم مَّوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٞ لِّمَا فِي ٱلصُّدُورِ وَهُدٗى

وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. (سورۃ یونس، آیت: ۵۷)

(لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے)

(iv)۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.
(سورۃ سباء، آیت: ۲۸)

(اور اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے)

حضرت امام نوویؒ[۱] کی روایت ہے کہ الماوردیؒ[۲] نے بیان کیا ہے کہ اگر ایک مسلمان کسی ایک غیر مسلم ملک میں اپنے مذہب کا اظہار کرسکتا ہے تو وہ ملک دارالسلام کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا وہاں قیام کرنا ہجرت کر جانے سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ اس کی موجودگی کی وجہ سے وہاں کے کئی اور لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے۔

زمانے کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے بے حد روایتی علماء نے بھی اقلیتوں کے حالات سے متعلق اپنے موقف پر از سر نو سوچنا شروع کر دیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ابوالقاسم نعمانیؒ نے کہا ہے کہ ’ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس ادارے نے مسلمانوں سے عیدالاضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی نہ کرنے کی اپیل کی ہے۔

(*http://www.thehindu.com*)

یہ فتویٰ اقلیتوں کے حالات کے بارے میں اسلام کی ترقی پسندانہ اور انسانی تعبیر کا اظہار ہے۔ یہ عصر حاضر کا ایک عمل ہے جو مندرجہ بالا دلائل کی تائید کرتا ہے۔ ذرا ایک لمحے کے لیے اس اہم آیت قرآنی پر غور کیجیے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ط قَالُوْا كُنَّا

۱۔ حضرت ابوزکریا یحییٰ بن شرف النوویؒ (1233ء-1277ء) ایک بہت بڑے عالم، فقیہ، محدث اور مصنف تھے۔

۲۔ حضرت ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردیؒ (972ء- 1058ء) ایک نامور اسلامی سکالر تھے۔ آپؒ نے سیاسی اضطراب کے زمانے میں دین، حکمرانی، خلافت، پبلک اور دستوری قانون پر بہت سی قابل قدر کتابیں لکھیں۔

مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا. (سورۃ النساء، آیت:۹۷)

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانہ ہے)

یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر مسلمان کسی غیر مسلم ریاست میں اذیت محسوس کریں یا وہاں اپنے مذہب پر عمل کرنے میں رکاوٹیں پائیں تو وہ کسی اسلامی ریاست میں ہجرت کر سکتے ہیں۔ جہاں ان کے لیے اپنے ایمان کے مطابق عمل کرنے میں آسانی ہو۔ تاہم زمینی حقیقت مختلف ہے۔ بعض مسلمان علماء اور سیاسی فعالیت پسندوں نے اپنے ملکوں میں اذیتوں کا سامنا کیا اور غیر مسلم ریاستوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ خاص طور پر انہی مغربی ریاستوں کا رُخ کرنا پڑا جنہیں وہ پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک عجیب صورت حال ہے کہ وہ لوگ جو اپنی مسلم ریاستوں میں پہنچنے والی اذیتوں سے بچنے کے لیے غیر مسلم ملکوں میں پناہ پاتے ہیں وہ بھی ان مغربی ملکوں کے عمومی سیاسی یا شہری نظام کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں جو پھر بھی زیادہ تر اس غیر معقول رویئے کو برداشت کر لیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ارباب الدعوۃ فی القرآن، محمد حسین فضل اللہ۔ بیروت: دارالازہرا، ۱۹۸۶ء۔

۲۔ تفسیر المنار، محمد رشید رضا۔ بیروت: دارالکوکب العلمیہ، ۲۰۰۰ء۔

۳۔ الخصائص العامہ لی الاسلام، شیخ یوسف عبداللہ القرضاویؒ۔ قاہرہ: مکتبہ وہبہ، ۱۹۸۹ء۔

۴۔ صناعۃ الفتویٰ وفقہ العقلیات، شیخ عبداللہ بن محفوظ بیہؒ۔ جدہ: دارالمنہاج، ۲۰۰۰ء۔

۵۔ فقہ الاقلیات المسلمہ، خالد عبدالقادر۔ طرابلس: دارالایمان، ۱۹۹۸ء۔

۶۔ کتاب المبسوط، امام محمد بن احمد سرخسیؒ۔ بیروت: دارالمعرفۃ، ۱۹۷۸ء۔

۷۔ من فقہ الدولۃ فی الاسلام، شیخ یوسف عبداللہ القرضاویؒ۔ قاہرہ: دارالشروق، ۱۹۹۷ء۔

۸۔ al-Ahkam al-siyasiyya li'l-aqalliyat al-muslima fi'l-fiqh al-Islami (The Political Rulings on Muslim Minorities in Islamic Jurisprudence) by Imam Sarkhasi. Beirut: Dar al-Nafa'is, 1997.

۹۔ To be a European Muslim: A Study of Islamic Sources in the European Context by Tariq Ramadan. Leicester: Islamic Foundation, 1999.

۱۰۔ http/www.fatwa-online.com

۱۱۔ http://www.fatwa-online.com

۱۲۔ http://www.gordonconwell.edu/resources/

۱۳۔ http://www.thehindu.com

۲۲

خلافت یا قومی ریاست



يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ. (سورۃ الحجرات، آیت: ۱۳)

(لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنادیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (اس لیے نہیں کہ تم ایک دوسرے سے نفرت کرو))

(۱)۔ 'خلافت' کا لفظ 'خلیفہ' (جانشین) سے نکلا ہے جو مسلم قوم کا حکمران ہوتا ہے۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے پردہ فرما گئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین (بطور سیاسی اتھارٹی) منتخب ہوئے تو انہیں خلیفہء رسول اللہ (پیغمبرِ خدا کا جانشین) کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں اسی طرح یہ اصطلاح اسی مفہوم میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام تک بطور خلفائے خدا استعمال ہوتی رہی۔ جب فرشتوں سے گفتگو کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ. (سورۃ البقرۃ، آیت: ۳۰)

(اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں ایسا نائب بنائیں گے جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا جبکہ ہم حمد وثناء کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے)

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ.
(سورۃ ص، آیت: ۲۶)

(اے داؤد علیہ السلام! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کریں)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. (سورۃ النور، آیت:۵۵)

(اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، انہیں اللہ تعالیٰ زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند فرمایا ہے اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ فاسق ہیں)

(۲)۔ بعض ایسے اہل دانش وعلم ہیں جن کا استدلال یہ ہے کہ پوری 'امتِ مسلمہ' کے لیے ایک ہی خلیفہ ہونا چاہیے۔ عربی میں امہ سے مراد 'عوام' ہیں اور یہ لفظ خصوصاً ان مسلمانوں کا حوالہ دیتا ہے جن کا نظریۂ حیات اور تہذیب وثقافت ایک ہو۔ لفظ 'امہ' اس کے محتاط و مخصوص مفہوم کے علاوہ عربی میں یہ عمومی مفہوم میں بھی مشترک مفاد رکھنے والے عوام کے لیے آیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد مبارک ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ. (سورۃ آل عمران، آیت:۱۱۰)

(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ ان میں ایمان والے بھی ہیں لیکن ان کے اکثر فاسق ہیں)

لفظ اُمّہ کی مزید وضاحت میثاق مدینہ (دستورِ مدینہ) سے ہوتی ہے جس کے لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 622ء میں مدینہ کے سرکردہ قبیلوں سے مذاکرات کیے۔ ان میں یہودیوں، عیسائیوں اور لا مذہب شہریوں کا واضح طور پر 'اُمّۃ واحدہ' کے ارکان ہونے کا حوالہ دیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیات سے اس امر کی خاصی وضاحت ہوگئی ہے کہ قرآن مجید عالمگیر

خلافت کے قیام کا حکم نہیں دیتا بلکہ یہ ایک سیاسی تشکیل ہے جو کہ ایک تاریخی عمل ہے۔ مسلمان روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ (نائب) اور انہیں کہا گیا ہے کہ اگر وہ کسی رقبے یا علاقے میں اپنا کنٹرول قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہاں اس کے احکامات کی پابندی کریں۔ وہ ان احکامات کو دستیاب سیاسی حالات میں زمانے کی سپرٹ کے مطابق بروئے کار لائیں۔

(۳)۔ جدید قومی ریاست جدید تاریخ میں ایک سیاسی فکر وعمل کے ارتقاء کا ایک ماحصل ہے۔ جدید قومی ریاست 1648ء میں ویسٹ فیلیا معاہدۂ امن[1] کے بعد ظہور پذیر ہوئی جو رومی مقدس حکومت (Holy Roman Empire) کی آخری شکست وریخت کا نتیجہ تھی۔ اس 'معاہدے' نے رومی مقدس حکومت کے اندر تیس (۳۰) سالہ خونریز جنگ (1618ء-1648ء) اور سپین اور ڈچ ری پبلک کے مابین اسی (۸۰) سالہ جنگ (1568ء-1648ء) کے بعد یورپ کے روحانی اور دنیاوی اتحاد کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

ایک قومی ریاست کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ ایک قائم بالذات جغرافیائی وجود جس کی شناخت یہ ہو کہ اس نے اپنا سیاسی جواز مطلق العنان رہ سکنے والی قوم کے طور پر حاصل کیا ہو۔ اس کا موازنہ کسی کثیر القومی ریاست، کسی شہری ریاست، کسی ایک بادشاہت، کسی ایک وفاق یا کسی دیگر ذی اختیار ساخت کے ساتھ کیا جا سکتا ہو۔ قومی ریاستیں اپنی تاثیر کے لیے ایک واضح مرکزی کنٹرول کی حامل ہوتی ہیں اور اپنی خود مختار حیثیت پر عمل درآمد کی اہلیت رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی حاکمیت اور علاقے کو تسلیم کرتی ہیں۔ نظری اعتبار سے جدید قومی ریاست پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں سیاسی معیشت، سرمایہ داری، تاجریت، سیاسی جغرافیہ اور سیاسی فلسفہ کے شعبوں میں ذہنی ارتقا کی ایک ضمنی پیداوار ہے۔

'قومی ریاست' کے ظہور سے قبل متعدد بادشاہتیں موجود تھیں۔ مثلاً آسٹریا کی بادشاہت، فرانس کی بادشاہت، ہنگری کی بادشاہت، عثمانیوں کی بادشاہت، مغل بادشاہت، صفوی بادشاہت، برطانوی بادشاہت وغیرہ۔ یہ قومی ریاستیں کثیر النسلی بادشاہتیں تھیں جن پر ایک

---

[1]۔ Peace of Westphalia: معاہدہ ویسٹفیلیا امن کے معاہدوں کا ایک سلسلہ تھا جو 1648ء میں مئی اور اکتوبر تک 'آسنابرک' (Osnabruck) اور 'منسٹر' (Munster) کے شہروں میں طے کیے گئے تھے۔

بادشاہ، ایک شہنشاہ، ایک سلطان یا ایک خلیفہ حکمران تھا۔

(۴)۔ مسلمانوں کو سلطنتوں اور خلافتوں کا تاریخی تجربہ حاصل ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے شہری ریاست مدینہ منورہ قائم فرمائی جس کا ایک تحریری دستور تھا جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا تھا۔ یہ ریاست 622ء میں آپ ﷺ کے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچنے کے فوراً بعد قائم ہوئی۔ اس دستور کے لیے ہجرت کر کے آنے والے قبیلہ قریش اور آٹھ دیگر مقامی قبیلوں کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ ان قبیلوں میں یہودی قبائل بھی شامل تھے۔ اس دستور نے ایک کثیر مذہبی ریاست کے لیے قانونی بنیاد تشکیل کر دی اور سب کو ایک قومی امہ (one nation) قرار دیا۔ یہ قومی امہ (nation) سب لوگوں سے منفرد تھی۔

(*The First Written Constitution in the World*)

حضور نبی کریم ﷺ 632ء میں دنیا سے پردہ فرما گئے اور مدینہ کی شہری ریاست خلافتِ راشدہ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ چار خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیاسی و مذہبی قیادت کے ماتحت تھی۔ یہ خلافت بتدریج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی جس نے میسوپوٹیمیا (عراق و شام)، مشرقی بحیرۂ روم، اناطولیہ، سلطنتِ ساسانیہ، شمالی افریقہ (مصر اور تیونس)، کوہ قاف اور جزیرہ نمائے عرب کو فتح کر لیا۔ خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کی سلطنت قائم ہو گئی جس کی بنیاد حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے رکھی اور اس کا خاتمہ مروان ثانی کی وفات پر 750ء میں ہوا۔ بنی امیہ نے مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ کا کیشیا، ماوراالنہر (ٹرانسوکشیانہ)، سندھ، مغرب اور جزیرہ نمائے آئبیریا (اندلس) تک بڑھا دیا جو ڈیڑھ کروڑ مربع کلومیٹر (57 لاکھ 90 ہزار مربع میل) رقبہ تھا۔ اس طرح بہ لحاظ رقبہ یہ دنیا کی وسیع ترین سلطنت تھی جو کبھی اہل دنیا نے دیکھی تھی۔ یہ پوری تاریخ انسانی کی پانچویں وسیع ترین سلطنت بنی۔

(*The End of the Jihad State, p. 371.*)

750ء میں عباسیوں کے انقلابات نے بنوامیہ کا تختہ الٹ دیا تاہم ان کی ایک شاخ فرار ہو کر شمالی افریقہ پہنچ گئی اور پھر وہاں سے اندلس چلی گئی جہاں انہوں نے خلافت قرطبہ قائم کر لی جو

1031ء تک قائم رہی۔عباسی انقلاب بنوامیہ کی عرب بادشاہت کا اختتام اورایک زیادہ جامع اورکثیر النسلی ریاست کا آغاز تھا جس میں غالب تعداد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلۂ نسب سے تعلق رکھنے والوں اور ایرانی نژاد لوگوں کی تھی۔عباس سفاح پہلا عباسی خلیفہ تھا اور اس کا تعلق بنو ہاشم سے تھا جو کہ قبیلہ قریش کی ایک ذیلی شاخ تھی۔آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ تھا جو 1213ء سے 1258ء تک برسر اقتدار رہا۔عباسی عہد میں مصر میں فاطمی خلافت 909ء میں قائم ہوئی اور 1171ء تک قائم رہی۔خلفائے قاہرہ 1261 اور 1517 کے درمیان رہے۔جنہیں مملوک سلطانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔مملوک سلطنت نے 1250ء سے 1517ء تک مصر، مشرقی بحیرہ روم اور حجاز کو کنٹرول کیے رکھا۔

(۵)۔ ذیل کے چارٹ سے مزید واضح ہو جائے گا کہ دنیا میں ایک ہی وقت میں مسلمانوں کی بہت سی ریاستیں موجود تھیں:

مسلم خلافتیں/ بادشاہتیں

(i)۔	خلافت راشدہ	(632ء-661ء)
(ii)۔	سلطنت خلافت بنوامیہ	(661ء-750ء)
(iii)۔	سلطنت قرطبہ، اسلامی سپین	(756ء-1031ء)
(iv)۔	سلطنت خلافت عباسیہ	(750ء-1258ء)
(v)۔	سلطنت خلافت فاطمین	(910ء-1171ء)
(vi)۔	سلطنت ایوبی خاندان	(1171ء-1260ء)
(vii)۔	سلطنت خلافت مملوک (بحری خاندان)	(1250ء-1517ء)
(viii)۔	سلطنت خلافت عثمانیہ	(1517ء-1923ء)

مسلمانوں کی علاقائی بادشاہتیں

یورپ اور روس

(i)۔ سلطنت قرطبہ، بنوامیہ، سپین (929ء-1031ء)

(ii)۔ سلطنت امارت سسلی (996ء-1072ء)

(iii)۔ سلطنت والگا بلغاریہ (992ء-1236ء)

(iv)۔ سلطنت گولڈن ہورڈ (1251ء-1502ء)

(v)۔ سلطنت اہل کریمیا (1441ء-1783ء)

مشرق وسطیٰ

(i)۔ سلطنت روم، سلجوق (1077ء-1307ء)

(ii)۔ سلطنت عثمانیہ (1299ء-1923ء)

(iii)۔ سلطنت خاندان خوارزم شاہ (994ء-1040ء)

(iv)۔ سلطنت طاہری خاندان (821ء-873ء)

(v)۔ سلطنت خوارزمی (1077ء-1231ء)

(vi)۔ سلطنت سفاری خاندان (861ء-1003ء)

(vii)۔ سلطنت سمانی خاندان (819ء-999ء)

(viii)۔ سلطنت سلجوق خاندان (1016ء-1153ء)

(ix)۔ سلطنت جیرے خاندان (1521ء-1550ء)

(x)۔ سلطنت الخانی (1256ء-1335ء/1353ء)

(xi)۔ سلطنت تیموری خاندان (1370ء-1507ء)

(xii)۔ سلطنت ایوبی خاندان (1171ء-1260ء)

(xiii)۔ سلطنت آق قویونلو (1378ء-1501ء)

(xiv)۔ سلطنت قرہ قویونلو (1375ء-1468ء)

(xv)۔ سلطنت ایران،صفوی خاندان (1502ء-1736ء)

(xvi)۔ سلطنت افشاری خاندان (1736ء-1796ء)

(xvii)۔سلطنت قاچار خاندان (1789ء-1925ء)

(xviii)۔ سلطنت مظفری (1391ء-1583ء)

(xix)۔ سلطنت شیروان شاہ (861ء-1539ء)

(xx)۔ سلطنت غوری (1149ء-1161ء)

(xxi)۔ سلطنت غزنوی (977ء-1186ء)

(xxii)۔ سلطنت عظیم سلجوق (1175ء-1194ء)

(xxiii)۔ سلطنت آل بویہ (934ء-1062ء)

(xxiv)۔ سلطنت راسی آف یمن (897ء-1962ء)

(xxv)۔ سلطنت بنورسول آف یمن (1229ء-1454ء)

(xxvi)۔ سلطنت طولونیہ (868ء-905ء)

وسطی ایشیا

(i)۔ سلطنت چغتائی خاندان (1260ء-1266ء)

(ii)۔ سلطنت سائبیر یا خاندان (1490ء-1598ء)

(iii)۔ سلطنت یارقند (1514ء-1533ء)

(iv)۔ سلطنت شیبانی (1428ء-1468ء)

افریقہ اور سپین

(i)۔ سلطنت عدل (1415ء-1555ء)

(ii)۔ سلطنت المور دخاندان آف مراکش (1040ء-1147ء)

(iii)۔ سلطنت الموحد خاندان آف مراکش (1121ء-1269ء)

(iv)۔ سلطنت اجوران (تیرہویں صدی-سترہویں صدی)

(v)۔ سلطنت فلانی آف سکوٹو (1804ء-1903ء)

(vi)۔ سلطنت فلانی آف سیکوامدادو (تیرہویں صدی-سترہویں صدی)

(vii)۔ سلطنت فلانی/فلبی آف الحاج عمر تال (1797ء-1864ء)

(viii)۔ سلطنت فلانی یا فلبی آف بوندو ملک داؤدسائی (1230ء-1600ء)

(ix)۔ سلطنت مالی (1230ء-1600ء)

(x)۔ سلطنت سونگھائی (1340ء-1591ء)

(xi)۔ سلطنت کلوہ (دسویں صدی-1517ء)

(xii)۔ سلطنت عمان (تیرہویں صدی-1744)

(xiii)۔ سلطنت اغالبہ خاندان افریقیہ تونس، مشرقی الجیریا، مغربی لبیا اور سسلی (800ء-909ء)

(xiv)۔ سلطنت امیہ آف سپین، فاطمیوں سے جنگ کے دوران (661ء-750ء)

(xv)۔ سلطنت سپین آف الطوائف مملوک (1009۔1238)

(xvi)۔ سلطنت بنو حفص (1229ء-1574ء)

(xvii)۔ سلطنت علوی خاندان آف مراکش (1631ء-1672ء)

(xviii)۔ سلطنت مرینیہ خاندان آف مراکش (1244ء-1465ء)

(xix)۔ سلطنت رستمی خاندان (767ء-909ء)

(xx)۔ سلطنت وطاسی خاندان آف مراکش (1472ء-1554ء)

(xxi)۔ سلطنت سعدی خاندان آف مراکش (1511ء-1628ء)

(xxii)۔ سلطنت درویش (1896ء-1920ء)

جنوبی ایشیا

(i)۔ سلطنت علی راجہ (1545ء-1819ء)

(ii)۔ سلطنت میسور (1704ء-1799ء)

(iii)۔ سلطنت دہلی، شمالی ہند (1206ء-1526ء)

(iv)۔ سلطنت مغل ہندوستان (1526ء-1857ء)

(v)۔ سلطنت خلجی خاندان (1290ء-1320ء)

(vi)۔ سلطنت لودھی خاندان (1451ء-1524ء)

(vii)۔ سلطنت دہلی، مملوک خاندان (1206ء-1290ء)

(viii)۔ سلطنت درّانی (1747ء-1823ء)

(ix)۔ سلطنت سوری خاندان (1540ء-1556ء)

(x)۔ سلطنت آصف جاہی خاندان (1720ء-1948ء)

(xi)۔ سلطنت نوابِ اودھ (1732ء-1856ء)

(xii)۔ سلطنت باہمنی، دکن (1347ء-1527ء)

(xiii)۔ سلطنت تغلق خاندان (1321ء-1398ء)

(xiv)۔ سلطنت برار، دکن (1490ء-1572ء)

(xv)۔ سلطنت بدار، دکن (1492ء-1619ء)

(xvi)۔ سلطنت احمد نگر، دکن (1490ء-1636ء)

(xvii)۔ سلطنت قطب شاہی خاندان، دکن (1518ء-1687ء)

(xviii)۔ سلطنت بیجاپور، دکن (1490ء-1686ء)

(xix)۔ سلطنت خاندانِ سادات (1414ء-1451ء)

(xx)۔ سلطنت بنگال (1336ء-1576ء)

(xxi)۔ سلطنت جونپور (1394ء-1479ء)

(xxii)۔ سلطنت گجرات (1407ء-1573ء)

(xxiii)۔سلطنت کشمیر (1346ء-1586ء)
(xxiv)۔سلطنت سومرو خاندان (1026ء-1351ء)
(xxv)۔ سلطنت سمہ خاندان (1335ء-1520ء)
(xxvi)۔سلطنت تالپور خاندان (1783ء-1843ء)
(xxvii)۔سلطنت کلہوڑا خاندان (1701ء-1783ء)
(xxviii)۔سلطنت نواب کرناٹک (1692ء-1859ء)

جنوب مشرقی ایشیا

(i)۔ سلطنت جوہر (1528ء-1855ء)
(ii)۔ سلطنت ماگوئنداناؤ (1500ء-1888ء)
(iii)۔ سلطنت کیلنٹن (1411ء-1963ء)
(iv)۔ سلطنت ترنگانو (1909ء-1957ء)
(v)۔ سلطنت پرلیس (1821ء-1957ء)
(vi)۔ سلطنت کیداہ (1909ء-1946ء)
(vii)۔ سلطنت پاہنگ (1895ء-1948ء)
(viii)۔ سلطنت پیرک (1528ء-1948ء)
(ix)۔ سلطنت نگری سمبیلان (1895ء-1948ء)
(x)۔ سلطنت سلانگور (1895ء-1948ء)
(xi)۔ سلطنت سُولُو (1405ء-1915ء)
(xii)۔ سلطنت یوجیاکرتا (1755ء-1939ء)
(xiii)۔ سلطنت آچے (1946ء-1903ء)
(xiv)۔ سلطنت دہلی (1632ء-1946ء)
(xv)۔ سلطنت سیاک سری اندراپورا (1725ء-1946ء)
(xvi)۔ سلطنت ریاؤ (1824ء-1911ء)
(xvii)۔ سلطنت اندراگیری (1298۔1945)
(xviii)۔سلطنت جمبی (1877ء-1904ء)
(xix)۔ سلطنت پالمبانگ دارالسلام (1675ء-1823ء)

(xx)۔ سلطنت بینتن (1527ء-1813ء)
(xxi)۔ سلطنت شیر یبون (1445ء-1677ء)
(xxii)۔ سلطنت دیماک (1475ء-1548ء)
(xxiii)۔سلطنت سوراکارتہ (1745ء-1946ء)
(xxiv)۔سلطنت ماتارام (1587ء-1755ء)
(xxv)۔ سلطنت بونتیاناک (1771ء-1950ء)
(xxvi)۔سلطنت بانجار ماسین (1526ء-2010ء)
(xxvii)۔سلطنت کوتائی (1949ء تک)
(xxviii)۔سلطنت بولنگان (1731۔1964)
(xxxix)۔سلطنت گوا (1300ء-1945ء)
(xxx)۔ سلطنت ترنات (1257ء-1914ء)
(xxxi)۔سلطنت تید ور (1450ء-1904ء)
(xxxii)۔سلطنت باکان (1513ء)
(xxxiii)۔سلطنت جیلولو (1500ء-1920ء)
(xxxiv)۔سلطنت بوتون (1450ء-1904ء)

(۶)۔ مندرجہ بالا مختصر بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آمد اسلام سے لے کر اب تک خلافت راشدہ کے بعد کوئی اس جیسی مہتم بالشان مسلم اسلامی خلافت نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عالمگیر خلافت قائم نہیں ہوئی جو پوری مسلم دنیا کی دنیوی اور سیاسی وحدت کی مظہر ہوتی۔ سنی مسلمانوں کی اکثریت خلافت راشدہ سے متعلق یکسو ہے تاہم اہل تشیع اسے بھی قبول نہیں کرتے۔ بعض اندازوں کے مطابق اہل تشیع پوری مسلم آبادی کا دس (۱۰) سے تیرہ (۱۳) فیصدی ہیں۔ ایران میں ان کی آبادی سب سے زیادہ ہے جو وہاں کی آبادی کا نوے (۹۰) سے پچانوے (۹۵) فیصد ہیں جبکہ انڈونیشیا میں ان کی آبادی بہت کم ہے یعنی وہ وہاں صرف 0.5 فیصد ہیں۔

پہلی عالمگیر مسلم خلافت (خلافتِ راشدہ) کا انتظام و انصرام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں چند مسائل کا شکار ہوگئی تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے درمیان خانہ

جنگی سے بچنے کے لیے پولیس ایکشن کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بلوائیوں کے بارے میں ان کے نرم وشائستہ رویے سے یہ لوگ مزید دلیر ہو گئے۔ 656ء میں جب آپ رضی اللہ عنہ تلاوت قرآن پاک کر رہے تھے تو بلوائی دروازہ توڑ کر گھر میں اندر داخل ہو گئے اور آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان خانہ جنگی چھڑ گئی۔ موخر الذکر، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے اور ایک قبیلہ بنوامیہ سے تھے۔

خانہ جنگی کی پہلی لڑائی جنگ جمل (اونٹوں کی جنگ) تھی جو 'برّا' (عراق) کے مقام پر ہوئی۔ یہ نومبر 656ء میں ہوئی تھی۔ ایک طرف امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسری جانب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی افواج تھیں۔ جنہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی حمایت حاصل تھی۔ یہ سب کبائر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔ بعض روایات کے مطابق دونوں اطراف سے دس ہزار (۱۰۰۰۰) سپاہی شہید ہوئے۔ دوسری لڑائی جنگ صفّین کہلاتی ہے۔ یہ جولائی 657ء میں ہوئی تھی۔ یہ شام کے علاقے الرّ فاع میں لڑی گئی۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج اسی ہزار (۸۰۰۰۰) مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جن میں ستر (۷۰) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ تھے جنہوں نے غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی۔ ستر (۷۰) وہ تھے جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر حلف اٹھایا تھا۔ چار سو (۴۰۰) جلیل القدر انصاری رضوان اللہ علیہم اجمعین اور مہاجرین تھے۔ جب کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں زیادہ تر شامی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کے اندازاً پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کے پنتالیس ہزار (۴۵۰۰۰) افراد شہید ہوئے۔

جمل اور صفّین کی جنگوں نے سنیوں اور شیعوں کے مابین مستقل خلیج حائل کر دی۔ ان کے نتیجے میں 'خوارج[۱]' نے بھی جنم لے لیا اور مسلمانوں میں سیاسی وحدت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ کیا اب خلافت قائم ہو سکتی ہے جب کہ مسلم دنیا میں متعدد سیاسی، مذہبی علاقائی نسلی

۱۔ خوارج اسلام میں پہلا مذہبی فرقہ ہے جس نے شعائر سے ہٹ کر اپنا الگ گروہ بنایا۔ ان کا بنیادی عقیدہ تھا کہ دینی معاملات میں انسان کو حاکم بنانا کفر ہے اور جو لوگ ایسے فیصلوں کو تسلیم کرتے ہیں وہ واجب القتل ہیں۔ اسی بنا پر ایک لمبے عرصے تک انہوں نے امت مسلمہ میں قتل غارت کا بازار گرم رکھا حتیٰ کہ کبائر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی شہید کر دیا۔

اور دیگر تفرقے موجود ہیں؟

(۷)۔ امام خمینی نے 1979ء میں ایران میں ایک اسلامی ریاست قائم کی تھی جس پر مسلمانانِ عالم نے عمومی طور پر اور عرب ہمسایوں نے خصوصی طور پر منفی تاثر کا اظہار کیا۔ اس کے نتیجے میں ایران اور عراق کے مابین جنگ ہوگئی جو آٹھ سال (1980ء-1988ء) جاری رہی۔ یہ بیسویں صدی عیسوی کی سب سے بڑی روایتی جنگ تھی۔ اس سے عراق میں اندازاً ایک لاکھ پانچ ہزار سے دولاکھ تک (۱۰۵۰۰۰-۲۰۰۰۰۰) اموات ہوئیں۔ چار لاکھ (۴۰۰۰۰۰) افراد زخمی ہوئے اور ستر ہزار (۷۰۰۰۰) کو جنگی قیدی بنالیا گیا۔

(*Conflict and conquest in the Islamic world, p.418.*)

ایران میں اموات تقریباً دولاکھ (۲۰۰۰۰۰-۲۲۰۰۰۰) ہوئیں جبکہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ دس لاکھ سے زیادہ ایرانی ہلاک ہوئے۔ جمل اور صفین کی جنگوں اور حالیہ ایران عراق جنگ کی روشنی میں کیا ممکن ہے کہ پوری مسلم دنیا میں ایک خلافت قائم ہوجائے گی؟ کیا اہلِ تشیع ایک سنی خلیفہ کو قبول کرلیں گے؟ کیا سنی ایک شیعہ خلیفہ کو قبول کرلیں گے؟ کیا ایک بنگلہ دیشی مسلمان پاکستانی خلیفہ کو قبول کرسکتا ہے؟

(۸)۔ مختصراً یہ کہ ایک ہمہ گیر مسلم خلافت کا دعویٰ اور اس کے قیام کے لیے جدوجہد ان زمینی حقائق کی روشنی میں ایک ناقابلِ عمل رومانوی تصور ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ایک نیا سیاسی فلسفہ ارتقاء کی منزلیں طے کررہا ہے اور جدید قومی ریاستوں کی تشکیل اور حصار بندی ہورہی ہے۔ امتِ مسلمہ کے اندر اتحاد کی خواہش کو عملی شکل دی جاسکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ مسلم ریاستوں کی ایک 'دولت مشترکہ' کا قیام موجودہ تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کو تقویت دے گا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مندرجہ بالا حقیقتوں نے اس تنظیم کو اپاہج بناکر رکھ دیا ہے۔

حضرت اقبالؒ نے جو جدید اسلام کے حوالے سے گہری بصیرت رکھتے ہیں، بالکل بجا کہا ہے:

ترکوں کے نظریے کو سمجھنے کے لیے، آیئے ہم اولین مورخ اسلام ابن خلدون سے رہنمائی حاصل کریں۔ ابن خلدون اپنی مشہور تصنیف 'مقدمہ' میں اسلام میں ہمہ گیر خلافت کے بارے میں تین واضح تصورات پیش کرتا ہے: (ا) یہ کہ یہ ایک الوہی ادارہ ہے اور ناگزیر ہے۔

(ب) یہ کہ یہ نظم ونسق اور مصلحت سیاسی کا تقاضا ہے اور (ج) یہ کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں جو خوارج کا نقطۂ نظر ہے۔ جدید ترکی نے معتزلہ کا زاویہ نگاہ اختیار کیا کہ یہ کوئی الوہی حکم نہیں بلکہ مصلحت کا تقاضا ہے۔ (دوسرا نقطہ نظر) تجربے نے ثابت کیا ہے کہ تمام عالم اسلام میں ایک خلیفہ عملاً بے معنی ہو گیا ہے۔ ملت اسلامیہ اقوام عالم میں اس طرح بٹ گئی ہے کہ اب دوبارہ اس کو وحدانی مملکت اور خلافت بنانا امرِ محال ہے۔ اب یہ خیال نہ صرف یہ کہ کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ اس کے اثرات ضرر رساں ہیں جو اقوام اسلامیہ کے اتحاد میں حائل ہوتے ہیں۔ شروع صدیوں میں خلیفہ کے لیے قریشی ہونا بھی لازمی شرط شمار ہوتا تھا۔ عربوں اور قریشیوں کے زوال کے بعد قاضی ابوبکر باقلانیؒ[1] نے یہ فتویٰ دیا کہ اب یہ شرط ساقط ہو گئی ہے۔ ابن خلدون کا بھی یہی خیال تھا کہ اب جس کے ہاتھ میں قوت آ جائے اس کو خلیفہ مان لینے کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ترکوں نے عملی تجربۂ سیاست اور تاریخ کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا ہے۔ محض فقیہانہ بحث نہیں کی۔ عربوں کی شہنشاہی مملکت کا زمانہ عرصۂ دراز ہوا کہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا سایہ اسلامی فقہ پر اب تک پڑ رہا ہے۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں پیش کئے گئے دلائل کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ایک بین الاقوامی نصب العین جو کہ اگرچہ اسلام کی صحیح روح ہے اس پر عرب شہنشاہیت نہ صرف سایہ فگن ہوئی بلکہ اس نے اس روح کی جگہ لے لی ہے۔ سرِ دست ہر مسلم قوم کو اپنے اندر مستغرق ہو کر اپنے نقطہ نظر کو عارضی طور پر خود پر مرتکز کر لینا چاہیے تاوقتیکہ وہ سب مضبوط اور طاقتور ہو کر جمہوری ریاستوں کا ایک زندہ خاندان بن کر ابھر آئیں۔ قومی جذبے سے سرشار مفکرین کے مطابق ایک سچا اور جاندار اتحاد محض علامتی سرداری کے ذریعے قائم کر لینا آسان نہیں ہے۔ اس کا حقیقی اظہار آزاد اور خود مختار اکائیوں میں ہے۔ جن کی نسلی رقابتوں کو سدھار کر مشترک روحانی امنگ کے ساتھ ہم آہنگ بنا دیا گیا ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آہستہ آہستہ اس سچائی تک لے جا رہا ہے کہ اسلام نہ تو ایک قومیت ہے اور نہ شہنشاہیت ہے بلکہ ایک جمعیتِ اقوام ہے جو مصنوعی حد بندیوں اور نسلی امتیازات کو صرف حوالے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ جبکہ

[1]۔ امام ابوبکر محمد بن طیب باقلانی (940ء-1013ء) ایک معروف مسلمان فقیہ، سکالر، محقق علم الکلام کا ماہر تھا جس نے اپنی زندگی سنی عقائد کو علم الکلام کے ذریعے ثابت کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔

اس کے ارکان کے معاشرتی افق کو محدود کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

(*Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, p. 67.*)

(۹)۔ میری عاجزانہ رائے میں قرارداد مقاصد جو 12 مارچ 1949ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی ایک اہم سیاسی فکری پیش قدمی ہے۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ مستقبل کا پاکستانی دستور سراسر یورپی نمونے پر نہیں بنایا جائے گا بلکہ یہ اسلام کے نظریئے اور جمہوری عقیدے پر استوار ہوگا۔ یہ قرارداد 1956ء، 1962ء اور 1973ء کے دساتیر کا دیباچہ بنی اور بالآخر آرٹیکل 2(A) کے تحت جب 1973ء کے دستور میں آٹھویں ترمیم کی 1985ء میں منظوری ہوئی تو یہ دستور پاکستان کا حصہ بن گئی۔ قرارداد مقاصد کا متن یہ ہے:

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کل کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمائے ہیں کیونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے:

یہ دستور ساز اسمبلی جو پاکستان کے عوام کی نمائندہ ہے، آزاد و خود مختار ریاست پاکستان کے لیے ایک دستور وضع کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہرگاہ یہ ریاست اپنے اختیارات و حاکمیت عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے بروئے کار لائے گی۔ جس کی رُو سے اصولِ جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری، عدل و حکمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا، جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر خود کو اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں متعین ہیں، تربیت دے سکیں۔ جس کی رُو سے اس امر کا واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقیدوں پر قائم رہ سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی جن میں حیثیتوں اور مواقع کی مساوات اور قانون کے مطابق معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی انصاف، آزادیِ فکر، آزادئ اظہار، مذہب و عقیدہ، عبادت و تنظیم سازی اور تابعِ قانون اخلاقیات کی آزادی شامل ہے۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا

اور جس کی رُو سے نظام عدل کی آزادی کاملاً محفوظ ہوگی۔

جس کی رو سے عدلیہ کی آزادی کی مکمل ضمانت دی جائے گی۔ پاکستان کے عوام اقوام عالم میں باوقار مقام حاصل کرسکیں اور وہ بین الاقوامی امن وترقی اور انسانیت کی خوشیاں بڑھانے میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔

اس قرارداد کو اس وقت کے تمام بڑے اسلامی مفکرین کی حمایت حاصل تھی جن میں سید ابواعلیٰ مودودیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ[1] پیر مانکی شریفؒ[2] اور دیگر علماء کرامؒ بھی شامل تھے۔ اس قرارداد کو اب بھی علماء کرامؒ اور اہل دانش کی حمایت حاصل ہے۔ باالفاظ دیگر پاکستان کے تمام علماء اور اہل دانش نے اجتماعی اجتہاد کے ذریعے پاکستان کی قومی ریاست کے تصور کو قبول کیا ہے۔ ایک عالمگیر اسلامی خلافت عہد حاضر میں ناممکن ہے اور نہ ہی کبھی ایک عالمگیر اسلامی خلافت ممکن ہوئی ہے۔ اس لیے اس محال تصور کے لیے خون نہیں بہانا چاہیے بلکہ اچھی مسلم قومی ریاستیں بنی چاہیں جن کا باہمی بین الاقوامی روحانی وسیاسی اتحاد ممکن ہوسکتا ہے۔

---

[1]۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (1885ء - 1949ء) ایک معروف پاکستانی اسلامی سکالر تھے جنہوں نے دارالعلوم دیوبند انڈیا سے تعلیم حاصل کی۔

[2]۔ امین الحسنات المعروف پیر آف مانکی شریفؒ (1923ء - 1960ء) شمال مغربی سرحدی صوبہ (حالیہ خیبر پختونخواہ) کے ایک مذہبی وسیاسی لیڈر تھے۔

حوالہ جات

۱۔ Conflict and Conquest in the Islamic World: A Historical Encyclopedia, Edited by Alexander Mikaberidze. Santa Barbara: ABC-CLIO, 2011.

۲۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam by Dr. Muhammad Iqbal. London: Oxford University Press, 1934.

۳۔ The End of the Jihad State: The Reign of Hisham Ibn 'Abd al-Malik and the Collapse of the Ummayyads by Khalid Yahya Blankinship. Albany: State University of New York Press, 1994.

۴۔ The First Written Constitution in the World by Dr. Muhammad Hamidullah. Lahore: Ashraf Press, 1975.

۲۳

جہاد کا صحیح تصور



As flies to the wanton boys, we are to the gods,

They kill us for their sport[1].

(جیسے کھلنڈرے بچوں کے لیے مکھیاں ہیں ویسے ہی ہم دیوتاؤں کے لیے ہیں)
(جو ہمیں تفریحاً قتل کر دیتے ہیں)

'جہاد' کے نام پر مسلمانوں کا بہت سا خون بہہ چکا ہے۔ امتِ مسلمہ لاکھوں نوجوانوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے ہماری بہتر مستقبل کی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس 'حکمتِ عملی' کا ازسرِنو جائزہ لیں۔ جس سے بڑے پیمانے پر کشت و خون ہوا، زبردست تباہی و بربادی ہوئی اور کوئی بھی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکا۔

'جہاد' کے معنی کیا ہیں؟ موجودہ زمانے کے منظرنامے میں جہاد کا مطلب کیا ہے؟ وہ کیسی صورت حال اور کیسا ماحول ہوتا ہے جب مسلمان ہتھیار اٹھا سکتے ہیں؟ کیا جہاد صرف ہتھیار استعمال کرنے سے ہی ہوتا ہے؟ کیسے حالات ہوتے ہیں کہ ہتھیاروں سے جہاد کی اجازت نہیں ہوتی؟ کیا مسلمانوں کا ایک فرقہ، مسلمانوں کے دوسرے فرقے کے خلاف جہاد کر سکتا ہے؟ کیا مسلمانوں کی سرزمین کے باشندوں کے لیے (ذاتی طور پر) جہاد 'فرض عین' ہو سکتا ہے؟ اور وہ کیسے حالات ہوتے ہیں جن میں یہ ایک معاشرتی ذمہ داری (فرض کفایہ) بن جاتا ہے؟

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیئیس (۲۳) برسوں میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں سو (۱۰۰) معرکے سر کیے جن میں سے ستائیس (۲۷) میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے۔ ان سب مسلح معرکوں میں صرف دو سو انسٹھ (۲۵۹) مسلمان شہید ہوئے اور دوسری جانب صرف سات سو انسٹھ (۷۵۹) غیر مسلم مارے گئے۔ ان فوجی اقدامات کی کل میزان کو بجا طور پر بلا خون بہائے لایا جانے والا انقلاب کہا جا سکتا ہے۔ یہ درحقیقت عظیم ترین ذہنی روحانی اور اخلاقی انقلابات میں سے ایک

---

[1] Shakespeare۔

تھا جس کا تاریخ انسانی نے مشاہدہ کیا تھا اور یہ بہت ہی کم خون ریزی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔
(*Muhamamd, p. 132*)

اس کے برعکس آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ پچھلی صدی میں اسلام کے نام پر چلنے والی تحریکوں میں کیا کچھ ہوا۔ الجزائر کی جنگ آزادی میں پچیس لاکھ (۲۵۰۰۰۰۰) مسلمان مارے گئے۔ پاک و بھارت جنگ، کشمیر، افغانستان اور چیچنیا میں لاکھوں مسلمان قتل ہوئے۔ فلسطین، شام اور مصر میں بھی یہی کچھ ہوا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو 'جہاد' کے تصور اور مفہوم پر ازسرِنو غور کرنا چاہیے اور قرآن وسنت کی حقیقی روشنی میں اپنی حکمت عملیوں کا نئے سرے سے جائزہ لینا چاہیے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو مسلمانوں کے خون کا بہنا جاری رہے گا اور حاصل وصول بھی کچھ نہیں ہوگا۔ فیض احمد فیض[۱] نے اس شعر میں ہماری حالتِ زار کا ہی حوالہ دیا تھا۔

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خون خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا
(نسخہ ہائے وفا: لہو کا سراغ)

مسلم دنیا میں 'جہاد' کو 'قتال' کے ساتھ گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ (قتال کے معنی لڑنا یا مسلح جدوجہد کرنے کے ہیں)۔ مسلمانوں کی اکثریت اس اصطلاح کو صحیح طور پر نہیں سمجھ پائی۔ وہ اس سے یہ مطلب لیتی ہے کہ کفار کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہو جب تک وہ ہتھیار ڈال کر مشرف بہ اسلام نہ ہو جائیں۔ مسلم معاشرے کی اس منتشر الخیالی کی وجہ سے غیر مسلم بھی غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں۔ جہاد ایک جامع اصطلاح ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں تمام قسموں کی مساعی (جدوجہد) کا حوالہ دیتی ہے: قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ. (سورۃ الحج، آیت: ۷۸)
(اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایسی جدوجہد کرو جیسا حق ہے)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کہتے ہیں کہ جہاد محض 'قتال' ہی نہیں بلکہ یہ

[۱] فیض احمد فیض (1911ء-1984ء) اردو ادب کے ترقی پسند شاعر تھے۔

لفظ ایک طویل جدو جہد اور دقت طلب کوشش کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (تفہیم القرآن ذیل سورہ الحج، آیت: ۷۸) مولانا ثناء اللہ پانی پتیؒ[1] کی رائے میں جہاد کا مطلب جدو جہد، توسیع اور قوت کا استعمال ہے۔ (تفسیر مظہری بحوالہ مذکورہ)

سورۃ الفرقان جو مکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یوں خطاب فرمایا ہے کہ

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا. (سورۃ الفرقان، آیت: ۵۲)
(پس اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کافروں کی بات ہرگز نہ مانیں اور اس قرآن مجید کے ذریعے کفار کے ساتھ جہادِ کبیر کریں)

اس مکی سورت میں 'جہادِ کبیر' کے الفاظ اس وقت استعمال ہوئے جب اہل ایمان کو تلواریں اٹھانے کا حکم نہیں ملا تھا۔ حتیٰ کہ وہ ظالموں کے خلاف بھی تلوار استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کفار کے خلاف جہاد، جہادِ کبیر کریں، قرآن مجید کے ساتھ، نہ کہ تلوار کے ساتھ۔ جہاد دراصل شر کے خلاف ہر سطح پر زندگی بھر جدو جہد جاری رکھنے کا نام ہے۔ یہ دیگر کسی بھی پُرعزم علمبردارانِ انسانی حقوق کی مانند ایک مسلمان سے بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہ ناانصافی، استحصال، جہالت، غربت اور دیگر برائیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے ایک پُرامن اور اخلاقی جدو جہد کرے۔ جہاد کا مطلب یہ بھی ہے کہ مخصوص حالات اور صورتِ حال میں ایک مسلح جدو جہد کی جائے یا جہاد کیا جائے۔ لیکن عربی کا لفظ قتال اس مفہوم کی صحیح تر ترجمانی کرتا ہے۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان دشمنوں کے خلاف جسمانی طور پر مزاحمت کریں اور ان کے خلاف صف آرا ہو جائیں جو ان پر ظلم و زیادتی کریں اور انہیں گھر بار سے بے دخل کرنے کی کوشش کریں۔

جہادِ کبیر کے تین اضافی معانی بھی ہیں:

(۱)۔ انتہائی کوشش جس میں آدمی کوشش و جان فشانی کا کوئی وقیقہ اٹھا نہ رکھے۔

(۲)۔ جملہ مساعی اور بڑے پیمانے کی جدو جہد کرنا جہاں معاشرے کے تمام افراد اور مادی وسائل

[1] مولانا ثناء اللہ پانی پتیؒ برصغیر پاک و ہند کے عظیم فقیہ، محدث، محقق اور مفسر تھے۔

اس مقصد پر خرچ کر دیے جائیں۔

(۳)۔ جامع جدوجہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے۔ (تفہیم القرآن بحوالہ مذکورہ) جہادِ عظیم سے مراد دل سے، زبان سے اور تلوار سے جہاد ہے۔
(کنز العمال، ج:۲، رقم الحدیث: ۶۶۷۳)

'جہادِ کبیر' کی مزید وضاحت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعدد احادیث میں کی گئی ہے:

عن جابر قال: قدم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم قوم غزاة فقال: قدمتم خیر مقدم، قدمتم من الجهاد الأصغر إلی الجهاد الأکبر مجاهدة العبد هواه.
(کنز العمال، ج:۲، رقم الحدیث: ۶۶۷۳)

(حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجاہدین کی ایک جماعت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آ گئے، بہت ہی خوب آئے۔ تم لوگ جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آ گئے ہو جس میں بندے کو نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے)

اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے (ذہن میں رہے کہ یہ وہ جنگ واحد ہے جس کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی الاعلان تیاری کروائی اور اس جنگ میں اسلامی مملکت کے وجود کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شاندار قربانی دے کر اپنی پکی فصلیں چھوڑ کر اس غزوہ میں گئے تھے)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر.
(ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تبلیغ و دعوۃ کی مصروفیتوں کو 'جہادِ اکبر' قرار دیا اور مسلح جدوجہد (قتال) کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہادِ اصغر (چھوٹا جہاد) سمجھتے تھے۔ اس تصور کی ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ چند سپاہی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا خیر مقدم کیا اور ارشاد فرمایا: تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بڑا جہاد کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان کو اپنی خواہشات اور ترغیبات کے

خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ (تفسیر ضیاء القرآن ذیل سورۃ الفرقان، آیت: ۵۲)

(۴)۔ 'جہاد' کی اولین شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اسلام سے اچھی طرح آگاہ ہو اور شعوری طور پر جانتا ہو کہ جہاد شروع کرنے کا مقصد کیا ہے۔ وہ 'کفر' اور 'جاہلیہ'[1] سے بھی آگاہی رکھتا ہو جس کے خلاف وہ 'قتال' شروع کرنے والا ہو، تاکہ وہ کفر کو اس کی کسی شکل میں جس میں وہ ظاہر ہو رہا ہو پہچان سکے۔ اس موضوع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بالکل بجا کہا ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشوونما پائی مگر وہ جاہلیت کو نہیں پہچانتا۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص: ۱۶۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے موجودہ دور کے بارے میں پیش گوئی کر دی تھی۔ آج مسلمانوں نے جہاد کے تصور کو ہی مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور بے حد بے سلیقگی سے اس تصور کو استعمال کیا ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے اسے کبھی اپنے مفاد کے لیے اور کبھی اپنے غیر ملکی آقاؤں کے حکم کی تعمیل کے لیے استعمال کیا۔ پھر اسے دہشت گردی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کو یہ مضحکہ خیز رویہ فوراً ترک کر دینا چاہیے۔ حکمران ڈالر وصول کر لیتے ہیں اور نوجوان اپنا خون بہا کر اپنی زندگیاں ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ ماتم کر کر کے ان کی ماؤں کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور دلہنوں کے آنگن اجڑ جاتے ہیں۔

شیکسپیئر کا یہ مصرعہ آج کی صورت حال کی بجا نقشہ گری کرتا ہے:

As flies to the wanton boys, we are to the gods,

They kill us for their sport.

(جیسے کھلنڈرے بچوں کے لیے مکھیاں ہیں، ایسے ہی ہم دیوتاؤں کے لیے ہیں)
(جو ہمیں تفریحاً قتل کر دیتے ہیں)

(۵)۔ سنت ثابتہ، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فقہائے امت کے مطابق جہاد کا اعلان نہ تو افراد کر سکتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کا کوئی گروہ کر سکتا ہے:

---

[1]۔ یہ لفظ اسلام کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

(i)۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جہاد ہر امام کے ساتھ فرض ہے خواہ وہ متقی ہو یا گنہگار۔ (سنن ابوداؤد، ج:۲، رقم الحدیث:۷۶۸)

(ii)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اگر کسی نے امیر (کمانڈر/ رہنما) کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی۔ اگر کسی نے امیر کی حکم عدولی کی اس نے میری حکم عدولی کی اور امام ایک ڈھال ہے جو دورانِ جنگ حفاظت کرتی ہے۔ اگر وہ (امام) تمہیں حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور وہ انصاف قائم کرتا ہے۔ اس کو اس کی جزا ملے گی اور اگر وہ تمہیں کوئی اور حکم دیتا ہے (کوئی تخریبی قسم کا کام) تو وہ اس کے لیے ذمہ دار ہوگا۔ (صحیح بخاری، ج:۲، رقم الحدیث:۲۲۴)

(iii)۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لیے لڑا، امام کی پیروی کی اپنی بہترین دولت خرچ کر دی اور فساد سے (انتشار پھیلانے سے) باز رہا، اس کا سونا اور جاگنا باعث ثواب ہوگا۔ تاہم اگر کوئی نمود و نمائش اور شہرت پانے کے لیے لڑا، امام کی نافرمانی کی اور فساد پھیلایا (فساد فی الارض) اسے کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

(سنن نسائی، ج:۲، رقم الحدیث:۱۱۰۱)

(iv)۔ حضرت امام ابو یوسفؒ نے جو ایک سرکردہ حنفی فقیہ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے خاص شاگرد اور اسلامی قانونی تاریخ کے اولین قاضی القضاۃ تھے انہوں نے یہ اصول اس طرح وضع کیا: امام یا اس کے نائب کی اجازت کے بغیر کوئی مہم روانہ نہیں کی جا سکتی اور مسلمان فوج کا کوئی شخص، امیر کی اجازت کے بغیر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ (کتاب الخراج، ص:۳۸۵)

(v)۔ حضرت امام محمد الشیبانیؒ جو اسلامی بین الاقوامی قانون کے بانی اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے سرکردہ شاگردوں میں سے دوسرے نمبر پر تھے، انہوں نے بھی اسی نظریئے کا اظہار کیا ہے۔

(کتاب السیر الکبیر: شرح امام سرخسیؒ، ص:۲۵۹)

(vi)۔ باالفاظِ دیگر ایک گروہ کے امیر (وہ امیر جس نے اہل الحرب پر حملہ کیا ہے) کے اختیارات امام کی مقرر کردہ مہم کے امیر کے مماثل ہوتے ہیں۔

(vii)۔ حضرت علاؤالدین ابوبکر الکسانیؒ جو ایک سرکردہ حنفی فقیہ ہے اس نے ایسی صورت حال پر بحث کی ہے جس میں اہل الموعدہ (ایسی ریاست جس کے ساتھ ایک مسلم ریاست کا معاہدہ ہو چکا ہے) کے غیر مسلموں کا ایک گروہ اپنی حکومت کی اجازت کے بغیر دارالسلام پر حملہ کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'اگر ایسے لوگوں کا گروہ جن کا کوئی 'مناعۃ' (فوجی اور سیاسی قوت) نہیں ہے تو وہ حملہ اس ریاست (اہل الموعدہ) کی طرف سے اس وقت تک حملہ نہیں سمجھا جائے گا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ حملہ اس ریاست کی مرضی سے ہوا ہے۔ (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ص:۷۷) بالفاظ دیگر جب تک اس ریاست کی حکومت حملے میں ملوث نہ ہو تو معاہدۂ امن اس حکومت اور اس کے عوام پر لاگو رہے گا۔

(۶)۔ یہ اصول 'حملے' اور 'دفاع' دونوں پر قابل اطلاق ہے۔ اس طرح جہاد کا اعلان کرنا صرف مسلم ریاست کا حق ہے وہ بھی دفاع کے لیے۔ یہ گروہوں یا افراد کا حق نہیں جو حکومت سے بے تعلق ہو کر بالا بالا ایسا کرتے رہیں۔ فوجی تصادم کے اندر یہ معلوم کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ کیا کیا اقدامات کئے جا چکے ہیں۔ فوجی عملہ کی تیاریاں، فورسز کو کہیں روانہ کرنا، انہیں ہدایات جاری کرنا، جاری جنگ کے دوران کمانڈر کا ہدایات لینا، کسی کو قیدی بنانا، جنگی قیدیوں کو رہا کرنا، یا ان کا دشمن کے جنگی قیدیوں سے تبادلہ کرنا، معاہدۂ امن پر دستخط کرنا، معاہدۂ امن کی تنسیخ کے لیے نوٹس دینا، یہ فیصلہ کرنا کہ کیا معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی ہے یا نہیں اور فوجی سرگرمیوں سے متعلقہ دیگر امور نمٹانا مسلم سربراہ ریاست کی اجازت یا اس کے علم میں لائے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

فقہائے امت کے مطابق مندرجہ بالا اصول میں صرف ایک معقول استثنا ہے۔ اگر دشمن پیشگی خبردار کئے بغیر حملہ آور ہو جائے اور مرکزی حکومت سے رابطہ قائم کرنا ناممکن ہو تو وہ لوگ جو حملے کی زد میں آ جائیں ان کا حق ہے کہ وہ اپنا دفاع کریں۔ یہ استثنا اس اصول پر مبنی ہے کہ ذاتی دفاع کرنا ہر شخص کے لیے ایک جائز حق ہوتا ہے جب ریاستی حکمرانوں سے ہدایات وصول کرنے کا کوئی امکان نہ ہو۔

(۷)۔ ہندوستان میں انیسویں صدی عیسوی کی اہلحدیث تحریک کے بانیان نے یہ نظریہ پُرزور

طریقے سے پیش کیا کہ حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد حرام (غیر قانونی اور بغیر اسلامی جواز کے) ہے کیونکہ ایک مسلم سربراہ مملکت (خلیفہ) موجود نہیں ہے جو اعلان جہاد کرسکتا ہو۔نواب صدیق حسن خانؒ[۱]، نذیر حسین دہلویؒ[۲] اور محمد حسین بٹالویؒ[۳] ابتدائی تحریک اہلحدیث کے تین نامور علماء تھے اور ان کی یہ رائے بالکل بجا تھی کہ مسلم سربراہ ریاست کے بغیر جہاد غیر قانونی ہے۔(رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد، ص:۱۸-۱۹) نذیر حسین دہلویؒ کے مطابق امام (سربراہ مسلم ریاست) کی موجودگی جہاد کے لیے اولین شرائط میں سے ہے۔(فتاویٰ نذیریہ، ص: ۱۹۱) نواب صدیق حسن خانؒ نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا تھا کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے جواز میں مشکلات ہیں۔

(*Mawa 'd al-'wa'd min 'Uyun al-Akhbar wa al-Fawa'd , p. 34-35.*)

(۸)۔ مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں یہ بات کافی حد تک واضح ہوگئی ہے کہ اس امر پر 'اجماع' ہے کہ جہاد ایک اجتماعی فریضہ ہے جس کا اعلان، منصوبہ بندی اور انتظام و انصرام حکومت کو کرنا ہوتا ہے۔افراد اور غیر ریاستی اہلکار نہ جہاد کا اعلان کرسکتے ہیں اور نہ شروع کرا سکتے ہیں۔یہ رائے کاملاً منطقی ہے۔اگر افراد یا گروہ اپنی آزاد مرضی سے جہاد کا اعلان کریں یا جہاد شروع کردیں تو یہ ریاست کے اندر ریاست بنانے کے مترادف ہوگا جو لاقانونیت اور 'فتنہ' (بدنظمی و انتشار) بن جائے گا جسے قرآن مجید (سورۃ البقرہ، آیت:۱۹۱) نے قتل سے بھی بدتر قرار دیا ہے:

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ.
(اور فتنہ قتل سے بھی بڑی سنگین برائی ہے)

(۹)۔ بعض جہادی گروپ اپنے پرائیویٹ جہادوں کے جواز کے لیے حضرت ابوبصیر عتبہ بن اسید

---

[۱]۔نواب صدیق حسن خانؒ (1832ء-1890ء) برصغیر پاک و ہند کے ایک نامور اہلحدیث عالم تھے۔

[۲]۔نذیر حسین دہلویؒ (1805ء-1902ء) برصغیر پاک و ہند کے نامور اہلحدیث عالم اور ہندوستان میں اہلحدیث تحریک کے شریک بانی تھے۔

[۳]۔مولانا محمد حسین احمد بٹالویؒ (1840ء-1920ء) برصغیر پاک و ہند کے ایک نامور اہلحدیث عالم تھے جنہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی اور احمدیہ جماعت کا زبردست رد کیا۔

کے واقعے کا ذکر کرتے ہیں۔ (والدین کی اجازت کے بغیر جہاد، ص: ۶۲ - ۶۳) یہ واقع کچھ یوں ہے:

مدینہ شریف میں ہجرت کے چھٹے سال کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ اور اہل مکہ کے درمیان حدیبیہ[1] کے مقام پر ایک معاہدۂ امن پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کی شرائط میں سے ایک یہ تھی کہ اگر مکہ مکرمہ کا کوئی آدمی مدینہ منورہ میں مسلمانوں سے جا ملے تو اسے لازماً اہل مکہ کو واپس کر دیا جائے گا؛ تاہم اگر مسلمانوں میں سے کوئی جا کر اہل مکہ سے مل جائے تو اسے واپس نہیں بھیجا جائے گا۔ (صحیح بخاری، ج: ۲، رقم الحدیث: ۴) حقیقت حال یہ تھی کہ اس شرط پر صرف زبانی اتفاق ہوا تھا، ابھی اسے ضابطۂ تحریر میں نہیں لایا گیا تھا کہ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ نامی ایک مسلمان جو کسی طرح مکہ مکرمہ کے ظالموں سے بچ کر حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچ گیا اور ان سے مدد کی درخواست کر دی۔ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کا باپ سہیل بن عمرو مذاکرات میں اہل مکہ کا ترجمان ونمائندہ تھا۔ اس نے حضور نبی اکرم ﷺ سے اپنے بیٹے کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ آپ ﷺ اس پر راضی ہو گئے کیونکہ ایسا نہ کرنا معاہدے (جس پر ابھی دستخط نہیں ہوئے تھے) کی خلاف ورزی کے مترادف تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا۔ تاہم حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ اہل مکہ کی گرفت سے نکل بھاگے اور ایسی جگہ جا پہنچے جو مسلم ریاست اور اہل مکہ دونوں کے دائرہ اختیار سے باہر تھی۔

اسی طرح ایک مسلمان حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ کا معاملہ تھا۔ وہ بھی اہل مکہ کی چیرہ دستیوں سے بچ نکلا اور مدینہ جا پہنچا۔ اہل مکہ نے شرائطِ معاہدہ کے تحت اس کی بھی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ آپ ﷺ نے حسب معاہدہ حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو بھی ان کے حوالے کر دیا۔ لیکن واپسی پر حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی جان چھڑا لی اور حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ سے جا ملا۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ سے کئی اور مسلمان فرار ہو گئے لیکن مدینہ منورہ کے مسلمانوں کے معاہدے کے خیال سے وہاں کی بجائے حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں پہنچتے رہے۔ اس طرح ان کی

[1]۔ اس معاہدے کا نام اسی جگہ کی نسبت سے معاہدہ حدیبیہ رکھا گیا۔

تعداد بڑھتی رہی جس سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان کی انسانی ضرورتیں تھیں۔ انہوں نے اپنے گزارے کے لیے ایسے علاقے کو منتخب کرلیا جو اہل مکہ کے شام جانے والے تجارتی قافلوں کے راستے میں واقع تھا۔ انہوں نے مکی قافلوں پر حملے کرنا شروع کر دیئے۔ جس سے انہیں بے پناہ مالی و جسمانی نقصان پہنچنے لگا۔ اس سے اہل مکہ بہت زچ ہوئے۔ انہوں نے ابوسفیان کو حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا۔ جس نے آ کر معاہدے کی اس شق کو ختم کرنے کی استدعا کرتے ہوئے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے تجارتی راستے کو محفوظ کرنے کے لیے اس گروپ کو مدینہ منورہ بلوالیں۔ (صحیح بخاری، ج: ۲، رقم الحدیث: ۴)

بعض جہادی گروپ اس واقعہ کو نظیر بنا کر استدلال کرتے ہیں کہ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ کی طرح کوئی بھی گروپ جہادی سرگرمیاں شروع کرسکتا ہے اور کسی سربراہ ریاست کی طرف سے اعلان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ (الجہاد فی الاسلام، ص: ۷۵-۷۷)
اس دلیل کو درج ذیل وجوہ کی بنا پر قبول نہیں کیا جاسکتا:

(i)۔ حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کا کیمپ مدینہ منورہ کی مسلم ریاست کے دائرہ اختیار اور اثر ورسوخ سے باہر تھا۔

(ii)۔ یہ گروپ نہ مسلم ریاست کے زیر کنٹرول تھا اور نہ ریاست اس کی کوئی مالی مدد کرتی تھی۔

(iii)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود انہیں واپس بھیجا اور فرمایا تھا کہ تمہاری درخواست کی منظوری سے معاہدہ حدیبیہ توڑنے کے مترادف ہوگا۔

(iv)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

(v)۔ اس گروپ کی سرگرمیوں کو مسلم فقہاء کرامؒ نے کبھی جہاد تسلیم نہیں کیا۔

(vi)۔ یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کتنی سختی سے معاہدے پر کاربند رہے باوجودیکہ ان شرائط کو قبول کرنے پر بہت مضطرب تھے۔

(vii)۔ یہ گروپ اس علاقے سے آپریٹ کرتا تھا جو اس کے اپنے کنٹرول میں تھا۔ مسلم ریاست کے

اندر نہیں تھا[1]۔ کوئی بھی 'مفروضہ' مثلاً حضور نبی کریم ﷺ اس گروہ کی مدد کر رہے تھے یا اسے مالی امداد پہنچا رہے تھے آپ ﷺ کے کردار پر سنگین الزام لگانے کے مترادف ہوگا۔ حتیٰ کہ اہل مکہ نے بھی یہ الزام نہیں لگایا جو اس دو طرفہ معاہدے کے فریق تھے۔

(۱۰)۔ لہٰذا کوئی بھی شخص مندرجہ بالا نظیر کا حوالہ دے کر حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کی سرگرمیوں کو بنیاد بنا کر اکیسویں صدی عیسوی میں جہاد کا اعلان اور جہاد شروع کرنے کا مجاز نہیں ہے جبکہ اس صدی میں مضبوط قومی ریاستیں موجود ہیں اور ایک قومی ریاست کا نظام پایا جاتا ہے جس میں عالمی مسلم کمیونٹی موجود ہے۔ فقہائے کرامؒ نے قرآن وسنت کی بنیاد پر بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جہاد کا اعلان کرنے، اسے عملی جامہ پہنانے یا تقدیس عطا کرنے کا کام حسبِ ضابطہ قائم اور آئینی طور پر مسلم حاکم، یعنی حکومت کر سکتی ہے۔ کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا نہ وہ خود یہ حق حاصل کر سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے فتنہ اور لاقانونیت پھیلے گی۔ خون بہانے کا یہ طریق عمل (پریکٹس) جو ہم اکثر دیکھتے ہیں غلط تعبیر پر مبنی ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ غیر اسلامی ہے۔

[1]۔ لہٰذا موجودہ پاکستانی جہادی، ریاست پاکستان سے باہر خود کو قائم کرنے کی شرط پر پورے نہیں اترتے۔ پاکستانی علاقے سے کی گئی کوئی بھی کارروائی پاکستان کی ان قانونی ذمہ داریوں سے متصادم ہوگی جو بین الاقوامی قانون اور معاہدۂ شملہ کے تحت پاکستان پر عائد ہوتی ہیں۔ معاہدۂ شملہ بھارت اور پاکستان کا ایک دو طرفہ معاہدہ ہے جو 1971ء میں بعد از جنگ طے پایا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ لکھنو: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۷۹ء۔

۲۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ابوبکر علاء الدین الکسانیؒ ترجمہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف۔ لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، ۱۹۹۳ء۔

۳۔ تفسیر ضیاء القرآن، پیر محمد کرم شاہ ازہریؒ۔ لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء۔

۴۔ تفسیر مظہری، قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ۔ کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۹۹ء۔

۵۔ تفہیم القرآن، سید ابواعلیٰ مودودیؒ۔ لاہور: الاصلاح کمیونیکیشن نیٹ ورک، ۱۹۹۹ء۔

۶۔ الجہاد فی الاسلام، عبدالرحمٰن رحمانیؒ۔ لاہور: دارالاندلس، ۱۹۹۷ء۔

۷۔ رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد، محمد حسین بٹالویؒ۔ لاہور: وکٹوریہ پریس، ۱۸۷۶ء۔

۸۔ سنن ابو داؤد، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

۹۔ سنن نسائی، حضرت امام احمد بن شعیب نسائیؒ ترجمہ مولانا افضل احمد۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۱ء۔

۱۰۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۱۱۔ فتاویٰ نذیریہ، نذیر حسین دہلویؒ۔ لاہور: اہلحدیث اکیڈمی، ۱۹۷۱ء۔

۱۲۔ کتاب السیر الکبیر، امام محمد بن حسن الشیبانیؒ شرح امام سرخسیؒ۔ بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۷ء۔

۱۳۔ کتاب الخراج، امام ابویوسف یعقوب بن ابراہیمؒ۔ پشاور: مکتبہ فاروقیہ ۲۰۰۰ء۔

۱۴۔ کنزل العمال، امام علاء الدین علی متقی ابن حسام الدینؒ ترجمہ مولانا احسان اللہ شائق۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۱۵۔ نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض۔ لاہور: فرید بک، ۲۰۱۰ء۔

۱۶۔ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد، حافظ عبدالسلام بن محمد۔ لاہور: دارالاندلس، ۲۰۰۳ء۔

۲۴

کلی اجتہاد کی ضرورت



جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی ہیں۔ (سنن ابوداؤد، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۹۹)

انسانی زندگی میں ثبات وتغیر ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ یہ امر اسلام کے بارے میں بھی ایک حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ بعض اصول مستقل نوعیت کے ہیں اور انہیں قرآنی اصطلاح میں محکمات [۱] کہا جاتا ہے جیسے 'توحید'، 'نبوت'، 'آخرت' اور انسانی وقار، یہ دائمی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہو سکتا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اس دائمیت کے ساتھ ساتھ بعض ایسی چیزیں ہیں جن میں زمانہ گزرنے سے تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں بنی نوع انسان کی بقاء اور ارتقاء کے لیے بہت ضروری ہوتی ہیں۔ اسلام نے تبدیلیوں سے عہدہ برآئی کے لیے اجتہاد کا تصور دیا ہے تاکہ ہم تہذیب انسانی کی تیز رفتار پیش قدمی کا ساتھ دے سکیں۔ یہ تبدیلیاں سائنسی، معاشرتی، اقتصادی اور فلسفیانہ ارتقاء کی صورت میں ہو رہی ہیں۔ نامور سیاستدان ومدبر، شاعر اور سکالر حضرت اقبالؒ اس تصور اجتہاد کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

۱۔ محکمات محکم کی جمع ہے اور مستحکم اور پائیدار موضوعات کو محکمات کہا جاتا ہے۔ محکمات سے وہ قرآن پاک کی وہ آیات ہیں جن کا مفہوم اور معنی اس قدر واضح اور روشن ہو کہ جس کے معنی میں بحث وگفتگو کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

ہمہ اقسام کی زندگی کی حتمی روحانی بنیاد، جیسا کہ اسلام نے متشکل کی ہے، لافانی ہے اور اپنا اظہار تنوع اور تغیر میں کرتی ہے۔ حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی معاشرے کو اپنی زندگی میں دوام اور تغیر کی اقسام کے ساتھ لازماً ہم آہنگی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کو با قاعدہ و باضابطہ بنانے کے لیے لازماً غیر مبدل اصول ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ان کا غیر مبدل ہونا مسلسل متغیر ہونے والی دنیا میں ہمیں قدم جمانے کی جگہ مہیا کرتا ہے۔ دائمی اصولوں کے بارے میں جب یہ سمجھ لیا جائے کہ انہوں نے تغیر کے جملہ امکانات کو خارج کر دیا ہے جو کہ از روئے قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے تو یہ ایک ایسا میلان ہوتا ہے جو اس چیز کو ساکن کر دیتا ہے جو اپنی فطرت میں اساسی طور پر 'متحرک' ہے۔ یورپ کی سیاسی اور معاشرتی علوم میں ناکامی اول الذکر اصول کا اظہار کرتی ہے جبکہ اسلام میں جمود، جو گزشتہ پانچ سو سال رہا، مؤخر الذکر اصول کا اظہار کرتا ہے۔ پھر اسلام کی ساخت میں جو اصولِ حرکت ہے؟ اسے اجتہاد کہا جاتا ہے۔

(*Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, p. 63.*)

اجتہاد کا یہ مطلب نہیں کہ ایک نیا مذہب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے مستقل اصولوں کی تعبیر کرنا اور انہیں ہر عہد میں لاگو کرنا ہے۔ اجتہاد محض ایک فنی (ٹیکنیکل) مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک انسانی ضرورت اور زمانے کا ایک تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے وقتوں میں تجارت اور کاروباری ترسیلات اونٹوں اور بادبانی کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھیں۔ اب ان کی جگہ بحری جہازوں اور طیاروں کا استعمال ہو رہا ہے اور انٹرنیٹ سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ تجارت اور کاروبار کے بنیادی اصول (دیانت داری، حساب دہی، جائز قیمتوں کی ادائیگی، جائز منافع، املاک کا تحفظ اور وعدہ ایفائی) غیر مبدل رہتے ہیں۔ لیکن جدید کاروبار میں سے سامنے آنے والے مسائل کی نئی تعبیرات تلاش کرنا پڑتی ہیں اور ان کا اطلاق مفادِ عامہ کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے لاحق ہوئی کہ کشتیوں کے ذریعے ہونے والی تجارت کی جگہ 'ای کامرس' (E-Commerce) نے لے لی ہے۔

حضرت ابو اسحاق الشاطبیؒ نے اپنی معروف کتاب 'الموفقات' میں لکھا ہے کہ اجتہاد کی ضرورت

تا قیامت رہے گی کیونکہ انسان نے شریعت پر عمل کرنا ہے۔(الموافقات فی اصول الشریعۃ، ج: ۴،ص: ۶۳) شریعت بنیادی اور وسیع تر اصول فراہم کرتی ہے لیکن چیزیں زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور نئے نئے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ ایسے مسائل کے حل کے لیے شریعہ کے بنیادی اور وسیع اصولوں کی نئی تعبیر اور ان کے اطلاق کے طریقوں کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔ بقول شاعر مشرق حضرت اقبالؒ:

'اس کے لفظی معنی زور لگانا، کے ہیں۔ اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قانونی مسئلے پر اپنی آزاد رائے قائم کرنے کی کوشش (جدوجہد) کی جائے'۔ میرے خیال میں اس کا حقیقی ماخذ قرآن کریم کی یہ معروف آیت ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (سورۃ العنکبوت، آیت: ۶۹)
(جو لوگ ہمارے لیے محنت کریں گے ہم انہیں اپنے راستے دکھائیں گے)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ہدایت فرمائی۔ وہ اسلام میں اجتہاد کا سرچشمہ ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی ہیں۔

(سنن ابوداؤد، ج: ۳، رقم الحدیث: ۱۹۹)

لفظ اجتہاد 'جُہد' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب 'زور' لگانا ہے۔ اجتہاد کے معنی ہیں اپنی ساری

صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لانا۔ مذہبی اصطلاح کے طور پر اس کا مطلب ہے شریعت کے وسیع اصولوں کی روشنی میں ایک مسئلے کو حل کرنے کے لیے تمام کوششیں بروئے کار لانا۔ اقبالؒ اس نقطے کی وضاحت کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں:

'تاریخ اسلام کا ہر طالب علم اس بات سے آگاہ ہے کہ اسلام کی سیاسی توسیع کے ہمراہ قانونی افکار کو منضبط و مربوط کرنا بے حد وحساب ضروری ہو گیا تھا۔ ہمارے فقہاء کرامؒ، انتھک کوشش کرتے رہے تا وقتیکہ انہوں نے قانونی افکار کا خزانہ جمع کر لیا جو مسلمہ مکاتب شریعت میں ڈھل گیا۔ یہ مکاتیب اجتہاد کے تین مدارج کو تسلیم کرتے ہیں۔

(۱)۔ قانون سازی کا مکمل اختیار جو عملاً ان مکاتب کے بانیوں تک محدود ہے۔

(۲)۔ نسبتی اختیار جو ایک خاص مکتبہ فکر کے دائرے کے اندر رہ کر بروئے کار لایا جائے گا۔

(۳)۔ خصوصی اجتہاد جو اس قانون سے تعلق رکھتا ہے جس کا اطلاق اس خاص مسئلے پر ہونا ہے جس کو بانیان نے طے نہیں کیا تھا۔

سادہ لفظوں میں اجتہاد دو قسموں کا ہے، جزوی اور کلی۔ اول الذکر اجتہاد یہ ہے کہ کسی چھوٹے حکم پر شریعت کے بنیادی اصولِ شریعہ کا اطلاق کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرنا۔ جزوی اجتہاد کی ایک مثال غزوہ خندق میں پیش آئی۔ جنگ خندق سے فارغ ہو کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ کو حکم دیا کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں جائیں اور وہاں جا کر عصر کی نماز پڑھیں۔ وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم راستے میں نماز نہیں پڑھیں گے بلکہ منزل پر پہنچ کر پڑھیں گے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھیں۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے۔ راستے میں نماز پڑھ لی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم دیا تھا اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ جلد از جلد منزل پر پہنچا جائے۔ تاخیر نہ کی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں گروہوں کی رائے کو منظور فرمایا۔ (صحیح بخاری، ج: ۲، رقم الحدیث: ۱۳۴۲) اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں گروہوں کی تعبیر کو درست قرار دے دیا۔

کلی اجتہاد سے مراد ہے کہ کسی صورت حال میں عام فکر سے اوپر اٹھ کر دین کے وسیع تر مفاد میں رائے قائم کی جائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں صلح حدیبیہ اس کی عمدہ مثال ہے (نبی علیہ السلام وحی کی روشنی میں کام کرتے ہیں۔ نبی کا عمل سنت کہلاتا ہے جو اجتہاد کا ماخذ ہے۔ اس لیے یہاں سیرت پاک کی مثالوں کو وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہیے)۔ یہ معاہدہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یک طرفہ شرائط پر کیا۔ عمرہ چھوڑ دیا۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا لفظ مٹا دیا۔ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ جیسے زخمی مظلوم کو واپس بھیج دیا۔ سب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ناخوش تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گلہ کیا کہ ایسی شرائط پر تو معاہدے ہم نے دور جاہلیت اور کمزوری کے وقت بھی نہیں کیے تھے۔ اب تو ہمارے پاس ہدایت اور قوت ہے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وقتی مصلحتوں اور پریشانیوں سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر حال کی بجائے مستقبل کو دیکھ رہی تھی۔ نتیجہ دیکھ لیں۔ قرآن مجید نے اس کو فتح مبین کہا ہے۔ (سورۃ الفتح، آیت:۱) تاریخ نے ثابت کر دیا کہ بظاہر دب کر کی جانے والی صلح اصل میں اسلام کے لیے مفید ثابت ہوئی اور غلبہ اسلام کا سبب بنی۔

اسی طرح جب حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کفار مکہ کے ظلم سے تنگ آ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تو قریش کے کچھ لڑکوں نے ان کا راستہ روکا اور دینار چھین لیے۔ اب حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے سامنے یقیناً یہ حدیث ہوگی کہ جو شخص اپنی جائیداد کو بچاتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے۔ (صحیح بخاری، ج:۱، رقم الحدیث: ۲۳۸۰) ان کے سامنے شہادت کے فضائل بھی ہوں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ باہمت انسان بھی تھے۔ لیکن انہوں نے قریش کے ان لڑکوں سے لڑنا پسند نہ کیا۔ شہادت کو چھوڑ دیا بلکہ اسلام کے وسیع تر مفاد میں اپنے دینار لڑکوں کے حوالے کر دیئے۔ (کنز العمال، ج:۱، رقم الحدیث:۴۲۷۱) اپنی جان بچا کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ یہ کلی اجتہاد کی ایک شکل تھی۔ مندرجہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہوا کہ اجتہاد کلی ہو یا جزوی کسی بھی دینی حکم یا ہدایت کے حوالے سے ہی ہوتا ہے۔

ہمیں عہد حاضر میں ایک عمومی اور کلی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ جس کے نتیجے میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے۔ حضرت اقبالؒ نے 1929ء میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید (The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam) میں اس عظیم

کام کو شروع کیا۔ عہد حاضر شدید تقاضا کرتا ہے کہ اس تشکیل جدید کے عمل کو جلد از جلد آ گے بڑھایا جائے۔ تشکیل جدید کلی اجتہاد سے ہوتی ہے۔ جس کے لیے ہمارے علما تیار نہیں ہیں۔ اس لیے تشکیل جدید کا عمل نہیں ہو سکا حالانکہ اجتہاد اسلام میں مطلوب اور لازم ہے۔ اجتہاد اتنا مطلوب ہے کہ اجتہادی غلطی پر بھی ثواب ملتا ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی فیصلہ کرے اور وہ اجتہاد کرے اور اس کا فیصلہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔ اگر وہ فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے پھر وہ غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔ (صحیح بخاری، ج: ۳، رقم الحدیث: ۲۲۵۲)

علماء نے لکھا ہے کہ پہلے شخص کے لیے جو دو اجر، کوشش اور درستگی کے لیے ہیں جبکہ دوسرے شخص کو صرف کوشش کا اجر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد اتنا پسندیدہ عمل ہے کہ اس میں غلطی کرنے پر بھی ثواب ہے۔ بشرطیکہ انسان کی نیت درست ہو۔ اس سے اصول طے ہو گیا کہ اجتہاد ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔ چاہے غلطیاں بھی ہوتی رہیں۔ اب ہم نے اجتہاد ختم کر دیا ہے کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ یہ اسلام کی تعلیم اور وقت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ اس لیے ہم پر جمود (inertia) طاری ہے۔ اگر ہم نے اپنا یہ رویہ ترک نہ کیا تو ذلت و رسوائی ہمارا مقدر ہو گی۔

اجتہاد ایک فریضہ اور ایک حساس مسئلہ ہے۔ ہر مومن اجتہاد کی مطلوب شرائط پر پورا نہیں اتر سکتا۔ اجتہاد کرنے کے لیے ایک شخص میں متعدد بنیادی شرائط پائی جانی چاہئیں۔ ان میں سے بعض شرائط کا قدیم کتابوں میں ذکر پایا جاتا ہے:

(i)۔ عربی زبان کا عالم ہونا۔

(ii)۔ قرآن کا عالم ہونا۔

(iii)۔ حدیث کا عالم ہونا۔

(iv)۔ اصول تفسیر، اصول حدیث اور اصول فقہ سے واقف ہونا۔

(v)۔ عظیم فقہا کی آراء سے واقف ہونا۔

(vi)۔ دین کی روح سے واقف ہونا، شریعت کے مقاصد سے واقف ہونا۔

(vii)۔ مروجہ قوانین اور رسوم ورواج سے واقف ہونا۔

(viii)۔ احکام دین پر عمل کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہم اپنے گردوپیش میں موجود اہل علم کو اس پیمانے سے جانچیں تو پتہ چلے گا کہ متعدد علما وفضلا ان شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ پھر اجتہاد کے دروازے نہیں کھلتے اور ہم تعطل کا شکار ہو رہے ہیں۔ حضرت اقبالؒ نے اس صورت حال پر کڑی تنقید کی ہے: اجتہاد کے دروازے بند ہونا محض ایک افسانوی بات ہے جو کسی حد تک اسلام میں قانونی فکر کے قلم پذیری/ جم جانے (crystallization) اور کسی حد تک ذہنی سہل انگاری کا شاخسانہ ہے۔ ایسا تصور خصوصاً روحانی زوال کے زمانے میں ابھرتا ہے جو عالی دماغ لوگوں کو بُت بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اگرچہ دورِ متأخر کے بعض علماء نے اس افسانے کی تائید کی ہے۔ تاہم جدید اسلام ذہنی آزادی سے رضا کارانہ دستبرداری کا پابند نہیں ہے۔ زرکشی نے جو آٹھویں صدی ہجری کا صاحبِ قلم تھا بجا طور پر کہا ہے: 'اگر اس تصور کے علمبرداروں کا مطلب یہ ہے کہ سابق دور کے فقہاء کے پاس زیادہ زیادہ سہولتیں تھیں اور دورِ متأخر کے صاحبانِ قلم کے لیے یہ راہ اختیار کرنے میں زیادہ مشکلات تھیں تو یہ احمقانہ بات ہے کیونکہ یہ دیکھنے کے لیے زیادہ سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں ہے کہ بعد کے فقہاء کے لیے اجتہاد، سابق دور کے فقہاء کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن وسنت کی تفاسیر اتنی تعداد میں مرتب ہوئیں اور آج اتنی بڑی تعداد میں دستیاب ہیں کہ آج کے مجتہد کے پاس تعبیر کے لیے اتنا مواد اکٹھا ہو چکا ہے جو اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔

(*Reconstruction of Religious Thoughts in Islam, p.75.*)

اس رویے (اجتہاد کے دروازے بند ہو جانے کا) کے بڑے اسباب میں سے، ایک سبب شخصیت پرستی ہے۔ مسلمان سابق ادوار کی شخصیات کے فیصلوں اور ان کی آرا سے انحراف نہیں چاہتے۔ وہ ذہنی اور علمی تنقید کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے اور نہ اس کی حمایت کر سکتے ہیں۔ تاہم اس قسم کا طرزِ عمل اسلام کے دور اول میں نہیں ملتا۔ ہماری فقہ کی ابتدائی تاریخ ایسی

عصبیت کی عکاسی نہیں کرتی حالانکہ اول اسلام ایسا نہ تھا۔اول فقہ میں ایسا نہ تھا۔حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں نے پچاسی فیصد (85%) معاملات میں اپنے استاد سے اختلاف کیا اور آج کل فقہ حنفی حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں کی آرا پر قائم ہے۔(خطبات بہاولپور،ص: ۹۲) شاید اس سے بھی زیادہ نمایاں بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس امر کی کافی مثالیں ہیں جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اختلاف کرکے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تبادلۂ خیال کیا اور اپنی آرا پیش کیں۔

ہمارے نزدیک تنقید یا اختلاف رائے ایک (taboo) کی حیثیت رکھتا ہے۔مجھے ولایت (England) میں حیرانی ہوئی کہ جب وہاں ہمیں مقدمات کی نظائر (precedents) پڑھا رہے ہوتے تھے تو عام جونیئر اساتذہ بھی برطانیہ کی اعلیٰ ترین عدالت (House of Lords) کے فیصلوں پر بہت بے رحمی سے تنقید کرتے تھے۔اس کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے تھے۔سچ تو یہ ہے کہ جدید نظام تعلیم میں جرح وتنقید کو بہت اہمیت حاصل ہے۔بڑوں کے نظریات پر تنقید بالکل عام ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں ناقدانہ فکر (critical thinking) پائی جاتی ہے۔جس کے سبب مغرب ہر لمحے ترقی کرتا رہتا ہے۔علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ
(ارمغان حجاز: ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

ہم نے اپنے بڑوں کے گرد تقدیس (holiness) کے ہالے بنالیے ہیں۔ذرا سے اختلاف کو بھی توہین اور لائق گردن زنی تصور کیا جاتا ہے حالانکہ اختلاف اور احترام دو مختلف چیزیں ہیں۔کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ صلح حدیبیہ اور جنگ حنین کے موقع پر اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اختلاف کیا تھا؟ خلافت راشدہ کے دور میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمد شیبانیؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے اکثر معاملات میں اختلاف کیا ہے۔آپ دیکھیں کہ احترام ومحبت بھی برقرار رہی اور اختلاف رائے بھی ہوا۔

اس لیے ہمیں یہ رٹ چھوڑ دینی چاہیے کہ فقہ کے پانچ مسلمہ مکاتب فکر (حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ،

حنابلہ اور اہل تشیع) کے علاوہ کوئی رائے نہیں ہوسکتی۔ دوسری رائے ہوسکتی ہے۔ قدیم وجدید علماؒ کی ایک کثیر اور قابل احترام جماعت اس کی حامی ہے۔ امام عبدالسلامؒ، علامہ بحرالعلوم حنفیؒ، امام محمد شوکانیؒ[1]، اشرف علی تھانویؒ[2] اور شیخ مصطفیٰ المراغیؒ[3] اس صف میں شامل ہیں۔ یہاں میں صرف ان چند ناموں کا تذکرہ کررہا ہوں۔

ہمارے ہاں کلی اجتہاد کی ایک بہت اچھی کوشش حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کی۔ شاہ صاحبؒ نے اسلام کی اجتماعی ہیئت اور عدل اجتماعی پر بہت زور دیا۔ جہادی تحریک (1831ء)، علما دیوبند، جامعہ ملیہ، ندوۃ العلماء، جماعت اسلامی، جمعیت العلماء ہند، علامہ شبلی نعمانی[4]، سرسید احمد خان، اور اقبال سب کسی نہ کسی درجہ میں شاہ صاحبؒ سے متاثر ہیں۔ لیکن میں انہیں اپنی تاریخ کے عظیم صاحبانِ ذہانت وفراست ماننے کے باوجود یہ کہنے کی جسارت کررہا ہوں کہ وہ نئے زمانوں کے تمام خطرات کا صحیح طور پر مکمل ادراک نہ کرسکے۔ دور حاضر کے نئے مسائل ان کے زمانے میں ہی سر اٹھا چکے تھے اور مغرب میں فطری سائنس اور معاشرتی علوم میں رونما ہونے والی نئی جہتوں میں ہونے والی پیشرفتوں سے لاتعلق رہے تھے۔

اس کے دور میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ (Renaissance) شروع ہوچکی تھی بلکہ صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) شروع ہورہا تھا۔ یورپی تاجر، مشنری، سیاح اور سائنسدان اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انگریزوں نے 1639ء میں مدراس اور 1661ء میں بمبئی پر قبضہ کرلیا تھا۔ ہندوستان کے اکثر ساحلی علاقے یورپ کی نئی سائنس وسماجی طاقت کے سبب انگریزوں کے قبضے میں آگئے تھے مگر یہاں کے جید علماء اس سے غافل رہے۔

ہمارے علما نے تفصیل کے ساتھ جہاد وقتال کے اصول ومسائل بیان کیے ہیں لیکن دعوت وتبلیغ

---

[1]۔ امام محمد شوکانیؒ (1759ء-1839ء) معروف یمنی اسلامی محقق، فقہ اور اصلاح پسند سکالر تھے۔

[2]۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (1863ء-1943ء) ہندوستان کے معروف حنفی سکالر تھے۔

[3]۔ شیخ محمد مصطفیٰ المراغیؒ (1881ء-1945ء) جامعۃ الازہر کے ریکٹر اور مصری اصلاح پسند مفکر تھے۔ آپ نے قرآن و حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد پر زور دیا۔

[4]۔ مولانا شبلی نعمانیؒ (1857ء-1914ء) برصغیر پاک وہند کے معروف اسلامی سکالر اور ندوہ العلماء کے بانی تھے۔ آپ کو جدید اسلامی تحقیقات کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔

پر زیادہ توجہ نہ دی۔ ان کی کتب دین کے اس اہم پہلو پر زیادہ تر خاموش ہیں۔ مسلمانوں میں حربی (militant) سوچ رہی ہے۔ جبکہ دین زیادہ تر دعوتی سوچ کا نتیجہ ہے اور اسی سے قائم ہے۔ اسی سے قائم رہے گا۔ سید احمد شہیدؒ[۱] کی تحریک سے لے کر اخوان المسلمین[۲] اور طالبان تک کی تاریخ گواہ ہے کہ ان تحریکوں کے پاک باز نوجوان بھی اپنی جوانیاں لٹا کر اسلام کو غلبہ نہ دے سکے۔ غالباً اسی لیے کہ اسلام میں تلوار سے زیادہ قلم کی اہمیت ہے۔ دین اقراء سے شروع ہوا ہے۔ سیف (تلوار) سے شروع نہیں ہوا۔ اس لیے نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

ہمارے عظیم عالم دین حضرت شاہ ولی اللہؒ سے بہت پہلے گیلیلیو اور نیوٹن نے سائنسی میدانوں میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس سائنسی ارتقا کا نوٹس نہیں لیا۔ ان کی شاہکار تصنیف حجتہ اللہ البالغہ پہلی بار 1870ء میں چھپی جبکہ یورپ پچھلے چار سو برسوں سے کتابوں کی طباعت و اشاعت کرتا چلا آ رہا تھا۔

میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی خدمات کا بہت مداح ہوں۔ انہوں نے پہلی بار قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور وحی الٰہی کا فہم عام کرنے کی شاہراہ کھول دی۔ ان کے مدرسہ رحیمیہ نے اسلامی علوم کی ترویج کے لیے بہت اہم کردار ادا کیا۔ میں یہاں ان پر تنقید نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کلی اجتہاد کی اشد ضرورت ہے۔ مسلم معاشرے کو شاہ ولی اللہؒ جیسے بہت سے اہل علم و دانش کی ضرورت ہے جو ہر زمانے میں اور بہت سے مقامات اور مختلف موضوعات پر دائماً اور مختلف موضوعات پر متغیر ہونے والے حالات میں اسلام کے سنہرے اصولوں کی از سر نو تعبیر و تشریح کا کام کرتے رہیں۔ بدقسمتی سے اسلامی دنیا میں یہ عمل بند چلا آ رہا ہے۔ شیخ ابن تیمیہؒ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی قابل ذکر نام نہیں ملتا۔ بعد ازاں موت کی سی ایک طویل خاموشی چھا گئی ہے۔

۱۔ سید احمد شہیدؒ (1786ء-1831ء) برصغیر پاک و ہند کے صوفی بزرگ، مجدد اور مرد مجاہد تھے۔ آپؒ کی کوششوں سے ہندوستان کو سکھوں اور انگریزوں سے آزاد کروانے کے لیے تحریک مجاہدین وجود میں آئی۔ بالآخر بالاکوٹ کے مقام پر مقامی لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے سکھ راجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں نے آپؒ کو شہید کر دیا۔

۲۔ اخوان المسلمین اسلامی تعلیمات کے احیاء کی جماعت ہے جو 1929ء میں مصر میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی شیخ حسن البنا تھے۔ اس جماعت کا منشا اسلام کے بنیادی عقائد کا احیا اور ان کا نفاذ تھا۔

اجتہاد سے مراد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی قیادت زندگی کے نئے پیش آنے والے مسائل میں انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلام کی روح اور اسلام کے قانون سے اتنی گہری واقفیت رکھتے ہوں کہ وہ امت کی مشکلات کو حل کر سکیں۔ وہ عقل اور علم رکھتے ہوں۔ محنت کے لیے تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وسیع کائنات میں جو قوتیں عطا کی ہیں۔ ان سے کام لے سکیں۔ ان کو اسلام کے مقاصد کے لیے مفید بنا سکیں۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص: ۱۶۳)

بدقسمتی سے آج ہماری صورت حال ان حالات کے بالکل برعکس ہے جو اسلام ہم سے توقع کرتا تھا کہ ہم پیدا کریں۔ ہماری زیادہ تر قیادت 'ایلیٹ کلاس' (elite) کے ہاتھ میں ہے جو علم اور ذہانت سے بالکل تہی دست ہے۔ نہ وہ دولتِ ایمان سے مالا مال ہے اور نہ اعلیٰ اخلاق سے مزّین ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ ہے تو وہ اقتدار اور دولت کی ہوس ہے۔ جب انتخابات کا وقت آتا ہے اور اپنے اقتدار کے دوام کے لیے ووٹ مانگنے آتے ہیں تو وہ اسلام پسند بن جاتے ہیں اور مذہب سے شغف ظاہر کرنے کے لیے جعلی طور طریقے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اسلام پسند عمومی طور پر بدعنوان حکمرانوں کی قوت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ پاکستان کا جنرل ضیاء الحق اور سوڈان کے جنرل عمر بشیر کی مثال لے لیجیے۔ اسلام پسند لوگوں نے اس مغالطے کا شکار ہو کر کہ یہ اسلام نافذ کریں گے، دونوں کو کامیاب بنا دیا۔

اس ذہنی بنجر پن کا نتیجہ بادشاہتوں کے سقوط کی صورت میں نکلا ہے مسلم ممالک بھی اسی کے شکار ہوئے، سید ابوالحسن ندویؒ ترکوں کی سلطنت کے زوال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا۔ جمود بھی دونوں طرح کا۔ علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ و عسکری تنظیم و ترقی میں بھی۔ قران مجید (سورۃ الانفال، آیت: ۶۰) کی آیت انہوں نے بالکل فراموش کر دی: مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لیے اپنا ساز و سامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ تعالیٰ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد (کنز العمال، ج: ۸، رقم الحدیث: ۴۲۸۵) ان کے حافظہ سے گویا محو ہو گیا تھا کہ دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں اس کو مل جائے وہی اس کا زیادہ حق

دار ہے۔ایسی حالت میں کہ وہ یورپ کی حریف سلطنتوں اور قوموں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ان کو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وہ وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے تھی جو انہوں نے مصر کے مسلمانوں کو کی تھی کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو۔ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہوئے ہو۔اس کہ تم ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہیے۔کیونکہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں۔

علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی۔واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا۔دماغ تھکے تھکے سے اور طبعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں۔اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی ہجری سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتدا نہ کریں تو اس میں شک نہیں کہ نویں صدی ہجری وہ آخری صدی تھی جب جدت فکر،قوت اجتہاد اور ادب وشاعری،حکمت وفن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں۔پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھیے۔سینکڑوں ناموں میں ایک ایسا شخص ملنا مشکل ہوگا جس پر عبقری (genius) کے لقب کا اطلاق درست ہو یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو۔پچھلی صدیوں میں ہم صرف چند افراد کا استثنا کر سکتے ہیں جو اپنے زمانہ کی عام علمی وذہنی سطح سے بہت بلند تھے۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر،ص:۱۸۹)

یہ طویل اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ المناک صورت آج بھی ویسی ہی ہے جو سلطنت عثمانیہ کے بارے میں تھی۔آج بھی وہی جمود ہے۔وہی بے خبری ہے۔آج بھی وہی خطرات ہیں۔آج بھی وہی تھکاوٹ واضمحلال ہے۔آج بھی کوئی باہمت مرد نہیں ہے۔ہم نے پانچ سو سال میں کوئی بھی عبقری پیدا نہیں کیا۔آپ یورپ کی فہرست دیکھیں۔سائنس میں آپ کو کاپرنیکس، برونو، کیپلر، گیلیلیو، نیوٹن، ڈارون اور آئن سٹائن[۱] ملتے ہیں۔فلسفہ میں بیکن، ہیوم، والٹیر[۲]،

---

[۱]۔Albert Einstein:البرٹ آئن سٹائن (1879ء-1955ء)،بیسویں صدی کا سب سے بڑا طبیعیات دان سمجھا جاتا ہے۔

[۲]۔Voltaire:والٹیر (1694ء-1778ء)ایک روشن خیال فرانسیسی فلسفی تھا۔وہ ایک شاعر،ناول نگار،ڈرامہ نویس اور تاریخ دان بھی تھا۔انسانی حقوق کے شعور اور انقلاب فرانس کے لیے اس کا کردار بہت اہم ہے۔

کانٹ، ہیگل[۱]، شوپنہار[۲]، نطشے اور برگساں[۳] ملتے ہیں۔ معاشیات میں آدم سمتھ، ریکارڈو، مالتھس، مارکس اور کینز ملتے ہیں۔ ادب میں شیکسپیئر، ملٹن[۴]، کیٹس، شیلے، ورڈز ورتھ، وکٹر ہیوگو[۵] اور ٹالسٹائی[۶] ملتے ہیں۔ نفسیات میں ولیم جیمز، ایڈلر[۷]، فرائڈ اور یونگ ملتے ہیں۔

یہ فہرست بہت طویل ہے۔ لندن میں آپ کسی محلے میں چلے جائیں تو آپ کو گلی میں ایک نیلے رنگ کی تختی ملے گی۔ جس پر لکھا ہوگا کہ وہ سائنسدان اس گھر میں فلاں سال سے فلاں سال تک رہا۔ اس گھر کو اس طرح محفوظ کیا گیا ہوگا کہ جیسے وہ سائنسدان ابھی چند لمحے کے لیے کہیں باہر گیا ہے۔ اس کا سارا سامان وہاں موجود ہے۔ ہم نے دین کی احیا کے نام پر کئی ممالک میں اپنے اکابرین کے سارے نشانات مٹا دیئے ہیں۔ صدیوں کا خزانہ چند دنوں میں برباد کر دیا۔ اس سے بڑی بدتہذیبی اور علم دشمنی کیا ہوسکتی ہے۔ یہ تاریخ سے کیسا انکار اور کیسی تہذیبی کورچشمی ہے!

میں نے مندرجہ بالا سطور میں یہ استدلال پیش کیا ہے کہ اسلام کلی اجتہاد کا متقاضی ہے۔ اسلامی فکر کو مکمل تشکیل نو کی ضرورت ہے کیونکہ پچھلے پانچ سو برسوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں آچکی ہیں تاہم میں اب متعدد مسائل کی نشاندہی کر رہا ہوں جو فوری طور پر اجتہاد

۱۔ Friedrich Hegel: ہیگل (1770ء- 1831ء) ایک مشہور جرمن فلسفی تھا۔ جس نے تاریخ، سیاسیات، مذہب، آرٹس، منطق اور مابعدازطبیعیات پر کتب تحریری کیں۔

۲۔ Arthur Schopenhauer: شوپن ہاور (1788ء- 1860ء) ایک قنوطی جرمن فلسفی تھا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں کی وجہ سے یورپ میں آئی افراتفری اس کے نظریات میں نظر آتی ہے۔

۳۔ Henri Louis Bergson: ہنری برگساں (1859ء- 1941ء) فرانسیسی فلسفی اور مشہور حکیم تھا۔ اسے 1927ء میں ادبیات کا نوبل انعام دے گیا۔ برگساں ثنویت کا قائل تھا۔ یعنی عالم میں دو مستقل جوہر، زندگی اور مادہ ہیں جو آپس میں برسرپیکار رہتے ہیں۔

۴۔ John Milton: جان ملٹن (1608ء-1674ء) ایک معروف انگریزی شاعر تھا۔

۵۔ Victor Marie Hugo: وکٹر ہیوگو (1802ء-1885ء) فرانسیسی شاعر، ناول نگار اور ڈراما نویس تھا۔

۶۔ Count Lev Nikolayevich Tolstoy: ٹالسٹائی (1828ء-1910ء) روسی ناول نویس اور فلسفی تھا۔

۷۔ Alfred Adler: آلفرڈ ایڈلر (1870ء- 1937ء) آسٹریا کا مشہور ماہر علاج امراض نفسی تھا۔ اس نے انفرادی نفسیات کے مکتب کی بنیاد رکھی۔

کے لیے صدا بلند کر رہے ہیں اور درخواست کرتا ہوں کہ ہم میں جو بہترین دماغ ہیں وہ ان کے حل کے لیے کوششیں شروع کریں۔

ا۔ مسلم اقلیتیں

مسلم آبادیاں یا مسلمان افراد جن علاقوں میں بطور اقلیت رہ رہے ہیں ان کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ کیا ان پر لازم آتا ہے کہ وہ جن ممالک میں رہ رہے ہیں وہاں کے قوانین کی پابندی کریں؟ بالخصوص ایسی صورت میں کہ ان ممالک کے قوانین بعض اسلامی اصولوں سے مختلف ہیں؟ ہماری فقہ کی کتابوں میں ان مسائل کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ یہ کتابیں اس زمانے میں لکھی گئیں جب مسلمان اکثریت میں تھے۔ یہ کتابیں اس مفروضے کی روشنی میں لکھی گئیں کہ مسلمان اکثریتی آبادی ہیں اور ان کی اپنی حکومتیں ہیں چنانچہ مسلمانوں کے بطور اقلیت مسائل پر کوئی بحث نہیں کی گئی لہٰذا مسلمانوں کی پرورش اس خام خیالی کی دنیا میں ہوئی جس نے انہیں اکثریتی ذہنیت کا شکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ان کی فہم اور فیصلہ سازی کی صلاحیتوں پر وہی ذہنیت سایہ فگن رہتی ہے۔

اس ذہنیت نے مسلم امت کو بہت نقصان پہنچایا ہے کیونکہ اس نے بطور مسلم اقلیت، اکثریتی ذہنیت اختیار کر لی ہے۔ اس سے متعدد مسائل نے جنم لے لیا ہے۔ خاص طور پر وہ یورپ اور امریکہ میں رہتے ہوئے مشکلات سے دوچار ہوئے۔ ان کے اس رویئے اور اس سے جنم لینے والے افعال کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں وہاں ایک منفی تصور پیدا ہو چکا ہے۔ حزب التحریر[ا] کے سابق سربراہ عمر باقری نے ایک برطانوی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ یہ امر اس کے ایمان کا جزو ہے کہ وہ برطانوی وزیر اعظم کے مکان اور دفتر '10 ڈاوننگ سٹریٹ' (10 Downing Street) میں اسلام کا پرچم لہرا دے۔ کیا اسلام کے اندر ایسی چپقلش پیدا کر دینا مناسب رویہ ہے؟ جبکہ برطانیہ میں رہنے والے مسلمان وہاں تمام شہریوں کو حاصل تحفظ سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

یہ غیر ذمہ دارانہ طرز عمل برطانیہ اور دیگر ممالک میں بطور اقلیت مقیم مسلمانوں کے لیے سنگین

ا۔ حزب التحریر ایک اسلامی خلافت کی احیاء کی تحریک ہے جس کی بنیاد تقی الدین النبہانی نے 1953ء میں رکھی۔

مسائل پیدا کر رہا ہے۔ یہ رویہ اسلام تو نہیں ہے اور یقیناً اسلام نہیں ہے تو کیا ہمیں ایسی ہرزہ سرائی ترک نہیں کر دینی چاہیے؟ یقیناً کرنی چاہیے۔

۲۔ اقلیتوں کے حقوق

مسلم معاشروں یا ملکوں میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتوں کے کیا حقوق ہیں؟ ہماری فقہ کی کتابیں، اقلیتوں کے مسائل کو ابھی تک نئی فتوحات کے تناظر میں دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اقلیتیں ذمی ہیں۔ اور یہ کہ یہ اقلیتیں اس وقت مسلمانوں کے لباس سے الگ قسم کا لباس پہنیں گیں اور 'جزیہ' (جنگی ٹیکس) ادا کریں گیں۔ اس مسئلے پر از سر نو غور ہونا چاہیے۔ کیا پاکستان ایران اور انڈونیشیا میں رہنے والی اقلیتوں پر اسی اصول کا اطلاق ہوگا۔ یہ سب مسلمہ طور پر مسلمان اکثریت کی ریاستیں ہیں۔ ان کے ہاں تحریری دساتیر ہیں جن میں تمام شہریوں کو بلا امتیاز عقیدہ یا مذہب بنیادی حقوق حاصل ہیں اور ان کی دستوری ضمانت دی گئی ہے۔

سیاسی فلسفہ، دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے ضمن میں بے پناہ پیشرفت کی ہے۔ جس کی جدید مسلم ممالک کے دساتیر میں بھرپور عکاسی ہوتی ہے تاہم ہمارا اجتماعی روایتی مذہبی ذہن ان پیشرفتوں کی تائید نہیں کرتا۔ ہماری فقہ پر گزشتہ چودہ سو سال اور بالخصوص جنگ عظیم اول سے لے کر اب تک اقلیتوں کے حقوق کے سلسلے میں ہونے والی پیشرفتوں کی روشنی میں نظر ثانی ہونی چاہیے۔ جب ہم اپنے ملکوں میں اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی کریں گے تو قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر ہمارے بارے میں غلط تاثر قائم ہوگا جبکہ یہ دلائل بھی لائے جا رہے ہیں کہ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی روا رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ امہ کا مزاج ہی اس طرح ڈھل چکا ہے۔ ہمیں اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا اور اپنے مزاج میں اصلاح لانی ہوگی تاکہ ہماری شبیہہ مزید مسخ نہ ہو سکے۔

۳۔ خواتین کے حقوق

آرا اور قوانین ایک خاص معاشرتی ماحول میں تشکیل پاتے ہیں۔ اسی طرح مسلم قوانین، آرا اور خواتین سے متعلقہ قواعد مختلف اوقات کے سیاق وسباق میں ایک خاص سیاسی اور معاشرتی تناظر میں متشکل ہوئے۔ گزشتہ ایک ہزار برسوں میں قومی اور بین الاقوامی قوانین میں

بے پناہ پیشرفتیں ہوئیں لیکن مذہبی تعبیرات ان سے موافق نہیں ہوسکیں۔جس کے نتیجے میں یہ تصور ابھر آیا ہے کہ اسلام میں عورتیں مردوں کے مساوی نہیں اور یہ کہ انہیں برابر حقوق حاصل نہیں ہیں۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔

اسلام انسانی وقار اور مساوات کا مذہب ہے۔ہمیں خواتین سے متعلقہ قوانین کا نئے سرے سے جائزہ لینا چاہیے بالخصوص دوسری شادی کے قوانین، قانون شہادت، حدود کے قوانین ور دیگر قوانین وضوابط کو زیر غور لایا جانا چاہیے۔ہمیں اس امر کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ کیا خواتین کا ثقافتی اور مذہبی سرگرمیوں سے اخراج قابل توجیہہ ہے یا یہ خالصتاً پدرسرانہ معاشرت پر مبنی ہے؟

۴۔ مالیاتی امور

معاشی معاملات میں بھی ہم قرون اول میں پھنسے ہوئے ہیں۔ معاشی معاملات نے پچھلے چار سو سال میں اپنی شکل بالکل بدل لی ہے۔ معاش نے نہ صرف مقامی سطح پر اپنی شکل بدل لی ہے بلکہ اس نے اب بہت حد تک بین الاقوامی جہت اختیار کر لی ہے۔ معاشی نظام میں مسئلہ سود (interest) کو بہت اہمیت حامل ہے۔ یہ عہد حاضر کا لازمہ بن گیا ہے۔ہم اس کو حرام تو کہتے ہیں لیکن اس کے متبادلات (alternatives) پر توجہ نہیں کرتے یا پھر صرف حیلہ و بہانہ کر کے سود کو ہی حلال مان لیتے ہیں۔

یہ معاملہ بہت سنجیدہ سوچ کا تقاضا کرتا ہے کہ سود سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مطلقاً (absolutely) حرام ہے یا اس کی کچھ قسمیں حرام ہیں؟ بین الاقوامی تجارت میں اس کا کیا کردار ہے؟ اگر سود بالکل حرام ہے تو جدید بینکاری کے نظام کو کیسے چلایا جائے؟ مضاربہ[۱] کو کیسے چلایا جائے؟ انشورنس و دیگر فنڈز کے مسائل کیسے حل کیے جائیں؟ لوگوں سے بچتیں کیسے وصول کی جائیں؟ ان کی حفاظت اور استعمال کیسے ہو؟ روپے کی قدر میں کمی (depreciation) سے لوگوں کو نقصان سے کیسے بچایا جائے۔ غیر مسلموں سے لین دین کیسے ہو۔ ان معاملات پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کی ضرورت ہے۔ معاشیات پر جدید اسلامی لٹریچر نہ صرف قلیل ہے بلکہ

۱۔ مضاربہ تجارت کی ایک قسم ہے جس میں ایک شخص اپنا مال کسی دوسرے شخص کو اس شرط پر تجارت کی غرض سے دیتا ہے کہ نفع میں باہمی معاہدہ کے مطابق دونوں شریک ہوں گے اور نقصان مال والا برداشت کرے گا۔

جہاں کہیں موجود ہے یہ سطحی دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں سنجیدہ اسلامی مفکرین کی ضرورت ہے جو آدم سمتھ اور کارل مارکس جیسے یا ان سے بڑے پائے کے ہوں تا کہ وہ اسلامی اقتصادی سوچ کی غیر منطقی قدامت کو چیلنج کر سکیں۔

۵۔ فقہ

فقہ اور قانون مسلمانوں کے علوم کے خصوصی شعبے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں فقہ کی غیر معمولی تدوین و تبویب اس کا واضح ثبوت ہے۔ قانون ایک عملِ جاریہ ہے جو معاشرتی ارتقا کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا اور فروغ پاتا رہتا ہے۔ زندگی جتنی زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، قانون اتنا ہی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ہم ابھی تک اسی قانونی ساخت کے اندر کام کر رہے ہیں جو ایک ہزار سال پہلے موجود تھی اور جو آج کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہے۔ علم کی نئی شاخیں جدید دور میں وجود میں آئیں۔ زندگی کے بعض شعبوں میں بے پناہ وسعت و ترقی ہوتی رہی اور ہم اسے نظر انداز کرتے رہے۔ بینکنگ، انشورنس اور مواصلات (کمیونیکیشنز) ان میں سے چند شعبے ہیں جن کا یہاں حوالہ دے رہا ہوں۔ ہمیں ان پیچیدہ مسائل کے لیے اسلامی نقطہ نظر سے کوئی رہنمائی نہیں ملی بلکہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم ان مسائل کو مسائل کے طور پر قبول نہیں کرتے۔

ہماری فقہ میں فوجداری قانون زیادہ تر ایک ذاتی مسئلہ رہا ہے۔ جدید فقہ کا اس سیاق وسباق میں بالکل مختلف طریق کار ہے۔ اس فقہ میں دیوانی معاملات، شخصی معاملات ہوتے ہیں جبکہ فوجداری امور فرد اور ریاست کے مابین ہوتے ہیں۔ ایک مثال لیجیے ایک صورت میں اکبر، اسلم کو قتل کر دیتا ہے۔ جب اکبر پر مقدمہ چلتا ہے اور اس کی کارروائی عدالتِ قانون میں شروع ہو جاتی ہے تو اس کا حوالہ بطور 'ریاست بنام اکبر' دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اکبر نے سارے معاشرے کے خلاف ایک جرم کیا ہے اور ریاست معاشرے کی طرف سے کارروائی کر رہی ہے۔ وہ مسئلے کی تفتیش کر کے اکبر کے لیے سزا تجویز کرتی ہے اور معاشرے اور اسلم کے لیے بھی کام کرتی ہے۔

جب اسلام قتل کو ایک شخصی مسئلہ سمجھتا ہے تو یہ سزا کا حق 'ولی' (قانونی وارث یا سرپرست) کو دیتا ہے کہ وہ مجرم کو خواہ معاف کر دے یا دیت وصول کر لے۔ بعض صورتوں میں قاتل قانونی

وارث ہوسکتا ہے اور کیا وہ خود کو معاف بھی کر سکتا ہے؟ یہ ایک احمقانہ بات ہے۔عصرِ حاضر کے بعض مذہبی سکالرز نے اس مسئلے پر غور کیا ہے اور کچھ پیشرفت بھی کی ہے۔ان کا استدلال یہ ہے کہ اس نوعیت کے بعض جرائم فساد فی الارض کی ذیل میں لائے جا سکتے ہیں جن میں ریاست قانون شکنی کی فریق بن جاتی ہے اور عدالتوں کو معافی کو مسترد کرنے کا حق حاصل ہے، باوجود اس امر کے کہ قانونی وارثوں نے جرم معاف کر دیا ہو، بلا معاوضہ یا با معاوضہ۔

جب مسلم فقہ کی تدوین کی جا رہی تھی تو دیوانی اور فوجداری کے درمیان قانون کی واضح تقسیم نہیں تھی۔آج قانون کی یہ تقسیم دنیا بھر کے تمام مسلمہ قانونی نظاموں نے تسلیم اور قبول کر رکھی ہے۔ چنانچہ لازم آتا ہے کہ ہم فقہ کے ان مسائل کا سنجیدگی سے جائزہ لیں۔ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کیا اس نوعیت کے جرائم کو 'فساد فی الارض' کے موضوع کے تحت لایا جا سکتا ہے؟ یہ امتیاز بہت پُر معنی ہے۔ فقہ کے اس اصول کو قبول کرنے کے بعد ہمیں بہت سے قوانین تبدیل کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اسلام نے 'معروف' (جو قبول کیا گیا ہو اور یا مروّج ہو) پر بہت زور دیا ہے۔قرآن مجید اس معاملے میں بہت واضح ہے۔قدیم فقہاء کرامؒ میں سے ایک فقیہی حضرت امام ابوحنیفہؒ نے اسے اسلامی قوانین کی تعبیر اور اطلاق کے لیے ایک بنیاد بنایا ہے۔عصرِ حاضر کی عالمی قبولیت اور اطلاق اور قرون اولیٰ کے اسلامی نظائر کے مطابق مسلمانوں کو 'معروف' کے اس پہلو کو جدید قوانین اور فقہ کے فروغ کے لیے زیر غور رکھنا چاہیے۔

۶۔ دنیوی تعلیم

کیا دینی اور دنیوی تعلیم دو الگ الگ قسم کی تعلیم ہیں؟ کیا وہ دو الگ الگ قسموں کی تعلیم تخلیق کرتی ہیں؟ کیا یہ ایک امتزاج ہے جو محتاط توجہ کا متقاضی ہے؟ کیا سائنس کی تعلیم کا حصول اتنا ہی اہم ہے جتنا فقہ کی تعلیم کا؟ کیا مسلمان سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لائق نہیں؟

مسلمان مذہبی تعلیم کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کا حصول آخرت کی منزل آسان بنائے گا۔ جبکہ دنیوی تعلیم دنیاوی ہے بلکہ بعض کہتے ہیں کہ یہ گناہ ہے۔لیکن اگر مسلمان دنیوی تعلیم کو گناہ نہ بھی سمجھیں تو اس کو کم اہمیت دیتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی

طبقہ جدید تعلیم کے دائرے سے خارج ہو گیا ہے۔ مزید برآں ہمارے دینی مزاج کے حامل نوجوانوں نے جدید تعلیم کے بارے میں منفی رویہ اختیار کر رکھا ہے جو انہیں جدید زندگی میں نمایاں ترقی کرنے سے منع کرتا ہے۔

یہ مسلمانوں کے لیے انتہائی اہم سوال ہے۔ یہ ان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے اور اجتہاد کا مطالبہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کو اس اجتہاد کی روشنی میں نصاب تعلیم اور طریق تدریس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

میں نے جدید امتِ مسلمہ کو درپیش صرف چند ایک سوالات کا ذکر کیا ہے جو بطور اصول اور بطور مثال سامنے لائے گئے ہیں۔ ابھی بہت کچھ جستجو طلب پڑا ہوا ہے جو ہمیں بطور امت آگے بڑھ کر ترقی یافتہ دنیا کے دوش بدوش چلنے سے روکتا ہے۔ یہ ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے اور ہمیں اس چیلنج کو قبول کرنا ہوگا۔ تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کو یہ ذمہ داری اٹھا لینی چاہیے۔ اسے پہلے موضوعات تلاش کرنے چاہئیں۔ پھر ہر موضوع کے بارے میں ایک تفصیلی سوالنامہ مرتب کر کے مسلم دنیا کے اہل علم و دانش (سکالرز) کے پاس بھیجنا چاہیے۔ جب ان کی آراء وصول ہو جائیں تو ان کی نقول پوری مسلم دنیا کے دیگر اصحاب فکر و دانش کے پاس تبصرے کے لیے بھیجنی چاہئیں۔ اس سے بہت نتیجہ خیز آراء سامنے آ جائیں گی۔ بعد ازاں بین الاقوامی کانفرنس بلائی جائے جس میں علماء اور سکالرز آپس میں تبادلہ خیال کریں اور مختلف موضوعات پر اتفاق رائے حاصل کرنے کے بعد عملی اقدامات وضع کئے جائیں۔ رابطہ عالمِ اسلامی، موتمر عالم اسلامی اور مسلمانوں کی دیگر باوقار و پرعزم تنظیموں کو بھی یہ مسئلہ اٹھانا چاہیے تا کہ امت مسلمہ مطلوبہ مقاصد و نصب العین حاصل کر سکے۔

حوالہ جات

۱۔ ارمغان حجاز، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: اقبال اکڈمی پاکستان، ۲۰۰۲ء۔

۲۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ لکھنو: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۷۹ء۔

۳۔ خطبات بہاولپور، ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ اسلام آباد: اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، ۲۰۰۷ء۔

۴۔ سنن ابو داؤد، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعت سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دارالدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

۵۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۶۔ کنزل العمال، امام علاء الدین علی متقی ابن حسام الدینؒ ترجمہ مولانا احسان اللہ شائق۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۷۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ، حضرت امام ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ شاطبیؒ ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی۔ لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، ۱۹۹۳ء۔

۸۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam by Dr. Muhammad Iqbal. London: Oxford University Press, 1934.

حصہ سوئم

ازخواب گراں خیز



۲۵

اقبالؒ کی نظم



از خواب گراں خیز

اٹھو! خوابِ غفلت سے

اے غنچہ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز[1]
کاشانہ مارفت بتاراج غماں خیز
(اے سوئے ہوئے نوخیز پھول، نرگس کی طرح آنکھیں کھولتے ہوئے اٹھ)
(کیونکہ ہمارا گھر غموں (بے عملی) نے تباہ کر دیا ہے)

از نالہ مرغ چمن، از بانگ اذاں خیز
از گرمی ہنگامہ آتش نفساں خیز
(چاہے چمن کے پرندے کی فریاد سے یا اذان کی آواز سے جاگ)
(چاہے آگ جیسی گرم سانسیں رکھنے والوں کی گرمی کے شور سے جاگ)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست
آویزہ بگوش سحر از خون جگر بست
(سورج نے طلوع ہو کر اپنے ماتھے کو صبح کے زیور سے سجا لیا ہے)
(اس نے صبح کے کانوں میں اپنے خون جگر کا بُندہ لٹکا دیا ہے)

از دشت و جبل قافلہ ہارخت سفر بست
اے چشم جہاں بیں بہ تماشائے جہاں خیز
(بیابان اور پہاڑوں سے کاروانوں نے سامان سفر باندھ لیا ہے)
(دنیا کو دیکھنے والی اے آنکھ تو دنیا کے تماشے کے لیے اٹھ)

---

[1] اقبالؒ کی یہ نظم مسلمانوں کے حالت زار کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

خاور ہمہ مانند غبار سر راہے است
یک نالہ خاموش و اثر باختہ آہے است
((اہل مشرق) سب کے سب راہ کے غبار کی مانند ہیں)
(وہ ایک خاموش فریاد اور بے اثر آہ کی مانند ہیں)

ہر ذرہ ایں خاک گرہ خوردہ نگاہے است
از ہند و سمر قند و عراق و ہمداں خیز
(اہل مشرق کی مٹی کا ہر ذرہ ایسی آنکھ کی مانند ہے جس پر گرہ باندھ دی گئی ہو)
(اہل مشرق ہندوستان، سمرقند، عراق اور ہمدان جہاں بھی ہیں اٹھ کھڑے ہوں)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

دریائے تو دریا ست کہ آسودہ چو صحرا است
دریائے تو دریا ست کہ افزوں نشد و کاست
(تیری زندگی کے دریا میں صحراؤں کی سی خاموشی اور سکون پایا جاتا ہے)
(تیرے دریا کے پانیوں میں اضافہ تو نہیں ہوا، کمی ضرور ہوئی ہے)

بیگانہ آشوب و نہنگ است چہ دریا ست
از سینہ چاکش صفت موج رواں خیز
(تیرا دریا، طوفان، تلاطم اور خطرناک مگرمچھوں سے بے خبر ہے)
(اس کے باوجود اس دریا کے پھٹے ہوئے سینے میں بہتی ہوئی لہر کی مانند اٹھ)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز

(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

این نکتہ کشائندہ اسرار نہان است
ملک است تن خاکی و دیں روح روان است
(یہ باریک بات پوشیدہ رازوں کو کھولنے والی ہے)
(کہ اگر ملک مٹی کا جسم ہے تو دین اس کی روح رواں ہے)

تن زندہ و جاں زندہ زربط تن و جان است
با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز
(جسم اگر زندہ ہے اور روح بھی زندہ ہے تو پھر جسم اور روح میں تعلق قائم رہتا ہے۔ جسم کے بغیر روح اور روح کے بغیر جسم بے کار ہے)
(ملک اور دین کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اس لیے دین کے نفاذ کے لیے خرقہ، سجادہ اور شمشیر و سنان کے ساتھ کوشش کرنا ہو گی۔ دینی و روحانی ترقی کے لیے جہاں سادگی و فقر درکار ہیں وہاں کبھی کبھی تلوار کی بھی ضرورت ہوتی ہے)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

ناموس ازل را تو امینی تو امینی!
دار اے جہاں را تو لیساری تو یمینی
(تو قانون فطرت کا امانت دار ہے۔ تیرے پاس اللہ تعالیٰ کیامانت (قران مجید) موجود ہے)
(تو اس قانون فطرت کا دایاں بازو ہے)

اے بندہ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز
(تو اپنے اس امانت داری کے منصب کو بھول کر ایک خاکی جسم رہ گیا ہے

اور زمان و مکان کی قید میں پھنس گیا ہے)
(تو یقین کی شراب پی لے اور وہم کے مندر کو خیر باد
کہہ دے، زندگی کی حقیقت تیرے ہاتھ آ جائے گی)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

فریاد زا فرنگ و دل آویزی افرنگ
فریاد ز شرینی و پرویزی افرنگ
(یورپ سے اور اس کی دل لبانے والی رنگین فضاؤں سے خدا بچائے)
(یورپ کے شیریں کے حسن اور پرویز کی طرح کی
مکارانہ چالوں سے بھی خدا محفوظ رکھے)

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز
(سارا جہاں فرنگیوں کی وجہ سے ویرانہ بن چکا ہے۔ یورپ نے
قلب و روح کی دنیا کو ویران کر دیا ہے۔ ان کی
تباہی و بربادی چنگیز خان کی بربریت سے کہیں بڑھ کر ہے)
(اے مسلمان تو معمار حرم ہے اس لیے اب تیرے عمل کا وقت ہے۔
اس جہاں خراب کی از سر نو تعمیر کے لیے آگے بڑھ کیونکہ
تیرے سوا جسم و روح کی تعمیر کوئی نہیں کر سکتا)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)
(زبور عجم)

حوالہ جات

۱۔ زبورِ عجم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء۔

۲۶

درد دل



مسلمان ایک عظیم امت ہیں جن کی بنیاد توحید، رسالت رحمۃ العالمین اور خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ مسلمانوں نے ذات اور کائنات کو تسخیر کیا اور ایک عظیم شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی جس میں سماجی انصاف، معاشی ترقی اور حقوق انسانی کا احترام تھا۔ مسلمانوں نے یونان، روم، مصر، چین اور ہندوستان کے تہذیبی ورثے میں اضافہ کر کے جدید مغربی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ پھر ایک طویل عرصے تک دنیا کی رہنمائی کرتے کرتے تھک ہار کے خواب غفلت میں گہری نیند سو گئے۔

حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی نظم ''از خواب گراں خیز'' میں ایسی ولولہ انگیز صدا بلند کرنے کی یہی وجہ تھی کہ ہمیں بطور مسلمان یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اس دنیا میں کیسے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟ ہمیں اپنے اعمال وافعال کے ذریعے عزم کرنا ہے کہ ہم کس قسم کے لوگ بننا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس اصول کو یوں واضح فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (سورۃ الرعد، آیت:۱۱)
(بیشک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی)

لہٰذا مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جاگنے اور اپنی حالت کی اصلاح خود کر لینے کی مہلت دی گئی ہے۔ ایسا نہ کرنے والوں سے کہا گیا ہے: وقت کا انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرما دے:

فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ.(سورۃ التوبہ، آیت: ۲۴)
(انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے)

اس کا فیصلہ ہوسکتا ہے کہ تمہاری پسند کا نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مزید مصائب کا حامل ہو یا ہمیں بدل کر نئے لوگ لے آنے کا ہو:
وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ. (سورۃ محمد، آیت:۳۸)
(اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے)

اب فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بہت سی قومیں اور تہذیبیں آئیں اور پھر مٹ گئیں۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ.(سورۃ آل عمران، آیت: ۱۴۰)
(یہ تو زمانہ کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں)

مسلم تہذیب بھی ایک شدید وجودی داخلی کشمکش کا شکار ہے۔ وہ عہد حاضر میں ایک باوقار اور خوشحالی کی زندگی گزارنے سے قاصر ہے۔ اس اضطراب وخوف میں یہ کوشش کی ہے کہ اپنی تاریخ پر ایک گہری نظر ڈال کر اس کے حال کا تجزیہ کیا جائے اور اصلاح کا ایک لائحہ عمل دیا جائے۔ یہ کتاب اس درد دل کا اظہار ہے۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں ہم اپنی روش پر چلتے چلتے ماضی کا ویسے ہی حصہ نہ بن جائیں جیسا کہ ہم سے پہلے تہذیبیں بن چکی ہیں۔

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں، جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے
(زندان نامہ)

حوالہ جات

۱۔ زندان نامہ، فیض احمد فیض۔ علی گڑھ: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۷ء۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کر دم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کر دم
(میں نے اپنی ساری زندگی کا حاصل اپنے دوست کے راستے میں قربان کر دیا ہے)
(اپنی زندگی سے خوش ہوں کہ میں نے کچھ کرکے ہی دم لیا ہے)

کتابیات

۱۔ ارباب الدعوۃ فی القرآن، محمد حسین فضل اللہ۔ بیروت: دار الازہرا، ۱۹۸۶ء۔

۲۔ ارمغان حجاز، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: اقبال اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۲ء۔

۳۔ اسرار خودی، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۵ء۔

۴۔ اعلام الموقعین عن رب العالمین، حافظ ابوعبداللہ بن قیم جوزیؒ۔ بیروت: دار الکوکب العلمیہ، ۲۰۰۰ء۔

۵۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ لکھنو: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ۱۹۷۹ء۔

۶۔ ایقاظ همم اولی الابصار للاقتداء بسید المهاجرین والانصار و تحذیر هم عن الابتداع الشائع فی القری والانصار من تقلید المذاهب مع الحمیة و عصبیة فقها الاعصار، امام صالح بن محمد العمری الشهیر بالفلانیؒ۔ شارجہ: دار الفتاح، ۱۱۹۵ء۔

۷۔ بال جبریل، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: تاج کمپنی، ۱۹۳۵ء۔

۸۔ بانگ درا، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔

۹۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ابوبکر علاء الدین الکسانیؒ ترجمہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف۔ لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، ۱۹۹۳ء۔

۱۰۔ بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ابوالولید محمد بن احمد بن رشد۔ لاہور: دار التذکیر، ۲۰۰۹ء۔

۱۱۔ پیام مشرق، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: شیخ مبارک علی، ۱۹۲۳ء۔

۱۲۔ تاریخ الامم والملوک: تاریخ طبری، امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ ترجمہ ڈاکٹر محمد صدیق ہاشمی۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، ۲۰۰۴ء۔

۱۳۔ تفسیر المنار، محمد رشید رضا۔ بیروت: دارالکوکب العلمیہ، ۲۰۰۰ء۔

۱۴۔ تفسیر ضیاء القرآن، پیر محمد کرم شاہ ازہریؒ۔ لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء۔

۱۵۔ تفسیر قرطبی، امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر قرطبیؒ ترجمہ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ۔ لاہور: ضیاء القرآن، ۲۰۱۲ء۔

۱۶۔ تفسیر مظہری، قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ۔ کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۹۹ء۔

۱۷۔ تفہیم القرآن، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ لاہور: الاصلاح کمیونیکیشن نیٹ ورک، ۱۹۹۹ء۔

۱۸۔ جامع البیان عن تاویل آیٔ القرآن، امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۹۹۷ء۔

۱۹۔ جامع ترمذی، امام محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ ترجمہ مولانا فضل احمد۔ کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۶ء۔

۲۰۔ الجہاد فی الاسلام، عبدالرحمٰن رحمانیؒ۔ لاہور: دارالاندلس، ۱۹۹۷ء۔

۲۱۔ حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ترجمہ مولانا محمد سعدس پالن پوری۔ کراچی: زمزم پبلشرز، ۲۰۰۵ء۔

۲۲۔ حیات انور، عبدالرحمٰن کوندو۔ ندوہ المصنفین، ۱۹۷۸ء۔

۲۳۔ الخصائص العامہ لی الاسلام، شیخ یوسف عبداللہ القرضاویؒ۔ قاہرہ: مکتبہ وہبہ، ۱۹۸۹ء۔

۲۴۔ خطبات بہاولپور، ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ اسلام آباد: اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، ۲۰۰۷ء۔

۲۵۔ دیوان حافظ، حافظ محمد شیرازیؒ۔ لاہور: پروگریسو بکس، ۲۰۱۰ء۔

۲۶۔ رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد، محمد حسین بٹالویؒ۔ لاہور: وکٹوریہ پریس، ۱۸۷۶ء۔

۲۷۔ رعبایات عمر خیام، حکیم عمر خیام نیشاپوریؒ۔ تہران: انتشارات امیر کبیر، ۲۰۰۰ء۔

۲۸۔ رموز بخودی، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: یونین سٹیم پریس، ۱۹۱۸ء۔

۲۹۔ زاد المعاد، حافظ ابوعبداللہ بن قیم جوزیؒ۔ دار السلام، لندن، ۲۰۰۳ء۔

۳۰۔ زبور عجم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۱۴ء۔

۳۱۔ سنن ابن ماجہ، امام حافظ ابی عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہؒ ترجمہ مولانا محمد قاسم امین۔ لاہور: مکتبہ العلم، ۲۰۱۰ء۔

۳۲۔ سنن ابوداؤد، امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانیؒ ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی۔ نئی دہلی: مجلس علمی دار الدعوۃ، ۲۰۰۸ء۔

۳۳۔ سنن البیہقی (شعب الایمان)، حضرت امام ابی بکر احمد بن حسین البیہقیؒ ترجمہ مولانا قاضی ملک محمد اسماعیل۔ کراچی: دار الاشاعت، ۲۰۰۷ء۔

۳۴۔ سنن الدارمی، امام ابومحمد عبداللہ دارمیؒ۔ ریاض: دار المغنی، ۲۰۰۰ء۔

۳۵۔ سنن نسائی، امام احمد بن شعیب نسائیؒ ترجمہ مولانا افضل احمد۔ کراچی: دار الاشاعت، ۲۰۰۱ء۔

۳۶۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابن ہشام، حضرت ابومحمد عبدالملک ابن ہشامؒ؛ حضرت محمد بن اسحاق بن یسارؒ ترجمہ سید یٰسین علی حسنی نظامی دہلوی۔ لاہور: ادارہ اسلامیات، ۱۹۹۴ء۔

۳۷۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علامہ شبلی نعمانیؒ؛ علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ لاہور: ادارہ اسلامیات، ۲۰۰۶ء۔

۳۸۔ سیرت حلبیہ، علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ ترجمہ مولانا محمد اسلم قاسمیؒ۔ کراچی: دار الاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۳۹۔ صحیح بخاری، امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ترجمہ حضرت مولانا محمد داؤد راز۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۴۰۔ صحیح مسلم، امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج نیشاپوری ترجمہ علامہ وحید الزمان۔ دہلی: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، ۲۰۰۴ء۔

۴۱۔ صناعۃ الفتویٰ وفقہ العقلیات، شیخ عبداللہ بن محفوظ بیہؒ۔جدہ: دارالمنہاج، ۲۰۰۰ء۔

۴۲۔ ضرب کلیم، ڈاکٹر محمد اقبالؒ۔لاہور: کتب خانہ طلوع اسلام، ۱۹۳۶ء۔

۴۳۔ غبار ایام، فیض احمد فیض۔لاہور: فرید بک، ۲۰۱۰ء۔

۴۴۔ غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، شیخ یوسف عبداللہ القرضاوی۔قاہرہ: مکتبہ وہبہ، ۱۹۸۴ء۔

۴۵۔ فتاویٰ نذیریہ، نذیر حسین دہلویؒ۔لاہور: اہلحدیث اکیڈمی، ۱۹۷۱ء۔

۴۶۔ فقہ الاقلیات المسلمہ، خالد عبدالقادر۔طرابلس: دارالایمان، ۱۹۹۸ء۔

۴۷۔ القول المفید فی الدلۃ الاجتہاد والتقلید، امام محمد بن علی بن محمد شوکانیؒ۔ملتان: فاروقی کتب خانہ، ۱۹۹۳ء۔

۴۸۔ کتاب الخراج، امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیمؒ۔پشاور: مکتبہ فاروقیہ، ۲۰۰۰ء۔

۴۹۔ کتاب الزہد، ظفر اللہ خان۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۷ء۔

۵۰۔ کتاب السیر الکبیر، امام محمد بن حسن الشیبانیؒ شرح امام سرخسیؒ۔بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۷ء۔

۵۱۔ کتاب المبسوط، امام محمد بن احمد سرخسیؒ۔بیروت: دارالمعرفۃ، ۱۹۷۸ء۔

۵۲۔ کشف الباری عما فی صحیح البخاری: اردو شرح صحیح بخاری، مولانا سلیم اللہ خانؒ۔کراچی: مکتبہ فاروقیہ، ۲۰۰۶ء۔

۵۳۔ کشف المحجوب، حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ منقولہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ترجمہ ایف ڈی گوہر۔لاہور: احمد ربانی ایم اے، ۱۹۷۲ء۔

۵۴۔ کلیات چکبست، پنڈت برج نرائن چکبست۔بمبئی: ساکر پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء۔

۵۵۔ کنزل العمال، امام علاء الدین علی متقی بن حسام الدینؒ ترجمہ مولانا احسان اللہ شائق۔کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۹ء۔

۵۶۔ لسان العرب، حضرت انصاری بن منظورؒ۔ بیروت: دارالکتب العلمیہ ،۲۰۰۹ء۔

۵۷۔ المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز، حضرت ابن عطیہ اندلسیؒ۔ بیروت: دار الکتب العلمیہ ، ۲۰۰۷ء۔

۵۸۔ المستدرک الی الصحیحین، امام ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ حاکمؒ ترجمہ شاہ محمد چشتی۔ لاہور: پیغام القرآن،۲۰۰۹ء۔

۵۹۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ، حضرت امام احمد بن حنبلؒ ترجمہ مولانا محمد ظفر اقبال۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۰۴ء۔

۶۰۔ مشکوٰۃ المصابیح، حضرت شیخ ولی الدین الخطیب التبریزیؒ ترجمہ مولانا محمد صادق خلیلؒ۔ لاہور: مکتبہ محمدیہ، ۲۰۰۵ء۔

۶۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ، امام ابی بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہؒ ترجمہ مولانا اویس سرور۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ، ۲۰۰۰ء۔

۶۲۔ من فقہ الدولۃ فی الاسلام، شیخ یوسف عبداللہ القرضاویؒ۔ قاہرہ: دارالشروق، ۱۹۹۷ء۔

۶۳۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ، حضرت امام ابواسحاق ابراہیم بن موسیٰ شاطبیؒ ترجمہ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی۔ لاہور: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، ۱۹۹۳ء۔

۶۴۔ نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض۔ لاہور: فرید بک، ۲۰۱۰ء۔

۶۵۔ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد، حافظ عبدالسلام بن محمد۔ لاہور: دارالاندلس، ۲۰۰۳ء۔

۶۶۔ وحدت امت، مولانا محمد اسحاقؒ۔ فیصل آباد: مکتبہ ملیہ، ۲۰۰۷ء۔

۶۷۔ وحیدالدین، فکر اسلامی۔ نئی دہلی: دارالتذکیر، ۲۰۰۹ء۔

۶۸۔ الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر وباسفلہ الکبریت فی بیان علوم الشیخ الاکبر محیی الدین بن العربی وھو امنتخب من کتاب لواقح الانوار القدسیۃ المختصر من الفتوحات المکیۃ، امام عبدالوہاب بن احمد الشعرانیؒ۔ بیروت: دارالاحیاء، ۱۹۹۸ء۔

(English)

۱۔ A History of Industrial Chemistry by F. S. Taylor. London: Heinmann, 1957.

۲۔ A History of Muslim Philosophy by M. M. Sharif. Otto Harrassowitz: Kempten, 1963.

۳۔ A Study of History: Abridgement of Volumes I to VI. by A. J. Toynbee. New York: Oxford University Press, 1947.

۴۔ al-Ahkam al-siyasiyya li'l-aqalliyat al-muslima fi'l-fiqh al-Islami (The Political Rulings on Muslim Minorities in Islamic Jurisprudence) by Imam Sarkhasi. Beirut: Dar al-Nafa'is, 1997.

۵۔ Al-Battani. Dictionary of Scientific Biography by Willy Hartner. New York: Charles Scribner's Sons, 1970.

۶۔ al-Ghazali: The Mystic by Margaret Smith. London: Luzac & Co., 1946.

۷۔ An Anatomy of the World by John Donne. London: A. Mathewes for T. Dewe, n. d.

۸۔ Arabian Medicine and Its Influence on the Middle Ages by D. Campbell. London: Routledge, 2000.

۹۔ Conflict and Conquest in the Islamic World: A Historical Encyclopedia, Edited by Alexander Mikaberidze. Santa

Barbara: ABC-CLIO, 2011.

۱۰۔ Controlling the State: Constitutionalism from Ancient Athens to Today by Gordon Scott. Harvard: Harvard University Press, 2009.

۱۱۔ Dictionary of Scientific Biography by W. Hartner. New York: Charles Scribner's Sons, 1970

۱۲۔ Dictionary of the Social Sciences by C. Calhoun. New York: Oxford University Press, 2002.

۱۳۔ Discourses of Iqbal by Dr. Muhammad Iqbal. Lahore: Sh. Ghulam Ali & Sons, 1979.

۱۴۔ Early Arabic Pharmacology: An Introduction Based on Ancient and Medieval Sources by M. Levey. Leiden: Brill, 1973.

۱۵۔ Encyclopedia Britannica. Chicago: The University of Chicago, 1988.

۱۶۔ Fiqh Al-Imam: Key Proofs in Hanafi Fiqh by Abdur Rehman Ibn Yusuf. London: White Thread Press, 2004.

۱۷۔ Galileo's Mistake: A New Look at the Epic Confrontation Between Galileo and the Church by Wade Roland. New York: Arcade Publishing, 2003.

۱۸۔ Historical Eclipses and Earth's Rotation by F. Richard Stephenson. New York: Cambridge University Press, 1997.

۱۹۔ Historical Facts for the Arabian Musical Influence by Henry George Farmer. London: Ayer Publishing, 1988.

۲۰۔ History of Project Management by Y. Chiu. Netherlands: Eburon Press, 2010.

۲۱۔ Introduction to Islam by Dr. Muhammad Hamidullah. Lahore: Sh. Mohammed Ashraf, 1974.

۲۲۔ Introduction to Islamic Civilisation by R. M. Savory. New Dehli: Vikas, 1980.

۲۳۔ Introduction to the History of Science by Goerge Sarton. New York: Huntington, 1975.

۲۴۔ Islam and Divine Comedy by M. A. Palacios. London: Frank & Cass, 1968.

۲۵۔ Islam at the Crossroads, M. Asad. Kuala Lumpur: The Other Press, 2005.

۲۶۔ Islamaic Law: Its Scope and Equity by Said Ramadan. London: P.R. Macmillan, 1961.

۲۷۔ Journal of history of behavioural sciences, 42 (2006). Is There a Problem with Mathematical Psychology? A fresh look at Kant's old argument by Thomes Strum

۲۸۔ Journal of the History of Ideas 59 (3), 1998. Explaining Away the Greek Gods in Islam by J. T. Walbridge.

۲۹۔ Journal of the History of Ideas: Was Copernicus Revolutions Approved by the Pope, 36(3), 1975.

۳۰۔ Makers of Chemistry by E. Holmyard. Oxford: Clarendon Press, 1931.

۳۱۔ Mathematical Geography by E. S. Kennedy. Routledge, 1996.

۳۲۔ Muhammad: A Prophet for all Humanity by Wahidduddin Khan. Noida: Goodword, 2002.

۳۳۔ Nozhat Al Mushtak fi Ikhtrak Al-Afak by al Idrisi. Romae in Typographia Medicea, 1592.

۳۴۔ Papermaking: The History and Technique of an Ancient Craft by Dard Hunter. New York: Dover Books, 1978.

۳۵۔ Philosophy and the Human Sciences by Charlas Taylor. Cambridge: Cambridge University Press, 1985.

۳۶۔ Qazalbash Waqf Case, 99 (Shariat Appellate Bench of Supreme Court 1990).

۳۷۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam by Dr. Muhammad Iqbal. London: Oxford University Press, 1934.

۳۸۔ Renaissance Genius: Galileo Galilei & His Legacy to Modern Science by David Whitehouse. London: Sterling Publishing, 2009.

۳۹۔ Science and Medicine in the Legacy of Islam by M. Meyerhof. London: Oxford University Press, 1931.

۴۰۔ Science and Technology in Islam, The Touch of Midas by M. A. Kettani. Manchester: Manchester University Press, 1984.

۴۱۔ Studies in Medieval Islamic Technology: From Philo to al-Jazari - from Alexandria to Diyar Bakr by D. R. Hill. London: Routledge, 1998.

۴۲۔ The Arabic Hegemony: A History of Mathematics by C. B. Boyer. John Wiley & Sons, 1991.

۴۳۔ The Arabs: A Short History by Philip Hitti. London: Macmillan, 2000.

۴۴۔ The Crest of the Peacock: Non-European Roots of Mathematics by George Gheverghese Joeph. London: Princeton University Press, 2010.

۴۵۔ The End of the Jihad State: The Reign of Hisham Ibn 'Abd al-Malik and the Collapse of the Ummayyads by Khalid Yahya Blankinship. Albany: State University of New York Press, 1994.

۴۶۔ The First Written Constitution in the World by Dr. Muhammad Hamidullah. Lahore: Ashraf Press, 1975.

۴۷۔ The History of Western Philosophy by Bertrand Russell. London: G.Allen & Unwin Ltd.Segal,(1996, June). Why Does the Muslim World Lag in Science? The Middle East Quarterly, 3(2), 61-70.

۴۸۔ The Impact of Science on Soceity by Bertrand Russell. London: Routledge Taylor & Francis Group, 1976.

۴۹۔ The Making of Humanity by R. Briffault. London: G.Allen & Unwin Ltd, n.d.

۵۰۔ The Message of The Quran by M. Asad. London: The Book Foundation, 2003.

۵۱۔ The Muslim Conduct of State by Dr. Muhammad Hamidullah.

Lahore: Islamic Book Trust, 2012.

۵۲۔ The Story of Civilization by W. J. Durant. New York: MJF Books, 1993.

۵۳۔ The Virtue of Selfishness: A New Concept of Egoism.by Ayn Rand. New York: New American Library, 1964.

۵۴۔ Thoughts and Reflections of Iqbal. By Dr. M. Iqbal. Lahore: Sh. Mohammed Ashraf Publishers, 1992.

۵۵۔ To be a European Muslim: A Study of Islamic Sources in the European Context by Tariq Ramadan. Leicester: Islamic Foundation, 1999.

۵۶۔ War and Peace in the Law of Islam by Majid Khadduri. New Jersey: The Law Book Exchange, 2006.

۵۷۔ What is Enlightenment? by Kant. New York: Macmillan, 1963.

۵۸۔ http/www.fatwa-online.com

۵۹۔ http: //hds.harvard.edu

۶۰۔ http://www.constitution.org/cons/medina/charter.htm

۶۱۔ http://www.darululoomdesbnd.com/english

۶۲۔ http://www.fatwa-online.com

۶۳۔ http://www.gordonconwell.edu/resources/

۶۴۔ http://www.library.leiden.edu/Spical-collection/oriental collections/intro-middle-east.html

۶۵۔ http://www.thehindu.com

۶۶۔ http://www-history.mcs.st-andrews.ac.uk/Biographies/Al-Jayyani.html

۶۷۔ http:/www.etymonline,com/index,php?term=ream

۶۸۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Islamic_contributions_to_Medieval_Europe

۶۹۔ https://www.jstor.org/stable/230255?seq=1#page_scan_tab_contents

۷۰۔ https://www.wsfcs.k12.nc.us/cms/lib/NC01001395/Centricity/Domain/8062/watson_AAR_and_its_diffusion.pdf

مصنف کی دیگر کتب

01 کتاب الزہد

02 کتاب الاخلاق

03 اللّٰھم : کتاب الدعا

04 مقامات تصوف : منزل ما کبریاست

05 مقامات : اللہ غایتنا (عربی)

06 ذوق بندگی

07 اجتہاد: اسلامی فکر کی عصری تشکیل

08 احوال: مائیم ہمیشہ شاد بے ما (جلد اول)

09 احوال: مائیم ہمیشہ شاد بے ما (جلد دوئم)

10 نفس جبریل

11 ہمارا تعلیمی نظام: ماضی، حال اور مستقبل



ظفر اللہ خان نے ابتدائی دینی و دنیاوی تعلیم صوفیائے کرام کے شہر ملتان میں حاصل کی۔ وفاق المدارس الدینیہ سے الشہادۃ العالمیہ فی العلوم الاسلامیہ کیا۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی (بین الاقوامی تعلقات) کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں تدریس کے شعبے سے منسلک رہنے کے بعد، سول سروس آف پاکستان کے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ (1987ء) میں شمولیت اختیار کر لی۔ سٹی یونیورسٹی لندن (1997ء) سے ایل ایل بی کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ یونیورسٹی آف ویسٹ آف انگلینڈ، برسٹل (برطانیہ) سے قانون میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کیا اور لنکنز ان (1998ء) سے بار ایٹ لاء کرنے کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے کر (2002ء) قانون کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ ہیگ (ہالینڈ)، تورین (اٹلی)، جنیوا (سوئزرلینڈ) اور آکسفورڈ (برطانیہ) سے قانون اور بین الاقوامی تعلقات پر کئی خصوصی کورسز کیے۔ وفاقی سیکریٹری برائے قانون و انصاف اور وزیر اعظم پاکستان کے خصوصی معاون/ وفاقی وزیر برائے قانون و انصاف، وزیر برائے حقوق انسانی، وزیر برائے اقتصادی امور، وزیر برائے کابینہ اور وزیر برائے پارلیمانی امور بھی رہے۔ آپ اسلام، قانون اور حقوق انسانی پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔



مشتاق بک کارنر

الکریم مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور فون: 042-37230350